یا اللہ جل جلالہٗ

فَاسْأَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ (النحل ۴۳)
اے لوگو علم والوں سے پوچھو اگر تم علم نہیں رکھتے

یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

سینکڑوں مسائلِ شرعیہ کے حل کا بیش بہا خزانہ

العطایا السیفیۃ
فی
الفتاویٰ النقشبندیۃ

المجلد الثانی

تصنیف
فخر المتاخرین العالم العارف باللّٰہ
مفسر کلام اللّٰہ تعالیٰ وخادم حدیث رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم
الشیخ السید احمد علی شاہ
الحنفی الترمذی الماتریدی السیفی
النقشبندی الجشتی القادری السھروردی

ناشر
جامعہ امام ربانی مجدد الف ثانی رحمہ اللہ تعالیٰ
فقیر کالونی اورنگی ٹاؤن نمبر ۱۰ کراچی غربی

نام کتاب: العطایا السیفیۃ فی الفتاوی النقشبندیۃ، المجلد الثانی

تصنیف و تالیف: پیر طریقت رہبر شریعت آفتاب ہدایت حضرت علامہ سید احمد علی شاہ سیفی نقشبندی دامت برکاتہم القدسیہ

تعلیق و ترتیب: پیر طریقت رہبر شریعت حضرت علامہ صاحبزادہ سید عبد الحق شاہ ترمذی سیفی نقشبندی دامت برکاتہم القدسیہ

طباعت اول: مارچ ۲۰۲۴ء بمطابق شعبان المعظم ۱۴۴۵ھ

طباعت ثانی:

کمپوزر: صوفی سید فرحان الحسن سیفی

ناشر: جامعہ امام ربانی مجدد الف ثانی، فقیر کالونی، اورنگی ٹاؤن، کراچی

فہرست

فہرست

فہرست

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم

(۱) باب نمبر ایک: معرفت اور ایمان کے بیان میں

اس میں گیارہ قول ہیں۔

پہلا قول: اللہ تعالیٰ کے حقیقی عارفوں کا بیان

مہتدی ابو شکور سالمی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ معلوم ہونا چاہیے کہ در حقیقت اللہ تعالیٰ کے عارفین وہ ہیں جو بغیر ادراک واحاطہ کے اس کی معرفت میں کامل ہیں اور اس معرفت سے ان کی مراد یہ ہے کہ ذات کو پہچاننا اس لئے کہ معرفت کی دو قسمیں ہیں۔

معرفت کی دو قسمیں ہیں

(۱) معرفت ذات (۲) معرفت صفات

ہمارا اس اجماع ہے کہ ذاتِ باری تعالیٰ کی معرفت اور پہچان میں تحیر اور نقصان جائز اور ممکن نہیں ہے۔

معرفت صفات کی تین قسمیں ہیں

ایک وہ صفات ہیں جو ربوبیت کے مخصوص اوصاف سے تعلق رکھتی ہیں کہ ان میں کسی حال میں تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا اور ان صفات کے بغیر ذات "الہ" ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتی تو ان صفات کی معرفت میں تحیر و نقصان جائز نہیں اور یہ وہ صفات ہیں جو نص سے ثابت ہوئی ہیں اور یقین میں خطا کا وہم وشبہ نہیں ہو سکتا، اس لئے ان صفات میں تحیر و نقصان جائز نہیں کیونکہ نص، قطعی و یقینی علم کا موجب ہوتی ہے اور وہ صفات جو نص سے یا خبر سے ثابت ہیں لیکن نص میں خطا کا وہم نہیں اور نہ شبہ کو واجب کرتا ہے۔ عام فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس میں تحیر جائز نہیں اور اللہ تعالیٰ کے کلام پر اور جو اس نے ارادہ فرمایا اور ایمان لانا واجب ہے اور یہ تحیر اور شک کو واجب نہیں کرتا، یہی اصح ہے اور بعض نے کہا: اس میں تحیر وشک جائز ہے۔

صفات میں تحیر توحید ہے اور ذات میں تحیر کفر ہے

بعض متقدمین سے مروی ہے کہ ذات میں تحیر کفر ہے، اس سے ان کی مراد اثبات اثبات ذات ہے، اس لئے کہ جو اثبات ذات میں تحیر وشک کرے وہ کافر ہے اور ان کا یہ کہنا کہ صفات میں تحیر وشک توحید ہے، یہ مطلقاً نہیں فرمایا بلکہ اسی تفصیل کے مطابق جو ہم نے ذکر کی۔

اشعریہ کہتے ہیں کہ معرفت کی حقیقت یہی ہے کہ معرفت میں حیرت و عجز ہو، اس لئے کہ معرفت میں درک واحاطہ نہیں ہو سکتا۔

مبتدعین کا نظریہ

بعض مبتدعین نے کہااور وہ مصور یہ ہیں کہ جب تک کوئی صورت دل میں متصور نہ ہو معرفت صحیح نہیں تعبد وعبادت جب صحیح ہو سکتی ہے کہ معبود کی صورت سامنے ہو اور یہ کفر ہے۔

محمد ابن حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ اس میں کوئی فرق نہیں کہ بظاہر صورت بنا کر عبادت کرے یا باطن میں فرض کر کے عبادت کرے۔

پھر صورت اس لئے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے علم سے معلوم ہے اور ہماری عقل سے معقول نہیں کیونکہ عقل، وہم وخیال اور صورت کو واجب کرتی ہے، یہاں تک کہ اس پر واقف ہو اور اللہ تعالیٰ وہم وصورت وخیال کا خالق ہے۔ اس معنی کے لحاظ سے حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: **تفکروا فی الصفات ولا تتفکروا فی الذات**۔ صفات میں تفکر کرو، ذات میں تفکر نہ کرو، اس لئے کہ ذات میں تفکر ماہیت و کیفیت کو واجب کرتا ہے اور جو خدا کو ماہیت اور کیفیت کے ساتھ مانے وہ کافر ہے۔

خدا کیا ہے؟ اور کیسا ہے؟

پھر اگر کہے کہ وہ کیا ہے اور کیسا ہے؟ تو ہم کہیں گے: سوال ہی محال ہے اور اس کا اعتقاد کفر ہے، اس لئے کہ وہ ہے جو ماہیت اور کیفیت سے پاک و منزہ ہے۔

معرفت کسے کہتے ہیں یا وہ کیا ہے؟

اگر سوال کیا جائے کہ معرفت کیا ہے؟ تو ہم کہیں گے کہ حادث وقدیم میں تمیز کرنا (اللہ (خالق) مخلوق کے درمیان فرق جاننا ہے)۔

معرفت کا ایک اور مطلب

بعض کہتے ہیں کہ صانع کی معرفت اس وقت صحیح ہے کہ اپنے نفس وروح کو پہچانے اور جو شخص اپنی روح ونفس کو نہ پہچانے، اس پر صانع کا پہچاننا واجب نہیں اور یہ کفر ہے۔

معرفت کا تیسرا معنیٰ

اور بعض نے کہا کہ جو چیز مدرک و محاط نہ ہو، اس کا پہچاننا صحیح نہیں اور یہ بھی کفر ہے (اس لئے کہ اللہ تعالیٰ مدرک و محاط نہیں اور پہچاننا فرض ہے) اس لئے کہ درک واحاطہ فقط محدود متغیر اور متکون جواہر میں متصور ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ ان امور سے منزہ وپاک ہے، اس لئے ہم کہتے ہیں کہ یہ کہنا جائز نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی کیفیت معلوم نہیں یا کہا جائے کہ اس کی ماہیت معلوم نہیں کیونکہ یہ کہنا بھی ماہیت و کیفیت کے جواز پر دلالت کرتا ہے اور یہ کفر ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات بے کم و کیف ہے

اسی طرح یہ بھی نہیں کہنا چاہیئے کہ اس کی سمع کی کیفیت اور بصر کی کیفیت معلوم نہیں کہ اس میں بھی وہی خرابی ہے جو ہم نے بیان کی۔ صحیح یہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ کے لئے کیفیت، ماہیت، اور کمیت نہیں اور اسی طرح اس کی صفات کو سمجھنا چاہیئے کہ ان کے لئے کیفیت نہیں۔

اعضاء کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف بطورِ نفی بھی درست نہیں

ہمارے بعض مشائخ فرماتے ہیں کہ فارسی میں یہ کہنا جائز نہیں کہ ''خدارا دست نیست'' (خدا کے ہاتھ نہیں) یا ''چشم نیست'' یا ''پائے نیست'' یا ''زبان نیست'' اور اس کی مانند (اس کی آنکھ، پاؤں، زبان وغیرہ نہیں) اس لئے کہ الفاظ موہم خطاء ہیں کیونکہ عرف وعادت میں جو اندھا ہوتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ اس کی آنکھ نہیں اور ایسے اشلّ (جس کا ہاتھ شلّ ہو گیا ہو) کو کہا جاتا ہے کہ اس کا ہاتھ نہیں اور اپاہج کو کہتے ہیں کہ اس کا پاؤں نہیں۔

صحیح یہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ بغیر آلہ کے سمیع ہے اور بغیر آلہ کے بصیر ہے اور تمام صفات کو اسی طرح سمجھنا چاہیئے کہ وہ ماہیت و کمیت اور کیف سے پاک و منزہ ہے تو اول صفات کو ثابت کرے، پھر تشبیہ کی نفی کرے۔

اللہ تعالیٰ کو ساقی اور مہمان نواز نہیں کہہ سکتے

ایسے ہی یہ کہنا جائز نہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمارا ساقی ہے اور مہمان نواز ہے کیونکہ یہ مشابہت و مشاکلت کا وہم پیدا کرتا ہے کیونکہ تمام مخلوق اللہ تعالیٰ کی مہمان ہے اور اللہ تعالیٰ ان کا رازق ہے اور اس میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا کہ اپنے بندوں کو دنیا میں رزق دے اور انہیں کھلائے پلائے یا جنت میں رزق دے اور کھلائے پلائے، یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: **وَ هُوَ يُطْعِمُ وَ لَا يُطْعَمُ** (الانعام ۱۴) اور وہ کھلاتا ہے اور کھانے سے پاک ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کی طرف سے خبر دی اور فرمایا: هُوَ يُطۡعِمُنِيۡ وَ يَسۡقِيۡنِ (الشعراء ۷۹) اور وہ جو مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے۔" اور فرمایا: وَ سَقٰهُمۡ رَبُّهُمۡ (الدھر ۲۱) اور انہیں ان کے رب نے پلائی۔" دنیا اور جنت میں کھانے پلانے میں فرق یہ ہے کہ دنیا میں آدمیوں کے واسطہ سے اور یہ نظر آتا ہے اور جنت میں واسطہ سے ہو گا مگر وہ نظر نہیں آتا ہے اور بسا اوقات بلاواسطہ کھلانا پلانا ہوتا ہے کیونکہ دونوں حال میں اسقاء واطعام (کھانا، پلانا) من جانب اللہ ہی ہوتا ہے۔

دوسرا قول: استدلال اور تقلید کا بیان

معتزلہ کہتے ہیں کہ ہدایت وفضل اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے، وہ آیات ونشانات ہیں جو اس کی صفات ووحدانیت پر دلالت کرتے ہیں اور یہی اس کا فضل وہدایت ہے (اس کے سوا اور کوئی اس کا فضل وہدایت نہیں) کہ راہنمائی، مہربانی اور انشراح صدر ہو۔

اہل سنت وجماعت

(اہل سنت وجماعت کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کیلئے ہدایت اور لطف اور عارفین کے لئے انشراح صدر ہے تعریف کے ساتھ)

بعض متصوفین کہتے ہیں: معرفت صانع کے لئے استدلال کی کوئی راہ نہیں، اس لئے کہ اشیاء صانع سے پہچانی جاتی ہیں اور یہ ناممکن ہے کہ اشیاء سے صانع پہچانا جائے اور انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ عارفوں کے دلوں کو اور ان کے اسرار کو جذب کرتا ہے اور ان کو اپنی معرفت کی طرف بغیر استدلال کے ہدایت کرتا ہے۔

رب کی پہچان کیسے ہوتی ہے؟ اس سوال کے جواب میں مشاہیر علماء کرام اور مشائخ رحمہم اللہ تعالیٰ کے ارشادات ہیں۔

حضرت شبلی رحمہ اللہ تعالیٰ سے پوچھا گیا کہ آپ نے اپنے رب کو کس چیز سے پہچانا؟ تو انہوں نے فرمایا کہ "عرفت اللہ باللہ" میں نے اللہ تعالیٰ کو اللہ تعالیٰ سے پہچانا، اگر اللہ تعالیٰ نہ ہوتا تو میں اس کو نہ پہچانتا۔

کیا معرفت الٰہی استدلال سے حاصل ہوتی ہے؟

اس کا جواب "ہاں" میں ہے اور معرفت الٰہی استدلال سے حاصل ہوتی ہے۔

اس پر دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:

اِنَّا هَدَيۡنٰهُ السَّبِيۡلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّ اِمَّا كَفُوۡرًا (الدھر ۳)

بیشک ہم نے اسے راہ بتائی یا حق مانتا یا ناشکری کرتا۔

نیز اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ (البلد ۱۰) (الی السبیلین)

اور اسے دو ابھری چیزوں کی راہ بتائی۔

حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا کہ آپ نے اپنے رب کو کس طرح پہچانا؟ فرمایا کہ ماں کے پیٹ سے خوبصورت بچہ کے پیدا ہونے سے کہ نہ یہ ستارہ سے ہے نہ طبع سے بلکہ صانع جل شانہ کی تقدیر سے ہے۔

حضرت علی شیر خدا رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے سوال کیا گیا کہ آپ نے اپنے رب کو کیسے پہچانا؟

فرمایا: "بفسخ العزائم و نقض الھمم"۔

کہ ہمارے پختہ ارادوں اور ہمتوں کی شکست و ریخت سے (یعنی تدبیر کند بندہ تقدیر زند خندہ) سے۔

حضرت حاتم الاصم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے دریافت کیا: تم نے اپنے رب کو کس طرح پہچانا؟ فرمایا: ہر شئے میں اس کا جلوہ دیکھ کر۔

ان اقوال سے ثابت ہوا کہ آیاتِ دالہ سے استدلال حصولِ معرفت کے لئے سبب ہے، اس کی رہنمائی اور فضل و کرم سے اور یہی صحیح تر ہے۔

تقلید استدلال کی ضد ہے، چنانچہ اب عنوان کی اس دوسری جز (تقلید) سے بحث ہوتی ہے۔

تقلید کسے کہتے ہیں؟

تقلید کی تعریف یہ ہے کہ بلا دلیل غیر کے قول کو مان لینا۔

بعض حضرات کہتے ہیں: بلا دلیل کسی کے قول و فعل کی متابعت کرنا تقلید کہلاتا ہے۔

سوال: کیا معرفت و ایمان میں تقلید کرنے والا مؤمن ہے یا نہیں؟

جواب: معتزلہ اور اشعریہ کہتے ہیں کہ مقلد (معرفت و ایمان میں) مؤمن نہیں ہے۔

فرقہ کرامیہ کی ایک شاخ متقشفہ نے کہا کہ مقلد مؤمن ہے۔

اہل سنت و جماعت فرماتے ہیں کہ مقلد اگر تصدیق کرتا ہے تو مؤمن ہے۔

مہتدی ابو شکور سالمی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے بلخ میں قاضی، امام شیخ الاسلام امام الائمہ ابو سعید خلیل ابن احمد ابن اسماعیل سنجری کا قلمی فتویٰ دیکھا، جوانہوں نے کسی کے اس سوال کے جواب میں لکھا تھا کہ مقلد فی الایمان مؤمن ہے یا نہیں؟ فرمایا: نرا مقلد مؤمن نہیں، اس لئے کہ معرفت صانع میں اس کو تقلید کی کیا ضرورت ہے؟ جب کہ آیات و علامات

اور آثار صانع کے وجود پر شاہد عدل ہیں، جیسے زمین و آسمان، سورج، چاند، رات، دن اور تمام اشیاء میں اس کی تاثیر ظاہر ہے، یہ صانع کے اثبات اور اس کی وحدانیت پر دلیل ہے۔

ایمان میں تقلید جائز نہیں

معتزلہ کہتے ہیں کہ ایمان میں تقلید جائز نہیں اور مقلد مؤمن نہیں۔

معتزلہ تقلید کس کو کہتے ہیں؟ معتزلہ کے ہاں تقلید کا معنیٰ یہ ہے کہ ہر مسئلہ کہ جس پر ایمان لانا واجب ہے، احکام و شرائع اور معرفت صانع اور معرفت رسول اس کے لئے واجب و ضروری ہے کہ دلیل و حجت سے مانے، بغیر شبہ کے بیان کرے تاکہ تقلید سے نکل جائے، ان کے مذہب میں ان کے اصول ہیں اور پانچ مسائل ہیں، ان کا نام اصول خمس ہے، جو ان مسائل کو نہ جانے ان کے نزدیک وہ مسلمان نہیں:

(۱) مسئلہ توحید (۲) مسئلہ عدل (۳) مسئلہ بین (۴) مسئلہ وعد (۵) مسئلہ وعید

مسئلہ توحید:

مسئلہ توحید یہ ہے کہ انہوں نے کہا: قرآن مخلوق ہے اور اللہ تعالیٰ کے لئے صفات نہیں اور صفات غیر اللہ ہے اور غیر اللہ قدیم نہیں تو صفات مخلوق ہوں گی۔

مسئلہ عدل:

اور مسئلہ عدل میں انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نہ شر کو پیدا کرتا ہے، نہ شر کا ارادہ کرتا ہے اور نہ شر کو چاہتا ہے۔ اس لئے کہ اگر وہ شر کو پسند کرے اور اس کا ارادہ کرے اور چاہے اور پھر فاعل شر (برائی کرنے والے کو) عذاب دے تو یہ عدل نہیں۔

مسئلہ بین:

مسئلہ بین یہ ہے کہ مؤمن جب کبیرہ گناہ کا ارتکاب کرتا ہے تو ایمان سے خارج ہو جاتا ہے اور کفر میں داخل نہیں ہوتا تو وہ کفر و اسلام کے بین یعنی درمیان ہو گا۔

مسئلہ وعد و عید:

اور مسئلہ وعد و وعید یہ ہے کہ ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ پر واجب ہے کہ ثواب وعقاب توجب ثواب کا یا عقاب کا وعدہ کیا تو جائز نہیں کہ وہ ثواب وعقاب کو روکے اور اگر ثواب سے روکا یا عقاب سے باز رہا تو یہ ان کے نزدیک عدل نہیں ہے۔ یہ اصولِ خمس (پانچ اصول) یعنی معتزلہ کا پانچ نکاتی پروگرام ہے تو جو ان پانچوں اصولوں کو نہ مانے اور معتقد نہ ہو، ان کے نزدیک

وہ مؤمن نہیں تو مقلد ہو جائے گا اور اس معنیٰ کے لحاظ سے اہل سنت وجماعت نے کہا کہ مقلد مومن ہے، اس لئے کہ ہر شخص کے لئے ناممکن ہے کہ وہ تقلید سے خارج ہو جب کہ یہی تقلید ہے۔

اشعریہ کہتے ہیں کہ بندہ جب اللہ تعالیٰ کو بجمیع صفاتہ دلیل وحجت کے ساتھ جاننے اور بیان کرنے پر قادر ہو تو حد تقلید سے نکل جاتا ہے۔

کرامیہ کہتے ہیں: جس نے "لا الہ الا اللہ" (یعنی کلمۂ طیبہ) پڑھا اور اللہ کو نہیں پہچانا اور صانع ومصنوع میں فرق نہ جانا اور اس کا معتقد بھی نہ ہو تو بھی مؤمن ہے اور یہ ہی تقلید محض ہے۔ اسی وجہ سے ہمارے فقہائے اہل سنت وجماعت فرماتے ہیں کہ اکیلا قول ہی (یعنی محض کہنا) ایمان نہیں اور مقلد جب تصدیق کرتا ہے تو مؤمن ہے اور اگر تصدیق نہیں کرتا تو مؤمن نہیں۔

اہل سنت وجماعت کی دلیل کہ مقلد محض مؤمن نہیں، یہ ہے کہ صحتِ ایمان کے لئے تصدیق شرط ہے اور تصدیق بغیر معرفت کے نہیں ہوتی اور معرفت بغیر استدلال کے نہیں ہوتی اور یہی معنی ہیں اس جواب کے کہ جس کی طرف شیخ امام خلیل ابن احمد سنجری نے اشارہ کیا تو جو شخص جانتا ہے کہ میرے لئے صانع اور تمام عالم کے لئے صانع ہے تو وہ حد تقلید سے نکل گیا اور صورتِ مسئلہ یہ ہوگی کہ جب تجھ سے کوئی سوال کرلے کہ تجھ کو کس نے پیدا کیا؟ اور تو جواب میں کہے: اللہ نے یا کہے آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے نے تو وہ مقلد محض نہیں اور اس کا ایمان صحیح ہے اور اگر کہے کہ میں نہیں جانتا اور باوجود اس کے کہ کلمہ پڑھتا ہے تو اہل سنت وجماعت کے نزدیک مؤمن نہیں اور کرامیہ نے کہا کہ وہ مؤمن ہے اور ایک مسئلہ امام محمد بن حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے "جامع کبیر" میں فرمایا، جو ہمارے قول کی صحت پر دلالت کرتا ہے اور وہ مسئلہ یہ ہے کہ جب صفت ایمان واسلام کو نہ جانے تو میاں بیوی میں تفریق کردی جائے گی۔

اس کا تفصیلی بیان یہ ہے کہ جب اس کے سامنے ایمان واسلام اور دین کی صفت بیان کی جائے تو اگر کہے: میں ایمان لائی اور تصدیق کرتی ہوں تو حد تقلید سے نہیں نکلی اور نکاح اس کا جائز ہے اور اگر کہتی ہے کہ میں نہیں جانتی پہچانتی تو اس کا نکاح جائز نہیں۔

بعض فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: تقلید صحیح جو کہ اہل سنت کے نزدیک ایمان ہے، وہ یہ ہے کہ جس کا لوگ کلمۂ شہادت اور اذان کے ساتھ تلفظ کرتے ہیں اور اس کی تفسیر نہیں جانتے اور اللہ تعالیٰ کو خیر کے ساتھ پہچانتے ہیں اور تقلید کے ساتھ من حیث الصنع والتاثیر (تاثیر وصنع کی حیثیت سے) اور اسلام کا صحیح اعتقاد کرتے ہیں اور جانتے ہیں کہ اسلام خیر الادیان ہے، لیکن زبان سے اس کا وصف نہیں کرسکتے تو وہ اہل سنت وجماعت کے نزدیک مؤمن ہیں۔

روایت

ایک روایت ہے کہ حضرت حماد بن ابی حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہمانے اس مسئلہ کو اپنے والد سے دریافت کیاتوامام ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہمانے اس مسئلہ کو اپنے والد سے دریافت کیاتوامام ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایاکہ وہ اس کے فائدہ کو جانتاہے اور نام سے جاہل ہے، عالم ہے اس کے نفع کااور جاہل ہے اس کے نام سے، یہ ایسے ہے جیسے دو پیالے ہیں، ایک میں شہد ہواور دوسرے میں زہر اور ایک شخص ہے کہ عسل وسم (شہد اور زہر) کے ناموں سے واقف نہیں، لیکن یہ جانتاہے کہ شہد زہر سے اچھااور بہتر ہے تونام سے جاہل ہونااس کو نقصان نہیں دیتااور اگر کسی کے سامنے ایمان اور شرائط بیان کئے جائیں تووہ سن کر اعتراف کرے تو مؤمن ہو گا اور اگر ایمان واسلام ودین اور اس کے شرائط سننے کے بعد کہے کہ میں نہیں جانتاتو مؤمن نہ ہو گا۔

تیسر اقول: رکن ایمان کا بیان

معلوم ہوناچاہیئے کہ لوگوں نے ایمان کے رکن، اس کی شرائط، وصف اور اس کے حکم میں کلام کیاہے۔

جہم ابن صفوان کہتاہے کہ ایمان کارکن معرفت بالقلب ہے اور اس کے سواکچھ نہیں۔

حشویہ اور متقشفہ کہتے ہیں کہ ایمان کارکن صرف اقرار ہے بغیر اعتقاد کے۔

بعض کرامیہ کہتے ہیں کہ ایمان کارکن زبان سے اقرار، دل سے اعتقاد کرنا (یعنی ماننا) اور عمل بالارکان یعنی اعضاء سے عمل کرناہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کا بھی یہی مسلک ہے۔

معتزلہ کہتے ہیں کہ ایمان کارکن زبان کے ساتھ اقرار کرنا، دل سے اعتقادر کھنااور اعضاء سے عمل کرنااور کبائر سے بچنا ہے۔

حروریہ اور خارجیوں کا کہناہے کہ ایمان کارکن اقرار لسانی، تصدیق قلبی، عمل بالارکان اور صغائر و کبائر سے اجتناب کرنا ہے اور صحیح تر یہی ہے جو ہم کہتے ہیں کہ ایمان کارکن اقرار باللسان اور تصدیق بالقلب ہے، یہ قول امام ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کاہے۔

مومن کے تین درجے ہیں

سیدنا امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ ایمان کے تین درجے ہیں:

(۱) ایک وہ جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک مؤمن ہے اور لوگوں کے نزدیک کافر ہے، یہ وہ ہے جو دل سے اللہ تعالیٰ کو پہچانتا ہے جیسا کہ اس کو پہچاننے کا حق ہے اور توحید کا معتقد ہے، دین کا اعتقاد کرتا ہے اور کفر سے بیزار ہے لیکن اس سے اقرار ظاہر نہیں ہوا یا وہ جانتا نہیں کہ اقرار کیسے کرتے ہیں (یعنی اقرار کی کیفیت سے ناواقف وانجان ہے) اور تقیہ کفر کو ظاہر کرتا ہے تو یہ اللہ تعالیٰ کے ہاں مؤمن ہے اور عند الناس کافر ہے۔

(۲) دوسرا مرتبہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کافر ہے اور لوگوں کے نزدیک مؤمن اور وہ یہ ہے جو لوگوں کے سامنے اقرار کرتا ہے لیکن دل سے تصدیق نہیں کرتا تو بظاہر اس کو مسلمان کہا جائے گا اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک کافر ہوگا۔

(۳) تیسرا درجہ یہ ہے کہ زبان سے اقرار کرے اور دل سے تصدیق کرے تو یہ اور فرشتوں کے نزدیک اور انسانوں کے نزدیک مؤمن ہے لیکن جس نے کہا کہ ایمان صرف معرفت بالقلب بغیر اقرار کے اور کہا کہ جب اپنے رب کو جانتا ہے تو اس کو معصیت مضر نہیں، اگرچہ رب کو گالی دے جیسے دل کی معرفت کے بغیر اقرار کا فائدہ نہیں دیتا تو ایسے ہی معرفت کے ساتھ انکار نقصان نہیں دیتا۔

ہم نے جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ نے معرفت کے ساتھ اقرار کو شرط قرار دیا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ (المائدۃ ۸۳)

اس لیے کہ وہ حق کو پہچان گئے۔

نیز فرمایا:

فَاَثَابَهُمُ اللّٰہُ بِمَا قَالُوْا (المائدہ ۸۵)

تو اللہ نے ان کے اس کہنے کے بدلے عطا کیے۔

اور نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ میں مامور ہوں کہ کافروں سے جہاد کروں یہاں تک کہ کہیں ''لا الٰہ الا اللہ'' نیز فرمایا: جنت کی کنجی ''لا الٰہ الا اللہ'' ہے اور حضور اقدس ﷺ کا یہ بھی ارشاد ہے کہ جس نے خالصاً مخلصاً ''لا الٰہ الا اللہ'' کہا جنت میں داخل ہوگا، اعتقاد کے ساتھ ساتھ اقرار کو بھی شرط قرار دیا، اس سے ثابت ہوا کہ نری معرفت کا نام ایمان نہیں ہے اور معنیٰ اس میں یہ ہے کہ ابلیس اللہ تعالیٰ کو خوب جانتا تھا لیکن جب اس کی زبان سے کفر صادر ہوا تو کافر ہو گیا۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ یَعْرِفُوْنَهٗ کَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَھُمْ (البقرۃ ۱۴۶)

جنہیں ہم نے کتاب عطا فرمائی وہ اس نبی کو ایسا پہچانتے ہیں جیسے آدمی اپنے بیٹوں کو پہچانتا ہے۔

پھر معرفت انکار یا بغیر انکار اس کو دنیا و آخرت میں نفع نہیں دے گی تو ثابت ہوا کہ خالی معرفت ایمان نہیں اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

لَیَکْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَھُمْ یَعْلَمُوْنَ (۱۴۶)

جان بوجھ کر حق چھپاتے ہیں۔

تو وہ صحیح ہے جو ہم نے کہا ہے۔

اب رہے وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ خالی اقرار ہی ایمان ہے تو یہ بھی مفضی الی الکفر ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے منافقین کے ایمان باطل ہونے کی شہادت دی۔

جہاں فرمایا کہ:

وَاللّٰہُ یَشْھَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ لَکٰذِبُوْنَ (المنافقون ۱)

اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ منافق ضرور جھوٹے ہیں۔

اور جو محض اقرار کو ایمان کو کہتا ہے اس نے منافقین کے ایمان کی صحت کا حکم کیا اور یہ عقیدہ کفر ہے اور اللہ تعالیٰ نے اقرار کے ساتھ اعتقاد کو شرط قرار دیا ہے، ان دلائل مذکور سے یہی ثابت ہوتا ہے۔

اعتراض: اگر کوئی کہے کہ منافقین کا ایمان تو ایمان ہے ہی نہیں لیکن غیر منافقین محض اقرار سے مؤمن ہو جائیں گے، اس لئے کہ وہ کافر نہیں لیکن مخطی و مبتدع ہو گا، اس لئے کہ اس نے نص و خبر کی مخالفت کی اور اگر وہ کہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ احکام دنیا میں اس کا ایمان صحیح ہے کہ اس کو قتل نہیں کیا جائے گا اور اس پر مسلمان کے احکام جاری ہوں گے اور احکام آخرت میں اس کا ایمان صحیح نہیں تو یہ صحیح ہے اور ہم بھی یہی کہتے ہیں۔

اور لیکن، جس نے یہ کہا کہ ایمان نام ہے اقرار باللسان، تصدیق بالجنان، عمل بالارکان کا، انہوں نے اس آیت سے احتجاج کیا:

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِیَعْبُدُوا اللّٰہَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ حُنَفَآءَ وَیُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَیُؤْتُوا الزَّکٰوۃَ وَذٰلِکَ دِیْنُ الْقَیِّمَةِ (البینۃ ۵)

اور ان لوگوں کو تو یہی حکم ہوا کہ اللہ کی بندگی کریں نرے اسی پر عقیدہ لاتے ایک طرف کے ہوکر اور نماز قائم کریں اور زکوۃ دیں اور یہ سیدھا دین ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ذکر کیا ہے اخلاص کا، نماز کا، زکوۃ کا۔

پھر فرمایا:

ذٰلِکَ دِیۡنُ الۡقَیِّمَۃِ (البینۃ۵)

تو دین نام رکھا شرائع کے پائے جانے کے بعد۔

تو ثابت ہوا عمل بالارکان بھی جزو ایمان ہے۔

اور حضرت امام جعفر ابن محمد صادق رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ عن ابیہ عن جدہ کہ نبی کریم ﷺ سے دریافت کیا، حضور ﷺ نے فرمایا: اقرار باللسان، تصدیق بالجنان اور عمل بالارکان اور اس مسئلہ میں نص ہے۔

آیت کا صحیح مفہوم

اور آپ کا جواب یہ ہے کہ "لیعبدو اللہ" کا معنی ہے "یوحدو اللہ" یعنی اللہ تعالیٰ کو ایک جانیں۔

اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ قرآن پاک میں جہاں عبادت کا نام آیا ہے، اس سے مراد توحید ہے اور اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کا نام مسلمان رکھا، ابھی نماز کا حکم بھی نہیں آیا تھا۔ پھر فرمایا کہ حُنَفَآءَ وَ یُقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَ یُؤۡتُوا الزَّکٰوۃَ خبر دی اس بات کی کہ فعل موحدین کا ہے ہم بھی یہی کہتے ہیں اور ضمیر "ذٰلِکَ" "دِیۡنُ الۡقَیِّمَۃِ (البینۃ۵) ایک طرف کے ہوکر اور نماز قائم کریں اور زکوۃ دیں، میں لِیَعۡبُدُوا اللہَ کی طرف لوٹتی ہے۔ اس پر دلیل یہ ہے کہ اگر مراد شرائع واحکام ہوتے تو "ذٰلِکَ" کی جگہ "تلک" "دِیۡنُ الۡقَیِّمَۃِ (البینۃ۵) ہوتا اور اس پر دلیل یہ ہے کہ قصۂ یوسف میں ہے۔ اِنِ الۡحُکۡمُ اِلَّا لِلّٰہِ اَمَرَ اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّاۤ اِیَّاہُ ذٰلِکَ الدِّیۡنُ الۡقَیِّمُ (یوسف ۴۰) حکم نہیں مگر اللہ کا اس نے فرمایا ہے کہ اس کے سوا کسی کو نہ پوجو یہ سیدھا دین ہے۔" معنیٰ اس میں یہ ہیں کہ ہم کہیں کہ عمل اگر ایمان میں سے ہے تو واجب ہوتا کہ انسان خراسان میں ہوتا اور ایمان مکہ میں، مدینہ و عراق میں اس لئے کہ حج کرے مکہ میں اور نماز پڑھے مدینہ و عراق میں اور رباطات (جہاد کے گھوڑے) و مساجد قناطیر (پلیں) مختلف شہروں میں اور محال ہے کہ ایمان ایک جگہ ہو اور مؤمن دوسری جگہ اور اس حدیث کا جواب جو جعفر صادق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، ہم نے کہا: العمل بالارکان سے مراد شرائع ایمان ہے اور اس سے مراد شرائط ایمان ہیں اور اگر عمل شرائط ایمان سے ہوتا تو بغیر عمل کے ایمان صحیح نہ ہوتا اور اس پر ہمارا اجماع ہے کہ بغیر عمل کے ایمان صحیح ہے تو اس سے ثابت ہوا کہ شرائع سے ہے شرائط سے نہیں اور تحقیق اس کی اللہ

تعالیٰ کا قول ہے کہ قُلْ لِّعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ (ابراھیم ۳۱) میرے ان بندوں سے فرماؤ جو ایمان لائے کہ نماز قائم رکھیں۔ نماز سے پہلے مومن نماز رکھا۔ صحیح ہوا جو ہم نے کہا کہ عمل ایمان نہیں اور لیکن جس نے کہا کہ ایمان اقرار باللسان اور تصدیق بالجنان اور عمل بالجوارح اور تجانب عن الکبائر ہے اور کہا کہ جو کبیرہ کا مرتکب ہوا، ایمان سے خارج ہو گیا اس سے حجت پکڑتے ہیں۔

وَاِنْ اَطَعْتُمُوْھُمْ اِنَّکُمْ لَمُشْرِکُوْنَ (الانعام ۱۲۱)

اور اگر تم ان کا کہنا مانو تو اس وقت تم مشرک ہو۔

اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اَلزَّانِیْ لَا یَنْکِحُ اِلَّا زَانِیَۃً اَوْ مُشْرِکَۃً (النور ۳)

بدکار مرد نکاح نہ کرے مگر بدکار عورت یا شرک والی سے۔

اور نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ فرمایا: زانی جس وقت زنا کرتا ہے تو وہ مؤمن نہیں ہوتا اور چور، جس وقت چوری کرتا ہے وہ مؤمن نہیں ہوتا اور شرابی جس وقت شراب پیتا ہے وہ مؤمن نہیں ہوتا۔

نیز حضور اقدس ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے قصداً نماز کو چھوڑا وہ کافر ہے۔

ایک سجدہ نہ کرنے سے شیطان کا کافر ہونا، تو جو پوری نماز ترک کر دیتے ہیں؟

نیز حضور ﷺ نے فرمایا: عبد اور کفر کے درمیان فرق نہیں مگر ترک صلوۃ کا اور نیز اس لئے بھی ایک سجدہ کے ترک سے ابلیس کافر ہو گیا تو جس شخص نے تمام نمازوں کو ترک کر دیا تو وہ بہ طریق اولیٰ کافر ہو گیا۔

جواب یہ ہے کہ وَ اِنْ اَطَعْتُمُوْھُمْ اِنَّکُمْ لَمُشْرِکُوْنَ (الانعام ۱۲۱) کہ یہاں اطاعت سے مراد اطاعت فی الشرک ہے کیونکہ وہ کہتے تھے کہ ہم میتہ (مردار) کھاتے ہیں، یہ اللہ تعالیٰ کا ذبیحہ ہے تو یہ زیادہ حلال اور زیادہ طیب و ستھرا ہو گا۔ اس پر آیت نازل ہوئی کہ اگر تم نے مشرکوں کی اطاعت کی تو تم بھی اس عقیدہ سے مشرک ہو جاؤ گے اور جواب اس آیت کا کہ اَلزَّانِیْ لَا یَنْکِحُ اِلَّا زَانِیَۃً اَوْ مُشْرِکَۃً (النور ۳)

ہم نے کہا: سعید بن مسیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ یہ حکم ابتدائے اسلام میں تھا پھر فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَآءِ "تو نکاح میں لاؤ جو عورتیں تمہیں خوش آئیں" سے منسوخ ہو گیا۔

اور لفظ ثانی یعنی اَوْ مُشْرِکَۃً لفظاً خبر ہے اور مراد اس سے نہی ہے اور "لا یزنی الزانی حین یزنی وھو مؤمن" کا جواب یہ ہے کہ ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ زانی زنا کرنے کے وقت امن من عذاب النار نہیں رہتا یعنی وہ مؤمن (یعنی امن والا نہیں

ہے عذاب سے)۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ یہ منسوخ ہے بدلیل اس کے جو حضور ﷺ سے مروی ہے کہ ابو درداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا کہ جاؤ اور ان لوگوں کو کہہ دو کہ "من قال لاالہ الااللہ دخل الجنۃ" کہ جس نے لاالہ الااللہ کہا جنت میں داخل ہوگا۔ حضرت ابو درداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا وان زنی وان سرق اگرچہ وہ زنا اور چوری کرے۔ [1]

حضور ﷺ نے فرمایا: وان زنی وان سرق تین مرتبہ حضور ﷺ نے اسی طرح فرمایا اور حضور ﷺ کا یہ فرمانا کہ جس نے قصداً نماز کو ترک کیا وہ کافر ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ کفران نعمت کیا، نہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کیا اور یہ ایسے ہی ہے جیسے قصہ سلیمان علیہ السلام میں ہے کہ انہوں نے فرمایا: لِيَبْلُوَنِيٓ ءَاَشْكُرُ اَمْ اَكْفُرُ (النمل ۴۰) تاکہ مجھے آزمائے کہ میں شکر کرتا ہوں یا ناشکری۔" اور انبیائے کرام علیہم السلام سے کفرباللہ متصور نہیں، تو ثابت ہوا کہ یہاں بھی کفرانِ نعمت مراد ہے نہ کہ کفرباللہ۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ جس نے ترک صلوۃ کو حلال جانا وہ کافر ہے۔

اور یہ کہنا کہ ابلیس ایک سجدہ نہ کرنے سے کافر ہو گیا، ہم کہتے ہیں کہ سجدہ ترک کرنے سے کافر نہیں ہوا بلکہ اس کا کفر تو اس سے ثابت ہے کہ اس نے تکبر کیا، سجدہ کرنے سے انکار کیا اور خود پسندی کی اور یہ کہ اللہ تعالیٰ کی طرف جہل کی نسبت کی، جب ہی تو کہا:

خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ (الاعراف ۱۲)

تو نے مجھے آگ سے بنایا اور اُسے مٹی سے بنایا۔

یعنی اس نے کہا کہ حکمت کے خلاف ہے، تو مجھے سجدہ کرنے کا حکم دے۔

اور حضرت عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ انہوں نے اس آیت: خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ (الاعراف ۱۲) تو نے مجھے آگ سے بنایا اور اُسے مٹی سے بنایا۔" کی تفسیر میں فرمایا کہ اس آیت میں دعویٰ ربوبیت ہے۔

کبیرہ گناہوں سے ایمان سلب نہیں ہوتا

اس کی دلیل کہ کبائر سے ایمان سلب نہیں ہوتا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى (البقرۃ ۲۵۶)

تو جو شیطان کو نہ مانے اور اللہ پر ایمان لائے اس نے بڑی محکم گرہ تھامی۔

---

[1] وقال رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم وان زنی وان سرق علی رغم انف ابی ذر۔ اور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا ہے "اگرچہ زنا کرے، اگرچہ چوری کرے، خواہ ابوذر کی ناک خاک آلود ہو جائے"۔ (یعنی بالفرض وہ تنگی اور کوفت محسوس کریں تب بھی) (مشکوۃ المصابیح کتاب الایمان الفصل الاول مطبوعہ مجطبائی دہلی ص ۱۴)

فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ یعنی تو جو شیطان کو نہ مانے **وَ يُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا (البقرة ۲۵٦)** اور اللہ پر ایمان لائے اس نے بڑی محکم گرہ تھامیجسے کبھی کھلنا نہیں۔

ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا:

لَا انقطاع لَهَا سوی الجنة تو اگر کبیرہ کے ساتھ کافر ہو جاتا تو عروہ وثقی کے ساتھ تمسک نہ ہوتا۔

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَتُوْبُوْا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ (النور ۳۱)

اور اللہ کی طرف توبہ کرو اے مسلمانو سب کے سب۔

اللہ تعالیٰ نے توبہ کا حکم دیا اور توبہ تمہارے نزدیک کبیرہ گناہوں سے ہوتی ہے، پھر ان کبیرہ گناہوں کے مرتکب کو مؤمن فرمایا اور نیز ارشاد خداوندی ہے:

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا (التحریم ۸)

اے ایمان والو! اللہ کی طرف ایسی توبہ کرو جو آگے کو نصیحت ہو جائے۔

ان کو مؤمن فرمایا اور توبہ کا حکم دیا تو ثابت ہوا کہ کبیرہ گناہوں کے ارتکاب سے ایمان سلب نہیں ہوتا، لہذا اس پوری گفتگو کا خلاصہ اور لب لباب یہ نکلا کہ ہمارا مدعا ثابت ہوا کہ اجتناب عن الکبائر (کبائر سے بچنا) شرط ایمان نہیں۔

ایمان کی دو قسمیں

(۱) مجمل (۲) مفسر (مفصل)

امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایسے ہی مروی ہے کہ ایمان کی دو قسمیں ہیں: مجمل اور مفسر۔

ایمان مجمل:

ایمان مجمل کی صورت یہ ہے کہ کہے:

"امنت باللہ و ملئکتہ و بجمیع ماقال علی ماارادالله و امنت برسول اللہ و بماقال رسول اللہ علی ماارادرسول اللہ ویعلم ویعتقد"۔

یعنی میں اللہ تعالیٰ پر اور اس کے فرشتوں پر ایمان اور تمام ان چیزوں پر جو اللہ تعالیٰ نے فرمائیں اور جو ارادہ فرمایا اور میں ایمان لایا اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ پر اور تمام ان باتوں پر جو حضور ﷺ نے ارشاد فرمائیں اور جو حضور ﷺ نے ارادہ فرمایا اور جن چیزوں پر حضور ﷺ کا اعتقاد ہے اور جو حضور ﷺ مانتے ہیں۔

ایمان مفسر:

ایمان مفسر کی صورت یہ ہے کہ ایمان کی تمام شرائط کو ذکر کرے اور جانے اور اعتقاد کرے اور ان سب پر ایمان لائے۔

سوال: ایمان مفسر بعد المجمل بنفسہ ایمان ہو گا یا نہیں؟

جواب: اس میں اختلاف ہے کہ ایمان مجمل کے بعد ایمان مفسر بنفسہ ایمان ہو گا یا نہیں؟ تو بعض کہتے ہیں کہ یہ مجمل کی تکرار ہے اور بعض کہتے ہیں کہ یہ (ایمان مفسر بعد از مجمل) بنفسہ ایمان ہے۔

زیادہ صحیح وہ ہے جو ہم کہتے ہیں کہ اگر وہ اس حال میں ہے کہ جب اس کے سامنے ایمان کے اوصاف اور شرائط بیان کئے جائیں تو اگر وہ کہے کہ میں یہ نہیں جانتا تھا کہ ان باتوں پر ایمان لانا ضروری ہے تو دیکھیں گے کہ اگر وہ حربی دارالحرب میں ہے یا ذمی ہے، اجمالاً ایمان لایا اور تفسیر کو نہیں جانتا تھا تو جب اس نے جان لیا اور کہتا ہے کہ میں نہیں جانتا تھا، اب میں ایمان لاتا ہوں تو اس کا پہلا ایمان معتبر ہو گا اور اگر تفسیر ایمان سنا کر ایمان نہ لائے تو اس کو مرتد کہا جائے گا اور اگر وہ مسلمان ہے اور دارالاسلام میں پیدا ہوا اور پھر کہتا ہے کہ میں نہیں جانتا تھا کہ ان باتوں پر ایمان لانا واجب ہے تو اس کا پہلا ایمان مجمل ایمان نہیں، از سر نو ایمان لائے اور وہ احکام جو ایمان مفسر سے پہلے تھے نکاح وغیرہ وہ جائز نہ ہوں گے اور نہ وہ منعقد ہوں گے اور سب احکام اس کے باطل ہوں گے۔

اور بعض محققین نے فرمایا: اس کے جملہ احکام زمانہ ایمان مجمل کے صحیح ہیں، عبادت ہو یا معاملہ البتہ نکاح صحیح نہ ہو گا کیونکہ نکاح، ایمان مجمل بوصف الایمان صحیح نہیں ہوتا۔

ایمان مجمل کن چیزوں سے مکمل ہو جاتا ہے؟

امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نزدیک ایمان مجمل ایک شہادت یعنی ''**لا الہ الا اللہ**'' کہنے سے تمام ہو جاتا ہے۔ پھر اس پر اوصاف ایمان کی تقریر اور اس پر ثابت رہنا واجب ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ایمان مجمل دو شہادتوں سے ہوتا ہے اور وہ یہ ہیں ''**لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ**'' پھر اس اس پر ثبات و تقریر واجب ہے اور تمام اوصاف ایمان اور شرائط ایمان اور ہر اس چیز پر کہ جس پر ایمان لانا واجب ہے، امر و نہی، ناسخ و منسوخ اور احکام کہ کرنے کے ہیں اور یا کرنے کے نہیں، یعنی صحت ایمان کے لئے جن چیزوں کا جاننا ضروی ہے، سب کو جانے اس لئے کہ صحت ایمان کے لئے یہ شرط ہے اور ایمان کا وصف ہے۔

اور دلیل یہ ہے کہ جو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"ان تؤمن باللہ و ملئکتہ و کتبہ و رسلہ و البعث بعد الموت و القدر خیرہ و شرہ من اللہ تعالیٰ"۔

یہ کہ تو اللہ تعالیٰ، اس کے فرشتوں، اس کی کتب، اس کے رسولوں، موت کے بعد اٹھنے اور اللہ کی طرف سے اچھی اور بری تقدیر پر ایمان لائے اور عنقریب ہم ذکر کریں گے۔

ایمان کا حکم کیا ہے؟ ایمان کا حکم عدالت ہے۔(یعنی صاحب ایمان عادل قرار دیا جائے گا۔)

ایمان کا موجَب کیا ہے؟

ایمان کا موجَب (مقتضی) جب کہ تصدیق سے مقرون ہو، اللہ تعالیٰ کے خبر دینے سے جنت ہے اور اگر زبان سے اقرار کرے اور دل سے اعتقاد نہ کرے تو اس کو مسلمان کہا جائے گا۔ مسلمانوں والے احکام اس پر جاری و نافذ ہوں گے، جب تک خلاف اسلام اس سے کوئی بات ظاہر نہ ہو اور جو تم کو سلام کرے اس کو یہ مت کہو کہ تو مؤمن نہیں یعنی جب وہ کہے "**السلام علیکم انی مؤمن**" کہ میں مسلمان ہوں تو اس کا قول قبول کیا جائے گا، دنیوی احکام میں۔ پھر اگر اس کے دل میں اعتقاد نہیں تو وہ جنت میں داخل نہ ہو گا، جنتی نہیں اور اس کا حکم منافقین کا سا ہو گا۔

چوتھا قول: ایمان کی شرائط اور اس کے شرائع کا بیان

اہل سنت و جماعت نے کہا: شرائط ایمان سے وہ امور مراد ہیں جن پر ایمان لانا ضروری اور ان کے بغیر ایمان صحیح نہیں اور ان کے انکار ورد سے آدمی کافر ہو جاتا ہے اور یہ وہ امور ہیں جو نص یا خبر متواتر یا اجماع امت سے ثابت ہوں، اس لیے کہ جو چیزیں ان دلائل ثلثہ سے ثابت ہوں گی ان کا قبول کرنا اور ان پر اعتقاد واجب و ضروری ہو جاتا ہے اور جو امر خبر واحد سے ثابت ہو اور جس پر ائمہ متفق نہ ہوں اور امت مرحومہ نے قبول پر اتفاق نہ کیا ہو تو ایمان کی صحت کے لئے شرط نہیں اور جو امر خبر واحد سے ثابت ہو اور امت کے فقہائے رحمہم اللہ تعالیٰ نے بالاتفاق اس کو بلا تاویل قبول کیا ہو تو وہ ہی شرائط ایمان سے ہو گا، جیسے عذاب قبر، پل صراط، میزان، شفاعت، معراج الی السماء اور اس کی مانند کہ خبر واحد سے ثابت ہیں لیکن صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور فقہائے کرام رحمہم اللہ تعالیٰ نے اس کی صحت و قبول پر اتفاق کیا ہو تو یہ بھی بہ منزلہ اجماع کے ہے اور اس پر ایمان واجب ہے پھر جو ان امور کا انکار کرے وہ کافر ہے یا نہیں ہے؟

بعض نے کہا: کافر ہے اور بعض نے کہا: کافر نہیں، اس لئے کہ وہ تاویل کرتے ہیں اگرچہ تاویل میں خطا کی تو مبتدع ہیں، ان کی تفسیق کی جائے گی۔

لیکن شرائع وہ ایمان نہیں بغیر شرائع کے ایمان صحیح ہے اور وہ اہل سنت کے نزدیک عمل بالارکان ہے اور معتزلہ کے نزدیک اور روفض و خوارج کے نزدیک شرائع ہی ایمان ہے اور یہی قول امام شافعی کا بھی ہے اور ہم پہلے اس کا بیان کر چکے ہیں۔

شرائط اور شرائع میں فرق

شرائط اور شرائع میں ہمارے نزدیک فرق یہ ہے کہ شرائط کا نام ملت ہے اور شرائع کا نام خدمت ہے اور ملت بغیر خدمت کے صحیح ہے اور خدمت بغیر ملت صحیح نہیں۔

شرائط اور شرائع کے درمیان دوسرا فرق

شرائط اور شرائع میں دوسرا فرق یہ ہے کہ ملت میں دوام شرط ہے اور خدمت میں دوام شرط نہیں۔

پھر اگر ان امور میں سے کسی امر کو چھوڑا اور منہیات میں سے کسی شیئے کا مرتکب ہوا تو دیکھا جائے گا کہ اگر حلال سمجھ کر اس نے ارتکاب کیا ہے تو تکفیر کی جائے گی اور اگر بغیر حلال سمجھے عصیاناً مرتکب ہوا ہے تو اس کی تکفیر نہیں کی جائے گی یہ اہل سنت وجماعت کے عقائد ہیں۔

اور دلیل یہ آیت ہے حق سبحانہ وتعالیٰ فرماتا ہے:

لَيۡسَ الۡبِرَّ اَنۡ تُوَلُّوۡا وُجُوۡهَكُمۡ قِبَلَ الۡمَشۡرِقِ وَ الۡمَغۡرِبِ وَ لٰكِنَّ الۡبِرَّ مَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَ الۡمَلٰٓئِكَةِ وَ الۡكِتٰبِ وَ النَّبِيّٖنَ وَ اٰتَى الۡمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ (البقرة ۱۷۷)

کچھ اصل نیکی یہ نہیں کہ منہ مشرق یا مغرب کی طرف کرو ہاں اصلی نیکی یہ کہ ایمان لائے اللہ اور قیامت اور فرشتوں اور کتاب اور پیغمبروں پر اور اللہ کی محبت میں اپنا عزیز مال دے۔

اللہ تعالیٰ نے ایمان وعمل کا فرق بیان فرمادیا اور نیز فرمایا:

وَ مَنۡ يَّكۡفُرۡ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ وَ الۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ فَقَدۡ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِيۡدًا (النساء ۱۳۶)

اور جو نہ مانے اللہ اور اس کے فرشتوں اور کتابوں اور رسولوں اور قیامت کو تو وہ ضرور دور کی گمراہی میں پڑا۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے خبر دی ہے جو ان شرائط کے ساتھ کفر کرے گا کافر ہو جائے گا۔ پھر اعمال بعض وہ ہیں جن کے کرنے سے ایمان کا حکم کیا اور وہ یہ ہیں کہ کافر جب جماعت سے نماز پڑھے اور جمعہ میں حاضر ہو اور عیدین میں حاضر ہو اور مسلمانوں کے ساتھ نماز ادا کرے اور اذان دے، اقامت کہے، حج کرے مسلمانوں کے ساتھ، تو ان اعمال سے اس کے مسلمان ہونے کا حکم کیا جائے گا اور اگر کفر کی طرف لوٹا تو ارتداد کا حکم کیا جائے گا اور اگر تنہا پڑھے تو مسلمان ہی نہ سمجھا جائے گا۔

اور ایسے ہی اگر مسلمان بت کو سجدہ کرے یا کسی فعل میں افعالِ کفار سے کافروں کی متابعت کرے، وہ افعال جو کافروں کا دین ہے تو کافر ہو جائے گا اور ایسے ہی اگر ظاہر کرے اپنی طرف سے علامت کفار کی ، جیسے مجوسیوں کی ٹوپی پہنے یا زنار، جنیو وغیرہ باندھے جو کفار کی علامت ہو تو کافر ہو جائے گا۔

پھر یہ اعتقاد کے ساتھ پہنے یا بغیر اعتقاد کے یا سخریہ اور مذاق کے طور پر کافر ہو جائے گا اور تقیۃً یا مکرہاً علامت کفار کو اختیار کیا تو کافر نہ ہو گا اور اگر کفار کا ایسا لباس پہنتا ہے جو کفار کی علامت نہیں یا ان کی عادت وخصلت کو اختیار کیا یا ان کی کسی ایسی چیز میں پیروی کی جو ان کا دین نہیں ہے بلکہ وہ اختراع اور لہو کے طور پر ہو تو کفر کا حکم نہیں دیا جائے گا۔ یہ جو کچھ کہا اس معنی کی

بناء پر ہے جو فعل واعتقاد کسی شئے کا ہو اس کی صحت کے لئے اعتقاد شرط ہے اور جو عمل اعتقاد پر دلالت کرے، وہ بھی اعتقاد کے حکم میں ہے اور اعتقاد کا وہ عمل کرے گا جیسے بت کو سجدہ کرنا بت پرستی کے حکم میں ہے اور جو عمل متحمل شبہ ہے وہ اعتقاد پر دلالت نہیں کرے گا۔

امام محمد ابن حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ انہوں نے "کتاب المنتقیٰ" میں ایک مسئلہ ذکر فرمایا کہ جو شخص: "**لا الہ الا اللہ**" پڑھتا ہے اور کفر سے بیزاری کا اظہار نہیں کرتا تو وہ منافق ہو گا، اس لئے کہ کفر سے بیزاری کا اظہار کرنا ایمان کے صحیح ہونے کی شرط ہے، بہ حوالہ **فَمَنْ یَّکْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَیُؤْمِنْ بِاللّٰہِ فَقَدِ اسْتَمْسَکَ بِالْعُرْوَۃِ الْوُثْقٰی لَا انْفِصَامَ لَھَا (البقرۃ ۲۵۶)** توجو شیطان کو نہ مانے اور اللہ پر ایمان لائے اس نے بڑی محکم گرہ تھامی جسے کبھی کھلنا نہیں۔" **واللہ تعالیٰ اعلم۔**

پانچواں قول: اس کا بیان کہ ایمان گھٹتا بڑھتا ہے یا نہیں؟

امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کے اصحاب رحمہم اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ایمان کم و بیش نہیں ہوتا۔

امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ایمان طاعت و عبادت سے بڑھتا اور معصیت و نافرمانی سے گھٹتا ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ایمان میں زیادتی ہو سکتی ہے اور نقصان (کمی) ہو سکتا اور یہ قول صحیح نہیں اس لئے کہ جب زیادتی ہو سکتی ہے تو نقصان بھی ہو سکتا ہے اور یہ بھی درست نہیں اور انہوں نے اس آیت سے حجت پکڑی ، **لِیَزْدَادُوْٓا اِیْمَانًا مَّعَ اِیْمَانِھِمْ (الفتح ۴)** "تا کہ انہیں یقین پر یقین بڑھے"۔

اور حضرت ابو ہریرہ، حضرت انس، حضرت سعید خدری اور حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہم نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ جب جنتی جنت میں اور دوزخی دوزخ میں داخل ہو جائیں گے تو اللہ تعالیٰ فرشتوں کو حکم دے گا کہ جس کے دل میں ذرہ برابر ایمان ہے اور ایک روایت میں ہے کہ رائی کے دانہ کے برابر اور ایک روایت میں جو برابر ایمان ہے اس کو جہنم سے نکال لاؤ (نکالا جائے)۔ اگر ایمان میں زیادتی و کمی جائز نہ ہوتی تو صغر و زیادۃ کے ساتھ ایمان کو موصوف نہ کیا جاتا تو اس حدیث سے ثابت ہوا کہ ایمان میں کمی و بیشی ہوتی ہے۔

آیت کا جواب یہ ہے کہ مراد تکرار ایمان ہے، یہ ایسے ہے جیسے فرمایا:

فَاِذَا قَرَاْنٰہُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَہٗ (القیامۃ ۱۸)

"تو جب ہم اسے پڑھ چکیں اُس وقت اس پڑھے ہوئے کی اتباع کرو۔"

قرأت کا نام قرآن رکھا حالانکہ قرأت اور ہے اور قرآن اور ہے، اس لئے کہ قرأت مخلوق ہے اور قرآن غیر مخلوق ہے تو ایسے ہی یہاں ہے۔

اورابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ یہ آیت اصحاب کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے بارے میں نازل ہوئی اوراس لئے کہ قرآن کریم تیئیس سال تک حضور ﷺ پر نازل ہوتارہا، جب بھی قرآن کریم کی آیت نازل ہوتی، اس پر ایمان لاناواجب تھا۔اس کے بعد شرائط ایمان نہ کم ہوں نہ زیادہ۔

اعتراض: اب اگر کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَ مَا كَانَ اللّٰہُ لِیُضِیۡعَ اِیۡمَانَکُمۡ(البقرۃ ۱۴۳)ای صلوتکمۡ۔

اور اللہ کی شان نہیں کہ تمہاراایمان (نمازیں) اکارت (ضائع) کرے۔صلوۃ کانام ایمان رکھا۔

(مطلب یہ کہ نماز عمل ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔)

جواب: ہم کہتے ہیں کہ اس سے مراد اعتقاد ہے کیونکہ آیت ان لوگوں کے متعلق نازل ہوئی جو سفر میں تھے اورانہیں تحویل (تبدیلیٔ قبلہ) قبلہ کی خبر نہ تھی اوروہ بیت المقدس کی طرف نماز پڑھتے رہے، جب ان کو تحویل قبلہ کی خبر ہوئی توانہوں نے کہا: خدا نے ہمارا ایمان ضائع کردیا کہ ہم سب بیت المقدس کی طرف نماز پڑھتے رہے اور ہم نے نسخ کے بعد اعتقاد کیا کہ قبلہ بیت المقدس ہے تو یہ آیت نازل ہوئی کہ اللہ تعالیٰ کی یہ شان نہیں کہ تمہاراایمان ضائع کردے۔

اوررأس المفسرین حضرت محمد ابن فضل رحمہ اللہ تعالیٰ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ میں نے محمد بن احمد قرطبی رحمہ اللہ تعالیٰ سے سنا، انہوں نے کہا: میں ابوسہیل رحمہ اللہ تعالیٰ سے اس آیت یعنی وَ مَا كَانَ اللّٰہُ لِیُضِیۡعَ اِیۡمَانَکُمۡ(البقرۃ ۱۴۳) کی تفسیر میں سنایعنی:

تصدیقکم بالنبی علیہ السلام علی القبلتین حیث صدقوہ وصلوا الی بیت المقدس وماتوا علی ذلک۔"

کہ اللہ تعالیٰ کی شان نہیں کہ تمہاری تصدیق بالنبی ﷺ کو ضائع کردے، جس نے دونوں قبلوں کی تصدیق کی اور نماز پڑھی اوراسی حالت میں مرگئے۔

اور حدیث کاجواب یہ ہے کہ ایمان سے مراد صدق ویقین اوراخلاص میں ہے جیساکہ ہم نے بیان کیااوراس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایاہے مماثلت کا، ایمان میں فرمایا:

فَاِنۡ اٰمَنُوۡا بِمِثۡلِ مَاۤ اٰمَنۡتُمۡ(البقرۃ ۱۳۷)

پھر اگر وہ بھی یونہی ایمان لائے جیساتم لائے۔

یعنی یہود اقرار کرلیں جیسے تم نے اقرار کیااوراگر ایمان میں زیادتی ونقصان (کمی وبیشی) ہوتایعنی ایمان گھٹتا بڑھتا تو یہود کا اقرار صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے اقرار کے مثل نہ ہوتااوراگر ہم نقصان کو جائز رکھیں تو یہ اس امر کو مستلزم ہے کہ

جتنا ایمان کم ہے، اس کی جگہ کفر ہے اس لئے کہ زوال ایمان مستلزم کفر ہے، جتنا ایمان کم اتنا اس کی جگہ کفر ہو گا تو اس سے لازم آئے گا کہ ایک وقت میں ایک شخص کچھ مؤمن ہو اور کچھ کافر ہو، یہ ناممکن اور محال ہے اس لئے کہ گناہ توحید و معرفت میں مؤثر نہیں تو ایسے ہی ایمان میں بھی گناہ موئثر نہیں۔ پھر بالاتفاق گناہوں کی کثرت ایمان کی زائل نہیں کرتی کہ کل ایمان زائل ہو جائے تو گناہوں کی قلت بعض ایمان کو واجب نہیں کرے گی۔

پھر اگر نیکی اور طاعت سے ایمان زیادہ ہو جاتا تو غنی کا ایمان ضعیف و نادار کے ایمان سے اقویٰ و اکمل ہوتا، یہ جائز و ناممکن نہیں اس لئے کہ ایمان اقرار و تصدیق و عمل کا نام ہے، ان کے نزدیک اور یہ افعال عباد ہیں اور فعل عبد عرض ہے، دو زمانوں تک باقی نہیں رہتا تو ناممکن بعض کو بعض کے ساتھ منضم کرنا یہاں تک کہ زیادت و نقصان متصور ہو۔ یہ کمی زیادتی کہاں ہوتی ہے؟

پھر یہ زیادتی یا تو عین ایمان میں ہو گی یا وصف ایمان میں یا حکم ایمان میں یا موجب ایمان میں؟ تو اگر زیادتی موجب ایمان میں ہو اور وہ ثواب ہے تو اس کے ہم بھی قائل ہیں اور اگر کہا جائے کہ زیادت و نقصان حکم ایمان میں ہے اور وہ شخص کا مسلمان عادل بہ حکم ایمان ہونا ہے اور یہ متصور نہیں اس لئے کہ شخص واحد بعض اس کا مؤمن ہو اور بعض کافر اور اگر کہا جائے کہ زیادتی و کمی وصف ایمان میں ہے اور وہ شرائط ایمان ہیں تو یہ بالاتفاق جائز نہیں ہے، اس لئے کہ جو ایک شرط یا وصف کا انکار کرے، وہ مسلمان نہیں اور اس کا ایمان صحیح نہیں کیونکہ کوئی شخص تمام شرائط ایمان کو مانے اور ایک کو نہ مانے وہ کافر ہے اس کا ایمان صحیح نہیں تو ثابت ہوا کہ ایمان میں کمی بیشی نہیں ہو سکتی اور اگر کہے کہ کمی بیشی عین ایمان میں ہوتی ہے تو عین ایمان تو اعتقاد ہے در حقیقت اور اقرار و عمل دلیل ہے اعتقاد پر اس دلیل سے کہ اگر کوئی کام کرے یا قول کرے جو اعتقاد پر دلالت کرتا ہو جیسے جمعہ میں حاضر ہونا، اذان دین، اقامت کہنا تو اس کے اسلام کا حکم کیا جائے گا، اگرچہ اس سے اقرار نہ پایا گیا ہو اور اگر کوئی فعل یا قول ایسا پایا گیا کہ جو کفر پر دلالت کرتا ہو تو علامت کفر کے اظہار اور الفاظ کفر کے کہنے سے اس کو کافر کہا جائے گا جب کہ مکرَہ نہ ہو، جہالت یا مذاق میں کلمات کفر کہے اور علامت پائی جائے تو اس کے کفر کا حکم دیا جائے گا تو ثابت ہوا کہ ایمان تو دراصل اعتقاد ہے لیکن ایمان کا حکم بغیر اقرار کے صحیح نہ ہو گا جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے۔

اور اعتقاد میں زیادت و نقصان کا تصور نہیں ہو سکتا، اس لئے کہ اصل اعتقاد میں اگر زیادتی مانی جائے تو مسلمان اور اگر اعتقاد میں کمی ہو گئی تو کافر ہو جائے گا (اور یہ باطل ہے۔) تو وہی صحیح ہوا جو ہم نے کہا۔

اسی طرح حدیث مبارک میں مذکور ہے کہ ایک انصاری جن کو ابو حارث رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے تھے، وہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ ﷺ نے فرمایا **کیف اصبحت یاابا حارثۃ**۔ ابو حارثہ! کیسے صبح کی؟ ابو حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کی: حضور (ﷺ)! میں نے صبح اس عالم میں کی کہ سچا مؤمن ہوں، تو حضور ﷺ نے فرمایا: "**من ارادان ینظر الی عبدنور اللہ قلبہ بالایمان فلینظر الی ھذا**۔" جو ایسے بندے کو دیکھنا چاہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے دل کو نور ایمان سے روشن کر دیا ہو، وہ ابو حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دیکھ لے۔" نیز حضور ﷺ نے فرمایا: تم نے ٹھیک کہا، اسی پر ثابت ہوا "**اصبت فالزم**" تو ثابت ہوا کہ بہ طور حقیقت ایسا کہنا روا اور مشروع ہے۔

سوال: اگر یہ پوچھا جائے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کے علم کے بارے میں تم کیا کہتے ہو؟

اللہ تعالیٰ کاموں کے انجام سے واقف ہے اور جس کو اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ یہ کافر مرے گا تو ناممکن ہے کہ وہ مسلمان مرے اور اللہ تعالیٰ کا علم بدلتا نہیں اور شاید یہ شخص کہے کہ میں سچا مسلمان ہوں اور اللہ تعالیٰ کے علم میں یہ ہے کہ کافر مرے گا۔

جواب: اس کا جواب یہ ہے کہ ہم کہتے ہیں کہ بے شک اللہ تعالیٰ عواقب اُمور (انجام کار) کو جانتا ہے، اسی طرح مبادی اُمور (آغاز کار) کو بھی جانتا ہے اور جو فی الحال مؤمن ہے تو اللہ تعالیٰ کے علم میں بھی وہ مؤمن ہے اور اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ یہ بھی جانتا ہے کہ یہ کافر مرے گا، اس لئے کہ فی الحال جب تک اس سے کفر نہیں پایا جاتا، کافر نہیں ہے، جیسے اللہ تعالیٰ جانتا ہے اہل جنت جنت میں داخل ہوں گے اور جہنمی جہنم میں داخل ہوں گے لیکن باوجود اس کے دونوں اپنے مقررہ تک مؤخر کیے گئے ہیں، اسی طرح یہاں معاملہ ہے۔

حضرت سفیان ثوری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ میں سچا مؤمن ہوں، فی الحال اپنے نزدیک اور یہ نہیں جانتا کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں میرا کیا حال ہے؟ اور ان شاء اللہ العزیز میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی سچا مؤمن ہوں۔

اور بعض نے کہا کہ اس مسئلہ میں کوئی اختلاف نہیں اس لئے کہ امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ نے خوف کی بناء پر کہا کہ میں ان شاء اللہ تعالیٰ مؤمن ہوں۔

اور امام ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ حسن ظن کی بناء پر کہا کہ "**انامؤمن حقا**" "میں سچا مؤمن ہوں" "**واکون مؤمنا ان شاءاللہ تعالیٰ**" "اور ان شاء اللہ تعالیٰ مؤمن ہی رہوں گا۔"

حضرت ابوالقاسم قشیری رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''انامؤمن حقا''''میں سچا مؤمن ہوں'' ''واکون مؤمناان شاءاللہ تعالیٰ''''اوران شاءاللہ تعالیٰ مؤمن ہی رہوں گا۔''

ترجیحی بات

حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا صحیح مذہب یہ ہے: میں انسانوں اور فرشتوں کے نزدیک اور لوحِ محفوظ میں سچا مؤمن ہوں اوراللہ تعالیٰ کے علم میں مجھے معلوم نہیں، ان شاءاللہ تعالیٰ مؤمن ہی ہوں گا۔

اس کی تحقیق بیان ہوچکی ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام اشیاء کواسی طرح جانتاہے جیسی کہ وہ فی الحال ہیں جیساکہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جس وقت مسلمان نہ تھے، اللہ تعالیٰ جانتاتھاکہ وہ مسلمان نہیں اورجب اسلام لائے توجانتاتھاکہ مسلمان ہیں اورلوحِ محفوظ میں لکھاہوااللہ تعالیٰ کے علم کے مطابق وموافق ہے۔پس ہم نے جو کہاتھا صحیح ثابت ہوا۔

چھٹاقول: ایمان میں شک وشبہ کے بارے میں

اہل سنت وجماعت کے فقہاءرحمہم اللہ تعالیٰ کااجماع ہے کہ جواپنے ایمان میں شک کرے کہ وہ کافرہےاورجس نے کسی دوسرے کے ایمان میں شک کیایااسے کہا: ''اوکافر''تودیکھاجائے گاکہ اس میں کفرکاشبہہ ہےتوکفرکی گالی دینےوالااوراس کے ایمان میں شک کرنے والاکافرنہ ہوگااوراگرگالی دینےوالےنےکفرکےشبہہ کےبغیرکافرکہاتووہ خودکافرہوجائے گا۔

تفصیل: جس شخص کے ایمان کے بارے میں شک ہے، اگروہ شخص گاوں کاوڈیرا(عریف) یاعشرلینےوالا (عشار) یا جاسوس (عوانا)ہےتواس کوکفرکی گالی دینےوالااوراس کےایمان میں شک کرنےوالاکافرنہ ہوگا۔

اگروہ شخص کھلم کھلافاسق ہے، اپنے فسق پراصرارکرتاہےاورعلوم دینیہ سے جاہل ہے، ایسے شخص کوکافرکہاتوکہنے والا کافرہوگااوراگراس کے ایمان میں شک کیاتوکافرنہ ہوگا۔

اوراگراس نےکبیرہ گناہوں کاارتکاب کیالیکن ان پراصرارنہ کیااورنہ ہی علی الاعلان گناہ کیےہیں اورعلوم دینیہ کاجاننے والاہےتواس کےایمان میں شک کرناجائزنہیں اورجواس کےایمان میں شک کرےگاوہ بدعتی ہے، یہ تمام باتیں اس قاعدے کی طرف لوٹتی ہیں کہ گناہوں سے ایمان کی نفی لازم نہیں آتی لیکن توبہ کو بھول جانا، دین کی تحقیراورگناہوں پرسزاقائل نہ ہونا، یہ امورایمان کی نفی کاباعث ہیں، اسی طرح جو شخص گناہوں کوبرانہ جانےیااطاعت وعبادت کواچھانہ جانےیااطاعت پر ثواب ملنےکاعقیدہ نہ رکھےیااطاعت کوواجب نہ جانےتووہ کافرہوجائے گااورجس میں ان (مذکورہ) باتوں کاتوہم ہو، اس کے

ایمان میں شک کرنا جائز ہے اور جو یہ باتیں زبان سے کہے۔(مثلاً کہے کہ نماز، روزہ، حج اور زکوۃ فرض نہیں ہیں) تو ایسے شخص کو کافر کہا جائے گا۔

ایمان میں شک کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول (صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم) کو پہچانے "لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ" پڑھے اور اس کی تصدیق کرے، پھر اس میں بایں صورت شک کرے کہ یہ ایمان اور یہ قول آیا اس کا ایمان ہے یا نہیں؟ اور کیا یہ کفر کو زائل کرتا ہے یا نہیں؟ پس یہی ایمان میں شک ہے اور شک کے ساتھ ایمان ثابت نہیں ہو سکتا۔

حضرت حماد بن ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ وہ امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وفات کے بعد مدینہ منورہ میں حاضر ہوئے اور امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ میرے والد قدس سرہ قرآن پاک کو اللہ تعالیٰ کا کلام اور غیر مخلوق فرمایا کرتے تھے اور حضرات شیخین یعنی حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو سب سے افضل فرماتے تھے اور نبی اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے دونوں نسبتی فرزندوں حضرت عثمان غنی اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے محبت رکھتے تھے، خیر وشر کو اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے جانتے تھے، کسی مسلمان کو بعینہ جنتی یا جہنمی نہیں فرماتے تھے (سوائے عشرہ مبشرہ کے، ان کا جنتی ہونا نبی اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے ارشاد سے ثابت ہے۔) اور ایمان میں شک کے قائل نہیں تھے، یہ سن کر حضرت امام مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ ایمان میں شک کیا ہے؟ حضرت حماد رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا کہ ہماری طرف کچھ ایسے لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم پر ایمان رکھتے ہیں اور پھر یہ کہتے ہیں کہ ہم نہیں جانتے کہ ہمارا کلمہ پڑھنا ایمان ہے یا نہیں؟ اور کلمہ پڑھنے کے بعد ہم کفر سے نکلے ہیں یا نہیں؟ پس امام مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تعجب سے تبسم فرمایا۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ جس نے اپنے ایمان میں شک کیا تو اس نے نص قرآنی کا انکار کیا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ایمان کا حکم دیا اور قرآن پاک میں ایمان کی صفت کو اپنے ان فرامین میں بیان فرمایا: فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَ لِلْمُؤْمِنِیْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ (محمد ۱۹) تو جان لو کہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہیں اور اے محبوب اپنے خاصوں اور عام مسلمان مردوں اور عورتوں کے گناہوں کی معافی مانگو۔" اور شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ (آل عمران ۱۸) اللہ نے گواہی دی کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔"

پھر اس قول، اس ایمان کی وجہ سے ان کا نام مؤمن رکھا، جو اس کے صحیح ہونے میں شک کرے گا وہ کافر ہو جائے گا، لیکن ایمان میں استثناء کرنا آیا یہ شک ہے یا نہیں؟ استثناء کا طریقہ یہ ہے کہ یوں کہے کہ میں مؤمن ہوں، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

حضرت امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ عنہ کا بھی یہی مذہب ہے۔ اگر کسی شخص نے کہا کہ میں اللہ تعالیٰ پر ایمان لایا، ان شاء اللہ تعالیٰ (اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا) تو اس کا ایمان صحیح نہ ہو گا اور وہ کافر ہو جائے گا۔

حضرت امام ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ یوں کہنا چاہیے کہ میں سچا مؤمن ہوں، یہی قول صحیح ترین ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کی تعریف فرماتے ہوئے فرمایا کہ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا (الانفال ۴) یہی سچے مسلمان ہیں۔"

سوال: اگر کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلے انہیں ایمان کی صفت کے ساتھ موصوف کیا ہے اور پھر انہیں سچے مؤمنین فرمایا ہے اور وہ فرمایا یہ ہے کہ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُکِرَ اللّٰہُ وَ جِلَتْ قُلُوْبُھُمْ وَ اِذَا تُلِیَتْ عَلَیْھِمْ اٰیٰتُہٗ زَادَتْھُمْ اِیْمَانًا (الانفال ۲) ایمان والے وہی ہیں کہ جب اللہ یاد کیا جائے ان کے دل ڈر جائیں اور جب اُن پر اس کی آیتیں پڑھی جائیں ان کا ایمان ترقی پائے۔"

جواب: ہم کہتے ہیں کہ یہ مؤمن کی صفت ہے نہ کہ ایمان کی۔ ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ مومن مختلف قسم کے ہیں، بعض مومن دوسروں کی بہ نسبت اصلح ہوتے ہیں لیکن ایمان میں مختلف نہیں ہیں، پس ایمان میں فاسق اور نیک تمام برابر ہیں جیسے کفر میں (تمام کفار برابر ہیں)، احادیث میں روایت کیا گیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے سامنے ایک صحابی حاضر ہوتے ہیں، جنہیں ابو حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہا جاتا تھا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اے ابو حارثہ! (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) صبح کیسے کی؟ ابو حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا کہ حضور (ﷺ)! میں نے سچے مؤمن کی حالت میں صبح کی، تو حضور ﷺ نے فرمایا: ہر حق کی ایک حقیقت ہوتی ہے۔ (الحدیث)، پھر حضور علیہ السلام نے فرمایا: کون ایسے شخص کو دیکھنا چاہتا ہے جس کے دل کو اللہ تعالیٰ نے ایمان کے نور سے منور کر دیا ہے، پھر حضور ﷺ نے فرمایا: تم نے ٹھیک کہا ہے، اس کو لازم پکڑو، اس سے معلوم ہوا کہ اس طرح کہنا حقیقت کے اعتبار سے درست ہے۔

سوال: آپ اللہ تعالیٰ کے علم اور اس کے حکم کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ اللہ تعالیٰ تمام امور کے انجام کو جانتا ہے، جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ وہ کافر مرے گا تو نا ممکن ہے کہ وہ مسلمان مرے، اللہ تعالیٰ کا علم بدلتا نہیں اور ہو سکتا ہے کہ وہ کہے کہ میں سچا مسلمان ہوں اور علم الٰہی میں یہ ہے کہ وہ کافر مرے گا۔

جواب: بے شک اللہ تعالیٰ تمام امور کے انجاموں کو جانتا ہے، اسی طرح امور کی ابتداؤں کو بھی جانتا ہے، لہٰذا جو فی الحال مومن ہے وہ اللہ تعالیٰ کے علم میں بھی مومن ہے اور باوجود اس کے کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ وہ کافر مرے گا تو وہ فی الحال کافر نہ ہو گا جب تک اس میں کفر نہیں پایا گیا، جیسے اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ عالم فنا ہو گا تو جہان فی الحال فانی نہ ہو گا، ایسے ہی اللہ تعالیٰ

جانتا ہے کہ جنتی جنت میں داخل ہوں گے اور جہنمی جہنم میں جائیں گے، اس کے باوجود وہ دونوں فریق اپنے اپنے وقت تک مؤخر کیے گئے ہیں، اسی طرح یہاں بھی ہے۔

حضرت سفیان ثوری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ میں فی الحال اپنے نزدیک سچا مسلمان ہوں لیکن یہ نہیں جانتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں میرا کیا حال ہے؟ اور (ان شاء اللہ تعالیٰ) اللہ تعالیٰ نے چاہا تو اس کے ہاں بھی میں سچا مومن ہوں۔

حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: میں فی الحال اپنے نزدیک سچا مسلمان ہوں اور اللہ تعالیٰ کے ہاں بھی مومن ہوں۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

بعض علماء کہتے ہیں کہ اس مسئلے میں کوئی اختلاف نہیں ہے کیونکہ امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ نے خوف کی بناء پر کہا کہ میں مؤمن ہوں ان شاء اللہ تعالیٰ اور امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اللہ تعالیٰ کے بارے میں حسن ظن کی بناء پر فرمایا کہ میں سچا مومن ہوں، امام ابو القاسم قشیری رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں سچا مومن ہوں اور ان شاء اللہ تعالیٰ میں مومن ہی رہوں گا۔

امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اصح مذہب یہ ہے کہ لوگوں اور فرشتوں کے نزدیک میں مومن ہوں لیکن لوح محفوظ اور اللہ تعالیٰ کے علم میں مجھے معلوم نہیں ہے اور ان شاء اللہ تعالیٰ مومن ہی رہوں گا، ہم اس کی تحقیق بیان کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تمام اشیاء کو جانتا ہے جیسی فی الحال ہیں مثلاً حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ جس وقت مسلمان نہ تھے، اللہ تعالیٰ جانتا تھا کہ وہ مسلمان نہیں ہیں اور جب اسلام لائے تو اللہ تعالیٰ جانتا تھا کہ وہ مسلمان ہیں اور لوحِ محفوظ میں لکھا ہوا اللہ تعالیٰ کے علم کے مطابق و موافق ہے تو ہمارا دعویٰ صحیح ثابت ہوا۔

ساتواں قول: ایمانِ میثاق کا بیان: چند نظریات

(۱) معتزلہ اور روافض نے کہا کہ جسموں سے عہد و پیمان لینا جائز نہیں اور نہ صحیح ثابت ہے، یہ ایسی بات ہے جسے عقلی طور پر قبول کرنا ضروری نہیں ہے۔

(۲) بعض کہتے ہیں: میثاق روحوں سے تھا۔

(۳) بعض کہتے ہیں یہ میثاق بطریق حکمت عقلی ہے اس لئے کہ شرک اور کفران (ناشکری) جائز نہیں اور شکر و ایمان واجب ہے۔

(۴) اہل سنت وجماعت کا مسلک اس بارے میں یہ ہے کہ میثاق جسموں سے لینا صحیح اور ثابت ہے اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَ اِذْ اَخَذَ رَبُّکَ مِنْ بَنِیْ اٰدَمَ مِنْ ظُھُوْرِھِمْ ذُرِّیَّتَھُمْ وَ اَشْھَدَھُمْ عَلٰی اَنْفُسِھِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ-قَالُوْا بَلٰی (الاعراف ۱۷۲)

"اور اے محبوب یاد کرو جب تمہارے رب نے اولادِ آدم کی پشت سے ان کی نسل نکالی اور انہیں خود ان پر گواہ کیا، کیا میں تمہارا رب نہیں سب بولے کیوں نہیں۔"

اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ اس نے نبی آدم سے عہد وپیمان لیا اور یہ خبر ماضی کی ہے اور میثاق اجساد پر تھا، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔"من بنی آدم" اور جسم کے بغیر صرف روح کو بنی آدم نہیں کہا جاتا۔

اور اس لئے بھی کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "من ظھورھم ذریتھم" اور ذریت روح جسم کے ساتھ اور یہ عہد وپیمان عیاں اور صریح تھا، محض عقلی اور حکمی نہ تھا، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "الست بربکم" کیا میں تمہارا رب نہیں؟ ان کو خطاب کے لفظ سے خبر دی اور خطاب بغیر مشافہ کے درست نہیں۔

اور اس لئے بھی کہ حضور اقدس ﷺ سے مروی ہے: آپ ﷺ نے فرمایا: بے شک اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علی نبینا و علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پشت پر ہاتھ پھیرا اور پشتِ آدم علیہ السلام سے قیامت تک ہر مولود (پیدا ہونے والے) نکالا اور ان سے عہد وپیمان لیا کہ تم میری عبادت کرنا اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا، تو ثابت ہو گیا کہ میثاق صحیح ہے۔

بعض فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ کا مسلک

بعض فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جبرئیل علیہ السلام کو حکم دیا، انہوں نے اپنے دونوں بازو آدم علیہ السلام کی پشت پر رکھے تو اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی اولاد کو نکالا اور ان کی ذریت کو ان کی پشتوں سے جو بھی قیامت تک پیدا ہونے والا تھا، روح وجسد کے ساتھ عاقل وبالغ، پھر ان سے خطاب فرمایا "الست بربکم" (کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں) سب نے متفق اور یک زبان ہو کر عرض کی "بلی" کیوں نہیں، اور یہ ان کا ایمان تھا۔

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ یہ میثاق آدم علیہ السلام میں روح ڈالنے سے پہلے لیا گیا تھا اور بعض اس کے قائل ہیں کہ میثاق اس وقت لیا گیا جب آدم علیہ السلام جنت کے دروازے پر تھے۔ بعض کہتے ہیں کہ میثاق اس وقت لیا گیا جب آدم علیہ السلام چوتھے آسمان پر تھے۔ بعض کہتے ہیں کہ میثاق اس وقت لیا گیا جب آدم علیہ السلام دنیا میں اتارے گئے اور ادائے رسالت کے بعد۔ بہر حال میثاق پر ایمان لانا واجب ہے اس کی کیفیت نا معلوم ہے۔

کیا میثاق کے بعد ان پر موت آ گئی تھی

اس پر اجماع ہے کہ ان پر موت طاری ہوئی اور نہ ہی ابھی ان کی پیدائش ہوئی تھی اور ان کی پشتوں سے اجزاء کو نکالا تھا جو چیونٹی یا ذرے کی مثل تھے بعض کو بعض کی پشتوں اور صلبوں سے نکال کر پھر میثاق لینے کے بعد پھر دوبارہ لوٹا دیا گیا تھا، جیسے پہلے تھے اسی طرح دوبارہ پشتوں میں رکھ دیا۔

کیا میثاق کا حکم اب بھی باقی ہے؟

رہا یہ امر کہ حکم میثاق اب بھی باقی ہے یا نہیں؟ تو بعض نے کہا کہ باقی ہے اور سب لوگ ایمان میثاق کے ساتھ ماسوائے ان لوگوں کے کہ جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کیا اور ایسے ہی مشرکین کے بچے (ان) بعض کے نزدیک مؤمن ہیں، مگر یہ صحیح نہیں ہے۔

بعض نے کہا کہ ان پر ایمان میثاق واجب نہ تھا اور یہ خطاب، خطاب تکلیف نہ تھا بلکہ استخبار و تفہیم کے لئے خطاب تھا اور استفہام کے معنی میں تھا۔

استفہام کے دو معنی

اور استفہام کبھی بمعنی نفی اور کبھی بمعنی اثبات ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو سمجھا دیا اور انہوں نے پہچان لیا اور ان کے دلوں میں ایمان ڈال دیا یہاں تک کہ انہوں نے "بلی" کہا۔ علاوہ ازیں وہ وقت، وقت تکلیف نہ تھا اور اس لئے کہ ابتلاء و آزمائش اور تکلیف احکام و معاملات میں ثابت ہوتی ہے اور ان کو وہاں حاجت نہیں تھی کیونکہ سب اولین و آخرین (اگلوں، پچھلوں) کو ایک ساتھ میں جمع فرمایا اور ان کے درمیان نہ نکاح تھا، نہ سفاح (زنا)، نہ دعوی و شہادت، نہ ولادت، نہ حیض و نفاس، نہ موت، نہ وراثت، نہ عادت، نہ روزہ، نہ نماز، نہ حج، نہ زکوۃ، تو وہ تمام احکام سے بے نیاز تھے اور نہ ہی ان کو کھانے پینے کی حاجت تھی اور مصالح و ابتلاء و آزمائش عبادات میں ہوتی ہے تاکہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی شکر گزاری ہو اور اللہ تعالیٰ کی نعمتیں اس وقت ان کے حق میں مکمل نہیں ہوئی تھی ثابت ہوا کہ خطاب، خطاب تکلیف نہ تھا اس معنی کے لحاظ سے ہم نے کہا اس ایمان پر جزاء واجب نہیں یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ایمان کا حکم باقی ہے اس لیے کہ اگر ایمان کا حکم باقی ہوتا تو جزا بھی واجب ہوتی اور جب جزاء واجب نہیں تو ثابت ہوا کہ ایمان باقی نہیں لیکن یہ صحیح نہیں اس لئے کہ ہر خطاب پر ایمان واجب ہے۔ پس ثابت ہو گیا کہ وہ خطاب کے اہل تھے تو ان پر واجب تھا کہ ایمان لائیں اور زیادہ صحیح وہ بات ہے جو ہم کہتے ہیں کہ ایمان روح ڈالنے کے بعد اور آسمان پر چڑھنے سے پہلے واجب ہے اور خطاب، خطاب تکلیف و الزام تھا اس معنی کے لحاظ سے کہ وہ ہمارا الہ (معبود) ہے اور ہم

اس کے بندے ہیں بغیر کسی شک و شبہ کے ،اس لئے کہ ایمان اللہ تعالی کا حق ہونے کے باعث واجب ہے ، معانی سے خالی، پھر اس ایمان پر جزا اس لئے واجب نہیں کہ یہ تو اللہ تعالی کا ان پر حق ہے۔

اس معنی کے لحاظ سے اہل سنت و جماعت کہتے ہیں کہ ایمان والے اللہ تعالیٰ کے فضل سے جنت میں داخل ہوں گے۔ ایمان والوں کو جنت میں داخل کرنا اللہ تعالیٰ پر واجب نہیں اور نہ یہ جزائے ایمان ہے اور اس لئے کہ جزا کا ثبوت و وجوب اور اس کا پتہ تو اللہ تعالیٰ کے خبر دینے سے ہوا ہے اور اللہ تعالیٰ نے ایمان میثاق کی جزا اور ثواب کی خبر نہیں دی تو ہم بھی نہیں کہتے کہ اس ایمان کی جزا ملے گی اور وہ باقی نہیں اس لئے کہ وہ ایک مدت تک کے لئے مشروع و مقصود تھا۔ وہ مدت ختم ہو گئی۔

اگر کہا جائے کہ یہ بات نہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

عن أبي هريرة: كلُّ مولودٍ يولدُ على الفطرةِ فأبواهُ يُهوِّدانِهِ وينصِّرانِهِ أو يُمجِّسانِهِ۔

کہ ہر مولود فطرت اسلامی پر پیدا ہوتا ہے پس اس کے ماں باپ یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا لیتے ہیں۔[1]

ہم کہتے ہیں کہ اگر مشرکوں کے بچے بلوغ سے قبل مؤمن ہوں تو لائق یہ ہو گا کہ جب وہ بالغ ہو جائیں تو کافر قرار دیئے جائیں اور ان سے جزیہ قبول نہ کیا جائے بلکہ ان کو قتل کر دیا جائے۔ اس لئے کہ ان پر اسلام کا حکم ثابت ہے اور اب کفر کریں گے تو اولاد مسلمین کی طرح مرتد قرار پائیں گے اور مرتد سے سوائے اسلام اور سیف (لڑائی) کے کچھ قبول نہیں کیا جاتا اور جب یہ شرط نہیں تو یہ اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ اصل میں وہ کافر تھے اور اگر اسلام کا حکم ثابت ہوتا تو کفر کا حکم نہ کیا جاتا بلکہ ماں باپ کی تبعیّت میں یا اسلامی مملکت کی تبعیت میں انہیں مسلمان قرار دیا جاتا، نیز "اسلام بلند ہوتا ہے مغلوب نہیں ہوتا" تو ہم نے اجماعی فیصلہ دیا کہ وہ تبعاً کافر ہیں، ان کا اسلام ثابت نہیں۔

اور اس لئے کہ یہ بچہ اپنے کافر والدین کی میراث کا وارث ہوتا ہے اور ولایت عصبیت اس پر ثابت ہوتی ہے۔ ثابت ہوا کہ جو ہم نے کہا، وہی حق ہے۔

اور حضور ﷺ کا فرمان ہے کہ **كلُّ مولودٍ يولدُ على الفطرةِ** بعض نے کہا **على** بمعنی **ل** ہے **للفطرةِ** اور ہم یہی کہتے ہیں اور اصح یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا فرمایا اپنے راستے پر اور اس کے لئے جائز و روا نہیں ہے کہ اس کے راستے کے سوا کوئی اور راستہ اختیار کرے اور دین کا نام فطرت رکھا کیونکہ شرعاً اس کا حکم ثابت اور ظاہر نہیں ہے، اس لئے کہ تخلیق تکلیف کو واجب

---

[1] البزار (ت ٢٩٢)، البحر الزخار ١١/٣٦١• ابن القيسراني (ت ٥٠٨)، ذخيرة الحفاظ ٤/١٨٦٠• الهيثمي (ت ٨٠٧)، مجمع الزوائد ٧/٢٢١• ابن حبان (ت ٣٥٤)، صحيح ابن حبان ١٢٨ • إسناده صحيح على شرط الشيخين • أخرجه البخاري (١٣٥٩)، ومسلم (٢٦٥٨)، وأبو داود (٤٧١٤)، والترمذي (٢١٣٨) مطولاً بنحوه، وأحمد (٩٣١٧) واللفظ له أبو نعيم (ت ٤٣٠)، حلية الأولياء ٩/٢٨• السيوطي (ت ٩١١)، الجامع الصغير ٦٣٣٨• صحيح•

نہیں کرتی۔ صحیح یہ ہے کہ یولدُ علی الفطرة ای علی الدین (بچہ) فطرت پر پیدا ہوتا ہے یعنی دین پر، اس لئے کہ واجب نہیں کہ کوئی مولود بغیر کسی دین کے پیدا ہو۔ پھر دینِ اسلام اصل ہے تو ہر بچہ دین اسلام پر پیدا ہوتا ہے، پیدائش کے وقت مگر ان کے تابع وزیرِ حکم ہونے کی وجہ سے والدین کا کفر بچے میں سرایت کرتا رہتا ہے، لیکن حقیقت میں اس کا کوئی دین نہیں، جب تک بالغ نہ ہو اور جب بالغ ہوا اور زبان سے تعبیر کر لیا تو ہو جائے گا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا" (الانسان ۳) کہ چاہے شکر گزار ہو یا ناشکرا۔" اصول صغار میں حضور ﷺ کے اس ارشاد کے متعلق فرمایا: کلُّ مولودٍ یولدُ علی الفطرة الایمان یوم المیثاق ام غیره۔ کہ ہر بچہ فطرت ایمان پر پیدا کیا گیا، میثاق کا دن ہو یا اس کے علاوہ ۔ روزِ میثاق کا ایمان مراد ہے یا کوئی دوسری چیز مراد ہے؟ فرمایا: حدیث میں مذکورہ فطرت سے مراد اتباع والدین ہے اور یہ دنیا میں احکام کے اعتبار سے نہ یہ کہ یوم میثاق کا ایمان مراد ہے۔

بعض کہتے ہیں : اللہ تعالیٰ نے ذریت آدم علیہ السلام کو نکالا اور بعض کو دائیں جانب کھڑا کیا اور بعض کو بائیں جانب اور فرمایا "الست بربکم" تو جو آدم علیہ السلام کے داہنی جانب کھڑے تھے انہوں نے مثبت طور پر سمجھا اور کہا "بلی" اور جو آدم علیہ السلام کے بائیں جانب تھے، انہوں نے نفی کے طور پر سنا اور سمجھا اور کہا "بلی" تو دائیں جانب والے (اصحاب یمین) اپنے جواب کی وجہ سے مؤمن ہیں اور اصحابِ شمال (بائیں جانب والے) اپنے جواب کے سبب کافر ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا "ھؤلاء فی الجنة ولا ابالی وھولاء فی النار ولا ابالی" یہ لوگ جنتی ہیں اور میں اس کی پرواہ نہیں کرتا اور یہ دوزخ میں اور میں اس کی پرواہ نہیں کرتا اور صحیح وہ ہے جو ہم نے ذکر کیا۔

آٹھواں قول: ایمان اوراسلام میں کیا فرق ہے؟ بعض فقہاءرحمہم اللہ تعالیٰ کا نظریہ

بعض فقہاءرحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا کہ اسلام اور ہے اورایمان اور ہے۔ رافضیوں کا بھی یہی مسلک و نظریہ ہے اوراس بناءپرانہوں نے اپنانام مؤمن رکھا۔رافضی لوگ اپنے علاوہ دوسری امت کو مسلم اور جوان کے مذہب کے موافق ہواس کو مؤمن کہتے ہیں۔

رافضیوں کا نظریہ

ان حضرات کا کہنا ہے کہ جو شرائع اوراحکام کو ادا کرتا ہے لیکن تاویل و تنزیل کے علوم کو نہیں جانتا وہ مسلم ہے اور جو علوم حقائق اور تاویل و تنزیل کو جانتا ہے وہ مؤمن ہے۔

معتزلہ کا نظریہ

معتزلہ کہتے ہیں کہ باطن کے لحاظ سے مؤمن اور ظاہر کے لحاظ مسلم ہے اور مرتکب کبیرہ ایمان سے خارج ہو جاتا ہے، اسلام سے خارج نہیں ہوتا۔ اس کو مسلمان کہیں گے، مؤمن نہیں کہیں گے۔

دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

قَالَتِ الۡاَعۡرَابُ اٰمَنَّا قُلۡ لَّمۡ تُؤۡمِنُوۡا وَ لٰکِنۡ قُوۡلُوۡۤا اَسۡلَمۡنَا (الحجرات ۱۴)

ایسے ہی حضور ﷺ سے جب کسی نے سوال کیا تو آپ ﷺ نے اسلام اورایمان کے درمیان فرق بیان فرمایا۔ حضور ﷺ سے پوچھا گیا کہ "ما الایمان؟" ایمان کیا ہے؟ جواب ارشاد فرمایا "ان تؤمن باللہ وملئکۃ وکتبہ ورسلہ" یہ کہ تو ایمان لائے اللہ تعالیٰ پر، فرشتوں پر، کتابوں اور رسولوں پر۔ اور جب سوال کیا گیا "ما الاسلام؟" اسلام کیا ہے؟ فرمایا: "اقام الصلوۃ وایتاء الزکوۃ" نماز قائم کرنااورزکوۃ دینا۔

اورعام فقہاءرحمہم اللہ تعالیٰ واہل سنت کہتے ہیں: ایمان واسلام معرفت وتوحید میں کوئی فرق نہیں ہے، اس لئے کہ ہر مؤمن مسلمان، عارف، مؤحد ہوتا ہے اور ہر مسلمان مؤمن عارف مؤحد ہوتا ہے اور ہر عارف مؤحد، مؤمن، مسلم ہوتا ہے اور ہر مؤحد عارف، مؤمن، مسلم ہوتا ہے۔

اوراس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قول ذکر فرمایا: وَ بِذٰلِکَ اُمِرۡتُ وَ اَنَا اَوَّلُ الۡمُسۡلِمِیۡنَ (الانعام ۱۶۳) مجھے یہی حکم ہوا ہے اور مَیں سب سے پہلا مسلمان ہوں۔" اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قول ذکر فرمایا "تُبۡتُ اِلَیۡکَ وَ اَنَا اَوَّلُ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ (الاعراف ۱۴۳)" میں تیری طرف رجوع لایا اور میں سب سے پہلا مسلمان ہوں۔"

سب انبیائے کرام علیہم السلام کا دین ایک ہے

سب انبیائے کرام علیہم السلام کا دین ایک ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے "مسلم" فرمایا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے "مؤمن" فرمایا تو ثابت ہوا کہ ایمان و اسلام میں کوئی فرق نہیں۔

خلاصہ کلام

مطلب یہ ہے کہ ان چار چیزوں (اسلام، ایمان، معرفت، توحید) میں سے کسی ایک کا بھی انکار موجب کفر ہے اہل سنت کے نزدیک، اس لئے کہ جو مسلمان مؤحد نہ ہو گا وہ کافر ہے اور جو عارف نہ ہو گا وہ بھی کافر ہے اور جو مؤمن و مسلمان نہ ہو گا کافر ہو گا۔

در حقیقت مسلمان اور مؤمن کا ایک مطلب ہے، اسلام اور ایمان۔۔۔ میں صرف لفظی فرق ہے

ان الفاظ میں لغوی اور لفظی اعتبار سے فرق ہے اور از روئے حقیقت کچھ فرق نہیں۔

بظاہر دو آیتوں میں تعارض کا جواب

لیکن رہا اس قول کا جواب کہ قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْا اَسْلَمْنَا (الحجرات ۱۴) "گنوار بولے ہم ایمان لائے تم فرماؤ تم ایمان تو نہ لائے ہاں یوں کہو کہ ہم مطیع ہوئے۔" اس سے مراد سلامتی ہے اسلام نہیں۔

دلیل: اس پر دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام امت کو مؤمن بھی فرمایا اور ان کو مسلمان کے نام سے بھی موسوم فرمایا، تو ثابت ہوا وہی بات ٹھیک ہے جو ہم نے بیان کی ہے کہ ایمان و اسلام اور معرفت و توحید میں فرق لغوی اور لفظی طور پر ہے اور حقیقت میں سب ایک ہے۔

اور حضور ﷺ کے ارشاد مبارک کے معنی یہ ہیں کہ نماز قائم کرنا اور زکوۃ ادا کرنا مسلمان کے فعل اور علامت ہیں اور یہی ہم کہتے ہیں۔

نواں قول: ایمان کا بیان (ایمان مخلوق ہے یا غیر مخلوق؟)

ایمان کے مخلوق یا غیر مخلوق ہونے کے بارے میں فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ کا اختلاف ہے۔ بعض فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ایمان غیر مخلوق ہے۔

عام فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ کا مسلک ہے کہ ایمان مخلوق ہے۔

ایمان کو غیر مخلوق کہنے والوں کی دلیل

جو حضرات ایمان کو غیر مخلوق مانتے ہیں، وہ اس آیت سے استدلال کرتے ہیں: شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ (آل عمران ۱۸) اللہ نے گواہی دی کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ "اور دوسری آیت وَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا (التوبة ۴۰) اللہ تعالیٰ کا کلمہ ہی بلند ہے یعنی اللہ ہی کا بول بالا ہے۔" اس سے مراد ایمان ہے۔

تیسری آیت: اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ (فاطر ۱۰) "اُسی کی طرف چڑھتا ہے پاکیزہ کلام۔" اس سے بھی ایمان مراد ہے۔

چوتھی آیت: وَ مَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ (المائدة ۵) "اور جو مسلمان سے کافر ہو اس کا کیا دھرا سب اکارت (ضائع) گیا۔" ان آیات سے ثابت ہوا کہ ایمان غیر مخلوق ہے۔

جواب: اس کا جواب یہ ہے کہ ہم کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں صفت ایمان بیان فرمائی ہے اور رہی یہ آیات تو یہ بعینہ ایمان نہیں۔

دلیل: اس کی دلیل یہ ہے کہ اگر کوئی کافر تمام قرآن پاک اول سے آخر تک پڑھے، ان آیات سمیت اور ان کی تصدیق نہ کرے تو اس کے اسلام کا حکم نہیں کیا جائے گا۔ ثابت ہوا کہ یہ ایمان نہیں، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور غیر مخلوق ہے یعنی کلام اللہ غیر مخلوق ہے۔

ایمان کے مخلوق ہونے پر دلیل

ایمان مخلوق ہے، اس پر دلیل یہ ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا: ایمان و کفر مخلوق ہیں اور یہ دونوں متضاد ہیں۔

اور حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ایمان کو پیدا فرمایا اور اس کو جواں مردی و حیاء کے پردہ میں ڈھانپ دیا اور کفر کو پیدا کیا اور اسے بخل و جفا سے ڈھانپ دیا۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضور اقدس صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے عرش کے نیچے ایمان سے زیادہ محبوب کوئی چیز پیدا نہیں فرمائی۔ ان دلائل سے ثابت ہوا کہ ایمان مخلوق ہے اور اس لئے کہ ایمان بندہ کی صفت ہے کیونکہ بندہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لایا اور بندے کا خدا پر ایمان لانا اس کی صفت ہے اور صفتِ بندہ بالاتفاق مخلوق ہے۔

اور اس لئے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ یَکْتُمُ اِیْمَانَهٗ (المؤمن ۲۸)

اور بولا فرعون والوں میں سے ایک مرد مسلمان کہ اپنے ایمان کو چھپاتا تھا۔

اور اگر ایمان مخلوق نہ ہوتا تو اس کا چھپانا اس کے فعل سے ناممکن تھا اور اصح یہ ہے جو ہم کہتے ہیں کہ بندہ کا ایمان اللہ تعالیٰ کی طرف طلب اور قبول واقرار اور تصدیق وثبات اور جو ہو اللہ کی طرف امر وہدایت توفیق اور ثبات اور لیکن بندہ بلا خلاف بجمیع صفاتہ مخلوق (اور بندہ کی ساری صفتیں تو پیدا ہیں) اور اللہ تعالیٰ قدیم ہے اور اسی طرح اس کی ساری صفتیں قدیم ہیں اور اس پر حدوث طاری نہیں ہوتا۔

ایمان کی دو قسمیں ہیں

(۱) ایک ایمان مکتوب من اللہ تعالیٰ، وہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے۔ کَتَبَ فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْاِیْمَانَ (المجادلة ۲۲) جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان نقش فرمادیا۔"

(۲) اور دوسرے ایمان محکوم، وہ بندے کا فعل ہے تو مکتوباللہ غیر مخلوق ہے اور محکوم علیہ مخلوق ہے۔

مہتدی ابوشکور سالمی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: مجھ سے کسی نے پوچھا کہ ایمان مخلوق ہے یا غیر مخلوق؟ میں نے کہا: ایمان کیا ہے؟ اس نے کہا: "لا الہ الا اللہ" اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ میں نے کہا: یہ غیر مخلوق ہے اور ایک اور شخص نے مجھ سے پوچھا: ایمان مخلوق ہے یا غیر مخلوق؟ میں نے کہا: ایمان کیا ہے؟ اس نے کہا: اقرار باللسان اور تصدیق بالقلب۔ میں نے کہا: یہ مخلوق ہے۔

دسواں قول: ایمان کے محل اور اس کی بقاء کا بیان

ایمان کہاں ہوتا ہے؟ اس بات پر اجماع ہے کہ ایمان کا محل ومقام قلب وزبان ہے قلب، محل اعتقاد ہے اور زبان، محل اقرار اور یہ دونوں (اعتقاد واقرار) ایمان کے رکن ہیں یہ اہل سنت وجماعت کا مسلک ہے۔

اقرار وتصدیق عرض ہے اس لئے کہ یہ دونوں بندے کی صفت ہیں اور عرض دو زمانوں تک باقی نہیں رہتی لیکن ایمان کا حکم ہمیشہ باقی رہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ باقی رکھتا ہے۔ پھر یہ کہ عرض اگرچہ فنا ہو جائے کوئی شخص ایمان کے حکم سے خارج نہیں ہوتا۔ اس کی نظریہ ہے کہ مثلاً نکاح ایجاب وقبول کا نام ہے اور ایجاب وقبول دو عرض ہیں، وہ دونوں زمانوں تک باقی نہیں رہتے ایجاب وقبول جب پائے جائیں گے تو نیست ونبود ہو کر رہ جائیں گے، اگر اس کا حکم باقی رہتا ہے (حکم یعنی نفع اٹھانا حلال

رہتا ہے)جب تک ایسی چیز نہ پائی جائے جو نکاح کو ختم کرنے والی ہو یا اس کے مناقض ہو جیسے طلاق وغیرہ تو ایسے ہی اقرار و تصدیق اگر چہ فنا ہو جائے مگر حکم ایمان باقی رہتا ہے بلکہ حکم ایمان اقویٰ و موکد ہے۔

تو لفظ اقرار کی فناء و تصدیق کی فناء جو بندے کے دل کا عمل ہے اور عمل حکم ایمان کی فناء کا موجب و باعث نہیں ہو سکتا، جب تک ایمان کی ضد و نقیض عارض نہ ہو اور وہ (ضد) کفر ہے۔

تو ہم کہتے ہیں کہ مؤمن جب ایک بار ایمان لایا تو اس کے مؤمن ہونے کا حکم دیا جائے گا اگر چہ اس کے بعد ہزار مرتبہ اقرار کرے کہ پہلا اقرار ہی ایمان ہے اور بعد کے اقرار اسی پہلے اقرار کی تکرار ہیں اور اگر ایک مرتبہ اقرار کرنے کے بعد پھر کبھی اقرار نہ کیا تو اگر چہ برسوں تک زندہ رہا تو اس کے کفر کا حکم نہیں دیا جائے گا۔جب تک ایمان کی ضد ظاہر نہ ہو اگر اسی اقرار کے بعد مر جائے تو اسے مؤمن قرار دیا جائے گا۔اور اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی، جب تک ایمان کے خلاف کوئی بات نہ پائی جائے۔پس اگر کہا جائے کہ مؤمن جب مر جائے تو اس کا ایمان جسم کے ساتھ تھا یا روح کے ساتھ؟

ہم کہتے ہیں کہ اس کا ایمان اللہ تعالیٰ کے حکم میں ہے نہ جسم میں اور نہ روح کے ساتھ، ہاں! جسم و روح مؤمن ہیں بہ حکم ایمان، اللہ تعالیٰ کے حکم میں جیسے حالتِ حیات میں کہ ایمان نہ روح کے ساتھ تھا اور نہ جسم کے ساتھ اور نہ دونوں کے ساتھ، لیکن ایمان روح و جسم سے (قائم) ہوتا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ ایمان نہ بندہ میں اور نہ بندہ ایمان میں لیکن بندہ حکمِ ایمان میں ہے اللہ تعالیٰ کے حکم سے اور ایمان و عبد دونوں اللہ تعالیٰ کے حکم میں ہیں۔واللہ تعالیٰ اعلم۔

گیارہواں قول:نزع کے وقت ایمان کا زوال جائز ہے یا نہیں؟

اس پر ہمارا اجماع ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام سے ایمان کا زوال قطعاً جائز نہیں اور پہلے بھی اس کا ذکر ہو چکا ہے۔

رہا صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا ایمان کہ وقتِ نزع ان کا زوال جائز ہے یا نہیں؟

تو جاننا چاہیئے کہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے دو فریق ہیں۔ایک فریق وہ ہے جن کے مامون ہونے کی حضور اقدس صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے پہلے ہی بشارت دے دی، وہ نقباء و عشرہ مبشرہ ہیں رضی اللہ تعالیٰ عنہم، یوں ہی حضرات حسنین کریمین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کہ ان کے حق میں حضور اقدس صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: ” **ھما سیدا شباب اھل الجنہ** “وہ دونوں (حسنین کریمین علیہما السلام) اور حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ اور ان کی مانند جس جس کو جنت کی بشارت و شہادت دی گئی ہے کہ یہ جنتی ہیں تو ان حضرات کے ایمان کے زائل ہونے کا امکان نہیں کہ حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا فرمان حق ہے اور جیسا فرمایا: ایسا ہی ہو گا۔

رہے وہ صحابہ کرام جن کے حق میں حضور اقدس ﷺ نے جنت کی بشارت نہیں دی، ان کے متعلق حکم یہ ہے کہ ہم ان کا ذکر بھلائی کے ساتھ کریں گے لیکن ہمیں ان کے قطعی جنتی ہونے کا حکم کرنے کا حق نہیں پہنچتا اور نہ قطعی ناری ہونے کا حکم کریں لیکن غیر صحابہ کے لئے جس قدر ہم امید کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو جنت میں داخل کرے گا، اس سے کئی درجات زیادہ ان کے جنتی ہونے کی امید رکھتے ہیں۔ اب رہے دیگر مؤمنین اور کافرین تو ان میں سے کسی کو متعین کرکے قطعی جنتی یا دوزخی نہیں کہہ سکتے۔ ہاں !یوں کہیں گے کہ جو ایمان کے ساتھ مرا وہ جنتی ہے اور جو کفر پر مرا وہ جہنمی ہے۔ ہاں! فی الجملہ یہ کہنا جائز ہے کہ مؤمنین سب جنت میں کفار سب جہنم میں ہوں گے۔

اور اہل سنت وجماعت کے نزدیک بداعمالی کے سبب بوقتِ معاینہ ، ایمان کے سلب ہو جانے سے مامون و محفوظ ہونا جائز نہیں، ہر عاصی کو سلب ایمان سے محفوظ کیونکر مانا جائے؟

مرجیہ اور مسئلہ ایمان

مرجیہ کہتے ہیں کہ جب ایک مرتبہ ایمان حاصل ہو گیا تو پھر معاصی اس کو نقصان نہیں دیں گے۔

دلیل: اور دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ ایمان اللہ تعالیٰ کی عطا ہے اور اس کی عطا میں تبدیل و خلع جائز نہیں اس لئے کہ یہ تو ایک نعمت دے کر واپس لینا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق نہیں کہ کسی کو نعمت عطا فرما کر واپس لے۔

اہل سنت کی طرف سے جواب

اہل سنت وجماعت مرجیہ کی اس دلیل کا جواب یہ دیتے ہیں کہ یہ عطیہ میں رجوع نہیں، نہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے عطا فرما کر (نعمت ایمان) واپس لے لیا بلکہ بندہ نے اس کی قدر نہیں کی اور اس کی نعمت کو ٹھکرا دیا اور اس کا حق ادا نہ کیا۔ (ورنہ اس کی تو شان یہ ہے جو اعلیٰ حضرت قدس سرہ نے ایک شعر میں فرمایا:

تو نے اسلام دیا تو نے جماعت میں لیا   تو کریم رب، کہیں پھرتا ہے عطیہ تیرا

تو اس نے اپنا انعام واپس نہیں لیا بلکہ بندہ نے اس کی جیسے چاہیئے تھی قدر نہیں کی اور اپنی بداعمالیوں اور برے کرتوتوں کے باعث اس کے عطیہ (ایمان) کو رد کر دیا۔

جیسا کہ قرآن پاک میں ارشاد ہوا:

فَلَا یَاْمَنُ مَکْرَ اللّٰہِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ (الاعراف ۹۹)

تو اللہ کی خفی تدبیر سے نڈر نہیں ہوتے مگر تباہی والے۔

اوراللہ تعالیٰ نے فرمایا:

سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ (الاعراف ۱۸۲)

جلد ہم انہیں آہستہ آہستہ عذاب کی طرف لے جائیں گے جہاں سے انہیں خبر نہ ہو گی۔

حضرت سیدناامام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: اکثر ایمان معائنہ عذاب کے وقت سلب ہو تا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ نزع (جان کنی) سے قبل ایسے امور کا مرتکب ہوا کہ حرام قطعی کو حلال جانا یا حلال کو حرام جانا یا ازروئے جہالت کلمۂ کفر کہا یا کفریہ فعل کا مرتکب ہوا (جیسے بت کو سجدہ کیا، یا قشقہ لگایا اور جنیو پہنا وغیرہ، شعار کفر استعمال کیے۔) یا بے علمی میں ایسی بات کی جس میں اسلام کارد ہو تا ہے اور توبہ نہ کی اور جب عذاب الٰہی کا معائنہ کیا تو اس وقت توبہ قبول نہیں اور اس وقت یہ توبہ نفع نہ دے گی۔

خاتمہ بالا یمان کے لئے بہترین وظیفہ

اس لئے ہر مؤمن بندہ پر لازم ہے کہ وہ روزانہ یہ دعا پڑھ لیا کرے:

”اللهم انی اعوذبک من ان اشرک بک شیئاو انااعلم به و استغفرک بمالااعلم به تبت عنه وتبرات من الکفرو الشرک والمعاصی کلهاو اقول لااله الاالله محمدرسول الله ﷺ“۔

الٰہی میں پناہ مانگتاہوں کہ میں تیرے ساتھ کسی ایسی چیز کو شریک کروں جسے میں جانتاہوں اور معافی مانگتاہوں جسے میں نہیں جانتا۔ میں کفروشرک اور سب گناہوں سے توبہ کرتاہوں اور کہتاہوں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی مستحق عبادت نہیں اور محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے سچے رسول ہیں ، اللہ تعالیٰ حضور ﷺ،ان کی آل اوراصحاب پر اپنی خاص رحمتیں نازل فرمائے۔(آمین)

(۲) باب نمبر دو: ایمان کی شرائط کے بیان میں

شرائط ایمان کے بیان میں انیس قول ہیں۔

مہتدی ابو شکور سالمی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جاننا چاہیئے کہ ایمان کی شرطیں وہ ہیں جو حضور اقدس ﷺ نے بیان فرمائی ہیں:

(۱) اللہ تعالیٰ پر ایمان (۲) اللہ تعالیٰ کے فرشتوں پر ایمان (۳) اس کی کتابوں پر ایمان

(۴) اس کے رسولوں پر ایمان (۵) آخرت پر ایمان

(۶) خیر و شر کی تقدیر من اللہ پر ایمان (یہ ایمان لانا کہ اچھا برا اللہ کی تقدیر سے ہے) (۷) موت کے بعد اٹھنے پر ایمان

اصل ایمان اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا ہے اور اس کا وصف اور حکم ہم بیان کر چکے ہیں، پھر فرشتوں پر ایمان لانا ہے۔

تو اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ہم کہتے ہیں کہ جاننا چاہیئے کہ تمام فرشتے اللہ تعالیٰ کے بندے اور مخلوق ہیں اور کفر سے معصوم، پاک، صاف، اور فرماں بردار واطاعت کیش ہیں۔

ابلیس جن تھا یا فرشتہ

سوال: اگر کہا جائے کہ ابلیس نے کفر کیا حالانکہ وہ فرشتوں میں سے تھا؟ (پھر معصوم کیونکر ہوئے؟)

جواب: ہم کہتے ہیں کہ اس میں فرشتوں کے اوصاف در آئے تھے اور عبادت کے ذریعے وہ فرشتوں کے مرتبہ پر فائز تھا لیکن در حقیقت وہ فرشتہ نہ تھا۔

ابلیس فرشتہ نہیں تھا

دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

إِلَّا إِبْلِيسَ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ أَمْرِ رَبِّهِ (الکھف ۵۰)

سوا ابلیس کہ قومِ جن سے تھا تو اپنے رب کے حکم سے نکل گیا۔

یعنی ابلیس جنوں میں سے تھا، اس نے اپنے رب کے حکم کی نافرمانی کی۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ وہ شہوت سے پیدا ہوا اور اس پر شہوت سوار ہو گئی تو ثابت ہوا کہ اصل خلقت میں فرشتوں میں سے نہ تھا، برائے نام فرشتہ ہونے سے فرشتوں میں شمار ہوا۔

ہاروت وماروت فرشتے تھے یا آدمی؟

سوال: اگر یہ کہا جائے کہ ہاروت وماروت کے بارے میں تم کیا کہتے ہو؟

جواب: ہم نے کہا: ان کے متعلق لوگوں کا اختلاف ہے۔

بعض نے کہا: یہ دو بادشاہ تھے (مَلِکَینِ لام کی زیر کے ساتھ پڑھیں تو) اور صحیح یہ ہے کہ وہ دونوں فرشتے تھے (یعنی مَلَکَینِ کے لام پر زبر پڑھو تو) اور اس پر ہمارا اجماع ہے کہ ان سے کفر کا صدور نہیں ہوا اور ان کے حال کی کیفیت نص میں مذکور نہیں اور نہ ان کے دین کا حال معلوم اور جب نص میں ان کا حال اور دین مذکور نہیں تو ان کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ پھر یہ کہ ان کا عمل کبیرہ گناہ بھی نہیں، اس لئے کہ ان پر عقوبت واجب نہیں کیونکہ عقوبت آخرت میں واجب ہوتی ہے اور انہیں آخرت میں عذاب نہیں ہوگا اور دنیا میں عذاب کبھی بطور جزا ہوتا ہے اور کبھی بطور معاتبت ہوتا ہے اور علی وجہ المعاتبۃ جائز ہے جیسے انبیاء کرام علیہم السلام سے اگر لغزش و سہو واقع ہو تو ان کو سختی اور مشقت پہنچتی ہے۔

انبیائے کرام علیہم السلام پر عتاب جائز ہے؟

اور ان پر عتاب جائز ہے جیسے موسیٰ علیہ السلام پر عتاب ہوا کہ بے ہوش کر دیئے گئے۔

جیسا کہ قرآن پاک میں ہے:

وَخَرَّ مُوسَى صَعِقًا (الاعراف ۱۴۳)

"اور موسیٰ گرا بے ہوش۔"

پھر موسیٰ علیہ السلام نے کہا:

سُبْحَانَکَ تُبْتُ إِلَيْکَ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُؤْمِنِينَ (الاعراف ۱۴۳)

پاکی ہے تجھے میں تیری طرف رجوع لایا اور میں سب سے پہلا مسلمان ہوں۔

فرشتوں پر عتاب ہو سکتا ہے

اور ایسے ہی اگر فرشتوں سے کوئی لغزش ہو تو ان پر عتاب ہو سکتا ہے۔ (انبیائے کرام علیہم السلام صغائر و کبائر سے معصوم ہوتے ہیں، ایسے ہی ملائکہ معصوم ہیں۔ لغزش، ذھول اور بھول سے معصیت (گناہ) نہیں۔)

اگر کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں (ہاروت وماروت) کے بارے میں خبر دی۔

إِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ فَيَتَعَلَّمُونَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُونَ بِهِ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهِ وَمَا هُمْ بِضَارِّينَ بِهِ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللهِ وَيَتَعَلَّمُونَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ۔ (البقرۃ ۱۰۲)

ہم تو نری آزمائش ہیں تو اپنا ایمان نہ کھو تو ان سے سیکھتے وہ جس سے جُدائی ڈالیں مرد اور اس کی عورت میں اور اس سے ضرر نہیں پہنچا سکتے کسی کو مگر خدا کے حکم سے اور وہ سیکھتے ہیں جو انہیں نقصان دے گا نفع نہ دے گا۔" ظاہر سی بات ہے کہ ضرر رسانی (نقصان پہنچانا) حرام ہے اور کفر کا ذریعہ و سبب بننا بھی حرام ہے۔

جواب: ان آیات کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ یہ دونوں فرشتے (ہاروت وماروت) لوگوں کو ڈراتے ہیں، وعظ کرتے ہیں کہ اِنَّمَا نَحۡنُ فِتۡنَۃٌ فَلَا تَکۡفُرۡ (البقرۃ ۱۰۲) اور پھر یہ کہ لوگ ان سے جادو کو سمجھنے کی حد، علم سِحر سیکھتے ہیں۔

اور یہ تو معلوم ہی ہے کہ کچھ جادو سیکھنا حلال و جائز ہے، لیکن اس پر عمل کرنا حرام ہے اور یہ دونوں (ہاروت وماروت) لوگوں کو اس پر عمل کرنے سے روکتے اور ڈراتے ہیں اور لوگوں کو بتاتے ہیں کہ جادو کو حلال جاننا باعث فتنہ اور نقصان ہے اور سبب کفر ہے اور مخلوق کا ان سے سیکھنا تو یہ کفر تعلّم سے حاصل ہوا نہ کہ تعلیم سے، لہٰذا اعتراض لازم نہیں آتا۔

بعض فرشتے رسول ہیں

فرشتوں میں سے بعض اللہ تعالیٰ کے پیغمبر ہوتے ہیں جیسے کہ جبرائیل، میکائیل، اسرافیل اور عزرائیل علیہم السلام مخلوق کی طرف سے اللہ تعالیٰ کے فرستادہ پیغمبر ہیں اور تمام ملائکہ بنوت ورسالت کے درجے پر ہوتے ہیں۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

تَوَفَّتۡهُ رُسُلُنَا (الانعام ۶۱)

ہمارے رسل (فرشتے) اس کی روح قبض کرتے ہیں۔

اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

بِاَيۡدِىۡ سَفَرَةٍ (۱۵) كِرَامٍۭ بَرَرَةٍ (عبس ۱۶)

"ایسوں کے ہاتھ لکھے ہوئے جو کرم والے نکوئی والے۔"

لَّا يَعۡصُوۡنَ اللّٰهَ مَاۤ اَمَرَهُمۡ (التحریم ۶)

"جو اللہ کا حکم نہیں ٹالتے۔"

دوسری بات یہ ہے کہ تمام فرشتے اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں، اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

جَاعِلِ الۡمَلٰٓـئِكَةِ رُسُلًا (فاطر ۱)

"فرشتوں کو رسول کرنے والا"۔

اور رسولانِ کرام اللہ تعالیٰ کے امین اور سفیر ہوتے ہیں اور وہ نبوت کے مرتبے پر فائز ہیں۔ اس لئے کہ جبرائیل علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے احکام پہنچاتے ہیں اور جسے جبرائیل علیہ السلام کی زبان سے اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچے وہ نبی اور رسول ہوتا ہے۔

اس پر دلیل یہ ہے کہ ان سے بغض رکھنا اور انہیں گالی دینا، سبّ و شتم کرنا جائز نہیں ہے اور جس شخص نے کسی فرشتے کو گالی دی یا اس سے بغض رکھا تو وہ کافر ہو گیا جیسا کہ نبیوں سے بغض رکھنے والا یا انہیں سبّ و شتم کرنے والا کافر ہو جاتا ہے۔

اور جو کسی نبی یا فرشتے کا حقارت کے ساتھ گھٹیا انداز میں ذکر کرتا ہے، وہ کافر ہے۔

اس پر دلیل اللہ تعالیٰ کا قول ہے:

مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ رُسُلِهٖ وَ جِبْرِيْلَ وَ مِيْكٰلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ (۹۸)

"جو کوئی دشمن ہو اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کے رسولوں اور جبریل اور میکائیل کا تو اللہ دشمن ہے کافروں کا۔"

عن علي بن أبي طالب: مَن سَبَّ نبيًّا فاقتُلوه ومَن سَبَّ أصحابي فاجلِدوه۔

اور نبی مکرم ﷺ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے نبی (علیہ السلام) کو گالی دی ہو اسے قتل کر دیا جائے اور جو نبی (علیہ السلام) کے صحابہ کو گالی بکتا ہو اس پر حد جاری کی جائے۔[1]

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّ مِنَ النَّاسِ (الحج ۷۵)

"اللہ چن لیتا ہے فرشتوں میں سے رسول اور آدمیوں میں سے۔"

اس کی تحقیق یہ ہے کہ فرشتوں پر ایمان لانا ایسے ہی واجب ہے جس طرح نبیوں پر اور اللہ تعالیٰ کی کتابوں پر تو ضروری ہوا کہ فرشتے بھی انبیاء کرام علیہم السلام کے مرتبہ میں ہوں۔

دوسرا قول: اللہ تعالیٰ کی کتابوں پر ایمان لانے کا بیان

یہ بات ذہن نشین رہے کہ اللہ تعالیٰ کی سب کتابیں اس کا کلام ہیں اور یہ کلام جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی کی صورت میں نازل ہوتا رہا، مخلوق نہیں ہے اور اس کا سب کلام واحد ہے۔

---

[1] (ابن القیم (ت ۷۵۱)، أحكام أهل الذمة ۳/۱۴۵۵• أخرجه الطبراني في «المعجم الصغير» (۶۵۹)، والديلمي في «الفردوس» (۵۶۸۸)، وابن عساكر في «تاريخ دمشق» (۵۶۸۸))

اللہ تعالیٰ کی کسی کتاب یا اس کے کسی فرمان کا انکار کرنے والا کافر ہے

جو شخص اللہ تعالیٰ کی کسی کتاب کا انکار کرتا ہے یا کسی ایک کلمے کا انکار کرتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام نہیں ہے، وہ کافر ہے۔

کیا اللہ تعالیٰ کی سب کتابیں ایک درجے کی ہیں؟

اللہ تعالیٰ کی کتابوں میں کلام ہونے کے پہلو سے کوئی فرق نہیں اور کتب الٰہیہ میں سے کسی کتاب کو دوسری کتاب پر کلام الٰہی ہونے کے حوالے سے کوئی فضیلت اور برتری حاصل نہیں، سب اس کا کلام ہے۔

ہاں! کتابت و تلاوت اور تنزیل کے لحاظ سے روا اور جائز ہے کہ ایک کو دوسرے پر فضیلت ہو، جیسے ہم کہتے ہیں کہ قرآن مجید اوّل سے آخر تک اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور بعض کو بعض پر فضیلت دینا ہے جائز نہیں۔ ہاں! کتابت و تلاوت اور قرأت میں فضیلت دینا جائز ہے جیسے احادیث مبارکہ میں آتا ہے کہ سورت اخلاص کے پڑھنے والے کو اتنا ثواب ملتا ہے جب کہ اس کے مقابل سورت تبت کے پڑھنے والے کو اس کی نسبت اتنا ثواب نہیں ملتا۔

دراصل یہ فضیلت پڑھنے والے کے اس اعتقاد کی طرف لوٹتی ہے، جو اس نے اختیار کیا کہ اس میں میرے رب صفات ہیں اور اس کا خالص ذکر ہے تو اس کا پڑھنا بہ نسبت سورت تبت وغیرہ کے افضل ہے، اسی طرح اس مقام کو سمجھنا چاہیئے۔(کہ سب کتابیں اللہ تعالیٰ کا کلام ہیں اور اللہ تعالیٰ کا کلام ہونے کے اعتبار سے ایک کو دوسرے پر فضیلت نہیں۔)

چار کتابیں سب سے افضل ہیں

چار کتابیں افضل الکتب ہیں تورات، انجیل، زبور اور قرآن مجید اور ان چاروں میں سے قرآن پاک افضل ہے۔

قرآن مجید نے سب کتابوں کو منسوخ کر دیا

اس پر ہم سب کا اجماع ہے کہ گزشتہ کتابوں کو پڑھنا اور لکھنا، قرآن کریم کی قرأت و کتابت اور نزول کے ساتھ منسوخ ہو گیا ہے۔

کیا سابقہ کتبِ الٰہیہ کے احکام، قرآن سے منسوخ ہو چکے ہیں؟

اب رہا یہ مسئلہ کہ قرآن پاک کے احکام کے ساتھ کتب ماضیہ کے احکام منسوخ ہو گئے ہیں یا نہیں؟

امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ہر وہ حکم جو سابقہ کتب میں تھا اس کا نسخ، قرآن پاک، احادیث رسول ﷺ، اجماع امت یا قیاس جلی جو نسخ پر دال اور اس کا مقتضی ہو، ان سے منسوخ ہو گا اور جس حکم کے منسوخ ہونے کا قرآن، حدیث، اجماع یا قیاس جلی تقاضا نہ کرتا ہو وہ بدستور سابق مشروع اور جائز ہوں گے تو ایسے احکام بحال اور باقی رہیں گے۔

تمام احکام سابقہ منسوخ نہیں

پس قرآن مجید تمام سابقہ کا ناسخ نہیں ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

شَرَعَ لَكُمۡ مِّنَ الدِّيۡنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوۡحًا (الشوریٰ ۱۳)

تمہارے لیے دین کی وہ راہ ڈالی جس کا حکم اس نے نوح کو دیا۔

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

مِلَّةَ اَبِيۡكُمۡ اِبۡرٰهِيۡمَ (الحج ۷۸)

تمہارے باپ ابراہیم کا دین۔

امام شافعی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ قرآن کریم احکام سابقہ کا ناسخ ہے خواہ نسخ پایا جائے نہ پایا جائے اور اس مسئلہ کا اصل مقام اصول فقہ ہے۔

تیسرا قول: رسولوں پر ایمان

تمام فقہائے اہل سنت و جماعت رحمہم اللہ تعالیٰ کا اجماع ہے کہ انبیائے کرام علیہم السلام اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں اور بنی آدم سے ہیں، تمام انبیاء کرام علیہم السلام معصوم ہی پیدا کیے گئے ہیں، انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے تائید و قوت حاصل ہوتی ہے اور عقل و عبادت میں کامل ہوتے ہیں۔ انبیائے کرام علیہم السلام کے اعمال کو ناقص کہنا جائز نہیں اگرچہ ان کا عمل کم ہو مگر کامل، وافر اور تام ہوتا ہے۔ سب انبیاء کرام علیہم السلام کا ایک دین، ایک ملت، ایک اسلام ہے اور تمام ملت حنیفہ پر ہوتے ہیں۔

تمام انبیائے کرام علیہم السلام پر خواہ ان کے نام و تعداد معلوم ہو یا نہ ہو، ایمان لانا واجب ہے جو ان میں سے کسی کا انکار کرے وہ کافر ہے۔

سوال: اگر کسی سے پوچھا جائے کہ تو فلاں نبی (علیہ السلام) پر ایمان لایا ہے حالانکہ یہ شخص اس نبی کا نام نہیں جانتا تو اس کا کیا جواب دینا چاہیئے؟

جواب: اگر کوئی کہے کہ بتا تو فلاں پیغمبر پر ایمان لایا ہے اور وہ اس کا نام نہیں جانتا تو مطلقاً نفی و اثبات (ہاں یا نہ) میں جواب نہ دیں کہ ممکن ہے کہ وہ نبی ہو اور ہو سکتا ہے کہ وہ نبی نہ ہو۔

صحیح جواب: یوں کہیں گے اگر وہ نبی ہے تو میں اس پر اور اللہ تعالیٰ کے تمام انبیاء و مرسلین علیہم السلام پر ایمان لایا اور اگر وہ نبی نہیں ہیں تو پھر میں غیر نبی کو نبی نہیں مانتا۔

انبیاء کرام علیہم السلام کی صحیح تعداد کیا ہے؟

انبیاء کرام علیہم السلام کی صحیح تعداد کے متعلق کوئی نص قطعی وارد نہیں ہوئی، البتہ نبی کریم ﷺ سے ایک روایت میں ایک لاکھ چوبیس ہزار اور ایک روایت میں دو لاکھ چوبیس ہزار اور جب تعداد کے بیان میں مختلف روایتیں بطریق آحاد مروی ہیں تو قطع ویقین کے ساتھ عدد کا تعین نہیں کرسکتے تو بغیر گنتی وشمار اور کسی حتمی تعداد کی حد اور تعین کہ تمام انبیاء ومرسلین علیہم السلام پر ایمان لائے۔

کیا کوئی عورت نبی ہوئی ہے؟ عورتوں میں سے کوئی نبیہ ہوئی ہے یا نہیں؟ بعض فقہاء کرام رحمہم اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ کوئی عورت نبی نہیں اور بعض فقہائے کرام رحمہم اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ چار عورتوں کو نبوت ملی جیسے کہ ایک روایت میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ چار نبیات ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ، حضرت مریم، سائرہ اور حضرت حوا علیھن السلام۔ بعض فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ نے اس روایت کو غیر صحیح قرار دیا ہے۔

پھر ہم کہتے ہیں کہ اگر یہ روایت ثابت ہو تو ہم کہیں گے کہ ہمارا تمام انبیاء ومرسلین علیہم السلام خواہ مذکر ہوں یا مؤنث پر ایمان ہے اور اگر ثابت نہیں ہے تو نہیں لیکن عورت ہونا رسالت کے منافی ہے کیونکہ یہ پردے کی مقتضی ہے۔ (جب کہ انبیاء کرام علیہم السلام اور رسولوں (علیہم السلام) کا کام کھلم کھلا اپنوں اور بیگانوں سے ملتا ہے۔)

چوتھا قول: حضور پرنور سید المرسلین ﷺ پر ایمان لانے کا بیان

جاننا چاہیئے کہ ہر عاقل پر واجب ہے کہ وہ حضور پرنور ﷺ پر اس طرح ایمان لائے کہ حضور ﷺ اللہ تعالیٰ کے رسول تھے اور اب بھی اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں اور جیسا کہ پہلے بھی ذکر ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی نبی کو منصب نبوت سے معزول نہیں فرماتا (نبوت کا سلب ہوجانا یا اس سے معزول کردینا جائز نہیں) اور یہ ایمان لائے کہ حضور ﷺ خاتم النبیین ہیں اور آپ ﷺ کے بعد کسی نبی کا آنا جائز نہیں، سوائے عیسیٰ علیہ السلام کے کہ وہ حضور ﷺ کے بعد آسمان سے نزول فرمائیں گے اور ان کی ملت اور شریعت حضور ﷺ سے پہلے تھی اور ان کی وفات، نزول کے بعد ہوگی اور حضور ﷺ کے بعد کوئی پیدا نہیں ہوگا۔

روافض کا عقیدہ کفر ہے

روافض کہتے ہیں کہ کوئی زمانہ نبی سے خالی نہیں ہوسکتا، ہر زمانہ کا نبی ہوتا ہے، یہ کفر صریح ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ (الاحزاب ۴۰) اور نبیوں کی نبوت ختم کرنے والا اور جو ہمارے زمانہ میں نبوت کا دعویٰ کرے وہ

قطعی طور پر کافر ہے کہ اس نے نص قطعی میں شک کیا اور یہ اعتقاد رکھنا واجب ہے کہ حضور ﷺ کی نبوت میں کوئی شریک نہیں۔

اس کے بر خلاف روافض یہ کہتے ہیں کہ حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم نبوت میں حضور ﷺ کے شریک تھے، یہ عقیدہ ان کا کفر ہے اور یہ اعتقاد کرنا واجب ہے کہ حضور اقدس ﷺ تمام مخلوق سے زیادہ علم رکھتے ہیں اور حضور ﷺ تمام مخلوق سے افضل ہیں۔

عقیدۂ کفر: اس کے خلاف رافضیوں نے کہا کہ حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم حضور ﷺ سے بھی افضل اور زیادہ والے تھے، یہ عقیدہ بھی ان کا کفر ہے۔

عقیدۂ کفر ۲: بعض رافضیوں نے کہا کہ نبوت در حقیقت حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لئے تھی اور جبریل امین علیہ السلام نے غلطی سے حضور ﷺ کو وحی کر دی، یہ عقیدہ بھی کفر ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللّٰہِ (الفتح ۲۹) محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔

اور اس لئے کہ رافضیوں نے اللہ تعالیٰ کو جہل کے ساتھ موصوف کیا، اس لئے کہ ملائکہ سے غلطی ناممکن ہے تو اللہ تعالیٰ سے غلطی کیسے ہو سکتی ہے؟

حشویہ کا عقیدہ

بعض حشویہ کہتے ہیں کہ حضرت عزرائیل علیہ السلام نے فلاں کی روح قبض کرنے میں غلطی کی، مدینہ یا روم سے، اور یہ عقیدہ کفر ہے، اس لئے کہ زندگی اور موت کا خالق تو اللہ تعالیٰ ہے۔ اگر بالفرض عزرائیل علیہ السلام روح قبض کرنے میں غلطی کریں تو اللہ تعالیٰ عزوجل کے ابطال حیات اور ایجاد ممات میں کیسے غلطی ہو سکتی ہے؟ اور جب عزرائیل علیہ السلام سے غلطی ہو سکتی ہے تو پھر جبریل علیہ السلام سے بھی غلطی ہو سکتی ہے اور جب جبرائیل علیہ السلام غلطی کر سکتے ہیں تو ہو سکتا یہ کہ وحیٔ رسالت حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم کو تھی اور وہ غلطی سے معاذاللہ حضور ﷺ کو دے گئے، تو ہو سکتا ہے کہ وحی معاذاللہ فرعون کو تھی اور موسیٰ علیہ السلام کو دے دی گئی لہذا جو وحی میں حضرت جبریل علیہ السلام کی غلطی کا قائل ہو یا حضرت عزرائیل علیہ السلام کے روح قبض کرنے میں غلطی کا قائل ہو وہ یقیناً کافر ہے اور اس میں کسی کا اختلاف نہیں۔

حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم حضور ﷺ سے زیادہ علم رکھتے تھے ؟

جو کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور ﷺ سے زیادہ علم رکھتے تھے، جیسے حضرت خضر علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام سے زیادہ جانتے تھے اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو کونین کا علم تھا جیسا کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو کونین کا علم تھا۔

ہم اس کا یہ جواب دیتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حضور اقدس ﷺ کی تعلیم سے کونین کا علم حاصل تھا۔

دلیل یہ ہے کہ حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم فرماتے ہیں کہ مجھ کو نبی کریم ﷺ نے یمن کا قاضی بنا کر بھیجنا چاہا تو میں نے عرض کی: حضور ﷺ! میں قاضی کے فرائض انجام دینے کے قابل نہیں تو حضور ﷺ نے تبسم فرمایا اور ارشاد ہوا کہ اپنا منہ کھول۔ میں نے اپنا منہ کھولا تو حضور اقدس ﷺ نے اپنا لعاب دہن میرے منہ میں ڈال دیا، اس کی برکت سے کبھی کسی فیصلے میں اشتباہ نہیں ہوا، تو ثابت ہوا کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو کچھ جانتے تھے وہ حضور اقدس ﷺ کی تعلیم اور لعابِ دہن کی برکت تھی۔

اور ان کا یہ کہنا کہ حضرت علی بہ منزلہ حضرت خضر علیہ السلام کے تھے، موسیٰ علیہ السلام کے لئے تو ہم کہیں گے کہ موسیٰ علیہ السلام حضرت خضر علیہ السلام سے افضل اور زیادہ جاننے والے تھے کیونکہ وہ صاحبِ شریعت اور صاحبِ کتاب تھے۔

حضرت خضر علیہ السلام کون تھے؟ ولی یا نبی؟

حضرت خضر علیہ السلام کے متعلق اختلاف ہے، بعض نے کہا: نبی تھے اور بعض نے کہا: ولی تھے اور بعض نے کہا: رسول تھے۔

مگر اس میں سب کا اتفاق ہے کہ خضر علیہ السلام نہ تو صاحب شریعت تھے اور نہ صاحبِ کتاب۔

پھر سرکارِ دوعالم محمد رسول اللہ ﷺ صاحب کتاب اور صاحبِ شریعت اور تمام انبیاء و مرسلین علیہم السلام سے افضل، اعلیٰ، برتر و بالا ہیں اور لیکن حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضور پر نور ﷺ کے دستِ حق پرست پر ایمان لائے تو حضور اقدس ﷺ سے کس طرح افضل و اعلیٰ ہو سکتے ہیں؟

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حضور ﷺ سے افضل ماننے والا کافر ہے

اور جو یہ عقیدہ رکھے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور ﷺ سے افضل و اعلم تھے تو وہ قطعاً کافر ہو جائے گا۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو شریکِ نبوت ماننے والوں کی دلیل

جن لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو نبوت میں شریک مانا، انہوں نے اس سے حجت قائم کی کہ حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ:

اما ترضی ان تکون منی بمنزلة هارون من موسیٰ (علیهما السلام)۔

کیا تو اس بات پر راضی نہیں کہ تو مجھ سے ایسے ہو جیسے ہارون علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام سے تھے۔

اور ہارون علیہ السلام نبی تھے لہذا ضروری ہوا کہ مولیٰ علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم بھی نبی ہوں۔

اس کا جواب ہم یہ دیتے ہیں کہ پوری حدیث یہ ہے: **الا انه لا نبی بعدی۔** یعنی میرے بعد کوئی نبی نہیں اور **اما ترضی ان تکون منی بمنزلة هارون من موسیٰ (علیهما السلام)** اس سے مراد قرابت و رشتہ داری اور خلافت ہے نہ کہ نبوت۔ (حضرت ہارون علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حقیقی بھائی تھے اور حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ حضور ﷺ کے چچازاد بھائی ہیں اور حضرت ہارون علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام سے عمر میں بڑے تھے اور حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ حضور ﷺ سے عمر میں چھوٹے ہیں اور حضرت ہارون علیہ السلام کا انتقال حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں ہوا اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور ﷺ کے بعد حیات رہے، حضرت ہارون علیہ السلام کی خلافت زندہ رہنے تک تھی اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت بھی نبی اکرم ﷺ کی حیات تک تھی، اختلاف وفات کے بعد کی خلافت میں ہے نہ کہ حضور ﷺ کی زندگی والی خلافت میں۔)

پانچواں قول: معراج کا بیان

معتزلہ اور جہمیہ نے کہا کہ معراج بیت المقدس تک تھی اور اس کے آگے بیداری میں نہ تھی۔ ان میں سے بعض نے کہا کہ معراج روح کو تھی جسم کو نہ تھی۔

اور اہل سنت وجماعت کہتے ہیں: معراج حق ہے۔ حضور ﷺ کے دراقدس سے بیت المقدس تک، بیت المقدس سے ساتویں آسمان تک، ساتویں آسمان سے الیٰ ماشاء اللہ جہاں تک اللہ تعالیٰ نے چاہا۔

اور بعض فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا کہ جنت تک۔ بعض نے کہا عرش کے اوپر تک۔ بعض نے کہا: طرف عالم تک۔ حضور ﷺ کا ایک قدم مبارک عالم کی طرف اور دوسرا قدم عدم میں۔

اور بعض نے کہا کہ حضور سید المرسلین ﷺ اس عالم ماورائے عالم تشریف لے گئے عدم میں اور یہ محال نہیں، اس لئے کہ کینونت عالم اور حدوثِ عالم عدم میں عدم سے اور جب وجود عالم عدم سے اور حدوثِ عالم عدم سے جائز ہوا تو نقل موجودات کا عالم موجودات سے عدم تک جائز ہے اور بعض نے کہا: ناجائز ہے، اس لئے کہ مخلوق کا وجود بغیر مکان کے جائز نہیں۔

مخلوق کا وجود بغیر مکان کے ممکن ہے؟

ہم نے کہا: کینونت شخصہ (اس کی شخص وذات کا ہونا) اس کی ذات کے لئے مکان ہو گا۔

پھر جب وجود عالم جائز ہے کہ مکان ہو اپنی ذات کے لئے اور دوسرے مکان میں رکھنے کی ضرورت نہیں تو جائز ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کے لئے یا دوسری مخلوق کے لئے کہ اس کی ذات کے لئے مکان ہو اور موضوع نہ ہو، مکانِ آخر میں۔

مکان کی دو قسمیں ہیں

(۱) مکانِ حقیقی (۲) مکانِ مجازی

مکانِ مجازی کسے کہتے ہیں؟ مکانِ مجازی وہ ہے کہ اس مکان کے بغیر شئے کا وجود ممکن ہو اور وہ مقام موضع جلوس ہو یعنی مکانِ مجازی کسی شئے کی نشست گاہ اور قرار گاہ کو کہا جاتا ہے اور یہ ایسے ہی ہے جیسے ہم کہتے ہیں کہ عالم کے لئے وہ مکانِ مجازی کے بغیر موجود ہے اس لئے کہ عالم کے نیچے منتہی الی العدم ہے اور اس کے نیچے اور کوئی چیز نہیں، جس پر وہ قرار پکڑے تو ہمارا کہنا درست ہے کہ اس کا وجود اور شکل و تشخص ہی اس کا مکان ہے۔

مکان حقیقی کسے کہتے ہیں؟

مکانِ حقیقی وہ ہے کہ جس کے بغیر شئے کا وجود نہ ہو اور اس مکان میں اور کوئی غیر نہ ہو اور اسے شئے کا شکل و دائرہ کہتے ہیں، اس لئے کہ مخلوق کو وجود بغیر شکل و دائرہ کے ممکن نہیں اور اس شکل و دائرہ میں دوسرے کا وجود نا ممکن ہے تو جو کچھ ہم نے کہا: وہ صحیح ہوا۔

کیا عدم کی جانب انتقال ممکن ہے؟ بعض نے کہا کہ عدم کی طرف کسی کا منتقل ہونا ممکن نہیں ہے، اس لئے کہ نبی کریم ﷺ سانس لینے کے محتاج تھے اور عدم میں سانس لینا نا ممکن ہے۔

ہم کہتے ہیں: تنفس بقائے حیات کے لئے علت نہیں، اس لئے کہ مچھلی اور اس کی مثل جاندار پانی میں زندہ موجود ہیں اور وہ سانس لینے کے بغیر زندہ باقی ہیں اور زیادہ درست بات یہ ہے کہ معراج حق ہے اور بیداری میں ہوئی جہاں تک اللہ تعالیٰ نے چاہا۔

معراج النبی ﷺ اور معتزلہ کا مسلک

معتزلہ کی دلیل وہ روایت ہے، جو ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ عفیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا کہ **مافقد جسد محمد ﷺ لیلۃ المعراج**۔ نبی کریم ﷺ کا جسم اقدس معراج کی رات مفقود نہیں ہوا اور حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے معراج کے متعلق دریافت کیا تو آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ وہ سچا خواب تھا اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمَا جَعَلْنَا الرُّؤْيَا الَّتِي أَرَيْنَاكَ إِلَّا فِتْنَةً لِلنَّاسِ (الاسراء ٦٠)

اور ہم نے نہ کیا وہ دکھاوا جو تمہیں دکھایا تھا مگر لوگوں کی آزمائش کو۔

اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ معراج نیند میں تھی اور یہ کہ معراج بیت المقدس تک نص سے ثابت ہے اور بیت المقدس سے آگے خبر واحد سے ثابت ہے اور خبر واحد سے جو چیز ثابت ہو، اس سے عقیدہ نہیں بنتا تو جو ہم نے کہا: وہ صحیح ہے۔

ام المؤمنین رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت کا جواب

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا فرمانا کہ معراج کی رات حضور ﷺ کا جسم اقدس گم نہیں ہوا، اس کا مطلب اور مفہوم یہ ہے کہ **مافقد جسدہ عن الروح بل کان روحہ معہ**۔ یعنی حضور ﷺ کا جسم، روح سے جدا نہیں ہوا بلکہ روح مع الجسد (یعنی روح و جسم دونوں) معراج ہوئی اور معراج فقط روحانی نہیں بلکہ روح و جسد دونوں کو ہوئی۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت کا مفہوم

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث کا مطلب یہ ہے کہ معراج بیداری میں ہوئی، خواب میں نہیں ہوئی اور حضور ﷺ نے سر کی آنکھوں سے عجائباتِ قدرت کو دیکھا۔

دوسری بات یہ کہ رؤیا مصدر ہے، کہا جاتا ہے "رای رؤیا" تو مراد رؤیا بالعین ہے یعنی ظاہری آنکھوں سے دیکھا۔

علاوہ ازیں اگر معراج خواب ہوتا تو کوئی انکار نہ کرتا، خواب تو ہنود منکر، کافر، گبرو، ترسا مجوس اور عاصی و مطیع سب ہی دیکھتے ہیں تو اس میں نبی اکرم ﷺ کی کوئی تخصیص اور فضیلت نہیں ہوئی، تو ثابت ہوا کہ یہ معراج جسمانی تھا اور بیداری میں ہوا، اسی طرح "وَمَا جَعَلْنَا الرُّؤْيَا الَّتِي أَرَيْنَاكَ (الاسراء ٦٠) اور ہم نے نہ کیا وہ دکھاوا جو تمہیں دکھایا تھا۔" سے مراد رؤیت عینی ہے، بیداری میں جیسا کہ ہم نے کہا اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد فِتْنَةً لِلنَّاسِ (الاسراء ٦٠) سے مراد ابو جہل اور اس کے متبعین ہیں، اس لئے کہ اس نے سب سے پہلے انکار کیا تھا۔ جب حضور ﷺ نے فرمایا: (ان شجرۃ الزقوم فی النار) کہ تھور کا درخت

جہنم میں ہے، یہ سن کر ابو جہل نے کہا تھا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ درخت اور جہنم میں (آگ میں درخت) کیونکر باقی رہ سکتا ہے؟ اور بہت سے ضعیف الایمان لوگ واقعۂ معراج سن کر مرتد ہو گئے۔

سب سے پہلے معراج کی تصدیق سیدنا ابو بکر صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کی اور بے شمار صحیح احادیث مبارکہ سے حضور اقدس ﷺ کی معراج جسمانی ثابت ہے اور جماعت صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے مروی ہے، ان میں سے ابو سعید خدری، انس بن مالک، مالک ابن صعصعہ، عبد اللہ ابن عباس اورام ہانی رضوان اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین مگر یہ احادیث بہ طریق آحاد ثابت ہیں، لہٰذا ان سے اعتقاد واجب نہیں تو ہم کہیں گے، احادیث کے تین مرتبے ہیں:

(۱) ایک مرتبہ یہ ہے کہ فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ نے بالاتفاق ان کو قبول کیا تو وہ حدیث حدِ شہرت میں کثرت روایت کی وجہ سے متواتر کے قریب ہے کہ بہ کثرت صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے مختلف مجالس میں واقعۂ معراج بیان کیا اور معروف متقدمین صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں سے کسی نے انکار نہیں کیا تو یہ بہ منزلہ اجماع کے ہو گیا اور علم و عمل واجب ہو گیا اور جو منکر ہے وہ فاسق ہے، مبتدع زجر و تعزیر کا مستحق ہے اور بعض نے کہا کہ کافر ہو جائے گا۔

(۲) دوسری قسم آحاد کی وہ ہے کہ اس کا منکر فاسق ہو گا اور اس کو مبتدع نہ کہا جائے گا۔

(۳) تیسری قسم آحاد کی وہ ہے کہ اس کا منکر فاسق بھی نہیں۔ پھر کلام معراج میں ہے اور یہ حد شہرت کو پہنچا ہوا ہے، جو "معراج الی ماشاء اللہ" کا انکار کرے گا، وہ فاسق و مبتدع قرار دیا جائے گا، اگرچہ کافر نہ ہو گا اور اس پر سب کا اجماع ہے کہ جو مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک کا انکار کرے وہ قطعاً کافر ہے۔

پھر یہاں تین چیزیں ہیں:

(۱) اسراء (۲) معراج (۳) اِعراج

(۱) لیکن اسراء مکہ سے بیت المقدس تک کا انکار تو معتزلہ بھی نہیں کرتے اور جو انکار کرے وہ قطعاً کافر ہے، اس لئے کہ بیت المقدس تک تشریف لے جانا نص قطعی سُبْحَانَ الَّذِي أَسْرَى بِعَبْدِهِ لَيْلًا مِنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ إِلَى الْمَسْجِدِ الْأَقْصَى الَّذِي بَارَكْنَا حَوْلَهُ (الاسراء ۱) پاکی ہے اسے جو راتوں رات اپنے بندے کو لے گیا مسجدِ حرام (خانہ کعبہ) سے مسجد اقصا (بیت المقدس) تک جس کے گرداگرد ہم نے برکت رکھی۔" سے ثابت ہے۔

(۲) اور معراج زمین سے ساتوں آسمان تک۔

(۳) اور اعراج ساتویں آسمان سے عرش معلیٰ تک۔

اور حضرت امام ہانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ نے رات میرے ہاں گزاری (ام ہانی ابو طالب کی بیٹی، حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بہن اور حضور علیہ السلام کی رضاعی بہن بھی ہیں۔) صبح کے وقت حضور ﷺ نے فرمایا: اے ام ہانی! آپ سے ایک حیرت انگیز اور تعجب خیز بات نہ بیان کروں؟ فرماتی ہیں: میں نے عرض کیا: کیوں نہیں، فرمایئے، حضور ﷺ نے فرمایا: میری آنکھیں سوتی تھیں اور دل بیدار تھا کہ جبریل علیہ السلام تشریف لائے اور مجھ کو جگایا، آخر تک حدیث بیان کی۔

اور دوسری دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

فَلَاأُقْسِمُ بِالشَّفَقِ (١٦) وَاللَّيْلِ وَمَا وَسَقَ (١٧) وَالْقَمَرِ إِذَا اتَّسَقَ (١٨) لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ (الانشقاق ١٩)

تو مجھے قسم ہے شام کے اجالے کی اور رات کی اور جو چیزیں اس میں جمع ہوتی ہیں اور چاند کی جب پورا ہو ضرور تم منزل بہ منزل چڑھو گے۔

اس آیت سے اللہ تعالیٰ نے چند چیزوں کی قسم یاد فرمائی اور فرمایا کہ نبی کریم ﷺ آسمانوں پر تشریف لے جائیں گے اور طبق آسمان ہے۔

اس پر دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

لَقَدْ رَأَى مِنْ آيَاتِ رَبِّهِ الْكُبْرَى (النجم ١٨)

بے شک اپنے رب کی بہت بڑی نشانیاں دیکھیں۔

ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا:

"ھو الرفرف"۔

وہ رفرف۔

نیز فرمایا:

ذُو مِرَّةٍ فَاسْتَوَى (النجم ٦)

پھر اس جلوہ نے قصد فرمایا۔

اس سے مراد حضور ﷺ ہیں اور فَاسْتَوَى (النجم ٦) سے مراد رفرف ہے۔

پھر فرمایا:

فَأَوْحَى إِلَى عَبْدِهِ مَا أَوْحَى (النجم ١٠)

اب وحی فرمائی اپنے بندے کو جو وحی فرمائی۔

یعنی ساتوں آسمانوں سے گزر کر عرش بریں پر پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے کلام فرمایا، جو بھی فرمایا، تو اس میں اعراج کا ثبوت ہے۔

پھر حضور نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے اپنے رب کو دل سے دیکھا آنکھ سے نہیں دیکھا (دیگر محققین کا کہنا ہے کہ سر کی آنکھوں سے دیکھا)۔

دلیل یہ ہے کہ حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سے دریافت کیا گیا کہ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے رب کو سر کی آنکھوں سے دیکھا؟

فرمایا: **سبحان اللہ سبحان اللہ رأیتہ بفؤادی و ما رایتہ بعینی۔**

سبحان اللہ! سبحان اللہ! میں نے رب کو دل کی آنکھوں سے دیکھا، آنکھوں سے نہیں دیکھا۔

اور حضرت ام المؤمنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے کہا گیا کہ کعب احبار رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے رؤیت (دیدار) اور کلام کو دو نبیوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ رؤیت حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو اور کلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کو، یہ سن کر ام المؤمنین رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا: تین چیزوں کے بارے میں جو کوئی تم سے کہے تو یہ اللہ تعالیٰ پر بڑا جھوٹ ہے:

(۱) جو یہ کہے کہ حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے شب معراج میں رب کو سر کی آنکھوں سے دیکھا، پھر دلیل میں یہ آیت تلاوت کی:

مَا کَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَأَی (النجم ۱۱)

"دل نے جھوٹ نہ کہا جو دیکھا۔" رؤیت کو قلب کی طرف مضاف کیا۔

(۲) اور یہ کہے کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم "**یعلم القیامۃ**" قیامت کا علم رکھتے تھے، پھر یہ آیت پڑھی:

إِنَّ اللہَ عِنْدَہٗ عِلْمُ السَّاعَۃِ (لقمان ۳۴)

یعنی قیامت کا علم بے شک اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ (جس کو چاہے عطا فرمائے)۔

(۳) اور جو یہ کہے کہ حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے "**کتم بعض ما اوحی الیہ**" بعض وحی کا حصہ چھپایا ہے، دلیل میں یہ آیت پڑھی:

یَا أَیُّھَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَیْکَ مِنْ رَبِّکَ۔ (المائدۃ ۶۷)

اے رسول پہنچا دو جو کچھ اُترا تمہیں تمہارے رب کی طرف سے۔" دلائل معراج صحیح ہو گئے۔

نوٹ: یعنی جو حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے دیکھا دل نے اس کو نہیں جھٹلایا، آنکھوں نے دیکھا دل نے تصدیق کی۔

قیامت کا علم بے شک خدا کے پاس ہے لیکن فرما دیا کہ:

وَعَلَّمَکَ مَا لَمْ تَکُنْ تَعْلَمُ (النساء ۱۱۳)

تمہیں سکھا دیا جو کچھ تم نہ جانتے تھے۔

تو اس عموم میں قیامت بھی داخل ہے۔

دوسرے:فَلَا يُظْهِرُ عَلَى غَيْبِهِ أَحَدًا (۲۶) إِلَّا مَنِ ارْتَضَى (الجن ۲۷)

تو اپنے غیب پر کسی کو مسلط نہیں کرتا سوائے اپنے پسندیدہ۔

تو وہ اپنے غیب پر کسی سے اظہار نہیں کرتا سوائے اپنے پسندیدہ (رسولوں) کے۔

یا:وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلَكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِي مِنْ رُسُلِهِ مَنْ يَشَاءُ (آل عمران ۱۷۹)

اور اللہ کی شان یہ نہیں کہ اے عام لوگو تمہیں غیب کا علم دے دے ہاں اللہ چُن لیتا ہے اپنے رسولوں سے جسے چاہے۔

چھٹا قول: آخرت پر ایمان

قرامطہ، زنادقہ، اباحیہ، منجمہ، تناسخیہ، فلاسفہ نے قیامت اور حشر کا انکار کیا ہے اور بعض رافضیوں سے شیعہ رجعیہ نے بھی انکار کیا۔

قیامت کا عجیب مطلب

اوران سب نے کہا کہ قیامت کے معنی یہ ہیں کہ روح جسم میں داخل کر کے ان عملوں کا بدلہ دیا جائے گا جو زمانۂ سابقہ اور گزشتہ ایام میں کئے ہوں گے اور یہ ان سب کا عقیدۂ کفر ہے اوراس بات کا فساد کسی عقل مند پر پوشیدہ نہیں، اس لئے کہ انہوں نے نص قطعی کا انکار کیا ہے اور بہ طریق مناظرہ ان کافروں سے اثباتِ وحی و نبوت کے دلائل ہیں۔

اور قرآن وحدیث کے خلاف ، کلام اللہ کی تاویل کرنا کفر ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام پاک میں قیامت کے اوصاف ذکر فرمائے ہیں۔ اور مثلاً وہ یہ ہیں کہ فرمایا:

فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ خَمْسِينَ أَلْفَ سَنَةٍ (المعارج ۴) اس دن ہو گا جس کی مقدار پچاس ہزار برس ہے۔

دوسری آیت میں ارشاد فرمایا:

وَ اَنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُوْرِ (الحج ۷) اور یہ کہ اللہ اُٹھائے گا اُنہیں جو قبروں میں ہیں۔

اسی طرح ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ وَفِيهَا نُعِيدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرَى (طہ ۵۵)

ہم نے زمین ہی سے تمہیں بنایا اور اسی میں تمہیں پھر لے جائیں گے اور اسی سے تمہیں دوبارہ نکالیں گے۔

اوراس طرح کی بہت آیتیں ہیں جن سے قیامت کا ثبوت سورج کی طرح روشن ہے۔

ساتواں قول: میزان اور صراط وکتاب کا بیان

معتزلہ اور جہمیہ، میزان، صراط اور حساب وکتاب کے منکر ہیں اور کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نیکیوں اور برائیوں کی مقدار کو جانتا ہے اور اسے ان (میزان وصراط اور حساب وکتاب) کی حاجت نہیں اور حقیقت میں یہ چیزیں صحیح اور ثابت نہیں بلکہ ان سے کچھ اور ہی مراد ہے اوران کا یہ اعتقاد کفر ہے، اس لئے کہ یہ چیزیں نص سے ثابت ہیں۔

قرآن کریم میں ہے:

فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (الاعراف ۸)

تو جن کے پلے بھاری ہوئے وہی مراد کو پہنچے۔

وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنْفُسَهُمْ (الاعراف ۹)

"اور جن کے پلّے ہلکے ہوئے تو وہی ہیں جنہوں نے اپنی جان گھاٹے میں ڈالی۔"

یہ میزان کے حق ہونے میں نص ہے۔

سیدنا ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا: ترازو کی ایک زبان ہے اور دو پلڑے ہیں، ایک پلڑا مشرق میں اور دوسرا مغرب میں۔ پھر اگر یہ کہا جائے کہ اعمال تو اعراض ہیں باقی رہنے والے نہیں وہ کس طرح تولے جائیں گے؟ اس کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ بندہ اپنے عمل سمیت تولا جائے گا۔

نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ حضور اقدس ﷺ کسی غزوہ میں تھے۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما ایک درخت پر چڑھے، ان کی پنڈلیاں پتلی تھیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم مسکرانے لگے، حضور اقدس ﷺ نے فرمایا: ان کی پتلی پنڈلیوں کو دیکھ کر تعجب کرتے ہو؟ یہ پنڈلیاں میزان میں آسمان وزمین سے بھی زیادہ وزنی ہیں۔

اور عبد اللہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا: بندہ کے اعمال صحیفوں میں لکھے جاتے ہیں، ایک صحیفہ میں نیکیاں اور دوسرے میں برائیاں۔ ایک پلڑے میں حسنات کا صحیفہ اور دوسرے پلڑے میں برائیوں کا صحیفہ رکھا جائے گا۔

اور محمد ابن علی ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اعمال بغیر انسان کے تولے جائیں گے، ایک پلڑے میں نیکیاں رکھی جائیں گی وہ نور کی مانند نظر آئیں گی اور دوسرے میں برائیاں رکھی جائیں گے وہ تاریکی وظلمت کی طرح معلوم ہوں گی۔

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ (۷) وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ (الزلزلة ۸)

"تو جو ایک ذرّہ بھر بھلائی کرے اسے دیکھے گا اور جو ایک ذرّہ بھر برائی کرے اسے دیکھے گا۔"

اور ایسے حساب بھی نص سے ثابت ہے۔

فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَسِيرًا (الانشقاق ۸)

"اس سے عنقریب سہل حساب لیا جائے گا۔"

دوسری نص:

إِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ (آل عمران ۱۹۹)

اور اللہ جلد حساب کرنے والا ہے۔

یہ نص حساب کے بارے میں ہے۔

اور مروی ہے کہ ایک اعرابی نے حضور ﷺ سے عرض کی: قیامت کے دن حساب کون لے گا؟ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ۔ اعرابی نے عرض کیا: جب تو میں کامیاب ہوں۔ قسم ہے رب کعبہ کی! اپنے حق میں گرفت نہیں فرمائے گا اور اپنا حق چھوڑ دے گا (اور بندے کے حق کو نہیں چھوڑے گا)۔

ایسے ہی کتاب نص سے ثابت ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

كِتَابٌ مَرْقُومٌ (۲۰) يَشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُونَ (المطففین ۲۱)

"وہ لکھت ایک مُہر کیا نَوِشْتَہ (تحریر نامہ) ہے کہ مقرّب جس کی زیارت کرتے ہیں۔"

دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

لَا يُغَادِرُ صَغِيرَةً وَلَا كَبِيرَةً إِلَّا أَحْصَاهَا (الکھف ۴۹)

"اس نَوِشْتَہ (تحریر) کو کیا ہوا نہ اس نے کوئی چھوٹا گناہ چھوڑا نہ بڑا جسے گھیر نہ لیا ہو"۔

إِنَّ رُسُلَنَا يَكْتُبُونَ مَا تَمْكُرُونَ (یونس ۲۱)

بے شک ہمارے فرشتے تمہارے مکر لکھ رہے ہیں۔

اور بھی اسی طرح آیتیں ہیں، یہ نص ہے، جو انکار کرے کافر ہے۔

اگر کہا جائے کہ حساب وکتاب اور میزان وصراط میں کیا حکمت اور فائدہ ہے؟ جب کہ اللہ تعالیٰ سب کو جانتا ہے تو وہ حساب وکتاب اور میزان وسوال کا محتاج نہیں۔

جواب: ہم کہتے ہیں کہ یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ بنی آدم پر ثابت کر دیا جائے اور ان پر حجت قائم کر دی جائے تاکہ بندہ اپنے اچھے اور برے عملوں کی مقدار کو جان لے اور اسے یقین ہو جائے کہ جو کچھ مجھے پہنچا ہے وہ عدل ہے اور بندہ اسی کا اہل ہے وہ جس کے قابل تھے وہ اسے مل گیا۔

اب اگر دریافت کیا جائے کہ ان میں سے سب سے پہلے کیا ہو گا؟

تو اس کے متعلق کوئی نص نہیں ہے، لیکن تاہم یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ سب کچھ صراط پر ہو گا اور یہ جائز نہیں کہ صراط سے پہلے ہو، اس لئے کہ میزان وحساب کے بعد مشقت جائز نہیں جس نے نجات پائی، اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهُ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (الاعراف ۸)

تو جن کے پلے بھاری ہوئے وہی مراد کو پہنچے۔

اور صراط کے بعد (حساب ومیزان) جائز نہیں، اس لئے کہ جب صراط سے گزر گیا تو کامیاب ہو گیا اور جہنم سے بچ گیا، پھر افعالِ قلوب فکر اور نیت وغیرہ کا حساب ہو گا یا نہیں ؟ بعض نے کہا: سب کا حساب ہو گا۔ بعض نے کہا: ان کا حساب نہیں ہو گا اور زیادہ درست بات یہ ہے کہ جب کبھی دل میں خطرہ گزرا (دل میں کسی برے کا کام خیال آیا) اگر اس کا عزم نہیں کیا اور نہ نیت کی تو اس کا حساب نہ ہو گا اگرچہ خطرہ (کھٹکا) کفر ہی کیوں نہ ہو۔

نوٹ: انسان کے ذہن میں جو بات، خیالات، ترغیبات اور عزائم پیدا ہوتے ہیں ان کی پانچ قسمیں:

(۱) ہاجس: اچانک کسی چیز کا خیال آئے۔

(۲) خاطر: کسی چیز کا بار بار خیال آئے۔

(۳) حدیث نفس: جس چیز کا خیال آئے، ذہن اس کے حصول کے لئے پروگرام تیار کرنا شروع کر دے۔

(۴) ھم: غالب جہت اس چیز کو حاصل کرنے کی ہو اور مغلوب سا خیال ہو کہ اس کو حاصل نہ کیا جائے۔

(۵) عزم: مغلوب سا خیال بھی زائل ہو جائے اور اس چیز کے حصول کا پختہ ارادہ ہو، اگر کسی شخص کے ذہن میں گناہ کا خیال آئے، ہاجس، خاطر، حدیث نفس اور ہم کے مرتبہ میں اس سے مؤاخذہ نہیں ہوتا، البتہ گناہ کا عزم کرے تو وہ مستحق مواخذہ ہے، خواہ اس کے بعد گناہ کا فعل نہ کرے۔

کیونکہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے عزم سے روکا ہے، فرمایا:

وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ (البقرة ۲۳۵)

اور نکاح کی گرہ پکی نہ کرو۔

نماز میں جو خیالات ہاجس اور خاطر کی قسم سے ذہن میں آئیں ان سے نماز میں کوئی کمی نہیں ہوتی، کیونکہ وہ اس کے بس اور اختیار سے باہر ہے، البتہ حدیثِ نفس سے احتراز کرنا چاہیئے اور یہ انسان کے بس میں ہے۔)[1]

اس لئے یہ خطرات ایسے ہیں جن سے بچنا ممکن ہے، ہاں! اگر دل میں خطرہ پیدا ہوا اور اس کا اعتقاد کیا اور اس پر جما رہا تو ضرور سوال ہو گا اور حساب لیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَا فِیْ صُدُوْرِکُمْ اَوْ تُبْدُوْهُ یَعْلَمْهُ اللّٰهُ (آل عمران ۲۹)

تم فرمادو کہ اگر تم اپنے جی کی بات چھپاؤ یا ظاہر کرو اللہ کو سب معلوم ہے۔

اور فرمایا:

اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ کُلُّ اُولٰٓئِکَ کَانَ عَنْهُ مَسْـُٔوْلًا (الاسراء ۳۶)

بے شک کان اور آنکھ اور دل ان سب سے سوال ہونا ہے۔

آٹھواں قول: کراماً کاتبین اور حفاظت کرنے والے فرشتوں کا بیان: معتزلہ کا مسلک

معتزلہ کہتے ہیں کہ ہم پر کوئی حفاظت کرنے والے اور ہمارے عملوں کو لکھنے کے لئے فرشتے مقرر نہیں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو اور ان کے اعمال کو جانتا ہے، جس کو چاہے بخشے، جس کو چاہے عذاب دے۔

اہل سنت مذہب

اہل سنت فرماتے ہیں کہ حفظہ (حفاظت کرنے والے فرشتے) ہر کافر اور مؤمن پر مقرر ہیں، جو بندے کے شب و روز کے اعمال کا حساب و کتاب رکھتے ہیں۔

دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَاِنَّ عَلَیْکُمْ لَحٰفِظِیْنَ (۱۰) کِرَامًا کَاتِبِیْنَ (۱۱) یَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ (الانفطار ۱۲)

اور بے شک تم پر کچھ نگہبان ہیں مُعَزّز لکھنے والے کہ جانتے ہیں جو کچھ تم کرو۔

دوسری آیت: مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ یَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ (الرعد ۱۱)

آدمی کے لیے بدلی والے فرشتے ہیں اس کے آگے اور پیچھے کہ بحکمِ خدا اس کی حفاظت کرتے ہیں۔

---

[1] (شرح مسلم شریف از غلام رسول سعیدی رحمہ اللہ تعالیٰ)

امام ابراہیم نخعی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ ان میں کسی رسول کو بھیجتا ہے تو اس رسول کی حفاظت کے لئے اللہ تعالیٰ فرشتوں کو بھیجتا ہے جو رسول کی مکمل حفاظت کرتے ہیں۔

ام المؤمنین سیدہ عائشہ صدیقہ عفیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں: جب قیامت کی سب سے پہلی نشانی اور علامت ظاہر ہوگی تو قلم ڈال دیئے جائیں گے اور فرشتے لائے جائیں گے اور تمام اعضاء گواہی دیں گے کہ بندوں نے فلاں فلاں اعمال کیے ہیں اور یہ اعمال صحیح ہیں اور یہ امر نص سے ثابت ہے جو انکار کرے، وہ کافر ہے۔

نواں قول: دوزخ میں داخل ہونے اور دوزخ سے نکلنے کا بیان

معتزلہ کہتے ہیں: مؤمنین دوزخ میں داخل نہیں ہوں گے، دوزخ میں کافر اور فاسق داخل ہوں گے اور جو دوزخ میں داخل ہو گیا وہ ہمیشہ اسی میں رہے گا، نکالا نہیں جائے گا۔

اہل سنت و جماعت کہتے ہیں کہ دوزخ میں داخل ہونا تمام امتوں کے لئے ہے اور دوزخ سے خروج مؤمنوں کے لئے خاص ہے، یہ حق ہے۔

اس کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

وَإِنْ مِنْكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا كَانَ عَلَى رَبِّكَ حَتْمًا مَقْضِيًّا (۷۱) ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِينَ اتَّقَوْا (یعنی من الشرک) وَنَذَرُ الظَّالِمِينَ فِيهَا جِثِيًّا (مریم ۷۲)

"اور تم میں کوئی ایسا نہیں جس کا گزر دوزخ پر نہ ہو تمہارے رب کے ذمہ پر یہ ضرور ٹھہری ہوئی بات ہے پھر ہم ڈر والوں کو بچا لیں گے (یعنی شرک سے) اور ظالموں کو اس میں چھوڑ دیں گے گھٹنوں کے بل گرے۔"

علماء رحمہم اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ورود اس جگہ داخل ہونے کے معنی میں استعمال ہوا ہے، اس پر دلیل حضور ﷺ کا وہ ارشاد ہے کہ سب سے آخر میں جہنم سے وہ نکلے گا جس کے دل میں ذرہ برابر ایمان ہوگا۔ ایک دوسری روایت میں آتا ہے کہ سب سے آخر میں جہنم سے اس شخص کو نکالا جائے گا، جس کے دل میں رائی کے دانہ کے برابر ایمان ہوگا اور یہ نص ہے۔

دخول جہنم سے مراد؟

پھر ہم کہتے ہیں کہ انبیاء و مرسلین علیہم السلام کے سوا سب امتوں کے لئے خواہ وہ مؤمن ہوں یا کافر دخولِ جہنم ثابت ہے، اس لئے کہ دخول سے مراد صراط سے گزرنا ہے اور یہ گزرنا جزاء و سزا، سوال و میزان اور حساب و کتاب کے لئے تمام امتوں سے ہوگا، سوائے نبیوں اور رسولوں (علیہم السلام) کے، اس لئے کہ یہ چیزیں نیکی اور بدی کے اظہار کے لئے ہوں گی تاکہ نیکوں کو اچھا بدلہ دیا جائے اور بروں کو سزا دی جائے اور انبیاء و مرسلین (علیہم السلام) تو پیدا ہی پاک و معصوم ہوتے ہیں، وہ ہر

چھوٹے بڑے گناہ سے معصوم ہوتے ہیں۔(اس لئے ان سے نہ سوال ہو گا، نہ حساب وکتاب وہ بالکل مامون ہوں گے۔) اس لئے کہ وہ تمام بندوں پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے حجت ہیں اور حجت پر حجت قائم کرنے کی ضرورت نہیں۔

علاوہ ازیں یہ امور اظہارِ تقصیر اور گناہ کے لئے ہیں اور انبیائے کرام علیہم السلام مغفور اور فائز المرام ہوتے ہیں، وہاں گناہ اور تقصیر و کوتاہی کا امکان ہی نہیں بلکہ ان سے گناہ و تقصیر کا وہم بھی نہیں کیا جاسکتا، اس لئے ان سے حساب بھی نہ ہو گا۔

قرآن پاک میں ہے:

فَامْنُنْ أَوْ أَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ (ص ۳۹)

اب تو چاہے تو احسان کر یا روک رکھ تجھ پر کچھ حساب نہیں۔

اور حساب حاصل و محصول کا ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے ان سے حساب اٹھالیا ہے، اس لئے وہ مدعیٔ نبوت ہیں اور شریعت کو بیان کرنے والے ہیں اور اگر انبیاء و مرسلین علیہم السلام ان امور سے محفوظ نہ ہوں، یعنی ان سے بھی سوال وجواب اور حساب وکتاب ہو اور سزا دیئے جائیں تو مخلوق کو نجات کی دعوت کس طرح دیں گے؟ جب وہ خود نجات یافتہ نہیں تو دوسروں کو نجات کا مژدہ کس طرح دے سکتے ہیں؟ جو خود خوف زدہ ہوں وہ دوسروں کو کیسے نجات دلا سکتا ہے؟ اور جب دوسروں کو نجات دلا سکتا ہے تو خود بہ طریقِ اولیٰ نجات یافتہ ہو گا۔

پس ثابت ہوا کہ انبیاء کرام علیہم السلام نجات یافتہ ہیں اور ہلاکت کے خوف سے محفوظ ہیں اور ان سے سوال ہو گا اور نہ انہیں عذاب ہو گا (بلکہ وہ تو دوسروں کی شفاعت کر کے نجات دلائیں گے۔)، لہذا جو ہم نے کہا وہ صحیح ثابت ہوا۔

بعض کہتے ہیں: یہ (حساب وکتاب، سوال وجواب) انبیاء کرام علیہم السلام سے بطور عرض اور ان کے فضل و کمال کے اظہار کے لئے ہو گا۔

اہل سنت وجماعت کے نزدیک اہل ایمان ہمشہ جہنم میں نہ رہیں گے۔

معتزلہ کے نزدیک مرتکب کبیرہ اگر بغیر توبہ کیے مرجائے تو وہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا اور انہوں نے یہ کیوں کہا؟ دراصل اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے زعم میں مرتکب کبیرہ ایمان دار نہیں رہتا اور جب توبہ کئے بغیر مر گیا تو وہ بے ایمان ہونے کی وجہ سے جنت و ثواب کا مستحق نہیں۔

معتزلہ اس آیت سے دلیل دیتے ہیں کہ:

وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا فَجَزَاؤُهُ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيهَا (النساء ۹۳)

اور جو کوئی مسلمان کو جان بوجھ کر قتل کرے تو اس کا بدلہ جہنم ہے کہ مدتوں اس میں رہے۔

ہم (اہل سنت) کہتے ہیں: مرتکب کبیرہ اسلام سے خارج نہیں تو جب وہ ایمان دار ہے تو کافروں کے ساتھ ہمیشہ جہنم میں نہیں رہے گا۔ حکمت کا تقاضا بھی یہی ہے، دوسری بات یہ ہے کہ مشرکوں کے لئے اللہ تعالیٰ نے تأبید (ہمیشہ) کا لفظ استعمال فرمایا۔

وَالْمُشْرِكِينَ فِي نَارِ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا (البينة ٦)

اور مشرک سب جہنم کی آگ میں ہیں ہمیشہ اس میں رہیں گے۔

اور اسی طرح جنتیوں کے لئے ہمیشہ کا لفظ فرمایا:

تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا (البينة ٦)

جن کے نیچے نہریں بہیں ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں۔"

خلود اور تأبید میں فرق؟

اور قاتل کے لئے خلود کا ذکر ہے، تأبید کا ذکر نہیں اور خلود سے مراد مکث طویل (مدت دراز تک ٹھہرنا) مراد ہے، اس بات کو ہم بھی مانتے ہیں کہ جہنم میں طویل مدت تک رہے گا، پھر نکال لیا جائے گا۔

ایک دوسری توجیہ

اور بعض نے کہا کہ یہ آیت اس شخص کے بارے میں نازل ہوئی ہے کہ جس نے مسلمانوں کو قتل کیا اور پھر مرتد ہو گیا تو ہم بھی کہتے ہیں کہ بوجہ ارتداد ہمیشہ جہنم میں رہے گا لیکن مسلمان مرتکب کبیرہ ہمیشہ جہنم میں نہیں رہے گا، اس لئے کہ ایمان کے ساتھ خلود بمعنیٰ تأبید ناجائز ہے۔

دسواں قول: شفاعت اور فدیہ کا بیان

شفاعت کے مسئلہ میں معتزلہ کے دو گروہ ہیں: ایک گروہ تو بالکل سرے سے ہی شفاعت کا منکر ہے۔ دوسرا تین قسم کے لوگوں کے لئے شفاعت ثابت مانتا ہے:

(۱) ایک وہ لوگ جو کبیرہ گناہوں سے پرہیز کرتے تھے اور صغیرہ گناہوں کے مرتکب ہوئے تو وہ صغیرہ گناہوں سے بخشش کے لئے نبی یا فرشتے کی شفاعت کے محتاج ہوں گے۔

(۲) دوسرا وہ جو مرتکب کبیرہ ہے، پھر توبہ کر لی تو وہ قبول توبہ کے لئے شفاعتِ انبیاء کرام علیہم السلام کا محتاج ہو گا۔

(۳) تیسرا وہ کہ چھوٹے بڑے گناہوں سے بچتا رہا ہے لیکن وہ درجات کی بلندی کے لئے انبیائے کرام علیہم السلام اور فرشتوں کی شفاعت کا محتاج ہے۔

شفاعت کون کر سکتا ہے؟

معتزلہ کے نزدیک شفاعت صرف انبیائے کرام علیہم السلام اور فرشتے کر سکتے ہیں۔

معتزلہ کے نزدیک اور اہل سنت کی جوابی کارروائی

مسئلہ شفاعت میں معتزلہ نے اپنے عقائد و نظریات بیان کرتے ہوئے جو چند سوال اٹھائے ہیں، ان کا جواب دیتے ہوئے اہل سنت فرماتے ہیں کہ جواب یہ ہے کہ جو شخص کبیرہ گناہوں سے بچتا رہا اور صغیرہ کا مرتکب ہوا تو ان کے نزدیک وہ شفاعت کا محتاج ہی نہیں، اس لئے کہ ان کا مذہب یہ ہے کہ جو کبیرہ گناہوں سے بچتا رہا اور صغیرہ کا ارتکاب کرتا رہا تو خدا پر واجب ہے کہ اس کو بخش دے۔

اس پر دلیل کے طور پر یہ آیت پیش کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

إِنْ تَجْتَنِبُوا كَبَائِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ (النساء ۳۱)

اگر بچتے رہو کبیرہ گناہوں سے جن کی تمہیں ممانعت ہے تو تمہارے اور گناہ ہم بخش دیں گے۔

تو جب ان (معتزلہ) کے نزدیک جیسا کہ ان کا زعم ہے کہ اللہ تعالیٰ پر ایسے بندے کی مغفرت کرنا واجب ہے تو وہ شفاعت کا محتاج ہی نہیں ہے اور ان کا یہ کہنا کہ جو شخص صغائر کا مرتکب اور کبائر سے اجتناب کرتا رہا تو اللہ تعالیٰ پر واجب ہے کہ اس کو بخش دے، یہ صحیح نہیں، اس لئے کہ جب وہ صغیرہ گناہ کرتا رہا اور اس کو ہلکا جانا تو کبیرہ ہو گیا اور ہم کہتے ہیں کہ بندوں کی طرف سے اللہ عزوجل پر کوئی شئے واجب نہیں اور اس کو اپنی جگہ بیان کریں گے۔

رد:

اور ان کا یہ کہنا کہ جو شخص کبائر کا مرتکب ہو کر تائب ہو گیا تو اس کے لئے بھی شفاعت ہے، یہ بھی صحیح نہیں کہ ان کا مذہب یہ ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ پر ایمان لایا اور اچھے کام کئے تو وہ محتاجِ شفاعت نہیں، پھر اثبات شفاعت اس فرق کے ساتھ ان کے مذہب میں کفر ہے، اس لئے کہ ان کے مذہب میں جب بخشنا واجب ہے تو پھر مغفرت کے لئے شفاعت کرنا، اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو نہیں بخشا تو جو چیز اللہ تعالیٰ پر واجب تھی وہ نہیں کی، واجب کو ترک کر دیا تو ظلم و ستم ہوا اور جو اللہ تعالیٰ کو ظلم و جور کے ساتھ موصوف کرے وہ کافر ہو جائے گا۔

اہل سنت وجماعت اور مسئلہ شفاعت

اہل سنت وجماعت کے نزدیک شفاعت کا ثابت کرنا بالکل صحیح ہے، اس لئے کہ وہ کہتے ہیں کہ مرتکبِ صغیرہ وکبیرہ بغیر توبہ کئے مر جائے تو اللہ تعالیٰ کی مشیت پر موقوف ہے۔ اگر بخشے تو اس کا فعل ہے اور اگر نہ بخشے اور عذاب دے تو عدل ہے اور ایسے ہی اگر توبہ کر کے مرے تو اس کی مشیت پر موقوف ہے، اگر چاہے اپنے فضل سے توبہ کر لے اور اگر چاہے تو تقاضائے عدل کے مطابق بندہ کی کوتاہیوں کی وجہ سے عذاب دے اور نہ بخشے۔

شفاعت کن کے لئے ہو گی؟

شفاعت ہر مؤمن کے لئے ثابت ہے خواہ مرتکب کبیرہ ہو خواہ مرتکب صغیرہ ہو، جب کہ وہ ایمان پر مرے، مستحق شفاعت ہے۔

حضور ﷺ نے فرمایا:

شفاعتی لاھل الکبائر من امتی و من انکرھالم ینلھایوم القیامۃ اترونھاللمصلین اترونھاللصائمین لاولکنھا للمتلوثین والخطائین۔

یعنی میری شفاعت میری امت کے مرتکب کبائر کے لئے ہے اور جو انکار کرے وہ قیامت کے دن شفاعت سے محروم ہو گا۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ شفاعت نمازیوں کے لئے ہے؟ کیا تم سمجھتے ہو روزہ داروں کے لئے ہے؟ نہیں! شفاعت گناہوں میں ڈوبے ہوؤں اور خطاکاروں کے لئے ہے۔

اشکال: اگر یہ دریافت کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَلَا يَشْفَعُونَ إِلَّا لِمَنِ ارْتَضَى (الانبیاء ۲۸) یعنی الالمن ارتضی عملہ وھذاغیر مرضی العمل۔

اور شفاعت نہیں کرتے مگر اُس کے لیے جسے وہ پسند فرمائے۔'' یعنی مگر اس کی جس کے عمل کو وہ پسند کرے اور یہ غیر پسندیدہ عمل ہے۔ شفاعت صرف ان لوگوں کی، کی جائے گی جن کے اعمال اچھے ہوں اور مرتکب کبیرہ وصغیرہ کے عمل اچھے نہیں ہیں، پھر ان کے لئے شفاعت کیسے ثابت ہوئی؟

اس اشکال کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ اس سے مراد **لِمَنِ ارْتَضَى دینہ** یعنی جس کا دین اچھا ہو اس کی شفاعت کی جائے گی۔ دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَرَضِيَ لَهُ قَوْلًا (طہ ۱۰۹) اور اُس کی بات پسند فرمائی۔

اور جو کبیرہ کا مرتکب ہے اس کا دین تو اچھا ہے اور اسی طرح اس کا عمل (دین دار ہونا) بھی پسندیدہ ہی ہے اس لئے کہ وہ نماز پڑھتا ہے، روزہ رکھتا ہے لہذا عمل بھی اچھا ہوا۔

اشکال: پھر اگر کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

مَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ حَمِيمٍ وَلَا شَفِيعٍ يُطَاعُ (الغافر ۱۸)

اور ظالموں کا نہ کوئی دوست نہ کوئی سفارشی جس کا کہا مانا جائے۔

یعنی اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ ظالموں کے لئے کوئی دوست اور شفیع جس کی بات مانی جائے نہ ہوگا تو مرتکب کبیرہ ظالم ہے۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِنَفْسِهِ (فاطر ۳۲)

تو ان میں کوئی اپنی جان پر ظلم کرتا ہے۔

ہم جواباً یہ کہتے ہیں کہ پہلی آیت میں ظالم سے مراد کافر ہے اور اس پر دلیل وہ آیت کریمہ ہے جو پہلے گزری کہ:

وَأَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْآزِفَةِ (الغافر ۱۸)

اور اُنہیں ڈراؤ اس نزدیک آنے والی آفت کے دن سے۔

نیز اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ (لقمان ۱۳)

بے شک شرک بڑا ظلم ہے۔

اگر کہا جائے حدیث میں ہے، حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

لا ینال شفاعتی اھل الکبائر من امتی۔

میری شفاعت میری امت کے کبیرہ گناہوں کا ارتکاب کرنے والوں کو نہیں حاصل ہوگی۔

حدیث کا صحیح مفہوم

اس حدیث کی دو توجیہات بیان کی جاتی ہیں:

(۱) یہ حدیث ثابت نہیں ہے، صحیح حدیث یہ ہے:

شفاعتی لاھل الکبائر من امتی۔

میری شفاعت میری امت کے کبیرہ گناہوں کا ارتکاب کرنے والوں کے لئے ہے۔

(۲) اوراگر بالفرض صحیح ہوتو اس کے معنی یہ ہوں گے جو کبیرہ گناہوں کو حلال جان کر ان کا مرتکب ہو اوہ میری شفاعت سے بہرورہ نہ ہوگا۔

پھر یہ مسئلہ راجع ہے، ایک حرف کی طرف، وہ یہ ہے کہ مرتکب کبیرہ معتزلہ کے نزدیک مؤمن نہیں تو وہ اہل شفاعت سے نہ ہو اور اہل سنت کے نزدیک مرتکب کبیرہ مؤمن ہے لہذا وہ اہل شفاعت سے ہے اور اس کا ذکر ہم کر آئے ہیں۔

معتزلہ کی طرف سے اہل سنت پر اعتراض

اگر (معتزلہ) کہیں کہ حدیث میں آتا ہے کہ:

عن أبي الدرداء لا يدخُلُ الجنَّةَ مُدمنُ خَمرٍ۔

"شراب کا رسیا جنت میں داخل نہ ہوگا۔" اس کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ اس سے مراد عذاب سے پہلے اوّل ریلہ میں جنت میں نہ جائے گا۔[1]

اشکال: اگر کہا جائے کہ حدیث میں ہے: **عن أبي الحمراء هلال بن الحارث: من غَشَّنا فليس منّا۔**[2]

جواب: اہل سنت معتزلہ کے اس اشکال کے جواب میں فرماتے ہیں کہ اس کے معنی بھی یہی ہیں کہ جو دجل وفریب، دھوکا دہی کو حلال سمجھے (وہ ہمارے طریقہ پر نہیں)۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ **ليس من سننا**۔ کہ وہ ہمارے طریقے پر نہیں۔

شفاعت کے ثبوت پر دلیل

اس کی دلیل وہ حدیث ہے جس کو صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی جماعت نے روایت کیا ہے، بعض کی حدیث بعض کی حدیث میں داخل ہوگئی ہے کہ حضوراقدس ﷺ نے فرمایا: **إذا كان يومُ القيامةِ**۔ جب قیامت ہوگی، بعض لوگ بعض کے پاس آئیں گے۔ پہلے آدم علیہ السلام کے پاس آئیں گے اور عرض کریں گے: آپ ہماری شفاعت کیجئے، آدم علیہ السلام فرمائیں گے۔**لست لها**۔ میں شفاعت کے لئے نہیں، نوح علیہ السلام کے پاس حاضر ہوں۔ حضرت نوح علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کریں گے: آپ ہماری شفاعت فرمائیے۔ آپ بھی یہی فرمائیں گے: میں شفاعت کے لئے نہیں، ابراہیم علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوں۔ ابراہیم علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کریں گے: اے ابراہیم علیہ السلام! آپ ہماری سفارش کیجئے، آپ فرمائیں گے: یہ کام میرے بس کا نہیں، موسیٰ علیہ السلام کا دامن پکڑو۔ پھر موسیٰ علیہ السلام کے پاس حاضر ہو کر کہیں گے: اے موسیٰ علیہ السلام! آپ ہماری شفاعت کریں، موسیٰ علیہ السلام فرمائیں گے: میرا یہ منصب نہیں، عیسیٰ

---

[1] (البوصيري (ت۸٤۰)، مصباح الزجاجة ٤/۳۹• البزار (ت۲۹۲)، البحر الزخار ۱۱/۱۸۸• ابن حبان (ت۳٥٤)، صحيح ابن حبان ٦۱۳۷•)

[2] (البخاري (ت۲٥٦)، العلل الكبير ۱۹٦•)

علیہ السلام کے پاس جاؤ۔ جب عیسیٰ علیہ السلام سے عرض کریں گے کہ آپ ہماری شفاعت کیجئے، عیسیٰ علیہ السلام فرمائیں گے: میرا یہ کام نہیں، حضور سید المرسلین شفیع المذنبین محمد رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ عرش جاہ میں حاضر ہو کر شفاعت کی درخواست کرو۔ پھر یہ سب بارگاہِ رسالت مآب میں حاضر ہو کر عرض کریں گے: حضور (ﷺ)! ہماری شفاعت فرمایئے۔ حضور رحمۃ للعالمین ﷺ اپنی زبان حق ترجمان سے ارشاد فرمائیں گے: ہاں! ہم شفاعت کے مالک ہیں۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ میں وہاں سے کھڑے ہو کر مقام محمود میں زیر عرش اللہ عزوجل کو سجدہ کروں گا اور اللہ تعالیٰ عزوجل کی حمد وثناء کروں گا اور اس وقت میری زبان پر وہ کلمات جاری ہوں گے جو کسی حمد کرنے والے کی زبان پر جاری نہیں ہوئے، اللہ عزوجل ارشاد فرمائے گا: اے محمد ﷺ! اپنا سر مبارک اٹھایئے اور شفاعت کیجئے، آپ کی شفاعت قبول کی جائے گی، اور سوال کیجئے، جو مانگو گے دیا جائے گا، تو میں اپنا سر اٹھاؤں گا اور عرض کروں گا: اے رب کریم! تو نے مجھ سے وعدہ فرمایا تھا کہ میں اپنی امت کے اہل کبائر کی شفاعت کروں، اللہ تعالیٰ فرمائے گا: جایئے! اور جہنم سے ہر اس شخص کو نکال لیجئے جس کے دل میں رائی کے دانہ کے برابر بھی ایمان ہو، پھر میں دوبارہ سجدہ کروں گا، پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا: اپنا سر اٹھایئے، شفاعت کیجئے، شفاعت قبول کی جائے گی، مانگیئے! جو مانگو گے عطا کیا جائے گا، تو میں اپنا سر اٹھاؤں گا اور اللہ تعالیٰ فرمائے گا: جایئے اور جہنم سے ہر اس شخص کو نکال لیجئے جس کے دل میں رائی کے دانہ کے برابر ایمان ہو۔

پھر میں تیسری مرتبہ سجدہ کروں گا، پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا: اپنا سر اقدس اٹھایئے اور شفاعت کیجئے، شفاعت کی جائے گی، مانگیئے! دیئے جاؤ گے۔ پھر میں سر اٹھاؤں گا اور عرض کروں گا: اے میرے رب! ہر اس شخص کے حق میں میری شفاعت قبول فرما، جس نے ساری عمر میں ایک مرتبہ ''لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ'' پڑھا ہو تو اللہ عزوجل فرمائے گا: مجھے اپنی عزت وجلال کی قسم! میرا حکم ہے جایئے اور جہنم سے ہر اس شخص کو نکال لیجئے کہ جس نے عمر بھر میں ایک مرتبہ کلمہ ''لا الہ الا اللہ'' پڑھا ہو (حدیث آخر تک)۔

اور اس کا ثبوت اس آیت سے ملتا ہے:

وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَى (ضحی ۵)

اور بے شک قریب ہے کہ تمہارا رب تمہیں اتنا دے گا کہ تم راضی ہو جاؤ گے۔

یہ نص قطعی ہے، کسی کو انکار کی گنجائش نہیں اور جو انکار کرے گا، کافر ہو جائے گا، پھر کافر مسلمان کی طرف سے فدیہ ہو کر جہنم میں جائیں گے۔

دلیل یہ ہے:
وَلَيَحْمِلُنَّ أَثْقَالَهُمْ وَأَثْقَالًا مَعَ أَثْقَالِهِمْ (العنکبوت ۱۳)
اور بیشک ضرور اپنے بوجھ اُٹھائیں گے اور اپنے بوجھوں کے ساتھ اور بوجھ۔
اور معتزلہ نے اس کا بھی انکار کیا، اس دلیل سے کہ:
وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ أُخْرٰى (الانعام ۱۶۴)
"کوئی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا"۔

ہم نے کہا: کیوں نہیں؟ ان پر مسلمان کے گناہ لادے جائیں گے، اس وجہ سے کہ کافر مسلمان سے بغض رکھتا ہے، گالیاں دیتا ہے، غیبت کرتا ہے اور جنگ کرتا ہے، اس لئے وہ مستحق ہے کہ صدقہ کا بکرا بنایا جائے۔

گیارہواں قول: اس کا بیان کہ کیا موت کے بعد بعینہ یہی اجسام اٹھائے جائیں گے؟

معتزلہ نے کہا کہ اجساد فنا و معدوم ہوجاتے ہیں، پھر اللہ تعالیٰ قیامت کو دوسرا جسم پیدا فرما کر اس میں روح ڈالے گا اور اسے عذاب وثواب دے گا اور یہ عقیدہ کفریہ ہے۔

اہل سنت وجماعت کہتے ہیں: بعینہ یعنی جسم اٹھایا جائے گا، دلیل یہ ہے کہ:
كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ (المدثر ۳۸)
ہر جان اپنی کرنی میں گروی ہے۔

نیز فرمایا:
جزاء بما کانوا یعملون۔

اور اس لئے کہ عمل اس جسم سے ہوتا ہے، اگر اللہ تعالیٰ دوسرا جسم پیدا کرکے اس میں روح ڈال کر عذاب دے تو یہ عدل کے خلاف ہے۔

اللہ تعالیٰ جل وعلا فرماتا ہے:
وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ أُخْرٰى (الانعام ۱۶۴)
"کوئی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا"۔
تو یہی واجب ہے کہ اسی جسم کو اٹھا کر اس کے اچھے برے کاموں کا بدلہ دیا جائے۔

اجساد کے بعینہ زندہ کرنے پر اشکال

دریافت طلب امر یہ ہے کہ اگر اسی جسم کو بعینہ اٹھایا جائے گا اور اسی جسم کو سزا دی جائے گی تو یہ شخص مرنے کے بعد گل سڑ گیا، مٹی ہو گیا، معدوم ہو گیا تو بعینہ اس کا اٹھانا متصور نہیں ہو سکتا بلکہ عدم سے دوبارہ وجود میں لایا جائے گا تو از سر نو تخلیق ہو گی، تو ثابت ہوا کہ دوسرا جسم پیدا کیا جائے گا، بعینہ ہو بہو یہی جسم تو نہ ہوا۔

رفع اشکال کی تقریر

اس اشکال کو اٹھانے کے لئے ہم نے کہا کہ جائز ہے کہ اللہ تعالیٰ اسی جسم کو بعینہ عدم سے وجود میں لائے اور اللہ تعالیٰ اسی جسم کو بعینہ اٹھائے، اس طرح کہ اس مٹی کو گوشت اور ہڈی بنادے، جیسی پہلی تھی۔ یہ تشخیص بالکل وہی تشخص ہو اور یہ جوہر بعینہ وہی جوہر ہو گا لیکن اس صفت کو بدل کر دوسری صفت عطا فرمائے گا اور صفت کی تبدیلی سے دوسرے شخص کا پیدا کرنا لازم نہیں آتا، بلکہ وہی شخص ہے پہلی صفت سے بدلا ہوا۔ یہودیوں نے کہا کہ روح مع الجسد بعینہ اٹھائی جائے گی، لیکن وہ نہ کھائے گی، نہ پیئے گی اور نہ کسی چیز سے انتفاع حاصل کرے گی، یہ مسئلہ اپنی جگہ بیان کیا جائے گا، بتوفیق اللہ تعالیٰ۔

بارہواں قول: سوالِ منکر و نکیر اور عذابِ قبر کا بیان

جہمیہ، معتزلہ اور نجاریہ ان تینوں فرقوں نے عذابِ قبر اور منکر و نکیر کے سوال کا انکار کیا ہے۔ انہوں نے کہا: اس کی چند صورتیں ہیں:

(۱) جسم کو عذاب ہو گا بغیر روح کے۔

(۲) یا یہ کہ روح جسم میں ڈالی جائے گی اور عذاب ہو گا۔

(۳) یا صرف روح کو عذاب ہو گا جسم کو نہ ہو گا۔

یہ تینوں باتیں جائز نہیں اس لئے کہ جسم کو بغیر روح کے تکلیف نہیں ہوتی اور اگر جسم میں روح داخل کی جائے تو دوبارہ موت کا محتاج ہو گا اور یہ جائز نہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ (آل عمران ۱۸۵)

ہر جان کو موت چکھنی ہے۔

دوسری صورت "روح بغیر جسم کے" یعنی روح کو بغیر جسم کے عذاب نہیں دیا جاتا۔

اہل سنت وجماعت فرماتے ہیں کہ عذابِ قبر حق ہے اور منکر ونکیر کا سوال بھی حق ہے اور ثابت ہے۔

اس کی دلیل:

حضوراقدس ﷺ کی وہ حدیث ہے جس میں آپ ﷺ نے عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے فرمایا: اے عائشہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہا) جب قبر دبائے گی اور منکر نکیر سوال کریں گے تو اس وقت تمہارا کیا حال ہو گا؟ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے عرض کیا: میں قبر کے عذاب اور منکر ونکیر کے سوال سے ڈرتی ہوں۔ حضور شفیع یوم النشور ﷺ نے ارشاد فرمایا: اے حمیرہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہا)!(ام المؤمنین کا لقب ہے) مؤمن کے حق میں قبر کا دبانا ایسا ہے جیسے ماں اپنے بچے کا ہاتھ پاؤں دباتی ہے اور سوالِ منکر و نکیر مؤمن کے لئے ایسے ہے جیسے آشوب چشم یعنی دکھتی ہوئی آنکھوں میں سرمہ لگایا تو اس کو تکلیف ہو۔ حضوراقدس ﷺ سے مروی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: اے عمر (رضی اللہ تعالیٰ عنہ)! اس وقت تمہارا کیا حال ہو گا جب تمہارے پاس قبر میں منکر ونکیر آئیں گے؟ عرض کی: یا رسول اللہ ﷺ! میں حال پر ہوں اور عقل میرے ساتھ ہو گی؟ فرمایا: ہاں، تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: اب مجھے پرواہ نہیں اور اس کے علاوہ یہ امر معقول ومشروع ہے کہ سونے والے کی روح اس کے جسم نکل جاتی ہے۔

قرآن کریم میں ارشاد ہے:

اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِہَا (الزمر ۴۲)

اللہ جانوں کو وفات دیتا ہے ان کی موت کے وقت۔

پھر خواب میں رنج والم اور راحت وآرام پاتا ہے، جانتا ہے، کلام کرتا ہے، روتا ہے، ہنستا ہے، سنتا ہے، اس لئے کہ اس کی روح کا جسم کے ساتھ تعلق رہتا ہے اور جب روح شخص کے ساتھ متصل ہے تو اس اتصال وتعلق کی وجہ سے درد محسوس ہو گا، خواہ ہڈی ہو، گوشت ہو، یا مٹی ہو، وہ رنج والم کا احساس کرتی ہے۔

(۱) اس پر دلیل یہ ہے کہ حضور ﷺ سے پوچھا گیا: یا رسول اللہ ﷺ! قبروں میں گوشت کو کیسے تکلیف ہو گی۔ حالانکہ اس میں روح نہیں ہو گی؟ فرمایا: جیسے تیرا دانت درد کرتا ہے اور اس میں روح نہیں اور دانت درد اس لئے کرتا ہے کہ دانت گوشت کے ساتھ متصل ہوتا ہے اور گوشت متصل ہے دانت کے ساتھ تو درد وتکلیف محسوس کرتا ہے۔

(۲) اور نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ قبرستان میں تشریف لے گئے، دو نئی قبروں کے پاس سے آپ ﷺ کا گزر ہوا، فرمایا: ان دونوں میں ہلکا عذاب ہے تو آپ ﷺ نے کھجور کی ایک ہری بھری ٹہنی لے کر اس کے دو ٹکڑے

کیے اور دونوں قبروں پر اس شاخ کے ٹکڑوں کو گاڑ دیا اور فرمایا کہ جب تک یہ خشک نہیں ہو گی، قبروں والوں کا عذاب ہلکا ہو جائے گا۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

سَنُعَذِّبُهُم مَّرَّتَيۡنِ ثُمَّ يُرَدُّونَ (التوبة ١٠١)

جلد ہم انہیں دوبارہ عذاب کریں گے پھر پھیرے جائیں گے۔

پھر وہ بڑے عذاب کو دیکھیں گے یعنی جہنم کو دیکھیں گے اور دو مرتبہ کے عذاب سے مراد، عذاب دنیا اور عذاب قبر ہے۔

عذاب قبر پر دلائل منقول از حماد ابن ابی حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما

اور حماد ابن ابی حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ انہوں نے اپنے والد (امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ) سے اس بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا: عذاب قبر حق، عذاب قبر حق۔ حماد پھر پوچھتے ہیں: والد گرامی! اس پر کوئی دلیل؟ ارشاد ہوتا ہے: اس پر دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے کہ:

وَإِنَّ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا عَذَابًا دُونَ ذَٰلِكَ (الطور ٤٧)

اور بے شک ظالموں کے لیے اس سے پہلے ایک عذاب ہے۔

یعنی جہنم کے علاوہ اور دُونَ جهنم۔ اس سے مراد عذاب قبر ہے۔

عذاب قبر کے تین حصے ہیں

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: عذاب قبر کے تین اجزاء ہیں:

(١) ١/٣ (ایک تہائی) غیبت کرنے والے کو غیبت سے۔

(٢) ١/٣ (ایک تہائی) چغل خور کو چغلی کھانے سے۔

(٣) ١/٣ (ایک تہائی) پیشاب کی وجہ سے ہو گا۔

مؤمنوں اور کافروں کے عذابِ قبر میں فرق

مؤمنوں کے لئے قبر کا عذاب جائزات سے ہے اور کافروں کے لئے عذابِ قبر واجبات سے ہے یعنی لازمی طور پر ہو گا۔

کافروں کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

النَّارُ يُعۡرَضُونَ عَلَيۡهَا غُدُوًّا وَعَشِيًّا (الغافر ٤٦)

آگ جس پر صبح وشام پیش کیے جاتے ہیں۔

یہ آیت عذاب قبر کے ثبوت پر واضح دلیل ہے، بہر حال عذاب قبر حق ہے کسی جگہ ہو، کسی حال میں ہو، جو اس کا انکار کرے وہ کافر ہے۔ واللہ اعلم۔

تیرہواں قول: جنت اور دوزخ کی تخلیق کا بیان: جنت و دوزخ ابھی پیدا نہیں ہوئے؟

معتزلہ اور جہمیہ کہتے ہیں کہ جنت اور دوزخ ابھی تک پیدا نہیں ہوئے، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن پیدا کرے گا، اس لئے کہ حکمت کا تقاضا نہیں ہے کہ ثواب وعتاب کو ان کے مستحقین سے پہلے ہی پیدا کر دیا جائے۔ علاوہ ازیں یہ وجہ بھی ہے کہ اگر یہ دونوں مخلوق ہیں تو زمین وآسمان کے ساتھ ان کا فنا ہونا بھی ضروری ہوگا۔

مسئلہ تخلیقِ جنت ودوزخ اور اہل سنت

اہل سنت وجماعت فرماتے ہیں: جنت اور دوزخ دونوں مخلوق (پیدا شدہ) ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ إِلَّا مَنْ شَاءَ اللَّهُ (الزمر ٦٨)

تو بے ہوش ہو جائیں گے جتنے آسمانوں میں ہیں اور جتنے زمین میں مگر جسے اللہ چاہے۔

اور استثناء سے مراد اہل جنت اور اہل نار ہیں۔ ثواب وعتاب کو ان کے اہل سے پہلے پیدا کرنے میں یہ حکمت بھی ملحوظ ہے کہ اس طرح بندہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر زیادہ حریص ہوگا اور معصیت ونافرمانی سے زیادہ اجتناب وگریز کرے گا۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِينَ (آل عمران ۱۳۳)

"اور ایسی جنت کی طرف جس کی چوڑان میں سب آسمان وزمین آجائیں پرہیزگاروں کے لیے تیار رکھی ہے۔"

اور دوزخ کے بارے میں فرمایا:

أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ (البقرة ۲۴)

تیار رکھی ہے کافروں کے لیے۔

اور اگر وہ دونوں مخلوق نہ ہوں تو اللہ تعالیٰ کی خبروں میں جھوٹ لازم آئے گا۔

جنت پیدا ہو چکی ہے کی تیسری دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:

خلق الجنة فوق السموت۔

اللہ تعالیٰ نے آسمانوں کے اوپر جنت کو پیدا فرمایا۔

اس کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى (١٤) عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَأْوٰى (النجم ١٥)

سدرۃُ المُنتہیٰ کے پاس اس کے پاس جنت الماویٰ ہے۔

تو آسمان وزمین کے فنا ہونے سے جنت کا فنا ہونا لازم نہیں آتا۔

اشکال: اگر کہا جائے کہ "جَنَّۃُ" سے مراد "جُنَّہ" ہے "ھا" کے ساتھ ہے اور یہ جبریل علیہ السلام سے کنایہ ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ لفظ "جُنَّۃُ" ہے "جَنَّ یجنُّ" کے باب سے اس کے معنیٰ "سترۃ" یعنی پردہ، آڑ مراد ہے۔

جواب: جواباً اس سلسلے میں گزارش یہ ہے کہ یہ لفظ ساتوں قرأتوں میں موجود نہیں، کسی قرأت میں اس کی تلاوت نہیں ہوتی، لہذا اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے، بلکہ لطف کی بات تو یہ ہے کہ اس کے خلاف دلیل میں ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی حدیث موجود ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں: جس نے "جُنَّہ" "ھا" کے ساتھ پڑھا، اللہ تعالیٰ اسے مجنون (دیوانہ) کر دے گا، لہذا یہ جائز نہیں۔ پس جو کچھ ہم نے کہا وہ صحیح ثابت ہوا۔

جہنم کہاں ہے؟

جہنم پیدا ہو چکی ہے اور وہ زمین کے نیچے ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ **إِنَّ كِتَابَ الْفُجَّارِ لَفِي سِجِّينٍ (المطففین ۷)** کافروں کی لکھت سب سے نیچی جگہ سجین میں ہے۔" اور یہ نص ہے اس باب میں، جو انکار کرے وہ کافر ہو جائے گا۔

چودھواں قول: جنت ودوزخ باقی رہیں گے یا نہیں؟

معتزلہ اور جہمیہ کہتے ہیں: عذاب چکھانے اور ثواب پہنچانے کے بعد جنت ودوزخ فنا ہو جائیں گے، ہمیشہ باقی نہیں رہیں گے۔

جنت اور دوزخ کے فنا ہونے پر دلیل

اس پر دلیل اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ وہی (اللہ تعالیٰ) اول اور وہی آخر ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ مخلوقات سے اول ہے اور ایسے ہی آخر ہے کہ اس کے بعد کوئی مخلوق نہیں آئے گی تو ضروری ہوا کہ اللہ تعالیٰ بغیر مخلوق باقی رہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

وَأَمَّا الَّذِينَ سُعِدُوا فَفِي الْجَنَّةِ خَالِدِينَ فِيهَا مَا دَامَتِ السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ إِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ (ھود ١٠٨)

اور وہ جو خوش نصیب ہوئے وہ جنّت میں ہیں ہمیشہ اس میں رہیں گے جب تک آسمان وزمین رہیں مگر جتنا تمہارے رب نے چاہا۔

اور جہنمیوں کے بارے میں فرمایا:

مَادَامَتِ السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ إِلَّا مَاشَاءَرَبُّکَ(ھود۱۰۸)

اس استثناء کا فائدہ یہی ہے کہ جنت ودوزخ دونوں ہمیشہ باقی نہیں رہیں گے۔

حضور ﷺ نے فرمایا کہ جہنم پر ایک دن آئے گا کہ ہوا اس کے دروازے بجائے گی کہ اس میں کوئی نہ ہوگا۔

جنت ودوزخ ہمیشہ باقی رہیں گے

اہل سنت وجماعت کے دلائل: اہل سنت وجماعت فرماتے ہیں کہ "جنت ودوزخ ہمیشہ باقی رہیں گے، ان کو فنا نہیں" اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ إِنَّ اللهَ اشْتَرَى مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ(التوبة ۱۱۱) بے شک اللہ نے مسلمانوں سے ان کے مال اور جان خرید لیے ہیں اس بدلے پر کہ ان کے لیے جنت ہے۔" جو چیز خریدی گئی ہے وہ دائمی طور پر باقی رہتی ہے یعنی خریدار نے جو سودا خریدا ہے، وہ اس کے پاس رہے گا، تو ثابت ہوا کہ اس کا بدل بھی علی سبیل الدوام (یعنی ہمیشہ کے لئے) ہوگا۔

نبی اکرم ﷺ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ ایک رات مسجد میں تشریف لے جانے کے ارادے سے نکلے تا کہ معلوم کر سکیں کہ آپ ﷺ کے غلاموں میں سے کون ہے جو اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول ہے۔ جب آپ ﷺ مسجد کے دروازے کے قریب پہنچے تو آپ ﷺ کو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی آواز سنائی دی، وہ قرآن پاک کی تلاوت میں مصروف تھے۔ جب وہ اس آیت کریمہ پر پہنچے: إِنَّ اللهَ اشْتَرَى مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ(التوبة ۱۱۱) تو وہ بڑے شدید انداز میں رونے لگے اور اس بات سے بے خبر تھے کہ حضور نبی اکرم ﷺ مسجد کے دروازے پر تشریف فرما ہیں۔ جب صبح ہوئی اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور اکرم ﷺ کی اقتداء میں نماز صبح ادا فرمائی تو نبی اکرم ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی طرف متوجہ ہوئے اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا تم إِنَّ اللهَ اشْتَرَى مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ(التوبة ۱۱۱) والی آیت پڑھ کر کیوں رو رہے تھے؟ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کی: یارسول اللہ ﷺ! میں کیسے نہ روتا؟ اللہ تعالیٰ نے بندے کی جان خرید لی، اب اگر بندہ عیب دار نکلا تو مشتری اس خریداری کو رد کر دے گا، لہٰذا مجھے خوف ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے میرے عیب کے سبب کہیں رد نہ فرما دے پس میں جہنم والوں میں سے ہو جاؤں، حضرت جبرائیل علیہ السلام نے بارگاہ رسالت مآب ﷺ میں حاضر ہو کر

عرض کی کہ اے محبوب ﷺ! آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کی طرف سے صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو فرمادیجئے کہ جب خریدار بندے کے عیب سے واقف ہو اور اس کے باوجود خرید لے تو اس کو ادا کرنے کا حق نہیں رہتا اور میں اپنے بندے کے عیب اس کے پیدا کرنے سے پہلے ہی جانتا تھا، لہذا میں اس کو رد نہیں کروں گا، اسی طرح اگر عیب خریداری کے بعد پیدا ہوا تو نئے عیب کی وجہ سے خریدار کو ردّ کرنے کا حق نہیں ہو گا۔

اسی طرح اگر کسی نے دس اونٹ خریدے اور ان میں سے نو عیب دار ہیں اور ایک صحیح سلامت ہے تو اب اگر اس نے عیب دار اونٹوں کو لوٹانے کا ارادہ کیا تا کہ بدلے میں صحیح اونٹ لے سکے تو شریعت اسے اس کام سے منع کرتی ہے اور تمام کو قبول کرنے کا حکم دیتی ہے یا پھر تمام کو لوٹانے کا حکم دیتی ہے، نہ کہ صرف عیب داروں کو اور میں نے تمام مؤمنوں کو خرید لیا ہے، پس ہماری اس خریداری میں انبیاء کرام علیہم السلام، اولیاء رحمہم اللہ تعالیٰ، نافرمان، فرمانبردار سب شامل ہیں اور ان میں کوئی عیب نہیں ہے، کیوں کہ میں نے تمام کو ایک خریداری سے خریدا ہے۔

اس پر دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے:

أُولَئِکَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ (الاعراف ۴۲)

وہ جنت والے ہیں انہیں اس میں ہمیشہ رہنا۔

اور جہنم کے بارے میں فرمایا:

أُولَئِکَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ (البقرة ۳۹)

وہ دوزخ والے ہیں ان کو ہمیشہ اس میں رہنا۔

"إِلَّا مَا شَاءَ رَبُّکَ (هود ۱۰۷)" کی تشریح فراء سے مروی ہے، انہوں نے کہا کہ اس کے معنی ہیں: وقد شَاءَ رَبُّکَ۔

عرب اسی قسم کا محاورہ بولتے ہیں کہ مثلاً وہ کہتے ہیں:

فعلت کذا و کذا الا ماشئت۔

میں نے ایسا کیا یعنی قد شئت۔ کے معنی میں ہے۔

اور دوسری دلیل یہ ہے کہ حضرت ضحاک رحمہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابو سعید خدری اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ:

فَأَمَّا الَّذِينَ شَقُوا فَفِي النَّارِ لَهُمْ فِيهَا زَفِيرٌ وَشَهِيقٌ (۱۰۶) خَالِدِينَ فِيهَا مَا دَامَتِ السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ إِلَّا مَا شَاءَ رَبُّکَ (هود ۱۰۷)

”تو وہ جو بد بخت ہیں وہ تو دوزخ میں ہیں وہ اس میں گدھے کی طرح رینکیں (چیخیں چلائیں) گے وہ اس میں رہیں گے جب تک آسمان وزمین رہیں مگر جتنا تمہارے رب نے چاہا۔“

یعنی وہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے مگر إِلَّا مَا شَاءَ رَبُّکَ (ھود ۱۰۷) اوراس سے مراد اہل کبائر ہیں کہ وہ ہمیشہ نہیں رہیں گے یعنی آخر جنت کی طرف نکالے جائیں گے۔

وَأَمَّا الَّذِينَ سُعِدُوا فَفِي الْجَنَّةِ خَالِدِينَ فِيهَا مَا دَامَتِ السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ إِلَّا مَا شَاءَ رَبُّکَ (ھود ۱۰۸)

اور وہ جو خوش نصیب ہوئے وہ جنّت میں ہیں ہمیشہ اس میں رہیں گے جب تک آسمان و زمین رہیں مگر جتنا تمہارے رب نے چاہا۔

یعنی اہل کبائر کہ وہ پہلے مرحلہ میں جنت میں نہیں جائیں گے، سزا بھگت کر بعد میں جنت میں داخل ہوں گے۔

دوسری توجیہ یہ ہے کہ مَا شَاءَ رَبُّکَ (ھود ۱۰۸) کے معنی ہیں مَا شَاءَ من المدة۔ جتنی مدت وہ چاہے اور یہ کہ اس سے مراد دنیا کی مدت، قبر کی مدت اور قیامت کی دن کی مدت مراد ہے۔

یعنی جنتی جنت میں اور دوزخی دوزخ میں نہیں ہوں گے جب تک وہ دنیا میں ہیں۔

”ھو الاول ھو الآخر“ کا مفہوم، اس قول کے متعلق ہم کہتے ہیں کہ آیت میں ”آخر“ ہے مگر یہ نہیں ہے کہ اس کا غیر نہیں، یعنی اس کے سوا کچھ نہیں۔ پھر ایک شئے کا ذکر دوسری چیز کی نفی کرنا۔

علاوہ ازیں ہم کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ ایک ہے، اثباتِ وجود کے ساتھ اوّل ہے اور آخر ہے بالبقاء یعنی باقی رہے گا۔ جنت و دوزخ اوراس کے اہل یہ اللہ تعالیٰ کے باقی رکھنے سے آخر ہیں، لہٰذا دونوں (اللہ اور بندوں) کے درمیان فرق ہو گیا۔

ایک حدیث شریف کی تشریح

حضور ﷺ کی اس حدیث:

”سیاتی علی جھنم یوم تصفق الریح ابو ابھا لیس فیھا احد“۔

”ای لیس فیھا احد من المؤمنین“ کا مفہوم یہ ہے کہ جہنم میں کوئی مؤمن باقی نہیں رہے گا اور ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ کوئی مؤمن جہنم میں نہیں رہے گا، جہنم مؤمنوں کے رہنے کی جگہ نہیں، اہل کبائر سزا بھگت کر آخر جنت میں جائیں گے اور وہ ہمیشہ جہنم میں نہیں رہیں گے۔

جنت ودوزخ کے بارے میں بعض لوگوں کے جداگانہ نظریہ کی تردید

بعض لوگوں کا نظریہ یہ ہے کہ جنت فنا نہیں ہوگی اور جہنم فنا ہو جائے گا اور جہنمی بھی فنا ہو جائیں گے، اس لئے کہ عقل و حکمت کا یہ تقاضا نہیں کہ انہیں ایک محدود وقت تک کفر میں مبتلا رہنے کی وجہ سے ہمیشہ کے لئے عذاب میں رکھا جائے۔

لیکن یہ درست نہیں ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا (البینة ٦)

اس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

اور فرمایا کہ:

كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُودُهُمْ بَدَّلْنَاهُمْ جُلُودًا غَيْرَهَا لِيَذُوقُوا الْعَذَابَ۔ (النساء ٥٦)

جب کبھی ان کی کھالیں پک جائیں گی ہم ان کے سوا اور کھالیں انہیں بدل دیں گے کہ عذاب کا مزہ لیں۔

یعنی "کلما" کا لفظ چاہتا ہے کہ یہ ان کی کھالوں کا بار بار بدلنا ابدی ہو اور ہمیشہ کے لئے ہو۔

دوسری بات یہ ہے کہ کافر کا کفر ابدی ہے کہ اگر وہ ہمیشہ زندہ رہتا تو کفر پر قائم رہتا کہ اس کا ہمیشہ کے لئے اعتقاد ہی کفر تھا، اس لئے عقوبت وسزا بھی ہمیشہ ہوگی۔ اسی لئے اہل جنت ہمیشہ جنت میں ہوں گے کہ اگر وہ ہمیشہ زندہ رہتے تو ان اعتقاد ایمان پر ہوتا تو وہ اپنے اعتقاد کے مطابق ہمیشہ جنت میں رہیں گے۔

جہنمیوں کے بارے میں بعض مرجیہ کا نظریہ

بعض مرجیہ کہتے ہیں کہ جہنم فنا نہیں ہوگی۔ اللہ تعالیٰ سب جہنمیوں کو جہنم میں داخل فرمائے گا، لیکن عذاب نہیں دے گا اور وہ جہنم میں بغیر عذاب کے رہیں گے۔ انہوں نے کہا کہ کیا آپ دیکھتے نہیں کہ دنیا میں اللہ تعالیٰ کافروں کو نعمتیں دیتا ہے، عذاب نہیں دیتا؟ یونہی آخرت میں ہوگا اور اہل سنت وجماعت کے نزدیک ان کو شدید عذاب ہوگا۔ قرآن پاک میں فرمایا: فَذَاقَتْ وَبَالَ أَمْرِهَا وَكَانَ عَاقِبَةُ أَمْرِهَا خُسْرًا (٩) أَعَدَّ اللهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا (الطلاق ١٠) تو انہوں نے اپنے کیے کا وبال چکھا اور ان کے کام کا انجام گھاٹا ہوا اللہ نے ان کے لیے سخت عذاب تیار کر رکھا ہے۔" اور فرمایا: لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ (آل عمران ٤) ان کے لیے سخت عذاب ہے۔" علاوہ ازیں اور بھی آیتیں ہیں جو اس مسئلہ میں بطور دلیل پیش کی جاسکتی ہیں۔

معتزلہ اور جہمیہ کا نظریہ (عقیدہ)

معتزلہ اور جہمیہ کہتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ پہلی بار صور پھونکنے کا حکم دے گا تو (پہلے نفخ سے) تمام اشیاء معدوم ہو جائیں گی، سوائے چند ان چیزوں کے جو یہ ہیں: عرش، کرسی، لوح و قلم اور ارواح وغیرہ۔

ان حضرات کے نزدیک جنت و دوزخ ابھی پیدا ہی نہیں ہوئے، ان کو قیامت کے روز اللہ تعالیٰ پیدا فرمائے گا اور یہ مذہب صحیح نہیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

فَصَعِقَ مَنۡ فِي السَّمَاوَاتِ وَمَنۡ فِي الۡأَرۡضِ (الزمر ٦٨)

تو بے ہوش ہو جائیں گے جتنے آسمانوں میں ہیں اور جتنے زمین میں۔

پھر بعض چیزیں صحیح رہیں گی، جنہیں اللہ تعالیٰ باقی رکھنا چاہے گا، مثل جنت، دوزخ اور جو کچھ ان میں ہے اور عرش و کرسی، لوح و قلم اور روح، یہ سب باقی اللہ تعالیٰ کے اذن سے رہیں گے۔

عرش سے کیا مراد ہے؟

معتزلہ کہتے ہیں کہ عرش سے مراد مُلک ہے اور کرسی سے مراد قلم ہے اور یہ صحیح نہیں، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَيَحۡمِلُ عَرۡشَ رَبِّكَ فَوۡقَهُمۡ يَوۡمَئِذٍ ثَمَانِيَةٌ (الحاقة ١٧)

اور اس دن تمہارے رب کا عرش اپنے اوپر آٹھ فرشتے اٹھائیں گے۔

اور ظاہر سی بات ہے کہ مُلک کو اٹھایا نہیں جاتا ہے تو ان کا کلام درست نہیں اور پھر یہ کہنا جائز نہیں کہ اللہ تعالیٰ تھا اور کوئی شئے نہ تھی، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ بھی شئے ہے۔

اور صحیح یہ ہے کہ یوں کہے کہ اللہ تعالیٰ تھا اور اس کے ساتھ کوئی شئے نہ تھی اور یہ کہنا بھی جائز نہیں کہ اللہ تعالیٰ ہو گا اور کوئی شئے نہ ہو گی، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ باقی ہے اور وہ شئے ہے، پھر (اسی طرح) جنت و دوزخ، عرش و کرسی، لوح و قلم اور روحیں باقی رہیں گے، اللہ تعالیٰ کے باقی رکھنے سے اور یہ سب بلا اختلاف شئے ہیں۔ **واللہ تعالیٰ اعلم۔**

پندرہواں قول: جنت کی نعمتوں سے نفع اٹھانے کا بیان

اہل سنت وجماعت فرماتے ہیں کہ جائز ہے کہ اللہ تعالیٰ مؤمنوں کو جنت کی بے حساب اور بے شمار نعمتیں عطا فرمائے اور ایک مؤمن کو پوری دنیا کے برابر عطا ہو بلکہ سات گنا زیادہ عطا ہو اور معتزلہ نے اس کا انکار کیا اور کہا کہ ایک مؤمن کیسے دیکھے گا

اور نفع اٹھائے گا اور کہاں بیٹھے گا؟ جب کہ اس کو دنیا کے برابر باغات اور نعمتیں اور خادم وغیرہ ملیں گے اور جب اس کو اس قدر چیزوں کی حاجت نہ ہو گی تو ان میں تصرف کیسے کرے گا اور نفع کیسے اٹھائے گا؟ تو اس میں نعمتوں کا ضائع کرنا ہے اور نعمتوں کا ضیاع نادانی اور بیوقوفی ہے اور اللہ تعالیٰ سبحانہٗ ہر عیب سے پاک ومنزہ ہے۔

معتزلہ کے مذہب کی تردید

ہم کہتے ہیں: جنت کی نعمتوں کو بے کار اور ضائع ہونے کے وصف سے موصوف نہیں کیا جاسکتا، اس لئے کہ جنت کی نعمتیں نہ گلیں گی نہ سڑیں گی اور نہ فنا ہوں گی اور اس لئے کہ وہ نعمتیں اس وقت بھی اپنی حالت میں موجود ہیں، اس پر دلائل پوری تفصیل کے ساتھ بیان ہو چکے ہیں اور وہ ضائع ہونے والی نہیں ہیں۔

پھر یہ ضروری ہوا کہ جنت کی نعمتیں اور اَملاک دنیا کی نعمتوں اور یہاں کی املاک سے زیادہ ہوں اور پھر جب دنیا کی نعمتوں میں جائز ہے کہ مشرق سے مغرب تک ہو، جیسے حضرت سلیمان علیہ السلام اور ذوالقرنین علیہ السلام اور بخت نصر اور نمرود کہ باوجود اس وسعت اور فراوانی کے ان کو حاجت نہ تھی اور سب چیزوں سے انتفاع حاصل کرتے تھے اور ایسے ہی جائز ہے کہ جنت میں شمار سے بھی زیادہ نعمتیں ہوں اور اللہ تعالیٰ کے مقدر کر دینے سے ان نعمتوں سے نفع اٹھانا بھی ممکن ہے اور اس لئے کہ سلیمان علیہ السلام اگر اپنا ملک دوسرے کو دے دیں تو کیا وہ جزاء کے مستحق نہیں ہیں؟ اور جب جزاء میں شک نہیں تو جائز ہے کہ اس کی جزاء دس گنا ہو، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ أَمْثَالِهَا (الانعام ۱۶۰) جو ایک نیکی لائے تو اس کے لیے اس جیسی دس ہیں۔

تو پھر جزائے دنیا سے دس گنا ہو گی، جب ایک کے لئے جائز ہے تو دوسرے تیسرے کے لئے بھی جائز ہو گی اور یہ کسی کے لئے جائز نہیں کہ وہ کہے کہ بادشاہ کے لئے مفت کسی دوسرے کو ملک وحکومت دے دینا جائز نہیں، لہذا جزاء بھی واجب نہیں۔

اس لئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: فَامْنُنْ أَوْ أَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ (ص ۳۹) اب تو چاہے تو احسان کر یا روک رکھ تجھ پر کچھ حساب نہیں۔" جب جنت اس پر واجب ہے تو جزا بھی واجب ہے۔

اگر کہا جائے کہ تمام دنیا حضرت سلیمان علیہ السلام کی ملک نہ تھی اور ہاں بادشاہی تھی اور بذل ملک جزا کو واجب نہیں کرتا۔ میں کہتا ہوں: جیسے تمام دنیا سلیمان علیہ السلام کی ملک تھی تو جائز ہے کہ ان کے سوا کسی اور کی بھی ملک ہو جیسے ہمارے نبی مکرم ﷺ کے لئے مال غنیمت حلال تھا تو اگر تمام دنیا یا بعض دنیا غنیمت کے سبب اپنے نفس اور ذات کے لئے ملکیت ہو سکتی ہے تو کیا پھر یہ بات جائز نہیں؟ تو جو ہم نے کہا وہ صحیح ہے اور ثابت ہے۔

ایک اور دلیل

اور نبی کریم ﷺ سے مروی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ:

لقاب قوسین احدکم فی الجنة خیر مماطلعت علیه الشمس و مماغربت۔

قاب قوسین کے برابر جنت میں جگہ دنیا سے بہتر ہے، توثابت ہوا کہ جنت اوراس کی نعمتیں دنیا سے زیادہ ہوں، یہاں تک کہ وہ دنیا سے بہتر ہو تو ہمارا کہنا صحیح ثابت ہوا۔

جنت اوراس کی نعمتوں سے فائدہ اٹھانے کی اباحت پر دلیل

جنت کھانا، پینا اور نفع حاصل کرنا مباح ہے۔

دلیل یہ ہے کہ قرآن پاک میں فرمایا:

أُكُلُهَا دَائِمٌ (الرعد ۳۵)

اس کے میوے ہمیشہ۔

اور فرمایا:

وَسَقَاهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُورًا (الانسان ۲۱)

اور انہیں ان کے رب نے ستھری شراب پلائی۔

اور فرمایا:

وَفِيهَا مَا تَشْتَهِيهِ الْأَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْأَعْيُنُ (الزخرف ۷۱)

اور اس میں جو جی چاہے اور جس سے آنکھ کو لذّت پہنچے۔

اور یہود و نصاریٰ اس کے منکر تھے، انہوں نے کہا کہ کھانا، پینا وغیرہ حاجت کے لئے ہوتا ہے اور اہل جنت، جنت کی نعمتوں کے محتاج نہیں۔

ہم کہتے ہیں کہ دنیا میں تو کھانا پینا وغیرہ کبھی حاجت کے لئے ہوتا ہے اور کبھی لذت حاصل کرنے اور خواہش اور شوق کے پورا کرنے کے لئے ہوتا ہے، لیکن جنت میں کھانا پینا اور نفع اٹھانا حاجت سے نہیں ہو گا بلکہ جنت میں یہ سب کچھ تلذذ اور خواہش سے ہو گا۔

کیا جن بھی جنت میں جائیں گے ؟

یہ اجماعی مسئلہ ہے کہ مسلمان جن جنت میں داخل ہوں گے۔ اب رہا یہ مسئلہ کہ ان کو ثواب بھی ملے گا یا نہیں ؟ تو امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں : مؤمن جن جنت میں جائیں گے، ان کو ثواب نہیں ملے گا، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے جنوں کے قول کی خبر دیتے ہوئے فرمایا کہ :

يَاقَوْمَنَاأَجِيبُوادَاعِيَ اللَّهِ وَآمِنُوابِهِ يَغْفِرْ لَكُمْ مِنْ ذُنُوبِكُمْ وَيُجِرْكُمْ مِنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ (الاحقاف ۳۱)

اے ہماری قوم اللہ کے منادی کی بات مانو اور اس پر ایمان لاؤ کہ وہ تمہارے کچھ گناہ بخش دے اور تمہیں دردناک عذاب سے بچالے۔

مغفرت و نجات کا ذکر فرمایا ثواب کا ذکر نہیں فرمایا۔

اور قاضی ابو یوسف و امام محمد اور امام شافعی رحمہم اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جنات کو بھی ثواب ہو گا، جس طرح عقوبت ہو گی۔ صحیح ترین بات یہ ہے کہ ان کے لئے کھانا پینا نہیں ہو گا، لیکن تمتع حاصل کریں گے دیکھ کر، سن کر جیسے دنیا میں تھا۔ لیکن استمتاع تو بعض فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان کے لئے جنت میں اہل جنت کے ساتھ استمتاع نہیں ہے۔

بعض فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جنات کے لئے استمتاع بھی ہے، جیسے دنیا میں تھا، حسبِ طبیعت اور حسبِ عادت اور متقدمین سے اس بارے میں کوئی قول مروی نہیں۔

اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

لَمْ يَطْمِثْهُنَّ إِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَانٌّ (الرحمن ۷۴)

ان سے پہلے انہیں ہاتھ نہ لگایا کسی آدمی اور نہ جنّ نے۔

اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ جنات جنتی اہل طمث میں سے ہیں اور یہ خبر نہیں دی کہ ان کو طمث بھی ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ اگر ان میں اشتہاء ہے تو طمث بھی ہو گا اور یہ محال نہیں، جیسے انسان کے حق میں ہے اور اگر ان میں اشتہاء نہیں تو طمث بھی نہیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

وَفِيهَا مَا تَشْتَهِيهِ الْأَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْأَعْيُنُ (الزخرف ۷۱)

اور اس میں جو جی چاہے اور جس سے آنکھ کو لذّت پہنچے۔

اور جب ان میں طمث کے ساتھ تلذذ دنیا میں تھا تو جائز ہے کہ آخرت میں بھی ہو، جیسے انسان کے حق میں ہے۔

اصح یہ ہے کہ ان کے لئے جنت والوں سے طمث ہے اور اہل جنت کے ساتھ نہ ہوں گے۔ پھر ہم کہتے ہیں: ان کو اشتہاء نہ ہو گی مگر جائز چیزوں کی اور ممنوع و محظور چیزوں کی خواہش نہ ہو گی بر خلاف دنیا کے۔ اس لئے کہ دنیا میں کبھی خواہش حرام کی جاتی ہے اور کبھی حلال کی اشتہاء ہوتی ہے، لیکن جنت میں نہ خطرہ گزرے گا اور نہ خواہش ہو گی، مگر ان چیزوں کی خواہش ہو گی جو جائز ہیں اور ممنوعات کی خواہش نہ ہو گی، جیسے زنا، لواطت وغیرہ۔

اگر کہا جائے کہ شیطان جنت میں جاسکتا ہے یا نہیں؟

ہم کہیں گے کہ کافر جنت میں نہیں جائیں گے خواہ انس ہوں یا جنّ یا شیاطین، ہاں! جو مسلمان ہو گیا وہ جنت میں جائے گا۔

کیا شیطانوں میں سے کوئی مسلمان ہوا ہے یا نہیں؟

بعض نے کہا کہ شیاطین میں سے ایک شیطان اسلام لایا، یہ وہ شیطان تھا جو حضور ﷺ کے ساتھ پیدا ہوا جیسا کہ حضور ﷺ نے فرمایا: "ان شیطانی قد اسلم۔" بے شک میرا ہمزاد اسلام لے آیا۔

اگر یہ صحیح ہو کہ وہ اسلام لایا تو وہ بھی جنت میں ہو گا اور بعض نے کہا کہ شیطان میں سے کوئی مسلمان نہیں ہوا اور حضور ﷺ کی حدیث کا مطلب یہ ہے کہ میں اس کے وسوسہ سے سلامت رہتا ہوں، اس لئے کہ شیطان کسی نبی علیہ السلام پر قادر نہیں، خصوصاً حضور پر نور سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ پر۔

پھر فرشتوں کو جنت سے روکا نہیں جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کے حکم سے جنت میں جاسکتے ہیں، لیکن فرشتے جنت میں وہاں کی نعمتوں سے استراحت حاصل نہ کر سکیں گے، اس لئے کہ بغیر اشتہاء و تلذذ کے استراحت ناممکن ہے اور تلذذ و اشتہاء طبیعت و شہوت سے ہوتی ہے اور ملائکہ ان چیزوں سے پاک ہیں، ان کو طبیعت و شہوت سے پاک و منزہ پیدا کیا گیا ہے تو ان میں تلذذ و اشتہاء نہ ہو گی اور اسی وجہ سے ہم نے کہا کہ وہ طاعت و عبادت کرنے سے ثواب کے مستحق نہیں، یعنی جنت اور اس کی نعمتوں سے وہ راحت حاصل نہیں کرتے، مگر ہاں! ان کو جنت سے روکا نہیں جائے گا، جیسے اب بھی وہ جنت میں جاتے ہیں۔

پھر فرشتوں کی حالت و عبادت کا بہترین بدلا انہیں عطا کر دیا اور وہ نعیم اصلیہ ہیں، ان کی پیدائش میں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو مقدس اور معصوم پیدا فرمایا کہ وہ نہ بھولیں، نہ لہو و بیہودگی میں مبتلا ہوں، نہ عبث و فضول کام کریں، نہ کھائیں، نہ پئیں، نہ نکاح کریں، نہ ان میں خواہش ہے، نہ شہوت، اس لئے وہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول رہتے ہیں، اس نعمتِ عظمیٰ کا شکر ادا کرتے رہتے ہیں، اس کے سوا ان پر کوئی شئے واجب نہیں ہے جیسے انسانوں میں، مگر اللہ تعالیٰ نے بندوں سے وعدہ کیا ہے ثواب کا ان کے افعال کی مزیت کی وجہ سے، اس معنیٰ کے لحاظ سے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے خمیر میں بلاء، خواہشات

اور شہوت کو جمع کر دیا اور گوندھ دیا ہے جیسا کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: بلا و شہوت آدم علیہ السلام کے خمیر میں گوندھی گئی ہے۔ پھر شیطان ان کو وسوسہ ڈالتا ہے اور معاصی کی طرف بلاتا ہے اور ترغیب دیتا ہے اور ان سب چیزوں کے باوجود انسان اللہ تعالیٰ کی طاعت وبندگی میں لگے رہتے ہیں اور خواہشاتِ نفسانی اور شہوات ووساوسِ شیطان کے ساتھ مقابلہ ومحاربہ کرتے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ثواب کا وعدہ دیا ہے، پھر استحقاقِ ثواب ترک عادت کا سبب ہے کہ خلافِ عادت وجبلت خدا کی عبادت میں مشغول ہیں اور ثواب ترکِ عادت کے سبب سے ہے کہ بندے عادت وجبلت کے خلاف خدا کی عبادت کرتے ہیں اور فرشتے اپنی عادت کے خلاف عمل نہیں کرتے بلکہ وہ پیدا ہی عبادت کے لئے کیے گئے ہیں، اس لئے کہ کھانا، پینا، نفع گیری ان کی عادت نہیں کہ عادت کو وہ ترک کر کے خدا کی عبادت کرتے ہوں بلکہ وہ تو پیدا ہی عبادت کے لئے کیے گئے ہیں ،اس لئے وہ ثواب کے مستحق نہیں، بخلاف جن وانس کے کہ وہ اپنی عادت وخصلت کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہیں تو مستحق ثواب ہوئے۔

بعض معتزلہ نے کہا کہ انسان پر شیطان کا کوئی عمل دخل نہیں اور نہ یہ ممکن ہے کہ شیطان وسوسہ پیدا کرے بلکہ انسان کی ہوا وخواہشِ نفسانی ہی وسوسہ ہے اور اس طرح جنات میں معتزلہ کا خلاف ہے۔

اہل سنت وجماعت کے نزدیک، نفع، نقصان، خبر دینا، ایجاد کرنا، وسوسہ ڈالنا جن وشیطان سے جائز وممکن ہے۔ دلیل وہی ہے جو حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ: ”**ان الشیطان یجری من ابن آدم مجری الدم فی العروق**“ کہ شیطان انسان کے دل میں اس طرح سرایت کرتا ہے جیسے رگوں میں خون رواں دواں ہوتا ہے یعنی شیطان انسان میں وسوسہ پیدا کرتا رہتا ہے۔

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

إِنَّ الشَّيْطَانَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوهُ عَدُوًّا (فاطر ٦)

بے شک شیطان تمہارا دشمن ہے تو تم بھی اُسے دشمن سمجھو۔

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

الْخَنَّاسِ (٤) الَّذِي يُوَسْوِسُ فِي صُدُورِ النَّاسِ (الناس ٤-٥)

اور دبک رہے وہ جو لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتے ہیں۔

نیز اللہ تعالیٰ نے شیطان کی خبر دی کہ وہ جہنم میں کہے گا:

وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِنْ سُلْطَانٍ إِلَّا أَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِي فَلَا تَلُومُونِي وَلُومُوا أَنْفُسَكُمْ۔ (ابراھیم ٢٢)

”اور میرا تم پر کچھ قابو نہ تھا مگر یہی کہ میں نے تم کو بلایا تم نے میری مان لی تو اب مجھ پر الزام نہ رکھو خود اپنے اوپر الزام رکھو۔“

ثابت ہو گیا کہ شیطان وسوسہ ڈالتا ہے۔

سولھواں قول: جنت میں اللہ تعالیٰ کا دیدار ہو گا یا نہیں؟

اہل سنت و جماعت نے فرمایا کہ جنت میں دیدارِ الٰہی جائز ہے۔

معتزلہ، جہمیہ اور یہود کہتے ہیں کہ رؤیت الٰہی جائز نہیں۔

ہماری (اہل سنت و جماعت کی) دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں فرمایا:

رَبِّ أَرِنِي أَنْظُرْ إِلَيْکَ قَالَ لَنْ تَرَانِي وَلَكِنِ انْظُرْ إِلَى الْجَبَلِ فَإِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهُ فَسَوْفَ تَرَانِي (الاعراف ۱۴۳)

اے رب میرے مجھے اپنا دیدار دکھا کہ میں تجھے دیکھوں فرمایا تو مجھے ہر گز نہ دیکھ سکے گا ہاں اس پہاڑ کی طرف دیکھ یہ اگر اپنی جگہ پر ٹھہرا رہا تو عنقریب تو مجھے دیکھ لے گا۔

اس آیت سے استدلال یوں ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے رؤیت کی درخواست کی اور اگر وہ رؤیت کو ناممکن جانتے ہوتے تو ہر گز اس کی طلب اور درخواست نہ کرتے، اس لئے کہ وہ دوسروں کی بہ نسبت زیادہ جانتے تھے کہ (دیدارِ الٰہی) جائز ہے یا ناجائز اور یہ کہنا بالکل بے معنیٰ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس کا علم نہ تھا۔ اگر علم ہوتا تو ہر گز رؤیت کی طلب نہ کرتے تو اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے علم کی نفی ہے کہ وہ اپنے خالق کی معرفت نہیں رکھتے، اپنے صانع کو نہیں جانتے تھے۔

اور جب معتزلہ وغیرہ جانتے ہیں کہ رؤیت باری تعالیٰ ممکن نہیں تو موسیٰ علیہ السلام کو تو ضرور علم ہونا چاہیئے تھا کہ یہ طلب نہیں کرنی چاہیئے۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ وہ جانتے تھے کہ یہ امر طلب کے لائق نہیں، پھر انہوں نے باوجود علم کے طلب کیا تو یہ طلب، طلب محال ہے اور موسیٰ علیہ السلام سے محال کا طلب کرنا محال ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ خدا تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے سوال کو رد کر دیا اور فرمایا:

لَنْ تَرَانِي (الاعراف ۱۴۳)

تو مجھے ہر گز نہ دیکھ سکے گا۔

تو جواباً ہم کہتے ہیں کہ یہ فرمایا کہ دنیا میں تم نہیں دیکھ سکتے اور یہ نہیں فرمایا کہ آخرت میں بھی تم نہیں دیکھ سکتے، گویا کہ دنیا میں رؤیت کی نفی فرمائی نہ کہ آخرت میں۔

لَنْ کے معانی

اگر کہا جائے کہ لفظ ''لَنْ'' تابید کے لئے ہے (یعنی ہیشگی پر دلالت کرتا ہے) تو ہمیشہ کے لئے دنیا میں بھی اور آخرت میں رؤیت ممکن نہیں تو ہم کہیں گے: لفظ ''لَنْ'' دو معنوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ کبھی ہیشگی کے لئے اور کبھی اس سے دوام و ہیشگی کے معنی مراد نہیں ہوتے، مدت دنیا مراد ہوتی ہے۔

لَنْ کے ہمیشہ کے معنیٰ پر دلالت نہ کرنے پر دلیل

دیکھیں! جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَلَنْ یَتَمَنَّوْهُ أَبَدًا (البقرة ۹۵)

اور ہرگز کبھی اس کی آرزو نہ کریں گے۔

اس جگہ لفظ ''لَنْ'' بیان فرمایا، مگر مراد یہاں دوام و ہیشگی نہیں بلکہ مدتِ دنیا مراد ہے۔

دلیل یہ ہے کہ فرمایا:

وَنَادَوْا یَامَالِکُ لِیَقْضِ عَلَیْنَا رَبُّکَ۔ (الزخرف ۷۷)

اور وہ پکاریں گے اے مالک تیرا رب ہمیں تمام کر چکے۔

اور کفار کے متعلق خبر دی:

یَالَیْتَهَا کَانَتِ الْقَاضِیَةَ (الحاقة ۲۷)

ہائے کسی طرح موت ہی قصّہ چکا جاتی۔

تو کلمہ ''لَنْ'' ذکر کیا اور مراد اس سے مدتِ دنیا ہے، ایسے ہی اس مقام میں لفظ ''لَنْ'' سے مدت دنیا مراد ہے، آخرت مراد نہیں۔

رؤیت باری پر دلائل

رؤیت باری تعالیٰ جائز ہے، دلائل یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وُجُوهٌ یَوْمَئِذٍ نَاضِرَةٌ (۲۲) إِلَى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ (القیامة ۲۳) کچھ منہ اس دن تروتازہ ہوں گے اپنے رب کو دیکھتے۔'' یعنی قیامت کے دن مؤمنین اللہ تعالیٰ کو بلا کیف اور بلا حجاب دیکھیں گے۔

اعتراض: اگر کہا جائے کہ اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ اپنے رب کے ثواب کی طرف دیکھیں گے؟

جواب: ہم کہتے ہیں کہ یہ تاویل صحیح نہیں، اس لئے کہ جب مؤمن جنت میں پہنچے گا تو اس نے ثواب پالیا اور جنت میں سکونت پذیر ہو گیا تو اب اس کی طرف کیا دیکھنا ہے؟ جنت میں پہنچ گیا اور وہاں کی نعمتیں حاصل ہو گئیں، جنت میں سکونت پذیر ہو گئے اور سب کچھ ان کو مل گیا، ثواب کیا کریں گے؟

دوسری دلیل یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا:

وَلٰكِنِ انْظُرْ إِلَى الْجَبَلِ فَإِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهُ فَسَوْفَ تَرَانِي (الاعراف ۱۴۳)

ہاں اس پہاڑ کی طرف دیکھ یہ اگر اپنی جگہ پر ٹھہرا رہا تو عنقریب تو مجھے دیکھ لے گا۔

اللہ تعالیٰ نے ان کے سوال کو شرط کے ساتھ معلق کیا اور وہ استقرارِ جبل ہے اور جب یہ شرط جائز ہے تو جس چیز کو معلق کیا وہ بھی جائز ہے۔

اعتراض: اگر کہا جائے کہ موسیٰ علیہ السلام کا نظر کرنا اگر جائز ہوتا تو ان پر توبہ واجب نہ ہوتی۔

جواب: ہم کہتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کا توبہ کرنا اس وجہ سے تھا کہ انہوں نے بلا اجازت سوال کیا تھا۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ آپ نے بتقاضائے طبیعت توبہ کی (یعنی توبہ طبیعہ) کہ جب ہول و وحشت کو دیکھا تو تجدید توبہ کی اور انسانی تقاضا یہی ہے کہ جزع، فزع اور ہول وحشت کے وقت توحید و توبہ کی تجدید کرتے ہیں، کیا آپ نے دیکھا نہیں کہ فرمایا: وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ (الاعراف ۱۴۳) اور میں سب سے پہلا مسلمان ہوں۔" حالانکہ معلوم ہے کہ آپ اوّل المؤمنین ہیں؟ تو ثابت ہوا کہ آپ نے توبہ اور تجدید توحید طبعی طور پر کی تھی۔

سوال: اگر کہا جائے کہ سوالِ رؤیت جائز ہوتا تو موسیٰ علیہ السلام کی قوم مستحق عتاب نہ ہوتی، حالانکہ وہ مستحق عقوبت ہوئی، تو ثابت ہوا کہ رؤیت کا سوال کرنا جائز نہیں۔

مستحقِ عقوبت ہونے کی دلیل

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَأَخَذَتْهُمُ الصَّاعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ (النساء ۱۵۳) تو انہیں کڑک نے آلیا ان کے گناہوں پر۔" اس کا جواب یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے رؤیت کا سوال استہزاء اور تمسخر کے طور پر کیا تھا اور موسیٰ علیہ السلام نے حقیقت کے طور پر سوال کیا تھا، وہ مستحق عقوبت نہ ہوئے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ تکذیب کی وجہ سے مستحق عقوبت ہوئے، اس لئے کہ انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کو جھٹلایا۔

رؤیت کے ثبوت پر دلیل

یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ سے کسی نے اس آیت کی تفسیر دریافت کی:

لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا الْحُسْنَى وَزِيَادَةٌ۔ "(یونس ۲۶)

بھلائی والوں کے لیے بھلائی ہے اور اس سے بھی زائد۔

تو حضور اقدس ﷺ نے فرمایا: الْحُسْنَى سے مراد جنت اور زِيَادَةٌ سے اللہ تعالیٰ کی ذات کریمہ کو دیکھنا مراد ہے یعنی دیدار الٰہی ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم سے مروی ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا:

وَلَدَيْنَا مَزِيدٌ (ق ۳۵)

اور ہمارے پاس اس سے بھی زیادہ ہے۔

کہ اس سے مراد یہ ہے کہ "**یتجلی لھم الرب**" رب تعالیٰ جل شانہ مؤمنوں کے لئے تجلی فرمائے گا۔

نیز مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

انکم سترون ربکم یوم القیامۃ کما ترون القمر لیلۃ البدر۔

بے شک تم عنقریب اپنے رب کو دیکھو گے جیسے چودھویں رات کے چاند کو دیکھتے ہو۔ "**لا تضامون**" بغیر دکھا دھونی (یعنی بغیر کسی مزاحمت وغیرہ کے) اور "**لا تضارون**" کا لفظ بھی آیا ہے کہ اس کے دیکھنے میں تمہیں ایک دوسرے کو تکلیف وزحمت نہ ہوگی یعنی بے تکلف خدا کا دیدار ہوگا۔

توجب حضور ﷺ نے فرمایا:

"**سترون ربکم**" (یعنی "**سوف ترون ربکم**") تو ثابت ہوا کہ حضور اقدس ﷺ کو خوب علم تھا کہ رب کریم کا دیدار حق ہے۔ (تو ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا دیدار حق ہے اور تم اس کے دیدار سے بے کیف ، بے حجاب اور تکلیف کے بغیر مشرف کئے جاؤ گے۔)

اگر یہ کہا جائے کہ یہ حدیث صحیح نہیں اس لئے کہ اس میں تشبیہ ہے؟

جواب یہ ہے کہ تشبیہ رؤیت کی رؤیت کے ساتھ دی ہے، مرئی (نظر آنے والی) کو مرئی کے ساتھ نہیں دی یعنی "**ترون کما القمر**" یہ کہ جیسے چاند کا دیکھنا جائز ہے، رب کا دیکھنا بھی جائز ہے، نیز جیسے چاند کے دیکھنے میں کوئی تکلیف نہیں ہوتی، یونہی

بلاتکلیف اپنے رب کو بے کیف دیکھوگے اور ''لاتضامون'' کے قول کا معنیٰ ہے: دیکھنے میں مزاحمت نہیں کروگے اور رب کے دیدار سے تمہیں کوئی تکلیف نہ ہوگی جیسے سورج کی طرف دیکھنے میں تکلیف ہوتی ہے۔

سوال: اگر یہ کہا جائے کہ دیکھنے والا جب مکان میں ہوگا تو مرئی بھی مکان میں ہوگا۔

جواب: ہم کہتے ہیں کہ ایسا نہیں ہوگا، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ تمام اشیاء کو ان کے مکان میں دیکھتا ہے اور خود مکان میں نہیں، اسی طرح وہ نظر آئے گا اور مکان میں نہ ہوگا۔

سوال: اگر کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مدح فرمائی '' لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ (الانعام ۱۰۳) '' آنکھیں اُسے احاطہ نہیں کرتیں اور سب آنکھیں اس کے احاطہ میں ہیں۔'' یہ کہ کوئی حسّ بصر اس کا ادراک (احاطہ) نہیں کرسکتی اور وہ سب ابصار کا ادراک (احاطہ) کرتا ہے۔

سوال: دریافت طلب امر یہ ہے کہ جب اللہ عزوجل کا دیدار ہوگا اور مشاہدہ ہوگا تو لازمی امر ہے کہ وہ ''منظور الیہ'' ہو اور ناظر (دیکھنے والا) جب کسی چیز کو دیکھتا ہے تو وہ چیز یا چہرہ کے مقابل سامنے ہوگی یا داہنی یا بائیں جانب ہوگی۔ بہر حال کسی نہ کسی جہت (سمت) میں ہوگی تو ضروری بات ہے کہ منظور الیہ (جس کی طرف نظر کی جائے) جہت میں ہو اور جب جہت میں ہوگا تو کیفیت اور مکان وغیرہ کی حد میں محدود ہوتا کہ دیکھنے والے کو معلوم ہو کہ میں کس کو دیکھ رہا ہوں اور کیسے دیکھ رہا ہوں تو اللہ تعالیٰ مدرَک ہوا (احاطہ میں آنے والا) اور یہ جائز نہیں، جیسا کہ آیت میں گزرا کہ '' لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ (الانعام ۱۰۳) '' آنکھیں اُسے احاطہ نہیں کرتیں اور سب آنکھیں اس کے احاطہ میں ہیں۔''

جواب: ہم کہتے ہیں: (بے شک) باری تعالیٰ جل شانہٗ کو دیکھا جائے گا، اس کا مشاہدہ ہوگا، دیدار ہوگا۔ پھر کیفیت اور جہت و مکان ضروری نہیں اس چیز کے لئے جو دیکھی جائے اور یا مشاہدہ کیا جائے، اس لئے کہ رؤیت مبنی ہے کہ وہ چیز یا ذات موجود ہو اور جب موجود ہوگی تو جائز ہے کہ مرئی ہو، نظر آئے۔

دیدار کے لئے چیز کا موجود ہونا ضروری ہے

لیکن شئے مرئی و مشاہد اسی حیثیت سے ہوگی، جس صفت سے وہ موصوف ہے اور شئے اسی صفت کے ساتھ نظر آئے گی، جس صفت کے بغیر وہ شئے موجود نہ ہو اور اس کو ثابت کرنا اس کی صفت کے بغیر محال ہے، اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ صانع جل شانہٗ شئے ہے موجود ہے، محدث ہے، مبدع (ایجاد کرنے والا، پیدا کرنے والا) ہے اور عالم اور ہر وہ شئے جو جنس عالم سے ہے وہ شئے ہے، محدث ہے مبدع ہے اور محدث کی صفات سے یہ ہے کہ جوہر کے لئے جنس و نوع کا ہونا ضروری ہے۔

جوہر کے لئے جنس ونوع ضروری ہے

اور جس کے لئے جنس ونوع ہو گی اس کے لئے قطع وفصل کا ہونا ضروری ہے اور جس کے لئے قطع وفصل ہو اس کے لئے حد و نہایت ہو گی اور جس کے لئے حد ونہایت ہو گی تو ضروری ہے کہ اس کے لئے طول وعرض اور عمق ہو اور جس میں طول وعرض، عمق ہو ضروری ہے کہ اس کے کم (مقدار) اور لون (رنگ) ہو اور ان تمام صفات کے معنٰی کیفیت ہے اور جب یہ معانی کسی چیز میں پائے جائیں گے تو اس کے لئے جہت ضروری ہے اور جب وہ جہت (سمت) میں نظر آئے گا اور جہت میں مشاہدہ کیا جائے گا اور اس کا ادراک جمیع صفاتِ مذکورہ کے ساتھ ہو گا اور ہر محدث میں یہ صفات ضروری ہیں، ان صفات سے خالی نہیں ہو سکتا اور جب بہ طریقِ ضرورت یہ بات جان لی کہ کوئی محدث (مخلوق) ان صفاتِ مذکورہ بالا کے بغیر نہیں پایا جا سکتا، ہر محدث ان صفات کے ساتھ جانا جاتا ہے، اس لئے رؤیت خلاف نہ ہو گی۔

پھر صانع جل مجدہٗ نہ جسم ہے، نہ جوہر اور جب وہ جسم وجوہر نہیں تو اس کے لئے جنس ونوع بھی نہیں اور جنس ونوع نہیں تو قطع وفصل بھی نہ ہو اور جب قطع وفصل نہیں تو اس کے لئے حد ونہایت بھی نہیں اور جب حد ونہایت نہیں تو اس کے لئے طول وعرض وعمق بھی نہیں ہو گا اور جب طول وعرض وعمق نہ ہو گا تو اس کے لئے لون وکیف نہ ہو گا اور جب لون وکیف نہ ہو گا تو رؤیت کے ساتھ مدرَک نہ ہو گا، اس لئے کہ ادراک ماہیت وکیفیت اور مقدار کا ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ ان صفات سے منزہ وپاک ہے۔

اس لئے فرمایا:

لَاتُدْرِکُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ یُدْرِکُ الْأَبْصَارَ (الانعام ۱۰۳)

آنکھیں اُسے احاطہ نہیں کرتیں اور سب آنکھیں اس کے احاطہ میں ہیں۔

مگر وہ شئے ہے، موجود قائم بذاتہ ہے، قدیم بصفاتہ ہے اور رؤیت جائز وصحیح ہے اور رؤیت ہو گی شئے موجود قائم بذاتہ موصوف بصفاتہ۔

پھر جب ہم نے جانا اور پہچانا اس کی صفات سے تو وہ نظر آئے گا اسی صفت کے ساتھ، جس صفت سے ہم نے پہچانا ہے اور جس صفت سے جانا ہے۔

(تو ثابت ہو گیا کہ اس کا دیدار بے کیف ہو گا یعنی مکان، زمان اور جہات سے پاک ہو گا۔)

جنات کو اللہ تعالیٰ کا دیدار ہو گا؟

جنات کو دیدارِ الٰہی ہو گا یا نہیں ؟ اس باب میں کوئی نص نہیں پائی گئی، لیکن ہم یہ کہتے ہیں کہ اگر یہ دیدارِ الٰہی کی سعادت وکرامت انسانوں کو ایمان کی وجہ سے حاصل ہو گی تو پھر کوئی وجہ نہیں ہے کہ ایمان کی برکت سے مؤمن جنات کو دیدار نہ ہو، مؤمن جنات کو بھی دیدار ہو گا، اور اگر یہ شرفِ رؤیت انبیاء ومرسلین صلوات اللہ وسلامہ علیہم اجمعین کی بدولت ہے تو پھر ان کو رؤیت نہیں ہو گی اس لئے کہ جنوں میں سے کوئی نبی اور رسول نہیں ہوا۔

فرشتوں کو دیدار ہو گا؟

فرشتوں کو دیدارِ الٰہی ہو گا کیونکہ وہ اہل نبوت ورسالت سے ہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **اللَّهُ يَصْطَفِي مِنَ الْمَلَائِكَةِ رُسُلًا (الحج ۷۵)** اللہ چن لیتا ہے فرشتوں میں سے رسول۔"

اور فرمایا:

تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا (الانعام ۶۱)

ہمارے فرشتے اس کی روح قبض کرتے ہیں۔

اور فرمایا:

سَفَرَةٍ (۱۵) كِرَامٍ بَرَرَةٍ (عبس ۱۶)

لکھے ہوئے جو کرم والے نکوئی والے۔

پھر حضرت جبریل ومیکائیل وعزرائیل، اسرافیل علیہم السلام سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر ہیں، انبیاء ومرسلین صلوات اللہ علیہم اجمعین کی طرف اور انہوں نے وحی سے رؤیت کی خبر دی۔

مؤمنوں کی قسمیں

پھر مؤمنوں میں بعض تو عاصی وگناہ گار اور کبائر کے مرتکب ہیں اور بعض وہ ہیں جو کافر ہو کر پھر اسلام لے آئے اور بعض وہ جو مبتدع ہیں اور ان میں ایمان نہیں ہو گا مگر ذرہ برابر، پھر جب یہ لوگ جنت میں جائیں گے تو وہ اللہ عزوجل کا دیدار کریں گے، بے کیف اور بلا کیفیت۔

اور وہ جو وحی لے کر تشریف لائے وہ رسول ہیں (یعنی جبریل علیہ السلام) آپ نے سب مؤمنوں کو دیدارِ الٰہی کی خبر دی اور دیدار کی بشارت دی تو ملائکہ بہ طریق اولیٰ مستحق ہیں کہ دیدار کریں اور دیدار سے محروم نہ کیے جائیں، اس لئے کہ اگر یہ

دیدار سے محروم ہوتے ہیں تو پھر عاصی و معاقب کو رسول پر فضیلت دینا لازم آتا ہے اور یہ قطعا جائز نہیں، تو پھر رؤیت یعنی دیدارِ الٰہی ثابت ہے۔ جبرائیل و میکائیل واسرافیل وعزرائیل اور ایسے ہی تمام ملائکہ کے لئے صلوات اللہ علیہم اجمعین، اس لئے کہ سب اللہ تعالیٰ کے رسل وانبیاء علیہم السلام ہیں۔

فرشتوں کے لئے دیدارِ الٰہی کے ثبوت یا عدم ثبوت میں۔۔۔ بعض فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ کا مذہب

بعض فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا: توقف (خاموشی اختیار) کرنا چاہیئے کیونکہ فرشتوں کے حق میں کوئی نص موجود نہیں اور منع وانکار بھی جائز نہیں تو توقف کرنا چاہیئے۔

کیا حور وغلمان دیدارِ الٰہی سے مشرف ہوں گے؟

حور وغلمان چونکہ اہل جنت سے ہیں، لہذا اللہ تعالیٰ کو دیکھیں گے۔ بعض کہتے ہیں: ہر جنتی اللہ تعالیٰ کو دیکھے گا اور بعض نے کہا کہ ہر وہ شخص جو جانتا ہے کہ مؤمنوں کو دیدار ہوگا اور وہ اللہ تعالیٰ کی دیدار کی تمنا وآرزو کرتا ہے اور دیدارِ الٰہی کا مشتاق ہے، اس کو بھی رؤیت ہوگی، منع وانکار جائز نہیں۔

اس لئے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وُجُوہٌ یَوْمَئِذٍ نَاضِرَۃٌ (۲۲) إِلَی رَبِّھَا نَاظِرَۃٌ (القیامۃ ۲۳)

کچھ منہ اس دن ترو تازہ ہوں گے اپنے رب کو دیکھتے۔

مطلقاً ارشاد فرمایا تو جن وانس اور ملائکہ وغیرہ سب (دیدار کرنے میں) برابر ہیں جب کہ ایمان ثابت ہو۔

دلیل اس کی یہ ہے کہ جو مؤمن نہیں اس کے لئے ارشاد ہوا:

وَوُجُوہٌ یَوْمَئِذٍ بَاسِرَۃٌ (۲۴) تَظُنُّ أَنْ یُفْعَلَ بِھَا فَاقِرَۃٌ (القیامۃ ۲۵)

اور کچھ منہ اس دن بگڑے ہوئے ہوں گے سمجھتے ہوں گے کہ ان کے ساتھ وہ کی جائے گی جو کمر کو توڑ دے۔

اس میں جن وانس وشیاطین برابر ہیں جب کہ مؤمن نہ ہوں اور اگر وہ اس بات کو نہ جانیں اور نہ ان کو رؤیت کی خبر ہے تو ان کے لئے رؤیت نہیں اور اصح یہ ہے کہ حور وغلمان کو دیدار ہوگا، اس لئے کہ ان سے تکلیف اٹھالی گئی ہے یعنی وہ مکلف بالشرائع نہیں اور طاعت واطاعتِ شرعیہ ان پر واجب نہیں تو ثوابِ آخرت سے ان کو نہیں نوازا جائے گا اور اس کرامت سے ان کا اکرام نہ کیا جائے گا۔

سترہواں قول: خیر وشر، اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقدر ہیں

اہل سنت وجماعت فرماتے ہیں کہ خیر وشر، نیک وبد، میٹھا کڑوا سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقدر ہے۔

معتزلہ اور قدریہ کہتے ہیں: خیر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور شر بندوں کی طرف سے ہوتا ہے۔

ہمارا اہل سنت کا اجماع ہے کہ خیر وشر سب اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے اور اس کے علم سے ہے۔

بعض کا مذہب

بعض کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو پیدا کیا اور ابلیس نے شر کو پیدا کیا۔

بعض نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں کو پیدا کیا اور بندوں نے شر کو پیدا کیا۔

شیطان کو کس نے پیدا کیا؟

بعض (قدریہ) کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے (شر کی طرح) ابلیس کو بھی پیدا نہیں کیا، اس لئے کہ اگر خدا نے ابلیس کو پیدا کیا تو بات پھر وہیں جا پہنچی کہ شر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو پیدا کیا اور ابلیس نے شر کو پیدا کیا۔ (نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ) گویا اللہ تعالیٰ نے شر کو پیدا کیا، کیونکہ ابلیس کفر اور شر پیدا کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو پیدا کیا تو گویا خدا نے کفر وشر پیدا کیا اور اس کا ارادہ فرمایا اور یہ ہرگز جائز نہیں کہ خدا کفر اور شر کو پیدا کرے اور اس کا ارادہ کرے۔

قدریہ فرقہ کا دوسرا نام شیطانیہ ہے۔ یہ (عقائد رکھنے والی) قوم قدریہ فرقہ سے ہے، اس کا نام شیطانیہ ہے اور یہی (مذکورہ بالا) مذہب آتش پرستوں کا ہے اور یہ بالکل کفر ہے، اسی معنیٰ کے لحاظ سے حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: "**القدرية مجوس هذه الامة**" کہ قدریہ اس امت کے مجوسی ہیں اور اگر ابلیس مخلوق نہ ہو تو پھر قدیم اور خالق ہوگا اور اس عقیدہ سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرکت ثابت ہوگی اور یہ صریح کفر ہے۔

پھر "قدر" کے معنیٰ ایجاد واحداث (پیدا کرنے) کے ہیں اور حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی سب کا خالق ہے۔

اہل سنت کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَمَاتَشَاءُونَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللهُ۔ (الدھر ۳۰)

اور تم کیا چاہو مگر یہ کہ اللہ چاہے۔

یعنی اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے وہی ہوتا ہے، تمہارے چاہے سے کچھ نہیں ہوتا، سب کچھ اس کی مشیت سے ہوتا ہے، اس میں خیر وشر کی تفصیل اور فرق نہیں۔ یہ نہیں فرمایا کہ خیر ہماری مشیت سے اور شر ہماری مشیت سے نہیں بلکہ مطلقاً فرمایا۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

قُلْ كُلٌّ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ۔ (النساء ۷۸)

تم فرمادو سب اللہ کی طرف سے ہے۔

تیسری دلیل یہ ہے کہ فرمایا:

وَ كُلُّ صَغِيرٍ وَ كَبِيرٍ مُسْتَطَرٌ (القمر ۵۳)

یعنی "مکتتب" اور ہر چھوٹی بڑی چیز لکھی ہوئی ہے۔

اور اللہ جل شانہٗ فرماتا ہے:

وَ لَقَدِ اخْتَرْنَاهُمْ عَلَى عِلْمٍ عَلَى الْعَالَمِينَ (الدخان ۳۲)

اور بے شک ہم نے اُنہیں دانستہ چن لیا اس زمانہ والوں سے۔

یعنی اللہ تعالیٰ نے اہل اختیار کو جان لیا تو ان کو اختیار دیا اور فرمایا:

وَ أَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلَى عِلْمٍ (الجاثیة ۸)

اور اللہ نے اُسے باوصف علم کے گمراہ کیا۔

یعنی اللہ تعالیٰ جانتا تھا کہ یہ اہل ضلالت ہیں تو ان کو گمراہ کیا اور نیز نبی کریم رؤف ورحیم ﷺ سے مروی ہے، حضور ﷺ نے فرمایا:

"بعثت داعیا و مبلغا و اللہ یھدی من یشاء و یضل من یشاء"۔

یعنی اللہ تعالیٰ نے مجھے داعی اور مبلغ بناکر بھیجا ہے، اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے گمراہی میں چھوڑ دیتا ہے۔

اور اللہ تعالیٰ نے شیطان کو وسوسے ڈالنے والا اور دنیا کو مزین کر کے دکھانے والا **"و لیس فی یدہ من الضلالۃ شئی"** اور وہ گمراہی پیدا کرنے والا نہیں اس کے ہاتھ میں کچھ نہیں۔ سوائے وسوسہ ڈالنے اور بنا سجا کر دکھانے کے اس پاس کچھ نہیں۔

ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: قیامت کے دن ابلیس سے کہا جائے گا، آدم علیہ السلام کو سجدہ کرلے اور جنت میں داخل ہو جا اور تیرے عمل جو تو نے کفر سے پہلے کئے تھے، اس کا درجہ ملے گا تو شیطان سجدہ کرنے سے باز رہے گا اور اہل قیامت میں سے جو عاصی و گناہ گار ہیں، ابلیس سے کہیں گے: سجدہ کرلے،

جہنم سے نجات مل جائے گی۔ ابلیس کہے گا: اے اہل قیامت! رک جاؤ اور مجھے کچھ نہ کہو۔ اللہ تعالیٰ اگر چاہتا کہ میں آدم علیہ السلام کو سجدہ کروں تو میری مجال نہ تھی کہ میں سجدہ نہ کرتا لیکن خدا نے نہ چاہا تو میں نے بھی سجدہ نہ کیا۔

اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں کو پیدا کیا، یہ جانتے ہوئے کہ ان سے شر واقع ہوگا اور اگر وہ ارادہ نہ کرتا اور شر مقدر نہ کرتا تو ازروئے حکمت ناجائز ہے کہ بندہ شر پیدا کرے اور اس لئے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَ اللہُ خَلَقَکُمۡ وَ مَا تَعۡمَلُوۡنَ (الصافات ۹۶)

اور اللہ نے تمہیں پیدا کیا اور تمہارے اعمال کو۔

دوسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جانتا تھا کہ ابو جہل سے کفر سرزد ہوگا تو اگر ہم یہ کہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ابو جہل کے کفر کا ارادہ بھی کیا تو ابو جہل کا کفر کو چاہنا علم الٰہی کے موافق ہوگا۔

اللہ تعالیٰ کا ارادہ اس کے علم کے خلاف نہیں ہو سکتا

اور اگر ہم کہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ابو جہل کے کفر کا ارادہ نہیں کیا تو اللہ تعالیٰ کا ارادہ اس کے علم کے خلاف ہوگا اور یہ جائز نہیں اور اگر ہم کہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کے کفر کو جانتا تھا اور اس کے کفر کا ارادہ نہیں کیا بلکہ ارادہ اس کے ایمان کا کیا، تو یہ ایسی ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ نے ابو جہل سے ایسی چیز کا ارادہ کیا جسے وہ جانتا ہے کہ یہ چیز نہ ہوگی تو یہ بات علم وارادہ کے بطلان کی طرف پہنچاتی ہے، بخلاف امر کے کہ یہ جائز ہے کہ کسی شئے کا امر کرے اور اس کے خلاف ارادہ فرمائے، جیسے ابراہیم علیہ السلام کو فرزند کے ذبح کا حکم کیا اور ارادہ کیا کہ ذبح نہ کریں ایسے ہی اس جگہ ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ کا کافر کے کفر کو جاننا اس کو کفر پر مجبور نہیں کرتا، ایسے ہی اس کی مشیت وارادہ اس کو مجبور نہیں کرتے کہ وہ کفر ہی کرے لیکن امر الٰہی علم الٰہی کے خلاف ہو سکتا ہے یہ جائز ہے۔ اس لئے کہ امر حجت وبیان کے لئے ہے اور اس کا ارادہ اس کے علم کے خلاف ہو یہ جائز نہیں، یہ سفاہت (بے وقوفی) ہوگا۔

اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

إِنَّا كُلَّ شَيۡءٍ خَلَقۡنَاهُ بِقَدَرٍ (القمر ۴۹)

بے شک ہم نے ہر چیز ایک اندازہ سے پیدا فرمائی۔

اور فرمایا:

وَ خَلَقَ كُلَّ شَيۡءٍ فَقَدَّرَهُ تَقۡدِيرًا (الفرقان ۲)

اُس نے ہر چیز پیدا کر کے ٹھیک اندازہ پر رکھی۔

اور فرمایا:

وَ كَانَ أَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُولًا (النساء۴۷)

اور خدا کا حکم ہو کر رہے۔

جس کا تقدیر پر ایمان نہیں اس کی کوئی عبادت قبول نہیں

روایت ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا کہ اگر تیرے پاس احد پہاڑ کے برابر سونا ہو اور تو خدا کی راہ میں خرچ کرے تو جب تک قدر پر ایمان نہ لائے گا، اللہ تعالیٰ قبول نہیں فرمائے گا اور جب تک یہ جانے کہ جو کچھ تجھ کو تکلیف یا راحت پہنچی ہے، وہ تجھ سے ٹل نہیں سکتی اور جو تکلیف و راحت تجھ کو نہیں پہنچی وہ پہنچنے والی نہ تھی، یعنی خیر اور شر اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقدر ہے، اس کے خلاف عقیدہ پر مرا تو جہنم میں جائے گا۔

اور اسی حدیث میں یہ بھی مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اگر اللہ تعالیٰ آسمان و زمین کی تمام مخلوق کو عذاب دے تو وہ ظالم نہیں اور اگر وہ سب پر رحم فرمائے تو ان کے لئے اس کی رحمت ان کے اعمال سے بہتر ہے۔

اگر کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ شر کی قضا فرمائے اور پھر ان کو عذاب دے تو یہ جور ہے، ہم کہیں گے کہ ہر گز ظلم و جور نہیں اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی قضاء نے اس کو مجبور نہیں کیا کہ وہ شر کرے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قضاء بالشر کو اپنے بندہ سے مخفی رکھا اور اس کو خیر کا حکم دیا، اس پر حجت ظاہر کر دی اور پھر بندہ نے خیر کو ترک کیا باوجودیکہ اس کو خیر کا حکم تھا اور اس پر حجت ظاہر کر دی گئی تھی اور شر کا ارتکاب کیا بغیر حجت کے اور اللہ تعالیٰ کی قضاء کو جانے بغیر، اس لئے کہ بندہ ارتکابِ شر سے پہلے نہیں جانتا تھا کہ قضاء الٰہی کیا ہے؟ شر ہے یا خیر؟ جب اس نے شر کا ارتکاب کر لیا تو جانا کہ قضاء الٰہی یہی تھی، لیکن اس کی مباشرت (کرنا) اور شر کا ارتکاب بغیر حجت کے تھا، لہذا مستحق عقوبت و سزا ہوا۔ اب اگر یہ کہا جائے کہ جب قضاء الٰہی شر کی تھی تو بندہ کے لئے ناممکن ہے کہ اس سے راہِ فرار اختیار کرے تو یہ جبر کی طرف پہنچانے والا ہے۔ ہم کہتے ہیں: قضاء الٰہی (قدرت کا فیصلہ) نے بندے کی قدرت و اختیار کو سلب نہیں کر دیا، جیسے اللہ تعالیٰ جانتا ہے بندے کے شر کو تو یہ جبر نہیں، اسی طرح اللہ تعالیٰ کی قضاء بندہ کو مجبور نہیں کرتی۔ بندے سے مواخذہ و پکڑ اس کے اختیار اور قدرت کی بناء پر ہے اور اللہ تعالیٰ کی قضاء و قدر اور علم اس کی قدرت و اختیار کو سلب نہیں کرتا، اس لئے کہ قضاء الٰہی کے خلاف ہونا جبر کو واجب نہیں کرتا۔

اگر کہا جائے کہ کیا ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے یہ روایت نہیں ہے کہ آپ ﷺ نے حج کے موقع پر فرمایا: ''لبیک والرغبة الیک والخیر فی یدیک والشر لیس الیک'' کہ ہم حاضر ہیں اور ہماری رغبتیں تیری جانب ہیں اور خیر تیرے دستِ قدرت میں ہے اور شر تیری طرف سے نہیں؟

جواب: ہم کہیں گے کہ ہم شر کو تیری طرف نسبت نہیں کرتے اور نیز یہ حسن ادب سے نہیں کہ شر اور قبح کو خدا کی طرف نسبت کریں۔ دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ تمام مخلوقات کا اکیلا خالق ہے مگر یہ کہنا خلافِ ادب ہے کہ ''یاخالق البعوضة والحیة والعقرب'' اے مچھر کے اور سانپ کے، بچھو کے پیدا کرنے والے! یوں کہا جائے: ''یاخالق السموات والارض'' اے آسمان وزمین کے پیدا کرنے والے!

اگر یہ دریافت کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **وَأَنَّ اللّٰہَ لَیۡسَ بِظَلَّامٍ لِّلۡعَبِیدِ** (آل عمران ۱۸۲) اور اللہ بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔'' **وَمَا اللّٰہُ یُرِیدُ ظُلۡمًا لِّلۡعِبَادِ** (غافر ۳۱) اور اللہ بندوں پر ظلم نہیں چاہتا۔''

جواب: اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ بندوں پر ظلم کرنے کا ارادہ نہیں فرماتا۔ آیت میں یہ تو نہیں کہ اللہ تعالیٰ ارادہ نہیں کرتا کہ بندہ بندہ پر ظلم نہ کرے۔

اگر دریافت کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

مَا أَصَابَکَ مِنۡ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰہِ وَمَا أَصَابَکَ مِنۡ سَیِّئَةٍ فَمِنۡ نَفۡسِکَ۔ (النساء ۷۹)

اے سننے والے تجھے جو بھلائی پہنچے وہ اللہ کی طرف سے ہے اور جو برائی پہنچے وہ تیری اپنی طرف سے ہے۔

جواب: ہم کہتے ہیں کہ جو بندہ کو پہنچائی جائے وہ اس کے نفس کی طرف سے ہے اور اس کے لئے ''اُصِیبَ'' کا لفظ بولتے ہیں اور جو غیر کی طرف سے پہنچائی جائے تو اس کے لئے ''اَصَابَ'' کہتے ہیں اور یہاں اللہ تعالیٰ نے فرمایا **وَمَا أَصَابَکَ مِنۡ سَیِّئَةٍ فَمِنۡ نَفۡسِکَ۔** (النساء ۷۹) تو ثابت ہوا کہ غیر کی طرف سے ہے، پھر کلام اس مسئلہ میں اور مسئلہ ارادہ واستطاعت میں برابر ہے۔

اٹھارواں قول: عبادات واحکام کا بیان: مرجیہ کا مسلک

مرجیہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے خلق کو پیدا کیا اور ان کو کسی چیز کا حکم دیا نہ کسی چیز سے منع فرمایا۔ اگر اچھا کام کرے گا تو اللہ تعالیٰ ثواب عطا فرمائے گا، اگر اس نے برا کام کیا تو اس پر کوئی عذاب نہیں اور قرآن کریم میں جس قدر امر و نہی ہیں وہ ندب واستحباب پر محمول ہیں اور یہ ان کا (عقیدہ) کفر صریح ہے۔

فرقۂ اباحیہ کا مذہب

فرقۂ اباحیہ والے یہ کہتے ہیں کہ جب بندہ محبت کی انتہاء کو پہنچتا ہے، پھر کبیرہ گناہ کا ارتکاب کرتا ہے، زناو چوری کرتا ہے تو خدا اس کو جہنم میں نہیں ڈالے گا، یہ عقیدہ ان کا کفر ہے۔

بعض لوگوں کا مذہب

اور بعض نے کہا کہ بندہ جب غایت محبت کو پہنچتا ہے تو اس سے امر و نہی ساقط ہو جاتے ہیں اور محبت کی غایت یہ ہے کہ کفر پر ایمان کو اختیار کرے اور پھر منافق نہ ہو تو وہ محب اللہ ہے، غایت محبت کو پہنچا ہوا۔

بعض دوسرے حضرات کا مذہب

بعض نے کہا کہ بندہ جب انتہائی محبت کو پہنچتا ہے تو اس سے ظاہری عبادت ساقط ہو جاتی ہے اور اس کی عبادت صرف اور صرف تفکر ہوتی ہے جیسا کہ حضور ﷺ نے فرمایا: "**تفکر ساعة خير من عبادة سنة**" ایک ساعت تفکر کرنا سال بھر کی عبادت سے بہتر ہے اور یہ عقیدہ ان کا کفر ہے۔

اور بعض نے کہا کہ جب بندہ غایت محبت کو پہنچتا ہے تو اس کے لئے دوسروں کی لونڈیاں اور عورتیں جائز ہو جاتی ہیں۔

اور بعض نے کہا کہ مالِ دنیا سب مباح ہے، اولادِ آدم علیہ السلام کے لئے اور یہ کسی کو حق نہیں کہ اپنے لئے مالک ہو، اس لئے کہ آدم و حوا علیہما السلام کا جب انتقال ہوا تو ان کا مال میراث ہے ان کی اولاد کے لئے۔ یہ عقیدہ کفر ہے۔

امر و نہی کسی حال میں ساقط نہیں ہوتے

یہ عقیدہ کفر ہے، اس لئے کہ امر و نہی انبیاء کرام علیہم السلام کے حق میں ثابت ہیں اور کسی حال میں ان سے امر و نہی ساقط نہیں ہوتے اور حالانکہ وہ محبت میں کامل و اکمل ہیں (تو غیر انبیاء سے کیونکر ساقط ہو سکتے ہیں جب کہ وہ اس درجۂ محبت میں بھی نہیں ہوتے)؟

نیز یہ بھی دلیل ہے: اللہ تعالیٰ جل شانہٗ فرماتا ہے:

وَاعْبُدْ رَبَّکَ حَتّٰی يَأْتِيَکَ الْيَقِينُ (الحجر ۹۹)

اور مرتے دم تک اپنے رب کی عبادت میں رہو۔

نیز فرمایا:

قُلْ أَمَرَ رَبِّي بِالْقِسْطِ وَأَقِيمُوا وُجُوهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ (الاعراف ۲۹)

تم فرماؤ میرے رب نے انصاف کا حکم دیا ہے اور اپنے منہ سیدھے کرو ہر نماز کے وقت۔

فرمایا:

إِنَّ اللَّهَ لَا يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ (الاعراف ۲۸)

بے شک اللہ بے حیائی کا حکم نہیں دیتا۔

اللہ تعالیٰ فحاشی کا حکم نہیں دیتا (یعنی چوری، زنا، بد فعلی، قتل وغارت اور غصب ولوٹ کھسوٹ وغیرہ) اس قسم کی اور بھی آیات ہیں اور جس نے امر کو ترک کیا اور نہی کا مرتکب ہوا تو اس سے عذاب ساقط نہ ہو گا۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يَغْفِرُ لِمَنْ يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَشَاءُ (آل عمران ۱۲۹)

جسے چاہے بخشے اور جسے چاہے عذاب کرے۔

اور ان باتوں کا اعتقاد کفر ہے۔ (جو اس سے پہلے ذکر ہوئیں)۔

اموال مشترکہ نہیں ہیں

اگر اموال لوگوں کی ملک ہوتے تو کسی کو منع کرنا حلال و جائز نہ ہوتا، حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ (البقرۃ ۱۸۸)

اور آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھاؤ۔

اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوا أَيْدِيَهُمَا جَزَاءً بِمَا كَسَبَا (المائدۃ ۳۸)

اور جو مرد یا عورت چور ہو تو ان کا ہاتھ کاٹو ان کے کیے کا بدلہ۔

اور ایسے ہی رجم و جلد (یعنی مرتکب زنا کو سنگسار کرنا اور کوڑے لگانا)۔

نیز حضور اقدس صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے فرمایا: میں غیور ہوں اور میرے باپ حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی غیور تھے اور ہم سے زیادہ غیور اللہ تعالیٰ ہے۔

جنت نے کیا کہا؟

حضور اقدس صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم فرماتے ہیں: جب اللہ تعالیٰ نے جنت کو پیدا کیا تو اس سے فرمایا: کلام کر۔ اس نے کہا: کامیاب ہوا وہ جو مجھ میں داخل ہوا۔ پھر فرمایا: "تکلمی" بول۔ اس نے کہا: قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ (المؤمنون ۱) بے شک مراد کو پہنچے ایمان والے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"حرمتک علی کل بخیل و مدمن و عاق و دیوث"۔

کہ میں نے تجھ کو حرام کیا بخیل پر، ہمیشہ شراب پینے والے پر، ماں باپ کے نافرمان پر، دیوث پر جو بے غیرت و بے حیا ہو۔

انیسواں قول: اس بارے میں کہ اللہ عزوجل پر بندوں کی جانب سے کوئی شئے واجب نہیں

اہل سنت وجماعت کہتے ہیں: ایجاب محض اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور کسی کی طرف سے نہیں۔

معتزلہ نے کہا کہ ایجاب بہ طریق عقل وحکمت (یعنی جو چیز عقل وحکمت سے واجب ہوئی ہے) ایسے ہی ہے جیسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اور یہ کفر ہے۔

متکلمین اور اصولیوں کی اصطلاح

اہل اصول اور متکلمینجو لفظ، جواز، وجوب اور محال استعمال کرتے ہیں، اسی طرح "وجوب من الحکمۃ" کا لفظ جو ان کے نزدیک استعمال ہوتا ہے یہ بہ طریق مجاز ہے۔ اور اہل سنت کے نزدیک غرض اس سے اللہ تعالیٰ جل شانہٗ سے قبح کی نفی کرنا ہے۔

وجوب کی از روئے حکمت کیا تعریف ہے؟

از روئے حکمت وجوب کی تعریف یہ ہے کہ اگر اس کو ترک کر دے تو مستقبح (برا) ہے۔

جواز از روئے حکمت کسے کہتے ہیں؟

از روئے حکمت جواز کی تعریف یہ ہے کہ اگر کرے تو "سفہ" بیوقوفی نہیں۔

محال کسے کہتے ہیں؟

محال کی تعریف یہ ہے کہ اس کا ثابت کرنا نہ حکمت ہے اور نہ وہ جائز ہے۔

پھر معتزلہ کے نزدیک بندوں کے حقوق اور ان کے مصالح اللہ تعالیٰ پر واجب ہیں اور خدا پر وہ چیز واجب ہے جو بندوں کے لئے اصلح ہو بہ طریق حکمت جیسے رزق اور صغیرہ گناہوں پر گناہ گاروں پر رحمت اور گناہ کبیرہ پر توبہ قبول کرنا اور اس کی مثل اور یہ سب معتزلہ کے نزدیک اللہ تعالیٰ پر واجب ہیں اور اسی طرح خدا پر واجب ہے کہ بندوں کو مستوی القامۃ، سلیم الجوارح یعنی اس کے اعضاء درست ہوں، توانا و مضبوط ہو، دیکھے، سننے والا ہو غرضیکہ اس میں کوئی نقص نہ ہو اور اگر اس کے خلاف کرے تو عدل نہ ہو گا، یہ عقیدہ کفر ہے۔ اس لئے کہ وجوب سے مراد تکلیف والزام ہے اور لامحالہ الزام جبر کو مستلزم ہے تو ملزوم علیہ مجبور ہو گا اور جو اللہ تعالیٰ کو اس صفت سے موصوف کرے وہ کافر ہے کیونکہ بندوں میں بعض بیمار ہیں اور بعض نابینا اور بعض گونگے اور بعض بہرے اور بعض بالکل معذور و دائم المرض وغیرہ اور ظاہر ہے ان عوارض میں بندوں کی مصلحت نہیں۔

پھر (دریافت طلب امر یہ بھی ہے کہ) یہ عوارض یا تو اللہ تعالیٰ کی قضاء (فیصلہ) اور قدر (تقدیر) سے ہوں گے یا نہیں؟

اگر بقضاء اللہ (یعنی اللہ تعالیٰ کے فیصلہ سے ایسا ہونا ٹھہرا) مانیں تو معاذ اللہ خدا ظالم ٹھہرا، اپنی قضاء وقدر میں اور اگر بقضاء اللہ نہیں تو دوسرے خالق کی احتیاج ہوگی تاکہ وہ یہ احوال وعوارض پیدا کرے اور جو اللہ تعالیٰ کے سوا دوسرے کو خالق و محدث اور موجد تجویز کرے وہ کافر ہے تو ان چیزوں سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ عزوجل پر بندوں کی طرف سے کسی وجہ سے کوئی شئے واجب نہیں، مگر ہم یہ کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں کی حوائج وضروریاتِ زندگی اپنے ذمہ کرم پر لے لی ہیں جیسے رزق وغیرہ۔

اور ایسے ہی نیکوکاروں کے لئے رحمت و بخشش کا وعدہ فرمایا ہے اور بدکاروں کو عذاب اور عقوبت سے ڈرایا ہے اور اس کے وعد و وعید میں خلف جائز نہیں، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ وعدہ خلافی نہیں کرتا۔

إِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيعَادَ (آل عمران ۹)

بے شک اللہ کا وعدہ نہیں بدلتا۔

اور عدم خلف کی وجہ سے اس قبح منفی ہے، لیکن وفاء وعد خدا پر واجب نہیں لیکن ہم یقیناً جانتے ہیں کہ وہ وعدہ خلافی نہیں کرے گا، نہ وعدہ خلافی اس کی صفت ہے اور نہ اس کے ساتھ اسے متصف کرنا جائز۔ پھر جب بندہ کو بھوک، پیاس، رنج و محن، درد والم بقضائے الٰہی اور بارادۃ اللہ ہوتے ہیں اور یہ مصلحت و حکمت سے خالی نہیں اور حکمت جلدی (ظاہر ہو) یا دیر سے، یہ اس کے عمل کا کفارہ اور بدلہ و جزاء ہے اور ثواب و کرامت ہے اور ثواب و کرامت ہے اس کی محبت کی وجہ سے اور اس لئے کہ اللہ تعالیٰ ہماری مصلحتوں اور انجام کو جانتا ہے تو وہ ہمیں بیماری وغیرہ پہنچا کر ارادہ کرتا ہے کہ ہمارا انجام اچھا ہو، یہ ایسے ہی ہے جیسے ہم فصد کھلواتے ہیں (نشتر لگانا)، پچھنے لگواتے ہیں اور داغ دے کر علاج کرتے ہیں کہ یہ مصلحتاً مباح ہے (ثانی حال میں) اگرچہ فی الحال درد اور دکھ محسوس ہوتا ہے۔

معتزلہ کا مسلک

مگر معتزلہ نے ان سب باتوں کا انکار کیا اور انہوں نے کہا: یہ عوارض بقضائے الٰہی نہیں ہوتے بلکہ باقتضائے طبع ہوتے ہیں یا غذا خراب ہونے سے، یا ہوا خراب ہونے سے یا تبدیلی ایام سے اور جو کسی فعل کو غیر اللہ کی طرف بہ طریق ایجاد و خلق منسوب کرے وہ کافر ہے۔

پھر اگر کہا جائے کہ اس میں کون سی حکمت ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں سے کفر کا ارادہ کرے؟ ہم کہیں گے کہ بے شک اللہ تعالیٰ قادر ہے کہ شروع سے اخیر تک ان کو مطیع اور مؤمن پیدا کرے بلکہ معصوم پیدا کرے، لیکن اس نے بندوں کو تفاوت احوال کی وجہ سے اپنے ارادہ سے چھوڑا، بعد اس کے کہ وہ جانتا ہے ان سے اظہارِ عفو و مغفرت و رحمت کے لئے جس کو وہ

بخشنا چاہے اور اپنی صفات کے لئے قہر انتقام و مجازات جس پر اس کا عقاب ہو اور ان صفات حمیدہ کی تاثیر ظاہر ہو گی، کفر و معاصی کے ساتھ اس سے بڑھ کر کیا حکمت ہو گی کہ اپنی صفات قہریہ کا اظہار فرماتا ہے اور اپنے دشمنوں سے انتقام لیتا ہے؟

دوسری بات یہ ہے کہ ان سے کفر و معصیت کو جانتا ہے تو اگر ارادہ کرے اس کے خلاف اور نہ ہو وہ جس کا ارادہ کیا تو وصف کیا جائے گا عجز و حقارت سے اور یہ جائز نہیں، اس لئے کہ تمام مخلوق اللہ تعالیٰ کے بندے اور غلام ہیں اور مولیٰ کو حق ہے کہ اپنے بندوں میں جو چاہے تصرف کرے اور جب چاہے کرے۔

حشویہ

اور بعض حشویہ نے کہا: رزق اور مصالح عباد بندوں پر ہیں، اللہ تعالیٰ کے ذمے کچھ نہیں، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت بندوں پر واجب ہے تو مصالح بہ طریق اولیٰ ان پر واجب ہونے چاہئیں اور یہ قول فاسد ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

إِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِينُ (الذاريات ۵۸)

بے شک اللہ ہی بڑا رزق دینے والا قوت والا قدرت والا ہے۔

اور فرمایا: **وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (هود ۶)**

اور زمین پر چلنے والا کوئی ایسا نہیں جس کا رزق اللہ کے ذمہ کرم پر نہ ہو۔

زمین میں جتنی مخلوق ہے اس کا رزق ہمارے ذمہ کرم پر ہے۔

حضور نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: "**الرزق مقسوم و مفروع یاتی ابن آدم علی ایّ سیرة سارها**"۔

رزق مقسوم و مفروع ہے آدمی جہاں بھی ہو اسے ملے گا۔[1]

بعض نے کہا: کسب اور مصالح کی طلب فرض ہے بندوں پر کسی وجہ سے ہو۔ اور بعض نے کہا: کسب اور طلب مصالح حرام ہے اور مال حلال کا رکھنا حرام ہے۔ صحیح تر یہ ہے کہ بوقتِ ضرورت کسب فرض ہے اور جب ضرورت نہ ہو تو رخصت ہے اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: **فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلَاةُ فَانْتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ (الجمعة ۱۰)**

پھر جب نماز ہو چکے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو۔

اور اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے زکوۃ فرض کی اور اس کا سبب اموال ہیں اور اگر مال حلال کا رکھنا حرام ہوتا تو پھر ان پر زکوۃ واجب نہ ہوتی، تو ثابت ہوا کہ جو ہم نے کہا وہ صحیح ہے۔

---

[1] (کنز العمال للہندی ج۶ ص ۴۷۳)

(۳) باب نمبر تین: دین اور شرائعکے بیان میں

اس میں تین قول ہیں۔

پہلا قول

مہتدی ابو شکور سالمی رحمہ اللہ تعالی نے فرمایا: قول اوّل اصول دین اور ہر اس چیز کے بیان میں جس پر اعتقاد واجب ہے۔

ابو شکور سالمی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: جاننا چاہیئے کہ اصول دین واعتقاد و شرائطِ ایمان کو قبول کرنا، احکام وغیرہ اور ہر شئے کہ جس پر اعتقاد واجب ہے اور ہر وہ شئے کہ جو اللہ تعالی کے دین کے موافق اور محبوب و مرضی (پسندیدہ) ہو یہاں تک کہ بندے خلافِ دین کسی چیز کا ذکر کرے یا اس پر اعتقاد رکھے جو اللہ تعالیٰ کی رضا و محبت کے خلاف ہو تو وہ کافر ہو جائے گا اور ایسے ہی اشارہ اس مسئلہ میں بہ منزلہ عبادت کے ہے، بیان اس اجمال کا یہ ہے کہا گر کسی کے سامنے ذکر کیا جائے کہ فلاں شخص کو یا فلاں چیز کو اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس سے محبت فرماتا ہے اور وہ سن کر کہے: میں پسند نہیں کرتا یا محبت نہیں کرتا تو وہ کافر ہے اور ایسے ہی اگر سر کے اشارہ سے یا ہاتھ کے اشارہ سے یا داڑھی کے اشارہ سے یا کسی اور چیز سے اشارہ کرے یا استہزاء یا مخالفت کے طور پر کرے تو کافر ہو جائے گا اور ایسے مبغوضاتِ الٰہی کو اگر کہے: میں مبغوض نہیں رکھتا کافر ہو جائے گا اور ایسے ہی محبوبات و مرضیات نبی کریم ﷺ میں اعتقاد و موافقت واجب ہے، جیسے اوّل میں ہے اور اگر حضور ﷺ کی مرضیات و محبوبات (مرضی و پسند) کے خلاف اعتقاد رکھتا ہے خواہ قولاً ہو یا فعلاً ہو جب کہ استخفاف (ہلکا جاننا) اور تحقیر کے طور پر ہو تو کافر ہو جائے گا۔ تو واجب ہے کہ مرضیاتِ الٰہی اور مرضیاتِ رسول کریم ﷺ کو دیناً اور اعتقاداً پسند کرے، اگرچہ طبیعت کے خلاف ہو اور اسی طرح مبغوضاتِ الٰہی اور مبغوضاتِ نبی کریم ﷺ کو دیناً و اعتقاداً مبغوض سمجھے، اگرچہ طبیعت اس کو پسند کرتی ہو، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ و رسول اللہ ﷺ کی پسندیدہ اور محبوب اشیاء کو پسند کرنا اس کی موافقت اعتقاداً و دیناً واجب ہے، اگرچہ طبعاً وہ چیز پسند نہ ہو تو طبیعت کا مقابلہ طبیعت پر جبر کر کے مرضیات اللہ اور مرضیاتِ رسول اللہ ﷺ کو پسند کرے اور اللہ تعالیٰ و رسول ﷺ کی ناپسندیدہ اشیاء کو مبغوض و ناپسند کرے۔

اس لئے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے عبادات و احکام و شرائع میں محنت اور آزمائش کو رکھا ہے کہ کون اوامر و نواہی اور سنتِ رسول کریم ﷺ کی موافقت کرتا ہے اور کون مخالفت کرتا ہے؟ اور صادق، کاذب، فاسق و مطیع، مخلص و منافق میں امتیاز ہو جائے اور سب جان لیں۔

دوسرا قول: محنت ومشقت اور ابتلاء کا بیان

اہل سنت وجماعت فرماتے ہیں کہ محنت ومشقت اور ابتلاء کی وضع اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں پر جائز ہے۔

کرامیہ نے کہا کہ محنت وابتلاء واجب ہے۔

اور معتزلہ نے کہا کہ محنت ومشقت میں بندوں کو ڈالنا قطعاً جائز نہیں، اس لئے کہ حکمت کے خلاف ہے کہ بندوں کو محنت ومشقت میں ڈال کر ان کا امتحان لے یا دنیا میں ان کو سزا وعقوبت دے اور دنیا دار الجزاء وعقوبت نہیں ہے۔

اور اس لئے کہ آلام وشدائد بدلا دینے کو ہوتے ہیں اور عقوبت ومحنت اور ابتلاء وآزمائش حصول علم کے لئے اور اللہ تعالیٰ کو بندوں کا حال معلوم ہے تو اس کو ابتلاء وآزمائش میں ڈالنا جائز نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ اس کا محتاج نہیں، بلکہ کل بلائیں، آزمائش بندہ کی طرف سے ہوتی ہیں، جیسے لغزش، فقر، بھوک، پیاس، مار دھاڑ، ناحق وخون ریزی یہ سب جرائم بندوں کی طرف سے ہوتے ہیں، لیکن آلام (درد)، بخار، مرض اور اسی طرح کی بیماریاں وغیرہ بندوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہوتیں، یہ چیزیں طبیعت کی وجہ سے ہوتی ہیں یعنی طبعی چیزیں ہیں، کیوں استحالہ لازم آتا ہے کہ اس کو امتحان وابتلاء میں ڈالنے کی حاجت نہیں کہ یہ علم حاصل کرنے کے لئے ہوتے ہیں اور خدا بندوں کو پہلے ہی جانتا ہے۔

اہل سنت وجماعت کے دلائل

اہل سنت اس آیت سے دلیل دیتے ہیں:

وَإِذِ ابْتَلَى إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمَاتٍ (البقرة ۱۲۴)

اور جب ابراہیم کو اس کے رب نے کچھ باتوں سے آزمایا تو اس نے وہ پوری کر دکھائیں۔

اس آیت میں خبر دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو آزمایا اور ان کو آیات کے ساتھ مبتلا کیا اور نبی کریم ﷺ نے مہاجر عورتوں کے امتحان کا حکم دیا، فرمایا:

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا جَاءَكُمُ الْمُؤْمِنَاتُ مُهَاجِرَاتٍ فَامْتَحِنُوهُنَّ (الممتحنه ۱۰)

اے ایمان والو جب تمہارے پاس مسلمان عورتیں کفرستان سے اپنے گھر چھوڑ کر آئیں تو ان کا امتحان کر لو۔

الَّذِي خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاةَ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا (الملک ۲)

وہ جس نے موت اور زندگی پیدا کی کہ تمہاری جانچ ہو تم میں کس کا کام زیادہ اچھا ہے۔

ان آیات سے ثابت ہوا کہ امتحان وابتلاء اللہ تعالیٰ کی طرف سے جائز ہے۔

دنیا میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کا امتحان جائز ہے؟

حدیث پاک سے دلیل: نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

"البلاء و الهواء و الشهوة معجونة بطينة آدم عليه السلام"۔

مصیبت، آزمائش، خواہش اور شہوت حضرت آدم علی نبینا و علیہ الصلوۃ والسلام کے خمیر میں گوندھی گئی ہیں۔

دوسری حدیث مبارک: اور حضور ﷺ نے فرمایا:

"اشد البلاء على الانبياء ثم الاولياء ثم الامثل فالامثل"۔

سب سے زیادہ سخت اور کڑی آزمائش انبیاء علیہم السلام کی، پھر اولیاء رحمہم اللہ تعالیٰ کی اور پھر جو ان سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔

ابتلاء و امتحان کا فلسفہ کیا ہے؟

دراصل یہ جو ہم کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے امتحان و آزمائش جائز ہے باوجودیکہ وہ بغیر امتحان و آزمائش کے جانتا ہے، اس امتحان کا فائدہ الزام حجت ہے اور جو کچھ بندہ میں ہے اس کا اظہار و اعلام کہ اس کے کرتوت اس کو دکھائے جائیں۔

مصائب و آلام کا راز

دکھوں اور بیماریوں میں مبتلا کرنا کفارۂ گناہ کا باعث ہے اور بلندئ درجات کا موجب ہے، اس کی دلیل یہ حدیث مبارک ہے: حضور ﷺ نے فرمایا کہ "حمى ليلة كفارة سنة" ایک رات کا بخار سال بھر کے گناہوں کا کفارہ ہے۔

ابتلاء و آزمائش کے من جانب اللہ جائز ہونے پر عقلی دلائل

دریافت طلب امر یہ ہے کہ امراض و آلام اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں یا غیر مخلوق؟ اگر کہو کہ مخلوق ہیں تو آزمائش وغیرہ کو منجانب اللہ مان لیا اور اگر کہیں کہ غیر مخلوق ہیں تو اس میں کلام ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا دوسرا خالق و محدث محال و ناجائز ہے اور تیسری صورت یہ ہے کہ اگر کہا جائے کہ اگر حدوث فعل طبیعت کی طرف سے یا بندے کی طرف سے ہو، اللہ تعالیٰ کے احداث و ایجاد (پیدا کرنا) کے بغیر تو اس میں خدا سے استغناء و بے نیازی کے علاوہ یہ بھی لازم آتا ہے کہ حدوث عالم بغیر صانع کے پایا جائے تو اس میں الوہیت کی نفی ہوتی ہے اور تعطیل کا موجب ہے اور یہ کفر ہے اور اس لئے کہ اللہ تعالیٰ

نے مخلوق کو پیدا فرمایا، وہ سب اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں اور فقر بندے کی صفت ہے اور فقر بندے کی صفت ہے اور عبودیت سخت آزمائش ہے اور محنت ومشقت اور فقر واحتیاج فضل ہے۔

اور اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے قید کو کفار کے حق بشرائط سبی (قید) مباح قرار دیا ہے اور قید، مشقت، محنت پہنچانے کو واجب کرتی ہے، جیسے فقر، خدمت اور ذلت سے دکھ اور مصیبت پہنچتی ہے اور اسی طرح اہل حرب کے مویشیوں کے بچے جب کہ ان کا دارالاسلام کی طرف چلنانا ممکن ہو، ان بچوں کو قتل کرنا مباح ہے اور یہ مشقت وآلام کے پہنچانے کو واجب کرتا ہے تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امتحان جائز ہے۔

زراعت سے دلیل

اور ایسے ہی ہمارے لئے زراعت کھیتی باڑی اور حرفت کو مباح قرار دیا، اس میں بھی مشقت ہے۔

نماز، وضو سے دلیل

اور اسی طرح نماز بغیر وضو کے جائز نہیں اور وضو بغیر پانی کے ممکن نہیں اور بعض اوقات پانی بغیر کنواں کھودنے کے حاصل نہیں ہوتا، یہ بھی باعث محنت ومشقت اور کلفت ہے۔

موسموں سے استدلال

اور اس لئے کہ خدا نے گرمی کو گرم پیدا کیا اور سردی کو ٹھنڈا جس سے لوگوں کو اذیت وتکلیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے، یہ سب کچھ دو حال سے خالی نہیں، یا تو سب خدا کی جانب سے ہوں گی یا غیر خدا کی جانب سے؟ اگر کہو کہ یہ سب غیر خدا کی طرف سے ہیں تو اس میں خالق وصانع کی الوہیت کی نفی ہے اور یہ کفر ہے اور اگر کہا جائے یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں تو ثابت ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ نے اسباب کو پیدا کیا۔ مشقت ومحنت، اذیت وتلف اور جب یہ جائز ہوا تو جائز ہو گیا کہ فقر، ذلت، ابتلاء وامتحان وغیرہ، اس لئے ہم نے کہا کہ یہ سب بقضاء اللہ تعالیٰ ہیں اور اس کی تقدیر وفیصلے سے ہیں۔

تیسرا قول: استطاعت اور تفویض کا بیان

قدریہ، معتزلہ، جہمیہ، روافض اور کرامیہ کہتے ہیں کہ بندہ میں کسی فعل کو سرانجام دینے سے پہلے اس فعل کی استطاعت موجود ہوتی ہے اور بندہ بذاتِ خود بغیر تقدیر اور اللہ تعالیٰ کے پیدا کرنے کے اپنے ذاتی افعال کی قدرت واستطاعت رکھتا ہے اور بندہ اپنے اچھے، برے کاموں کا خود خالق ہے۔

جبریہ کا نظریہ

جبریہ نے کہا کہ بندے کا کوئی فعل نہیں ہے اور نہ بندہ فعل پر قادر ہے اور وہ اپنے نیک و بد افعال میں مجبور ہے اور کافر اپنے کفر میں معذور ہے اور بندہ کی حرکت درخت کے پتوں کی طرح ہے کہ بغیر اختیار کے وہ حرکت کرتے ہیں۔

بعض کا مسلک

بعض نے کہا کہ فعل بندے اور خدا کے درمیان موقوف ہے، ہمیں اس چیز کا ادراک نہیں ہے کہ فعل خدا کی طرف سے ہے یا بندے کی طرف سے ہے۔

اہل سنت و جماعت کا موقف

اہل سنت فرماتے ہیں کہ بندہ اپنے ذاتی افعال میں استطاعت رکھتا ہے لیکن بذاتِ خود نہیں ، بلکہ اللہ عین اس وقت بندے میں یہ قوت پیدا فرمادیتا ہے اور یہ قوت فعل سے متصل اور مقترن ہوتی ہے، فعل سے مقدم (پہلے) یا مؤخر (بعد) نہیں ہوتی۔

استطاعت کی قسمیں

استطاعت تین قسم کی ہوتی ہے (۱) استطاعتِ اموال (۲) استطاعتِ افعال (۳) استطاعت احوال۔

پہلی قسم: (یعنی استطاعت اموال) جیسے حاجی کے لئے زادِراہ اور سواری وغیرہ اور استطاعتِ افعال سے مراد ہے: جسم اور اعضاء کا تندرست اور صحیح وسلامت ہونا، اس لئے استطاعت کا فعل سے مقدم ہونا جائز ہے، حسی طور پر بھی اور حکماً بھی فعل سے پہلے قوت کا پایا جانا جائز ہے۔ اور استطاعتِ احوال فعل پر وہ قوت وقدرت ہے جو نہ فعل سے مقدم ہوتی ہے اور نہ مؤخر بلکہ مقارن (ساتھ) فعل ہوتی ہے۔

معتزلہ کا قرآن سے استدلال

معتزلہ کی حجت یہ آیت ہے: لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا (البقرة ۲۸۶) اللہ کسی جان پر بوجھ نہیں ڈالتا مگر اس کی طاقت بھر۔" اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ بندہ فعل پر قدرت واستطاعت رکھتا ہے۔

دوسری آیت: وَلِلّٰہِ عَلَی النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْہِ سَبِیْلًا (آل عمران ۹۷)

"اور اللہ کے لیے لوگوں پر اس گھر کا حج کرنا ہے جو اس تک چل سکے۔"

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو مخاطب کیا اوران کو حکم دیا نماز، حج وغیرہ کا، تو اگر نماز وغیرہ شروع کرنے سے قبل توجہ خطاب کے وقت استطاعتِ ادائیگی نماز وغیرہ نہ ہو تو پھر نماز کا خطاب صحیح نہ ہوتا، اس لئے کہ خطاب ہجوم وقت کے ساتھ متوجہ ہوتا ہے، تو بسا اوقات نماز آخر وقت میں شروع کرتا ہے تو یہ مقتضی ہے کہ نماز پڑھنے کی طاقت ہجوم وقت کے وقت ہو، لیکن خطاب کا متوجہ ہونا صحیح ہوا۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگر ہم یہ کہیں کہ استطاعت ساعۃ ساعۃ (لمحہ بہ لمحہ) پیدا ہوتی ہے تو یہ چیز جبر وتسلیط کا موجب ہے اور واجب کرتی ہے کہ قبائح کی اضافت ونسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو، اس لئے کہ زانی اور لوطی جب زنا اور لواطت کریں تو ایلاج ودخول علی الترتیب والترادف ہوگا تو ہر حرکت اور ایلاج (دخول) محتاج ہوگا حدوثِ قوت وقدرت کا۔

اور اگر ہم کہیں کہ اللہ تعالیٰ اسی ساعت دورانِ عمل میں قدرت کو پیدا کرتا ہے تو یہ اس فعل پر تسلیط (مسلط کرنا) ہے جو کہ جائز نہیں ہے۔

اور بندہ کے لئے یہ ممکن ہے کہ اس فعل کو غیر کی طرف پھیر دے، اس لئے کہ قوت اخراج (نکالنے کی مدت) نکالنے کے وقت پیدا ہوگی اور داخل کرنے کی قوت داخل کرنے کے وقت پیدا ہوگی اور فعلِ ایلاج واخراج (داخل کرنا اور نکالنا) زنا ہے اور یہ ناممکن ہے کہ اس کا فعل واقع ہو اور زنا میں نہ ہو بلکہ زنا ہی میں واقع ہوگا، سو اس میں اختیار کی نفی ہو جاتی ہے اور یہ جائز نہیں۔

جواب: اس آیت سے معتزلہ کے استدلال کا جواب یہ ہے کہ یہ آیت **لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (البقرة ٢٨٦)** نفقۂ ازواج کے متعلق نازل ہوئی ہے۔

آیت مذکورہ بالا کے نفقۂ ازواج کے بارے میں نازل ہونے کی دلیل یہ آیت ہے: **لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا مَا اٰتٰهَا (البقرة ٢٨٦)** یہ آیت مفسر ہے اور پہلی مجمل ہے اور مجمل کا حمل مفسر پر کیا جاتا ہے، تو اعتراض لازم نہیں آیا۔

مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا (آل عمران ٩٧) کا جواب یہ ہے کہ حدیث میں وارد ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

الاستطاعة هو الزاد والراحلة۔

یعنی استطاعت سے مراد زادِ راہ اور سواری وغیرہ ہے۔

لیکن ان کا یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ نے نماز کا حکم دیا ہے تو واجب ہے کہ بندہ خطاب کے متوجہ ہونے کے وقت نماز ادا کرنے کے لئے استطاعت رکھتا ہو، اس کے جواب میں ہم نے کہا کہ ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ استطاعت تکلیف کے وقت موجود ہے اور وہ

(استطاعت) اعضاء سلیمہ ہیں، اس لئے کہ تکلیف اعضاء ہی کو ہوتی ہے اور لیکن ادائے قوت وقدرت سے ہی ہوتی ہے اور یہ کسب کے وقت پیدا ہوتی ہے، جب نماز شروع کرنے لگتا ہے۔

دلیل اس کی یہ ہے کہ قوت وقدرت کے اثبات کے لئے فعل اور حرکت کے علاوہ کوئی اور دلیل نہیں ہے اور اس فعل و حرکت سے قبل اس فعل پر قوت وقدرت کو ثابت کرنے کی اس میں کوئی دلیل نہیں ہے۔

اگر کوئی کہے کہ فعل وحرکت جو موجود تھی، قبل اس کے دلیل ہے اس فعل کے اثبات پر اور ایسے ہی مابعد کے۔ ہم نے کہا: وہ فعل اور حرکت دلیل ہے اس قوت پر جس سے یہ فعل وحرکت حاصل ہوا ہے، لیکن اس کے غیر پر نہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ قدرت علی الصلوۃ توجہ خطاب کے وقت موجود ہے، اس لئے کہ آلہ اور قوت ثابت ہے اور یہ قدرت صلاحیت رکھتی ہے، غیر صلاۃ کے لئے، دلیل اس پر یہ ہے کہ محمد بن حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ فرمایا: استطاعت جس کے ساتھ تو ایمان لایا ہے یہی استطاعت ہے، جس کے ساتھ کفر کرتا ہے اس کے معنی یہ ہیں جس استطاعت سے تم ایمان لائے ہو وہی استطاعت صلاحیت رکھتی ہے کہ کفر کرے۔

مہتدی ابو شکور سالمی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: استطاعت کو جب ایمان کی طرف صرف کیا تو پھر ممکن نہیں کہ ایمان کے بعد کفر کی طرف صرف اس لئے کہ استطاعت عرض ہے، اور عرض دو زمانہ تک باقی نہیں رہتی تو ممکن نہیں کہ قبل از فعل موجود ہو اور پھر بعد از فعل باقی نہ رہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ وہ استطاعت جو قبل از فعل موجود تھی تو ضعم کے نزدیک وہ استطاعت قریب زوال تھی حال ثانی میں اور ہمارے نزدیک استطاعت فی الحال موجود ہے اور عنقریب حال ثانی میں موجود ہو گئی۔

پھر جب اس استطاعت کے ساتھ جو فی الحال موجود ہے اور لیکن بحال ثانی موصوف بالزوال ہے، خطابِ الٰہی کا متوجہ ہونا جائز ہے تو ایسے ہی جائز ہے کہ خطاب متوجہ ہو، اس استطاعت کے ساتھ جو فی الحال موجود ہے اور بحال ثانی (آئندہ وقت میں) موجود ہو گی۔[1]

اس کی دلیل یہ ہے کہ تمام افعال بندے کے اختیار سے ہوتے ہیں اور اختیار عرض ہے تو اگر ہم یہ کہیں کہ جائز ہے کہ باقی رہے تو یہ مودی ہو گا، اس بات کی طرف کہ کافر اپنے کفر پر باقی رہے، جبراً اور یہ محال ہے۔ بیان اس کا یہ ہے کہ اختیار کا آلہ جب

---

1 تمہید شریف میں عربی عبارت اس طرح ہے: وعندنا الاستطاعۃ موجودۃ (والصحیح معدومۃ) فی الحال او (والصحیح الواو) علی شرف الوجود.... ثم لما جاز توجہ الخطاب بالاسطاعۃ التی ھی موجودۃ.... (الصحیح معدومۃ) فی الحال۔ "فقیر کی دانست میں جس طرح کی عبارت ہونی چاہیے، اس کی نشاندہی اس عبارت میں قوسین کے درمیان کر دی گئی ہے۔ ترجمہ بھی اس کے مطابق کیا گیا ہے۔

اپنے اختیار سے کفر میں مشغول رہے تو اس سے اس کا اختیار زائل نہیں ہو گا تو یہ ممکن نہیں ہو گا کہ وہ اسلام کو قبول کرے، ساتھ زوال کے ثانی حال میں عدم اختیار کی وجہ سے تو اس کا کفر پر باقی رہنا مجبوراً ہو گا اور اس کے ہوتے ہوئے اس سے ایمان کا خطاب جائز نہ ہو گا اور یہ محال ہے۔

اشکال: اور ان کا یہ کہنا کہ استطاعت ساعۃ ساعۃ (لمحہ بہ لمحہ) پیدا ہوتی ہے تو اس میں تسلیط ہو گی اور قبائح کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو گی۔

جواب: ہم نے کہا: ایسا نہیں ہے، اس لئے کہ بندہ محتاج استطاعت ہے، اپنے امور کے مصالح کے لئے اور اپنے اعمال کے لئے مصلحۃً للمعیشۃ اور ایک وقت تک بقاءِ عالم کے سبب سے تو اللہ تعالیٰ لمحہ بہ لمحہ بغیر انقطاع کے استطاعت کو پیدا کرتا ہے۔ جیسے پانی کا پیدا و جاری کرنا، ہوا کا چلنا، پھر بے شک اللہ تعالیٰ نے بندے کو حکم دیا ہے کہ بعض استطاعت کو بعض اوقات میں صرف کرے، عبادات کی طرف شکر ادا کرنے کے لئے اور منع فرمایا اس کو استطاعت کے صرف کرنے سے معاصی اور قبائح کی طرف امتحان اور آزمائش کے لئے۔

اگر ہم کہیں کہ اللہ تعالیٰ استطاعت کو معاصی کی طرف پھیرنے سے منع کر دے جبراً کیونکہ بندہ طاعت کو ترک کرتا ہے اور استطاعت کو عبادات کی طرف اپنے ذاتی اختیار سے صرف نہیں کرتا اور شبہ کا دعویٰ کرے اور حجت اللہ تعالیٰ پر بایں معنی کہ مجبور تھا، ایک وقت میں دوسرے وقت میں اور ایسے ہی دعویٰ کر لے جبر کا، اس وقت میں تو اس کو شبہ ہو جائے گا اس کا اور یہ جائز نہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگر ہم کہیں کہ امر (معاملہ) بندوں کے سپرد ہے اور وہ اپنے افعال کے خود خالق ہیں تو اس میں ربوبیّت کا بندوں کے سپرد کرنا اور تفویض کرنا لازم آتا ہے اور یہ محال ہے۔

مسئلہ تفویض اور امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

سیدنا امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے حضرت امام جعفر بن محمد صادق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے دریافت کیا کہ اے ابن رسول ﷺ! کیا اللہ تعالیٰ نے امر (معاملات) بندوں کے سپرد کر دیا ہے؟

امام جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اس سے بلند اور اعلیٰ ہے کہ ربوبیت بندوں کے سپرد کرے، پھر عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں کو مجبور کیا ہے؟ اور ان پر تسلط فرمایا ہے، اعمال کے باب میں، فرمایا: اللہ تعالیٰ اس سے اعلیٰ اور برتر ہے کہ بندوں پر جبر فرمائے اور پھر ان کو عذاب دے۔

اوران کا یہ کہنا کہ قبائح کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو گی ؟ ہم کہتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے کیونکہ جب یہ جائز ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کو پیدا کرے اور جانتا ہے کہ بندہ یہ فعل کرے گا اوراس کے منع پر بھی قادر ہے کہ وہ یہ فعل نہ کرے اور پھر منع نہیں فرماتا تو فعل کی قباحت و عیب بندہ کی طرف راجع ہے تو ایسے ہی جائز ہے کہ اس کے لئے ان افعال کی قدرت پیدا فرمادے اوراس قدرت کو معاصی (گناہوں) کی طرف پھیرنے سے منع نہ فرمائے علی سبیل الجبر باوجود ان افعال سے منع کرنے کے پھر عیب و قبح بندہ کی طرف راجع ہے جیسا کہ علم اور تخلیق میں۔

اس کی تحقیق یہ ہے کہ تخلیق امر اور تخلیق قدرت میں کچھ فرق نہیں، پھر جب جائز ہے کہ آلات پیدا کرے اوران آلات سے وہ گناہ اور معصیت کرتا ہے تو عیب عاصی (گناہ گار) کی طرف رجوع کرتا ہے۔

دوسرے یہ کہ اس میں اوصافِ جمیلہ کا اظہار ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ عفو و غفران (درگزر اور بخشش) کی صفت سے موصوف ہے اور صفت قہر وانتقام سے بھی موصوف ہے، پھر ان صفات کی تاثیر حالات کے بدلنے کے ساتھ ظاہر ہو گی، تو ہم کہتے ہیں کہ بتقاضائے حکمت جائز ہے کہ اللہ تعالیٰ اس فعل سے منع کرنے اور حجت لازم کرنے کے بعد اس قدرت کو سلب کرلے، تاکہ ظاہر ہو قہر و انتقام اور عفو و غفران اوراس معنیٰ کے لحاظ سے ہم نے کہا کہ بندوں کے افعال اللہ تعالیٰ کے پیدا کیے ہوئے ہیں، برخلاف اس کے معتزلہ نے کہا: ہماری دلیل ان پر یہ ہے: وَاللّٰہُ خَلَقَکُمْ وَمَا تَعْمَلُونَ (الصافات ۹۶)

اور اللہ نے تمہیں پیدا کیا اور تمہارے اعمال کو۔"

اگر کہا جائے کہ اس سے مراد معمولات ہیں۔ ہم نے کہا: ایسا نہیں ہے، اس لئے کہ جس جگہ اللہ تعالیٰ نے مَا تَعْمَلُونَ (الصافات ۹۶) فرمایا ہے، اس سے عمل مراد لیا ہے۔

اس پر دلیل یہ آیت ہے:

هَلْ تُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ (النمل ۹۰)

تمہیں کیا بدلہ ملے گا مگر اسی کا جو کرتے تھے۔

اور اگر بندہ ہی افعال کا خالق ہوتا تو اس کی قدرت عدم پر نافذ ہے تو پھر خالق و مخلوق میں فرق نہ رہے گا اور اگر بندہ قادر ہے کہ اپنے آپ کو پیدا کرلے تو وہ قادر ہو گا کہ کوئی اور شئے پیدا کرے اور یہ کفر ہے اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيرًا (الفرقان ۲)

اُس نے ہر چیز پیدا کر کے ٹھیک اندازہ پر رکھی۔

استطاعت دو طریق کی ہے

بعض فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ استطاعت دو وجہ پر ہے: تکلیفی و توفیقی۔ تکلیفی اعضاء سلیمہ میں ہے اور یہ افعال سے قبل موجود ہوتی ہے اور توفیقی وہ قدرت علی الاداء سے عبارت ہے اور یہ قدرت فعل کے ساتھ اداء کے وقت پیدا ہوتی ہے۔

جبریہ اور مسئلہ جبر و قدر

جبریہ کہتے ہیں کہ بندے کوئی ہے اور اسے فعل پر قدرت ہے۔

بندہ مجبور محض ہے؟ جبریہ کے دلائل

(۱) جبریہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَنْ تَسْتَطِيعُوا أَنْ تَعْدِلُوا بَيْنَ النِّسَاءِ (النساء ۱۲۹)

اور تم سے ہرگز نہ ہو سکے گا کہ عورتوں کو برابر رکھو۔

(۲) ارشاد فرمایا:

لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ (آل عمران ۱۲۸)

یہ بات تمہارے ہاتھ نہیں۔

تو اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ بندہ کے لئے کسی امر اور فعل پر قدرت و استطاعت نہیں اور یہ اس باب میں نص ہے۔ (جبریہ نے مزید کہا کہ) اور ہمارا اجماع ہے کہ فعل عرض ہے، عرض دو زمانوں تک باقی نہیں رہتا تو جب پایا جائے گا تو ایک لطیف سی ساعت اور ایک لحظہ میں مٹ جائے گا اور بندہ جب کسی خیر و شر، اچھے یا برے کام میں مشغول ہوتا ہے تو اسی لحظہ میں قدرت پیدا ہوتی ہے تو اس کے لئے ناممکن ہے کہ قدرت کو دوسری طرف پھیر دے اور قدرت کو دوسرے امر کی طرف پھیرنا باقی نہیں رہتا۔

اور اس لئے کہ اقوی الاحوال وہ اختیار ہے، جو اسے اعمال پر حاصل ہوتا ہے اور اختیار ہوتا ہے ضمیر و خطرہ سے اور بندہ کو خطرہ کے پیدا کرنے اور منع کرنے پر قدرت نہیں ہے کیونکہ خطرہ بندے کے عمل دخل کے بغیر پیدا ہوتا ہے (بندے کا اس خطرہ کی ایجاد یا عدم ایجاد میں کوئی رول یا کردار نہیں ہوتا) تو یہ لامحالہ جبر کو واجب کرتا ہے اور جب یہ اختیار و خطرہ میں صحیح ہے تو تمام احوال میں صحیح ہے۔

جوابات

جبریہ کے اس آیت وَلَنْ تَسْتَطِیعُوا أَنْ تَعْدِلُوا بَیْنَ النِّسَاءِ(النساء ۱۲۹) سے قائم کردہ استدلال کا جواب یہ ہے کہ عدل عورتوں میں قوت و فعل سے نہیں بلکہ نفقہ سے ہے اور ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ بندہ عورتوں کے درمیان عدل کرنے میں کبھی تو انفاقِ مال سے استطاعت رکھتا ہے اور کبھی طاقت نہیں رکھتا تو لازم نہیں۔

دوسری دلیل کا جواب

اور لَیْسَ لَکَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ(آل عمران ۱۲۸) سے کیے گئے استدلال کا جواب دیتے ہوئے ہم کہتے ہیں کہ اس (امر) سے مراد فعل نہیں بلکہ حکم مراد ہے یا جزا مراد ہے۔ دلیل یہ ہے کہ فرمایا: أَوْ یَتُوبَ عَلَیْهِمْ أَوْ یُعَذِّبَهُمْ(آل عمران ۱۲۸) یا انہیں توبہ کی توفیق دے یا اُن پر عذاب کرے۔"یعنی بدلہ دینا آپ کے اختیار میں نہیں اور تعذیب و مکافات (سزا وغیرہ) بھی آپ کے اختیار میں نہیں اور ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی صفاتِ خصوصیہ میں سے ہے۔ کسی بندے بشر کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے اختیار سے کسی کو عذاب دے یا اس کی بخشش کر دے۔

تیسری دلیل کا جواب

اوران کا یہ کہنا فعل عرض ہے، دو زمانوں تک باقی نہیں رہتا، ہم کہتے ہیں کہ بے شک بجا ہے کہ فعل عرض ہے، دو زمانوں تک باقی نہیں رہتا، ہر لحظہ پیدا ہوتا رہتا ہے اور بندہ کو ہر لحظہ اختیار ہے، جس طرف چاہے قدرت کو صرف کرلے، قدرت دونوں کی صلاحیت رکھتی ہے۔

پھر ظہور قدرت علی الشر، بہ سبب عادت اور اللہ تعالیٰ کے بندہ کو رسوا کرنے سے سبب ہے، اس نے قدرت کو شر کی طرف پھیرا، یہ واجب نہیں کرتا کہ اس کے حق میں عذر و جواز کو اس لئے کہ فعل سے قبل نہی وارد ہو چکی ہے اور عند الفعل اختیار موجود ہے اور وہ اپنے آپ کو اس فعل بد سے روکنے پر قدرت رکھتا ہے، جیسے اس کے کرنے پر قدرت رکھتا ہے تو اس کو کوئی عذر نہیں اور منع پر اور لانے پر کوئی منت نہیں، اس کی دلیل یہ ہے:

فَمَنْ یَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَیْرًا یَرَهُ(۷) وَمَنْ یَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا یَرَهُ(الزلزال ۸)

توجو ایک ذرّہ بھر بھلائی کرے اسے دیکھے گا اور جو ایک ذرّہ بھر برائی کرے اسے دیکھے گا۔

اور اس کا یہ کہنا کہ اختیار خطرہ سے ہوتا ہے اور خطرہ اس کا فعل نہیں تو جب اس کے دل میں اس بات کا خطرہ (کھٹکا) پیدا ہوا تو دوسرا خطرہ لانا ناممکن ہے تو ہم نے کہا کہ ہاں! تمام خطرات اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں بغیر مباشرت عبد کے، مگر اللہ تعالیٰ نے کبھی تو اشیاء کو پیدا کیا بنفسہ، بلاواسطہ اور کبھی پیدا کیا بواسطہ اور واسطہ جائز ہے کہ فرشتہ ہو یا واسطہ شیطان ہو اور جائز ہے کہ طبیعت اس پر غالب آجائے تو ہر خیر وطاعت، ضمیر و خطرہ و اختیار سے ہے۔

اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کو بلاواسطہ یا بواسطہ مَلک (فرشتہ) اور ہر شر و قبائح بواسطۂ شیطان پیدا فرماتا ہے، اس لئے کہ شیطان وسوسہ ڈالتا ہے اور اللہ تعالیٰ پیدا فرماتا ہے، پھر خطرہ اولیٰ اور اس کے مثل مقتضی ہیں، خیر کو اس لئے کہ یہ افعال عبد سے نہیں اور نہ اس کے اختیار و مباشرت سے تو ثواب و عقاب کا موجب نہیں جیسا کہ یہ ثابت ہے، اس لئے کہ بندے کے دل میں خیر و شر کا خطرہ پیدا ہوتا ہے، پھر اسی ساعت اس کے مناقض خطرہ پیدا ہوتا ہے۔ پس پس خطرہ اور ضمیر پر تمسک بھی کار بند رہنا اور اس شئے کا اختیار عزیمت و قصد ہے اور یہ بندے کے اس فعل کو پسند کرنے اور ثابت کرنے سے ہوتا ہے تو جب کسی پر تمسک کیا اور اس کو اختیار کیا تو فعل حاصل ہوا اور ثابت و اختیار بندہ کی جانب سے ہے تو یہ ثواب و عقاب کا موجب ہے اور حد جبر سے خروج اس کے فعل اور اختیار کے سبب سے ہے۔ پس خطرہ اولیٰ سے احتراز ممکن نہیں ہے، سو تمسک سے احتراز ممکن ہے۔

(۴) باب نمبر چار: تکلیف وطاقت کے بیان میں

اس میں سات قول ہیں۔

پہلا قول: تکلیف اور طاقت کا بیان

جاننا چاہیئے کہ اہل سنت وجماعت کے نزدیک تکلیف مالایطاق جائز نہیں ہے اور معتزلہ، جہمیہ اور متقشفہ نے کہا کہ جائز ہے اور اس آیت سے استدلال کرتے ہیں۔ **وَلَنْ تَسْتَطِيعُوا أَنْ تَعْدِلُوا بَيْنَ النِّسَاءِ (النساء ۱۲۹)** اور تم سے ہر گز نہ ہوسکے گا کہ عورتوں کو برابر رکھو۔" اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ ان میں عورتوں کے درمیان عدل کرنے کی استطاعت نہیں اور پھر عدل کا حکم دیا کہ فرمایا: **إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ (النحل ۹۰)** بے شک اللہ حکم فرماتا ہے انصاف اور نیکی۔"

اور فرمایا:

اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ (آل عمران ۱۰۲)

اللہ سے ڈرو جیسا اُس سے ڈرنے کا حق ہے۔

پھر اس آیت سے کہ:

فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ (التغابن ۱۶)

تو اللہ سے ڈرو جہاں تک ہوسکے۔

سے آیت مذکورۃ الصدر کا حکم منسوخ فرمادیا تو نسخ سے قبل اس کو طاقت و وسعت نہ تھی۔

اور اللہ تعالیٰ نبی کریم ﷺ کی طرف سے خبر دیتا ہے:

وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا (البقرۃ ۲۸۶)

ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جس کی ہمیں سہار (طاقت) نہ ہو۔

تو اگر تکلیف مالایطاق جائز نہ ہوتی تو نبی کریم ﷺ ایسی دعا نہ کرتے اور جب دعا کی تو ثابت ہوا کہ جائز ہے۔

اور حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

من صور صورۃ کلفه اللہ تعالیٰ بان ینفخ فیه الروح و لیس بنافخ۔

"یعنی جس نے ذی روح کی صورت بنائی، اللہ تعالیٰ قیامت میں اس کو تکلیف دے گا کہ اس میں جان ڈالو اور (حالانکہ) وہ جان نہ ڈال سکے گا۔"

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

أَنْبِئُونِي بِأَسْمَاءِ هَؤُلَاءِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ (البقرة ۳۱)

سچے ہو تو ان کے نام تو بتاؤ۔

اور وہ عاجز تھے، تو ثابت ہوا کہ تکلیف مالا یطاق جائز ہے۔

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

ائْتِيَا طَوْعًا أَوْ كَرْهًا (فصلت ۱۱)

کہ دونوں حاضر ہو خوشی سے چاہے ناخوشی سے۔

معدوم کو خطاب فرمایا اور معدوم میں طاقت نہیں تو ان دلائل سے ثابت ہوا کہ تکلیف مالا یطاق جائز ہے۔

اہل سنت وجماعت کی طرف سے جوابات

وَلَنْ تَسْتَطِيعُوا (النساء ۱۲۹) کا جواب یہ ہے کہ اس سے مراد استطاعت از روئے قوت نہیں بلکہ عورتوں پر مال خرچ کرنا اور عادت کے مطابق معروف طریق سے ان کے امور زندگی کا خیال رکھنا اور ان کی بہتری اور بہبود کے لئے مقدور بھر کوشش کرنا ہے۔

پھر ہم کہتے ہیں کہ مرد کے لئے ناممکنات میں سے ہے کہ عورتوں میں وہ عادتاً موافقت ومصالحت قائم کر سکے لیکن استطاعت وقوت کے پہلو سے دیکھا جائے تو ایسا ممکن ہے۔

دوسری آیت کا جواب کہ فرمایا:

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ (النحل ۹۰)

بے شک اللہ حکم فرماتا ہے انصاف اور نیکی۔

اس سے مراد عدل ہے جو جور (ظلم) کی ضد ہے اور سیدھی سی بات ہے کہ اس پر استطاعت ثابت ہے۔

تیسری آیت کا جواب

اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ (آل عمران ۱۰۲)

اللہ سے ڈرو جیسا اُس سے ڈرنے کا حق ہے۔

یہ بھی "تکلیف علی الطاقة" تھی، اس لئے کہ انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کرام رحمہم اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے تو یہ خطاب انبیاء کرام علیہم السلام اور اولیاء اللہ رحمہم اللہ تعالیٰ کو ہے اور فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ (التغابن

۱ ۱) یہ خطاب عام لوگوں کو ہے اور تکلیف مالایطاق نہیں بلکہ تکلیف علی مایطاق ہے (لہذا معتزلہ وغیرہ کا کہنا درست نہیں کہ تکلیف مالایطاق جائز ہے کیونکہ یہ تکلیف مالایطاق ہے ہی نہیں بلکہ تکلیف مایطاق ہے اور نیز یہ کہ آیت منسوخ بھی نہیں ہے۔)اوراس میں اوراس میں کوئی فرق نہیں اوراس آیت کا جواب ہے کہ **وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا(البقرة۲۸۶)** سے مراد دوام ہے، جیساکہ امم سابقہ پر محنت شاقہ تھی اوراس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں بھی تکلیف علی مالایطاق نہیں دی تھی لیکن تعسر و دشواری تھی تو نبی کریم ﷺ نے ہمارے لئے تخفیف اور آسانی وسہولت کی دعا فرمائی تو اعتراض لازم نہیں آتا۔

اور حضور ﷺ کا ارشاد ''من صور صورۃ'' میں اللہ تعالیٰ نے نفخ روح (جان ڈالنے) کی تکلیف نہیں دی کہ ان میں روح پھونکو بلکہ ان کے عجز کا اظہار کیا ہے اوران کو عاجز ٹھہرایا کہ تم روح نہیں ڈال سکوگے اور بوجہ تصویر سازی ان کو عذاب دیا جائے گا اور یہ بھی آخرت میں ہوگا، دنیا میں نہیں اور آخرت دار التکلیف نہیں وہ تو دار الجزاء ہے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو عاجز قرار دیا، پھر ان کو تصویر سازی کی سزا دی جائے گی جو دنیا میں تصویر کھینچتے تھے۔

دلیل کا جواب

اور **أَنۡبِئُونِي بِأَسۡمَاءِ هَٰؤُلَاءِ (البقرة ۳۱)** سے تکلیف مراد نہیں، اس لئے کہ تکلیف موجب عقاب ہے اور یہاں اس کے بر خلاف ہے بلکہ مقصود اظہار عجز ہے۔

دلیل کا جواب

اور **ائۡتِيَا طَوۡعًا أَوۡ كَرۡهًا(فصلت ۱۱)** والی دلیل کا جواب یہ ہے کہ یہ خطاب نہیں ہے، اس لئے کہ ہمارے(اہل سنت) کے نزدیک معدوم کو خطاب نہیں کیا جاتا بلکہ یہ ایجاد وانشاء سے خبر دینا ہے اور حدوث کی اطلاع بہم پہنچانا ہے اور لفظ خطاب سے اعلان مراد لیا تو اعتراض لازم نہ آیا۔ دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفۡسًا إِلَّا وُسۡعَهَا(البقرة۲۸۶)** اللہ کسی جان پر بوجھ نہیں ڈالتا مگر اس کی طاقت بھر۔'' اوراسی طرح ارشاد فرمایا کہ **فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسۡتَطَعۡتُمۡ(التغابن ۱۶)** تو اللہ سے ڈرو جہاں تک ہو سکے۔''

اور نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں پر وہ بوجھ رکھا ہے جس کی وہ طاقت رکھتے ہیں اور جس کی وہ طاقت نہیں رکھتے، اللہ تعالیٰ نے ان پر (وہ بوجھ) نہیں رکھا۔

نیز حضور اکرم ﷺ سے مروی ہے کہ جس سے طاقت سلب کرلی گئی اس سے اطاعت اٹھالی گئی ہے اور اس لئے کہ تکلیف دینے کی غرض مکلف بہ (جس چیز کی تکلیف دی گئی ہے) کا وجود میں لانا ہے اور جب مکلف میں طاقت ہی نہیں تو پھر تکلیف

دینے میں کچھ فائدہ نہیں اور حکیم کا فعل حکمت سے خالی نہیں تو جب فائدہ پایا جائے گا اور وہ طاقت ہے اس فعل کے کرنے کی تو تکلیف دے جائے گی ورنہ نہیں۔

تکلیف کی قسمیں

تکلیف دو قسم پر ہے:

(۱) تکلیف الزام وایجاب (۲) تکلیف اتیان ووجود[1]

اور مکلف بہ بھی چند وجوہ پر ہیں

(۱) بعض وہ ہیں جو مالایطاق (۲) اور بعض وہ ہیں مالایطیق (۳) اور بعض وہ ہیں جو مالایمکن (۴) اور بعض وہ ہیں جو محال ہیں (۵) اور بعض وہ ہیں جو لایجوز کے زمرے میں آتے ہیں۔

اجمال کی تفصیل

اس اجمال کا بیان یہ ہے کہ تکلیف مالایطاق یہ ہے کہ وہ شئ مکلفین کی طاقت سے باہر ہو جب کہ مکلف ایک جنس کے ہوں، عادتاً تحت قدرت نہ ہو، لیکن جائز ہے، دوسری جنت کی قدرت کے نیچے عادتاً داخل ہو جیسے ملائکہ اور جن اس لئے کہ پانی پر چلنا اور ہوا میں اڑنا، دور دراز کے مصر (شہر) سے مکہ مکرمہ تک اور خراسان سے ہندوستان تک ایک دن میں جانا عادتاً آدمیوں میں اس کی طاقت نہیں، لیکن خلافِ عادت اور نقض عادت تو وہ حجت نہیں، اس لئے کہ وہ شاذونادر ہوتی ہے یا کرامت ومعجزہ سے ہوتی ہے۔ پھر اس کی طاقت فرشتے، جن اور شیاطین رکھتے ہیں۔

پس آدمی کو پانی پر چلنا یا ہوا میں اڑنے کی تکلیف دینا جائز نہیں، اس لئے کہ یہ شخص یا اس کا ہم جنس عادتاً قادر نہیں تو تکلیف دینے کا فائدہ نہ ہو گا، کسی وجہ سے تکلیف دینا جائز نہیں نہ ایجاب والزام کی جہت سے اور نہ ہی اتیان وجود کے پہلو سے تکلیف دینا جائز ہے۔

---

[1] حضرت مصنف رحمہ اللہ تعالیٰ نے آئندہ روزے اور حج کی مثال دی ہے، اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ تکلیف اتیان کا مطلب یہ ہے کہ کسی شخص کو ایک کام کرنے کا حکم دیا جائے اور مقصد یہ ہو کہ وہ شخص یہ کام کرے، اب اگر اس میں کام کرنے کی طاقت نہیں ہے تو اسے حکم دینا بے فائدہ ہے اور تکلیف وجوب کا مطلب یہ ہے کہ کسی شخص کے ذمہ ایک کام واجب اور لازم کر دیا جائے، پھر اگر وہ طاقت نہیں رکھتا تو وہ اس کا متبادل پیش کر دے گا، مثلاً شیخ فانی کے ذمہ روزہ، حج واجب ہے، وہ طاقت نہیں رکھتا تو روزے کی جگہ فدیہ دے دے اور حج کے لئے کسی شخص کی خدمت حاصل کرے۔

یہ حضرت مصنف رحمہ اللہ تعالیٰ کے زمانے کے اعتبار سے گفتگو ہے، ورنہ آج تو ہوائی جہاز اور خلائی راکٹ کے ذریعے انسان کے سفر کی رفتار بہت تیز ہو گئی ہے۔

یہ ایسے ہی ہے جیسے ہم کہیں کہ مریض اور شیخ فانی (انتہائی کمزور بوڑھا) روزہ رکھنے اور حج کے لئے مکہ معظمہ تک چلنے کی طاقت نہیں رکھتے، لیکن خطاب ایجاب والزام ان کی طرف بھی متوجہ ہو گا یہاں تک کہ ان پر روزہ اور حج واجب ہے اور ادا کرنے کی تکلیف نہیں دی جائے گی، محض اس توہم کے باعث کہ کہیں ہلاکت کا شکار نہ ہو جائیں۔

مالایمکن (ناممکن) سے مراد؟

مالایمکن یہ ہے کہ اس کا وجود اللہ تعالیٰ کی قدرت سے دنیا میں متصور ہے، لیکن انسانی عادت سے عادۃً خارج ہے، جیسے آدمی کا اڑنا اور انشقاق قمر (چاند کے ٹکڑے کرنا) اللہ تعالیٰ کی قدرت سے ہو سکتا ہے لیکن مخلوق کی قدرت سے خارج ہے۔

اور ایسے ہی تکلیف **علی مایستحیل** وہ یہ ہے کہ اس کا وجود من کل الوجوہ محال ہو۔ طعام کے وجود کے بغیر طعمہ (ذائقہ) کا پایا جانا اور جوہر کے وجود کے بغیر عرض کا پایا جانا محال ہے، ایسے ہی اللہ تعالیٰ سبحانہ کے لئے اثبات محال ہے تو بہر حال تکلیف اوران دونوں معنیٰ کے لحاظ سے جائز نہیں۔

اور تکلیف **مالایجوز** وہ تکلیف دینا ہے معصیت پر کہ یہ شخص کر سکتا ہے اور اس کا وجود متصور ہو سکتا ہے، لیکن شریعت میں ممنوع اور منہی عنہ ہے تو اس کی تکلیف جائز نہیں، خواہ وہ ایجاب والزام کی جہت سے ہو اور چاہے اتیان ووجود کے پہلو سے، کسی طرح سے جائز نہیں ہے۔ اس لئے کہ اگر معصیت کا ارتکاب کیا تو ممنوع نہیں ہے اور نہ مکلف ہو گا، بتکلیف استطاعت اس معصیت کے وقت بغیر تکلیف وتسلیط کے تو بمقتضائے حکمت جائز ہے باوجود ان دونوں سے نہی وارد ہونے کے۔

دوسرا قول: زجر وامتناع (ڈانٹنے اور منع کرنے) کا بیان

جاننا چاہیئے کہ زجر وتحریم اور منع در حقیقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں اور اللہ تعالیٰ ہی تحریم کو واجب کرتا ہے اور جو مباح قرار دے اور بلا عذر اور بغیر شبہ کے حلال جانے، وہ کافر ہو جائے گا۔

روافض اور جہمیہ کہتے ہیں: "**تحریم**" کراہت کے معنی میں ہے اور زجر حرمت کے معنی میں ہے۔

اور بعض نے کہا کہ جو چیز عین نص سے ثابت ہو گی تو وہ تحریم کی موجب ہے اور اس کے علاوہ دلالت، اشارت، تأویل اور مقتضٰی وقیاس سے جو ثابت ہوں گی وہ تحریم کو واجب نہیں کریں گی۔ اسی معنیٰ کے لحاظ سے انہوں نے کہا کہ خمر (شراب) اور لواطت (بد فعلی) اور متعہ حلال ہے اور گانا بجانا، رقص وسرور اور شعر وشاعری حلال ہیں، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ

نے قرآن مجید میں صریحاً حرام نہیں فرمایا، کیونکہ قرآن پاک میں اجۡتَنِبُو ہے اور اجتناب کراہت پر دلالت کرتا ہے اور ایسے ہی لواطت (غیر فطری فعل) کو منکر کے نام سے بیان فرمایا:

جواب: یہ ہے کہ خمر (شراب) کے حرام ہونے کی دلیل یہ ہے کہ:

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ (المائدة ۹۰)

اے ایمان والو شراب اور جُوا اور بُت اور پانسے ناپاک ہی ہیں شیطانی کام تو ان سے بچتے رہنا کہ تم فلاح پاؤ۔

عملِ شیطان حرام ہے اور ہر "رجس" حرام ہوتا ہے اس دلیل سے کہ فرمایا:

وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ (الاعراف ۱۵۷)

اور گندی چیزیں اُن پر حرام کرے گا۔

اور "فَاجْتَنِبُو" امر ہے اجتناب کے لئے اور اجتناب محض قبیح باتوں سے ہوتا ہے اور فرمایا:

فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ (البقرة ۲۱۹)

"ان دونوں میں بڑا گناہ ہے۔"

اور "إِثْمٌ" (گناہ) اور محرمات (حرام شدہ) میں ہوتا ہے، تو ثابت ہوا کہ حرام قطعی ہے، جو حلال جانے وہ کافر ہو جائے گا۔

اور حضور اقدس ﷺ نے فرمایا:

"کل مسکر حرام و کل خمر حرام"۔

ہر نشہ آور حرام اور ہر خمر حرام ہے۔

اور ایسے ہی لواطت (بدفعلی) حرام ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

أَتَأْتُونَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ أَحَدٍ (الاعراف ۸۰)

"کیا وہ بے حیائی کرتے ہو جو تم سے پہلے کسی نے نہ کی۔"

اس کا نام فاحشہ رکھا پھر خبر دی کہ فواحش (بے حیائی کے کام) حرام ہیں، دلیل یہ ہے کہ:

قُلْ إِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ (الاعراف ۳۳)

"تم فرماؤ میرے رب نے تو بے حیائیاں حرام فرمائی ہیں جو ان میں کھلی ہیں اور جو چھپی۔"

لعنتی کون؟

اور نبی کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم سے مروی ہے کہ فرمایا: جو شخص ماں اور بیٹی کو نکاح اور ملک یمین میں جمع کرے وہ ملعون اور جو کسی کے زمین کے نشانات مٹائے وہ ملعون ہے، جو جانور سے بد فعلی کرے وہ ملعون ہے اور جو قومِ لوط کا عمل کرے وہ ملعون (لعنتی) ہے۔

لواطت کی حرمت اور سزا

نبی کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے فرمایا: فاعل اور مفعول بہ (بد فعلی کرنے والا اور بد فعلی کروانے والے) دونوں کو قتل کر دو۔ ثابت ہوا کہ لواطت (غیر فطری کام) حرام ہے اور جو حلال سمجھے کافر ہے۔

متعہ کی حرمت اور اس کا حکم

متعہ پہلے مباح تھا، پھر خیبر میں گدھا اور "متعہ" حرام کر دیئے گئے اور ان کے منسوخ ہونے پر امت کا اجماع ہے اور جو متعہ کو حلال جانے کافر ہے۔

ناچ گانے کا شرعی حکم

لہو ولعب (کھیل کود)، رقص و سرور اور شعر و شاعری کو مباح سمجھنے والا فاسق ہے کافر نہیں۔ اس لئے کہ اس کی حرمت خبر آحاد سے ثابت ہے اور جو نہی نص یا دلالت النص اور خبر متواتر یا اجماع امت سے وارد ہو تو وہ لا محالہ موجب حرمت ہے اور اس کے وارد ہونے سے سابقہ احکام منسوخ ہوں گے اور جو اس کا منکر ہو وہ کافر ہے۔

خبر واحد اور قیاس کا حکم

اور جو خبر واحد اور قیاس کے حجت ہونے کا انکار کرے کافر ہے اور اگر یوں کہے کہ یہ خبر غیر صحیح ہے یا یہ قیاس غیر ثابت ہے تو کافر تو نہ ہو گا فاسق ہے اور اگر کوئی حکم قیاس سے یا خبر واحد سے ثابت ہو اور امت متفقہ طور پر اجماع کرے اور کوئی اختلاف نہ کرے تو یہ اجماع ہو گیا جو اجماع کا انکار کرے تو کافر ہو جائے گا۔

تیسرا قول: حدود و کفارات کا بیان

اہل سنت وجماعت فرماتے ہیں کہ حدود و کفارات تطہیر ہے (اس سے گناہوں سے پاک ہوجاتا ہے) اوراس کے عمل کی جزاء ہے اوراس کے کرتوتوں کا کفارہ ہے، اسی طرح جب بندہ کو تکلیف اوررنج وآلام پہنچتے ہیں تووہ گناہوں کا کفارہ ہوجاتے ہیں یا کثرتِ ثواب ترقی درجات کا باعث ہوتے ہیں۔

معتزلہ اورروافض نے انکار کیا، اس لئے کہ انہوں نے کہا کہ حدود و کفارات زجر وتوبیخ کے لئے مشروع ہوئے ہیں کہ قبائح اور سیئات سے رکیں، رنج ومحن، آلام ومصائب اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں، اس لئے کہ دنیادارالجزاءاور ثواب کاگھر نہیں، وجوبِ ثواب کا سبب وہ اطاعت ہے اور ثواب آخرت میں ملے گا اورایسے ہی تکفیر عقوبت سے ہوگی اور عقوبت آخرت میں ہوگی اور حدود و کفارات زجر ومنع کے لئے مشروع ہیں اوراس کے علاوہ تکالیف اور مصائب وآلام وغیرہ خدا کی طرف سے نہیں۔ اہل سنت وجماعت نے کہا: رنج ومحن، آلام وامراض سب کچھ خدا کی طرف سے ہوتے ہیں اور گناہوں کا کفارہ ہوجاتے ہیں اوراس کے عملوں کی جزاءاورانعام واجر ہے اور یہ بدل سے خالی نہیں، اس لئے کہ انبیاء علیہم السلام کورنج ومحن، تکالیف ومصائب پہنچے، ان کے حق نہیں، عقوبت نہیں توثابت ہوا کہ ثواب وترقی مدارج کے لئے ہیں اورآخرت میں اجر وثواب ملے گا اور یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عدل ہے لیکن حدود و کفارات جزاء عمل ہے اور گناہوں سے پاک ہونے کا ذریعہ ہے، دلیل یہ ہے: وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوا أَيْدِيَهُمَا جَزَاءً بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِنَ اللهِ (المائدۃ ۳۸) اور جو مرد یا عورت چور ہو تو ان کا ہاتھ کاٹو ان کے کیے کا بدلہ اللہ کی طرف سے سزا۔" تواللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ یہ ان کے عملوں کی جزاء ہے۔

اور مروی ہے کہ ایک عورت حضوراقدس ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کرنے لگی: یارسول اللہ ﷺ! میں نے زنا کیا ہے، مجھے پاک کردیجئے۔ جب چار مرتبہ اس نے اقرار شرعی کیا توآپ ﷺ نے سنگساری کا حکم دے دیا اور یہ نہیں فرمایا کہ رجم گناہوں سے پاک کرنے والا نہیں ہے توثابت ہوا کہ حدمطھر الذنوب (گناہوں سے پاک کرنے والی) ہے اور نیز حضور ﷺ نے فرمایا: تلوار گناہ مٹانے والی ہے۔

اور فرمایا حضور ﷺ نے: جب کبھی مؤمن کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے توگناہوں کا کفارہ ہوجاتا ہے، یہاں تک کہ لقمہ اس کے منہ میں پھنس جائے اورایک روایت میں ہے کہ کانٹا چبھے۔

اور فرمایا: "الموت کفارة" موت کفارہ ہے۔ حضورانور ﷺ کا ارشاد ہے کہ موت ہر مسلمان کے لئے کفارہ ہے، توثابت ہوا کہ حدود و کفارات گناہوں کا کفارہ ہیں اور ثواب وجزاء کا موجب ہیں۔

چوتھا قول: توبہ اور استعاذہ کا بیان

اہل سنت وجماعت فرماتے ہیں کہ بندے کی توبہ ہر گناہ سے جو اس سے سرزد ہوا ہو، چاہے جان کر یا بھول کر قبول ہوتی ہے اور دعا، صدقہ اور استعاذہ (پناہ مانگنا) دنیا میں نفع مند ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ توبہ ہر گناہ کے لئے شرط ہے اور گناہ کو یاد کئے بغیر توبہ کرنا صحیح نہیں۔

اور بعض نے کہا کہ تمام گناہوں سے توبہ کرنا شرط ہے، تب اس کی توبہ صحیح ہو گی۔

معتزلہ کے نزدیک توبہ کا مفہوم

معتزلہ کہتے ہیں کہ توبہ یہی ہے کہ اللہ عزوجل پر ایمان لائے، اس لئے کہ ان کے نزدیک توبہ گناہ کبیرہ سے ہے اور بندہ ارتکاب کبیرہ سے ایمان سے نکل جاتا ہے اور تو اس کی توبہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے۔

دعا وصدقہ وغیرہ دنیا میں بے سود ہیں؟

معتزلہ کہتے ہیں کہ دعا، صدقہ اور استعاذہ دنیا میں نفع نہیں دیتے، اس لئے کہ دعا وصدقہ اگر کسی خیر کے لئے کیے ہیں تو خیر قضاء الٰہی سے ہوتی ہے تو اگر خیر کا سوال کیا تو یہ اللہ تعالیٰ کی قضاء کے موافق ہو گی، سوال کرے یا نہ کرے خیر تو بقضاء اللہ ہوتی ہی ہے اور اگر وہ دعا موافق قضاء نہیں تو وہ دعا نفع نہ دے گی اور قضاء الٰہی کو نہیں بدلے گی۔

اور اگر دعا واستعاذہ شر سے ہے تو یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں بلکہ شر سب بندہ کی طرف سے ہے اور بندہ ایک پہلو سے صاحبِ استطاعت بنایا گیا ہے تو یہ جہد و تقصیر کوشش اور کوتاہی بندے کی طرف سے ہے۔

صدقہ وخیرات کے متعلق معتزلہ کا مسلک

معتزلہ کے نزدیک زندوں کی طرف سے دیئے گئے صدقات وخیرات کا مردوں کو کوئی نفع نہیں پہنچتا۔ معتزلہ دلیل دیتے ہیں کہ "کل نفس مرھونۃ بما کسبت" ہر جان اپنے اعمال کی مرہون اور پابند ہے، جیسا کمائے گی ویسا پائے گی۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (السجدۃ ۱۷) صلہ اُن کے کاموں کا۔ "تو قیامت میں جو کام کیا ہے، اس کا بدلہ دیا جائے گا اور غیر نے جو کام کیا ہے اس بدلہ اس کو نہیں ملے گا۔[1]

---

[1] تو دعا، خیرات وصدقات دوسرے کا عمل ہے، لہذا غیر کے عمل کا اس کو نفع نہیں پہنچتا۔

اوراسی طرح ''لاحول ولاقوۃ الاباللہ العلی العظیم'' نہیں کوئی نیکی کی توفیق اور برائی سے بچنے کی طاقت سوائے اللہ تعالیٰ بلند وبرتر کے۔'' کے منکر ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ لوگوں کے منہ میں شیطان نے ڈال دیا ہے اور یہ کفر ہے، اس لئے کہ جو شخص ''حول وقوۃ'' کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں سمجھتا، وہ کافر ہے۔

''لاحول ولاقوۃ'' کی زبانِ رسالت سے تفسیر

اور نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ ''لاحول ولاقوۃ'' کی تفسیر دریافت کی تو فرمایا: ''لاعصمة من معصية الابعصمة الله'' کہ اللہ تعالیٰ کی حفاظت وعصمت کے بغیر کوئی معصیت سے محفوظ نہیں رہ سکتا، اور طاعت وعبادت کی قدرت اللہ تعالیٰ کی اعانت وامداد کے بغیر نہیں ہوسکتی۔

مسئلہ قدراور امام زفر

حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سامنے امام زفر رحمہ اللہ تعالیٰ کا تذکرہ کیا گیا کہ وہ ''قدر'' کی طرف مائل ہیں۔ اتنے میں امام زفر مسجد میں داخل ہوئے اور فرمایا: ''لاحول ولاقوۃ الاباللہ العلی العظیم'' نہیں کوئی نیکی کی توفیق اور برائی سے بچنے کی طاقت سوائے اللہ تعالیٰ برتر کے، توامام صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ زفر قدر کو دیکھتا ہے (یعنی ان کا عقیدہ قدر کے بارے میں درست ہے، وہ مانتا ہے)۔

اہل سنت وجماعت کی حجت ودلیل اس مسئلہ میں کہ ایک توبہ تمام گناہوں کے لئے کافی ہے۔ جان بوجھ کر دانستہ طور پر کئے ہوں یا بھول کر سب کے لئے ایک ہی توبہ کافی ہے۔

ایک توبہ سب گناہوں کے لئے کافی ہے

ہر ایک گناہ کے لئے علیحدہ علیحدہ توبہ کرنا شرط نہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَتُوبُوا إِلَى اللَّهِ جَمِيعًا (النور ۳۱) اور اللہ کی طرف توبہ کرو اے مسلمانو سب کے سب۔'' اور یہ نہیں فرمایا: جدا جدا گناہوں کی توبہ کرو۔ ایک دوسری جگہ اللہ جل مجدہ نے فرمایا: ثُمَّ تُوبُوا إِلَيْهِ (ھود ۵۲) پھر اس کی طرف رجوع لاؤ۔'' نیز فرمایا: غَافِرِ الذَّنْبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ (غافر ۳) ''گناہ بخشنے والا اور توبہ قبول کرنے والا۔'' توبہ کا مطلقاً حکم فرمایا اور یہ شرط نہیں کہ تمام گناہوں کو یاد کرکے توبہ کرو۔

توبہ کی خوبصورت اور جامع تفسیر

حضور اقدس ﷺ نے فرمایا: ''الندم توبة'' پشیمان ہونا توبہ ہے اور یہاں گناہوں کی تفصیل کی شرط نہیں تو صحیح یہی ہے۔ [1]

---

[1] کہ تمام گناہوں کے لئے ایک مرتبہ توبہ ہی کافی ہے، خواہ ایسے گناہ یاد ہوں یا بھول چکے ہوں۔

دعااور صدقہ کے دنیوی فوائد

دعا، استعاذہ اور صدقہ دنیا میں بھی نفع دیتے ہیں۔

حضور نبی کریم ﷺ سے مروی ہے:

"الدعاء یرد البلاء" دعابلا کو رد کرتی ہے۔

"والصدقة تطفیٔ غضب الرب"۔

صدقہ اللہ تعالیٰ کے غضب کو بجھاتا ہے (ٹھنڈا کرتا ہے)۔ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا:

"لولا المشائخ الرکع والصبیان الرضع والبهائم الرتع لصب علیکم العذاب صبا"۔

یعنی فرمایا: اگر بوڑھے عمر رسیدہ نمازی نہ ہوتے، شیر خوار بچے نہ ہوتے اور چرنے والے چوپائے نہ ہوتے توتم پر عذاب کی زوردار بارش ہوتی مگر ان کے طفیل تم بچے ہوئے ہو۔

زندوں کی دعامردوں کو نفع دیتی ہے

زندوں کی دعااور صدقات مردوں کو نفع دیتے ہیں۔ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب عالم یاطالب کسی گاؤں سے گزرتا ہے تواس بستی کے قبرستان سے اللہ تعالیٰ چالیس دن کے لئے عذاب دور فرمادیتا ہے۔

نیز حضور اکرم ﷺ نے دو قبروں پر کھجور کی ہری بھری تروتازہ شاخیں رکھیں اور فرمایا: جب تک یہ ٹہنیاں خشک نہ ہوں گی، اللہ تعالیٰ ان قبر والوں کے عذاب میں تخفیف فرمادے گا، ان کا عذاب ہلکا ہو جائے گا۔

حضور ﷺ نے عالمِ خواب میں مصنف ابو شکور سالمی رحمہ اللہ تعالیٰ کو تعلیم فرمائی

المہتدی ابو شکور سالمی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور پرنور سید عالم ﷺ کو خواب میں دیکھا کہ آپ ﷺ "حظیرہ مشبک" میں جلوہ افروز ہیں اور کثرتِ نوراور وفورِ ضیاء کی وجہ سے میں (یعنی انوار و تجلیات کی فراوانی کی وجہ سے) صرف چہرۂ انور کو دیکھ پایا تو میں نے سنا: حضور پرنور ﷺ فرماتے ہیں کہ جس نے ہر جمعہ کو دو من (دو سیر) روٹی یا دو درہم صدقہ کیے (راوی کو شک ہے کہ روٹی فرمایا یا درہم، غالب گمان یہی ہے) تو اللہ تعالیٰ اس کے ماں باپ کو قبر میں عذاب نہیں دے گا۔ یہ دلیل ہے کہ عذاب قبر حق ہے اور دلیل ہے کہ صدقات اور زندوں کی دعا مردوں کو نفع دیتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

پانچواں قول: سعادت وشقاوت کا بیان

اہل سنت وجماعت کے بعض فقہائے کرام رحمہم اللہ تعالیٰ نے فرمایا: شقی (بدبخت) سعید (نیک بخت) ہو سکتا ہے اور سعید، شقی ہو سکتا ہے۔ یہی قول حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ہے۔

اور بعض فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ سعید (نیک بخت) شقی نہیں ہو سکتا اور شقی سعید نہیں ہو سکتا ہے اور یہ قول عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما اور مجاہد کا ہے۔ یہی اختلاف اجل (عمر) اور رزق کے متعلق ہے۔

بعض نے کہا: رزق اور اجل (مدتِ حیات) میں کمی وبیشی ہو سکتی ہے۔

اور بعض نے کہا: رزق اور عمر میں کم وبیش ہونے کا امکان نہیں ہے۔

حاصل اختلاف یہ ہے کہ زیادتی ونقصان (کمی) اور احکام میں تغیر عند الخلق ظاہر ہوتا ہے اور مخلوق کے علم میں، لیکن اللہ تعالیٰ کے علم میں اور اس کے نزدیک تغیر وتبدل نہیں ہو سکتا۔

رأس المفسرین محمد بن فضل نے فرمایا کہ لوحِ محفوظ میں یہ لکھا ہوا ہے کہ فلاں سعید ہے، اگر میں چاہوں اور فلاں شقی ہے اگر میں چاہوں۔

اور بعض فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ قضاء کی دو قسمیں ہیں۔

تقدیر کی اقسام

قضاء معلق اور قضاء مبرم۔

قضاء مبرم میں تغیر وتبدل جائز نہیں، جیسے وحی، نبوت اور انبیاء کرام علیہم السلام کی سعادت ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

لَاتَبْدِیلَ لِکَلِمَاتِ اللہِ (یونس ۶۴)

اللہ کی باتیں بدل نہیں سکتیں۔

اور قضاء معلق میں تغیر وتبدل جائز ہے، جیسے مرض وشفاء، نیند، گفتگو اور تمام افعال واحوال عبادت کہ اس میں تغیر وتبدل جائز ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

یَمْحُو اللہُ مَایَشَاءُ وَیُثْبِتُ (الرعد ۳۹)

"اللہ جو چاہے مٹاتا اور ثابت کرتا ہے۔"

یہ چاروں مسائل حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نزدیک قضاء معلق سے ہیں اور عبد اللہ بن عباس اور مجاہد رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے نزدیک قضاء مبرم میں داخل ہیں۔

خلیفۂ دوم حضرت امیر المؤمنین عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے اپنی دعا میں کہا: الٰہی اگر تو نے ام الکتاب میں مجھ کو شقی لکھا ہے تو اسم شقاوت مجھ سے مٹا دے اور مجھ کو سعید (نیک بخت) لکھ دے، اس لئے کہ تو نے فرمایا کہ جس کو چاہے، مٹائے اور جس کو چاہے ثابت رکھے۔

والدین سے نیکی کرنے اور تبلیغِ دین کرنے سے تقدیر بدل جاتی ہے

فرمانِ رسول ﷺ: اور حضرت شیر علی المرتضی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم سے مروی ہے کہ انہوں نے حضور پر نور ﷺ سے دریافت کیا: یَمۡحُو اللّٰهُ مَا یَشَاءُ (الرعد ۳۹) سے کیا مراد ہے؟ اور یُثۡبِتُ (الرعد ۳۹) ”سے کیا مراد ہے؟ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ شقاوت اور بد بختی کو مٹا دیتا ہے، مثلاً ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنے سے، صدقہ دینے سے اور بھلائی کا حکم کرنے سے اللہ تعالیٰ شقاوت کو مٹا دیتا ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عباس و مجاہد رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے دلائل

حضرت ابن عباس اور مجاہد رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی دلیل یہ حدیث ہے، عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی کریم ﷺ سے راوی ہیں، فرمایا: سعید (نیک بخت) وہ ہے جو ماں کے پیٹ میں سعید (نیک بخت) ہوا اور شقی (بد بخت) وہ ہے جو ماں کے پیٹ میں شقی ہوا۔ نیز حضور ﷺ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے حضرت یحیٰی علیہ السلام کو ان کی ماں کے پیٹ میں مؤمن سعید نبی پیدا کیا اور فرعون کو اس کی ماں کے پیٹ میں شقی کافر پیدا کیا اور نیز حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے جنت کو پیدا کیا اور اس کے لئے جنتی پیدا کیے اور دوزخ کو پیدا کیا اور اس کے لئے دوزخی پیدا کیے۔

ایک اجمال کا بیان

اور یہ جو ہم نے بیان کیا کہ زیادت و نقصان اور تغیر و تبدل بندوں کے نزدیک اور بندوں کے علم میں ہوتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کے نزدیک اور اس کے علم میں زیادت و نقصان اور تغیر و تبدل نہیں ہوتا تو اس اجمال کا بیان یہ ہے کہ ایک شخص دیوار کے نیچے بیٹھا یا مکان میں بیٹھا تھا اور دیوار یا مکان گرا اور یہ شخص دب کر مر گیا تو بندوں کے نزدیک اور بندوں کے علم میں تو یہ ہے کہ

اگر یہ شخص دیوار یا مکان کے نیچے نہ بیٹھتا تو امید تھی کہ دیر تک زندہ رہتا یا کسی نے قصداً کسی انسان کو قتل کر دیا اور وہ قصاص میں قتل کیا گیا تو اگر وہ قتل نہ کرتا تو وہ قتل نہ کیا جاتا اور بظاہر وہ عرصۂ دراز تک زندہ رہتا۔

اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ (البقرة ۱۷۹)

اور خون کا بدلہ لینے میں تمہاری زندگی ہے اے عقلمندو۔

تو یہ قضاء معلق کی صفت ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کے علم میں زیادت و نقصان (زیادتی و کمی) تغیر و تبدل (تبدیلی) ممکن نہیں کیونکہ وہاں سہو ونسیان اور غلطی کا امکان ہی نہیں ہے اور اس لئے کہ اللہ تعالیٰ تمام اشیاء کو جانتا ہے، جیسی وہ ہیں تو وہ جانتا ہے اس کی موت کا وقت اور اس کی کیفیت تو اپنے علم کے مطابق کرتا ہے۔

اور ایسی ہی رزق، سعادت و شقاوت اس لئے کہ ارادہ و قضاء علم کے مقتضیات میں سے ہیں تو جب اس کے علم میں ہے کہ فلاں شئے نے ہونا ہے، فلاں وقت میں، فلاں دن میں، فلاں کیفیت کے ساتھ اور اس کی مقدار یہ ہوگی تو وہ اپنے علم کے مطابق ارادہ کرتا ہے اور فیصلہ فرماتا ہے، اس لئے کہ اس کا ارادہ اور قضاء (فیصلہ) اس کے علم کے خلاف نہیں ہو سکتے۔

اور جس نے یہ کہا کہ سعید شقی اور شقی سعید ہو سکتا ہے تو وہ بندوں کے نزدیک اور ان کے علم میں اس لئے کہ کافر لامحالہ شقی ہے مگر جب وہ مسلمان ہو گیا تو ہم کہتے ہیں کہ وہ لامحالہ مسلمان و سعید ہے مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ کے ارادہ پر موقوف ہے کہ انجام کیا ہوگا؟

اس لئے کہ ہم کسی مسلمان کو یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ قطعی جنتی ہے اور کافر کو یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ قطعی جہنمی ہے، اس لئے کہ ہمیں خاتمہ اور انجام کی خبر نہیں، مگر یہ کہیں گے: جو مسلمان مراوہ جنت میں ہوگا اور جو کافر مراوہ جہنم میں ہوگا۔

جبریہ کا مسلک

جبریوں نے کہا کہ مؤمن ایمان پر مجبور ہے اور کافر کفر پر مجبور ہے اور ابلیس جس وقت اسلام لایا اور خدا کی عبادت کی تو اس وقت بھی وہ کافر تھا اور ابو بکر و عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما جس وقت اسلام نہیں لائے تھے تب بھی وہ مسلمان تھے۔

دلیل یہ ہے:

هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَمِنْكُمْ مُؤْمِنٌ (التغابن ۲)

وہی ہے جس نے تمہیں پیدا کیا تو تم میں کوئی کافر اور تم میں کوئی مسلمان۔

اور فرمایا:

وَلَایَلِدُوااِلَّافَاجِرًاکَفَّارًا(نوح ۲۷)

اور ان کے اولاد ہو گی تو وہ بھی نہ ہو گی مگر بدکار بڑی ناشکر۔

جبریہ کے ان آیات محولہ بالا سے استدلال کا جواب دیتے ہوئے ہم کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا کیا، جب بھی کیا، اشخاص واعیان کی صورت میں، ہم یہ نہیں کہتے کہ وہ مؤمن تھے یا کافر تھے، مگر انبیاء کرام علیہم السلام کے حق میں یہ کہیں گے کہ وہ مؤمن ہی پیدا ہوئے، پھر جو مخلوق میں سے ایمان لایا تو ان کے اعتقاد واقرار کے ساتھ ایمان بھی پیدا کیا گیا اور ان میں سے جو کافر ہوا تو ان کے اعتقاد و عمل و قول کے ساتھ کفر بھی پیدا کیا گیا اور اگر ایک بھی کفر نہ کرتا تو اللہ تعالیٰ کفر کو پیدا نہ فرماتا۔

لیکن اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَمِنْكُمْ مُؤْمِنٌ (التغابن ۲) تو ہم کہتے ہیں کہ یہ آیت ہمارے لئے حجت ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ (التغابن ۲) پھر فرمایا: فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَمِنْكُمْ مُؤْمِنٌ (التغابن ۲) یعنی منكم من يصير كافر أو منكم من يصير مؤمنا'' یہ کہ اللہتعالیٰ نے فرمایا: وہ، وہ ذاتِ مقدس ہے جس نے تم کو پیدا کیا اور پھر تم میں سے کچھ کافر ہو گئے اور تم میں سے کچھ مؤمن ہو گئے۔

اور وَلَا يَلِدُوا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا (نوح ۲۷) کے معنی بھی یہ ہیں کہ عنقریب فاجر و کفار ہو جائیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کافر ہی پیدا ہوں، اپنے ماں باپ کے تابع قرار دے کر حکماً انہیں کافر فرمایا۔

موت ایک ہے یا زیادہ؟

بعض معتزلہ کہتے ہیں کہ اجل ہے کیونکہ انسان قتل کیا جائے یا بغیر معالجہ کے مر جائے تو وہ بغیر اجل (موت) کے مرتا ہے۔

اہل سنت وجماعت فرماتے ہیں کہ جو شخص بغیر معالجہ کے مرتا ہے یا قتل ہو جاتا ہے، خواہ کسی بھی وجہ سے قتل کیا جائے یہی اس کی اجل (موت) ہے۔

دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

فَإِذَاجَاءَأَجَلُهُمْ لَايَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَلَايَسْتَقْدِمُونَ (الاعراف ۳۴)

توجب ان کا وعدہ آئے گا ایک گھڑی نہ پیچھے ہو نہ آگے۔

نیز اللہ جل مجدہٗ فرماتا ہے:

تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَاوَهُمْ لَا يُفَرِّطُونَ (الانعام ۶۱)

ہمارے فرشتے اس کی روح قبض کرتے ہیں اور وہ قصور نہیں کرتے۔

اور فرمایا: اوراس لئے کہ اللہ تعالیٰ حقیقتاً جانتا ہے، اس کی اجل (موت) کو تو یہ محال ہے کہ اس کے خلاف ہو، پھر یہ بھی ناممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قضاء اس کے علم کے خلاف ہو جیسا کہ ہم کہہ آئے ہیں اور معتزلہ کہتے ہیں کہ بقضاء اللہ نہیں اور یہ کفر ہے۔

معتزلہ کی طرف سے اعتراضات اوران کے جوابات

اگر کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **ثُمَّ قَضَى أَجَلًا وَأَجَلٌ مُسَمًّى عِنْدَهُ (الانعام ۲)** پھر ایک میعاد کا حکم رکھا اور ایک مقرر وعدہ اس کے یہاں ہے۔" اوراس لئے کہ اگر مقتول قتل نہ ہوتا تو آیا زندہ رہتا یا اسی وقت اچانک (طبعی موت) مر جاتا؟

ہم نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان **ثُمَّ قَضَى أَجَلًا (الانعام ۲)** یعنی پیدا کیا جائے گا یہاں تک کہ مرے اور **أَجَلٌ مُسَمًّى عِنْدَهُ (الانعام ۲)** کے معنی ہیں: جب بھی مرے یہاں تک کہ اٹھایا جائے اوران کا یہ کہنا کہ مقتول اگر قتل نہیں کیا جاتا تو کیا وہ زندہ رہتا یا مر جاتا؟

ہم کہتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ کے علم میں یہ ہے کہ اس کی اجل (موت) قتل سے ہے تو اس کے خلاف نہیں ہو سکتا اور اگر اللہ تعالیٰ جانتا تھا کہ وہ قتل نہیں کیا جائے گا تو ایسا ہی ہو گا اور خلاف اس مسئلہ موت میں اور مسئلہ رزق میں برابر ہے۔

حرام کو رزق کہا جائے گا یا نہیں؟

معتزلہ کے نزدیک حرام رزق نہیں ہے اور حرام کا کھانا اللہ تعالیٰ کا رزق کھانا نہیں، اس لئے کہ حرام اللہ تعالیٰ کی قضاء سے نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف اوراس کی قضاء سے ہوتا تو ملک حلال ہونا چاہیئے تھے اور حرام ملک نہیں تو رزق بھی نہ ہوا۔

اہل سنت وجماعت فرماتے ہیں: رزق تو غذا ہے اور غذا حلال ہو یا حرام دونوں برابر ہیں، غذا ہونے میں دونوں کا ایک حکم ہے۔

دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: **نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَعِيشَتَهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا (الزخرف ۳۲)** ہم نے اُن میں ان کی زیست (زندگی گزارنے) کا سامان دنیا کی زندگی میں بانٹا۔" اور فرمایا: **فَوَرَبِّ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ إِنَّهُ لَحَقٌّ مِثْلَ مَا أَنَّكُمْ تَنْطِقُونَ (الذاریات ۲۳)** تو آسمان اور زمین کے رب کی قسم بے شک یہ قرآن حق ہے ویسی ہی زبان میں جو تم بولتے ہو۔" اوراگر رزق کے لئے ملک ہونا ضروری ہوتا تو حیوانات (جاندار)، بہائم (چارپائے)، طیور (پرندے) اللہ تعالیٰ کا رزق کھاتے ہیں حالانکہ وہ مالک نہیں ہیں نہ وہ ملکیت کے اہل ہی ہیں۔

اور جس نے کہا کہ حرام قضاء الٰہی سے نہیں ہے تو (اس شخص کے مذہب پر) پھر دوسرے قاضی کی حاجت ہو گی اور یہ (اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے کو تقدیر کا مالک ماننا) کفر ہے۔

مفروغیہ کا مذہب

اور بعض کہتے ہیں اور وہ مفروغیہ فرقہ ہے کہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی قضاء سے ہے، طرفۃ العین کے برابر نہ زائد ہونہ کم (یعنی اس میں ذرہ برابر کمی وبیشی ممکن نہیں) مگر اللہ تعالیٰ نے تمام چیزوں کو پیدا کیا اور ان کے ظاہر وباطن سب چیزوں کا اندازہ کر دیا، یہاں تک کہ درختوں کے پھل پھول، قیامت تک جو ہونا تھا، وہ سب پیدا کر کے فارغ ہو گیا اور اب کچھ باقی نہیں ہے کہ پیدا کرے، اب وہ پیدا کرنے سے فارغ ہے اور قضاء وقدر سے بھی فارغ۔ دلیل یہ ہے کہ هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا (البقرة ۲۹) وہی ہے جس نے تمہارے لیے بنایا جو کچھ زمین میں ہے۔'' جس نے تمہارے لئے پیدا کیا جو آسمان وزمین میں ہے اکٹھا (یعنی سب کچھ ایک دم پیدا کر دیا)۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اشیاء کو ظہور سے قبل پیدا نہیں کیا، ہاں! جانتا اور ارادہ فرماتا ہے اور ہر چیز کی قضاء وقدر یعنی ان کا اندازہ اور فیصلہ فرماتا ہے اور ہر چیز کے لئے اس کی خوراک وروزی مقدر فرمادی اور پیدا کیا جب بھی پیدا کیا۔

دلیل یہ ہے کہ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ (الرحمن ۲۹) اُسے ہر دن ایک کام ہے۔''

حضرت سیدنا امام جعفر صادق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے دریافت کیا گیا کہ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ (الرحمن ۲۹) کے کیا معنی ہیں؟ اور حالانکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا (البقرة ۲۹) امام جعفر صادق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: اس کی شان یہ ہے کہ مقادیر کو مواقیت پر چلاتا ہے (یعنی جو کچھ جس وقت میں ہونا مقدر ہو چکا ہے، اس وقت میں اس کو پیدا فرماتا ہے)۔

كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ (الرحمن ۲۹) کی دوسری تفسیر

حضرت علی ابی طالب کرم اللہ وجہہ الکریم سے پوچھا گیا: كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ (الرحمن ۲۹) کا کیا مطلب ہے؟ فرمایا: اس کی شان یہ ہے کہ نطفہ کو باپوں کی پشت سے ماؤں کے رحم میں پہنچاتا ہے، پھر اس کی صورت بناتا ہے پھر ماں کے پیٹ سے اس کو نکالتا ہے، پھر اس کو دنیا سے نکال کر قیامت کے دن اٹھائے گا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ (الرحمن ۲۹) یعنی یمضیه لافی شان یقضیه۔ تو ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی قضا اور اس کا حکم اور اس کی تقدیر اور اس کا شقاوت وسعادت کے بارے میں علم اور اسی طرح رزق، موت تمام اشیاء کا علم نہ متغیر ہو نہ کم وبیش ہو، یہ سب کچھ ہمارے ہاں ثابت ہے اور ہمارے علم میں ہے۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: المقدور کائن و الھم فضل اور کہا گیا ہے: ان الھم من المقدور ایضاً یعنی جو مقدور ہے وہ ہونے والا ہے اور قصد زائد ہے (اور کہا گیا ہے کہ قصد و تلاش معاش یہ بھی مقدور ہے)۔

پھر ہم کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تمام اشیاء کو جانتا ہے ان کے اوقات میں اور اللہ تعالیٰ کافروں کو جانتا ہے ان کے کفر کے وقت کہ یہ کافر ہیں اور مؤمنوں کو جانتا ہے ان کے ایمان کے وقت مؤمن اور جانتا ہے اس سے قبل کہ مستقبل میں ایسا ہو گا، کافر کے کفر کو پہلے جانتا ہے کہ یہ فلاں وقت کفر کرے گا اور کافر کو کفر سے پہلے جانتا ہے کہ فلاں وقت ایمان لائے گا بلکہ ازل میں سب کو جانتا ہے کہ فلاں کافر اسلام لائے گا اور فلاں مسلمان کفر کرے گا، لیکن اللہ تعالیٰ جانتا ہے اس کے مسلمان ہونے کو، دوسرے حال میں اس کے اسلام کے وجود سے پہلے تو یہ اس کے کفر کو واجب نہیں کرتا اور اللہ تعالیٰ کا جاننا کہ یہ کافر ہو گا دوسرے وقت میں واجب نہیں کرتا، اس کے ایمان کے سلب کو فی الحال تو کافر کافر ہو گا، وقتِ کفر حقیقتاً اللہ تعالیٰ کے نزدیک، فرشتوں کے نزدیک، انسانوں کے نزدیک یعنی سب کے نزدیک اور کافر جب اسلام لایا تو وہ سعید ہے انسانوں کے نزدیک اور مسلمان وقتِ اسلام مسلمان ہو گا حقیقتاً اللہ کے نزدیک، فرشتوں کے نزدیک، انسانوں کے نزدیک، تمام مخلوق کے نزدیک اور مسلمان جب کفر کرے گا شقی ہو جائے گا، یہ عند الناس حکم ہے مگر یہ امر خاتمہ پر موقوف ہے اور جو ہم نے ذکر کیا سعادت وشقاوت اس کی موقتہ ہے، مگر ہر شخص کا خاتمہ اور اس کا انجام علمِ الٰہی میں ہے جیسا کہ وہ جانتا ہے وہی ہو گا، اس کے خلاف ناممکن ہے اور حکم سعادت وشقاوت ہمارے نزدیک ثابت ہوں گے، بسبب الظاہر اور وہ اسلام و کفر ہے اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک شقاوت وسعادت اس کے ارادہ اور علم سے ثابت ہو گی، تو ہم نے کہا کہ سعید شقی ہو سکتا ہے اور شقی سعید ہو سکتا ہے، بسبب ظاہر ہمارے نزدیک اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک عند الخاتمہ جیسا وہ جانتا ہے۔

چھٹا قول: قضاء اور ادا کا بیان

اہل سنت وجماعت فرماتے ہیں کہ فرائض یعنی نماز، روزہ، زکوۃ وغیرہ جب اپنے وقت سے فوت ہو جائیں تو ان کی قضاء واجب ہے اور قضاء اسی کی فرض ہو گی جو فوت ہو گیا ہے اور فریضہ اس سے ساقط ہو جائے گا اور جس وقت اس کی قضاء کرے گا اور قضاء سے بعینہ وہی حاصل ہو گا جو ادا سے حاصل ہوتا ہے۔

اس کی دلیل یہ ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

من نام علی صلوۃ او نسیہافلیصلیہااذاذ کر ھا جو نماز کے وقت سو گیایا ادا کرنا بھول گیاتوجب اس کو یاد آئے فوراً پڑھ لے۔یہی اس کا وقت ہے اس کے غیر کا نہیں اور **فلیصلیہا** میں اس طرف اشارہ ہے کہ قضاء بعینہا وہی عبادت ہے۔

معتزلہ کہتے ہیں کہ قضاء علیحدہ عبادت ہے اور حکمی طور پر اس کو اصل قرار دیا جاتا ہے،اس لئے کہ جو فرائض فوت ہو گئے ہیں وہ ساقط نہیں ہوئے اور اللہ تعالیٰ قضاء کے ساتھ ثواب عطا فرما دیتا ہے اور فرض فوقت ہو گیا،اس کا عقاب دیا جائے گا۔

معتزلہ کی ایک بات کی تردید

اور معتزلہ کا یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ قضاء اصل (ادا) کا بدل نہیں،اس لئے کہ قضاء اصل کا بدل ہے۔دلیل یہ ہے کہ فریضہ اپنے وقت میں ادا کرلیتا قضاء اس پر واجب اور اگر یہ (قضاء) علیحدہ حکم ہوتا تو دونوں حالتوں میں واجب ہوتی۔دوسری بات یہ ہے کہ قضاء اسی ہیئت وصفت پر ہوتی ہے،جس ہیئت وصفت پر فوت ہوئی اور اس پر واجب ہے کہ نیت کرے بعینہ فوت شدہ فریضہ کی،تو ثابت ہوا کہ قضاء فوت شدہ کا بدل ہے،نہ اس میں کمی ہوگی نہ زیادتی اور نبی کریم ﷺ کی فجر کی نماز فوت ہو گئی تھی تو اسی صفت وہیئت پر حضور ﷺ نے اس کی قضاء کی۔کہ قضاء ادا سے بدل ہے۔

ساتواں قول:اس شخص کے متعلق جس نے عمداً (جان بوجھ کر) فرائض کو ترک کیا

جان بوجھ کر فرائض کو ترک کرنے والے کا کیا حکم ہے؟: حروریہ یعنی خارجیوں کا عقیدہ ہے کہ جس نے قصداً نماز کو ترک کیا یا کسی محظور وممنوع کا ارتکاب کیا،خواہ صغیرہ گناہ ہو یا کبیرہ وہ کافر ہو جائے گا۔

معتزلہ کیا کہتے ہیں؟

معتزلہ اس بات کے قائل ہیں کہ مرتکب کبیرہ ایمان سے خارج ہو جاتا ہے اور کفر میں داخل نہیں ہوتا۔

امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کیا فرماتے ہیں؟

امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس کی تکفیر تو نہیں کی جائے گی لیکن ایمان اس کا ناقص ہو گیا اور مباح الدم ہو گیا۔

احناف کا موٴقف

اہل سنت وجماعت اصحاب ابی حنیفہ رحمہم اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ نہ وہ مباح الدم ہے اور نہ ایمان سے خارج ہوا اور نہ وہ کافر ہوا،مگر وہ موٴمن فاسق ہے۔

خوارج کی دلیل

خارجیوں نے یہ دلیل دی کہ وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا فَجَزَاؤُهُ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيهَا (النساء۹۳) اور جو کوئی مسلمان کو جان بوجھ کر قتل کرے تو اس کا بدلہ جہنم ہے کہ مدتوں اس میں رہے۔"

اس آیت میں خبر دی کہ وہ "مخلدفی النار" یعنی ہمیشہ آگ میں جلتا رہے گا اور کافر نہ ہوتا تو ہمیشہ دوزخ کی آگ میں نہ رہتا۔

جواب یہ ہے کہ یہ آیت اس شخص کے متعلق نازل ہوئی جو مؤمن تھا اور اس نے دوسرے مؤمن کو قصداً قتل کیا، پھر اسلام سے مرتد ہو گیا۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ خلود (ہمیشہ رہنے) سے مراد تابید (ابدی طور پر رہنا) نہیں ہے، بلکہ مکث طویل مراد ہے (یعنی طویل مدت تک)۔

اس کی دلیل یہ آیت ہے: أَفَإِنْ مِتَّ فَهُمُ الْخَالِدُونَ (الانبیاء۳۴) یعنی فهم الباقون بقاءالدنیا یعنی اگر آپ انتقال فرمائیں تو کیا یہ کفار ہمیشہ دنیا میں باقی رہیں گے؟ تو ثابت ہوا کہ خلود سے مراد مکث طویل (یعنی عرصۂ دراز تک رہنا) ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ جو مؤمن کے قتل کو حلال جانے وہ کافر ہے، ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔

ہم بھی یہی کہتے ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ تعالی عنہما نے فرمایا کہ آیت سے مراد یہی ہے اور اس کی دلیل کہ قاتل جب تک مؤمن کے قتل کو حلال نہ جانے کافر نہیں، یہ آیت ہے: يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ (البقرة۱۷۸) اے ایمان والو تم پر فرض ہے کہ جو ناحق مارے جائیں ان کے خون کا بدلہ لو۔" اس آیت میں قاتل کو مؤمن فرمایا، اگر مؤمن نہ ہوتا تو اس پر قصاص فرض نہ ہوتا۔

معتزلہ کا استدلال

معتزلہ اس آیت سے حجت قائم کرتے ہیں کہ أَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا لَا يَسْتَوُونَ (السجدة۱۸) تو کیا جو ایمان والا ہے وہ اس جیسا ہو جائے گا جو بے حکم ہے یہ برابر نہیں۔" اللہ جل مجدہ نے فاسق و مؤمن میں فصل (فرق) کر دیا کہ فاسق اور مؤمن دو برابر نہیں ہو سکتے۔ اس پر ہم سب کا اجماع ہے کہ وہ فاسق ہے، ہم نے یہ جانا کہ نہ وہ مؤمن ہے اور نہ وہ کافر۔ جواب یہ ہے کہ یہ آیتِ کریمہ ولید بن عقبہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے، یہ شخص بڑا بولنے والا، حسین و خوبصورت اور قوی ہیکل تھا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم سے کہنے لگا کہ اگر آپ حسین و جمیل ہیں تو میں بھی صاحب حسن و جمال ہوں

، اگر آپ کے پاس قوت ہے تو میرے پاس بھی قوت ہے، اگر آپ لسان یعنی زورِ خطابت اور فصاحت وبلاغت کے مالک ہیں تو میں بھی کچھ کم نہیں، منہ میں زبان رکھتا ہوں۔

حضرت مولیٰ علی شیر خدا رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: خاموش! تو کافر ہے تو یہ آیت کریمہ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی موافقت میں نازل ہوئی اور اس کا کہنا کہ یہ شخص فاسق تھا، ہم کہتے ہیں کہ ہر کافر فاسق ہے اور ہر فاسق کافر نہیں۔

اور اس کی دلیل یہ ہے کہ ایمان سے خارج نہیں ہوا، اس لئے کہ معتزلہ کے نزدیک بھی کافر نہیں۔ پھر خروج من الایمان موجب کفر ہے کیونکہ جس نے ایمان کو ترک کیا یا ایمان کا انکار کیا یا اسلام سے نکل کر مرتد ہو گیا تو وہ لا محالہ کافر ہو گیا اور ہمارا اجماع ہے کہ کافر نہیں ہو گا تو ہم نے جان لیا کہ ایمان سے نہیں نکلا۔

اور امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کا فرمانا کہ وہ مباح الدم ہے تو ہم کہتے ہیں: ایسی کوئی بات ثابت نہیں، اس بلا دلیل دعویٰ کی کچھ حیثیت نہیں ہے، اس لئے کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

لا یباح دم واحد من اھل القبلۃ الا لمعان ثلث الزنا بعد الاحصان والکفر بعد الایمان وقتل النفس بغیر نفس۔

اہل قبلہ میں سے کسی کا خون مباح نہیں مگر تین وجہ سے (۱) زنا بعد الاحصان (شادی شدہ زانی کا) (۲) کفر بعد الایمان (مرتد کا) (۳) اور ناحق قتل کرنے والے کا خون بہانا شرعاً مباح ہے۔

(۵) باب نمبر پانچ: خلافت وامارت کے بیان میں

اس میں آٹھ قول ہیں۔

پہلا قول: خلافت وامارت کا بیان

مہتدی ابو شکور سالمی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ خلافت ثابت ہے اور امارت قائم و مشروع ہے اور لوگوں پر واجب ہے کہ وہ اسے از روئے کتاب، سنت اور اجماع امت اپنے اوپر لازم سمجھیں۔

امارت کی مشروعیت و قیام کا قرآن سے ثبوت

کتاب اللہ سے دلیل یوں ہے کہ ارشاد فرمایا: أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ (النساء ۵۹) حکم مانو اللہ کا اور حکم مانو رسول کا اور ان کا جو تم میں حکومت والے ہیں۔'' اور سنت سے یوں کہ جب سرور عالم ﷺ کا وصال ہوا تو سقیفہ بنی ساعدہ خزرجی میں صحابہ کرام مہاجرین وانصار رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین نے جمع ہو کر کہا کہ ہم نے آنحضرت ﷺ سے سنا ہے کہ جو بغیر امام کے مرے اس کی موت جاہلیت کی موت اور ہم ایک دن بھی بغیر امام کے رہنا پسند نہیں کرتے۔ یہ دلیل ہے اس کی کہ جو امام کو حق نہ جانے تو وہ کافر ہے۔

اجماعِ امت سے دلیل یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم جمع ہوئے اور سب نے بالاتفاق حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کو تسلیم کیا اور کسی ایک نے بھی انکار نہیں کیا اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خلیفہ بنانے سے ہوئی اور اس پر بھی کسی نے انکار نہیں کیا۔

پھر خلافت حضرت عثمان غنی اور خلافت حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما اجماع امت سے ہوئی۔ ان دلائل سے ثابت ہوا کہ خلافت حق اور ثابت ہے اور اس پر بھی ہمارا اجماع ہے کہ خلیفہ قریش سے ہو گا اور غیر قریش سے خلیفہ ناجائز ہے اور یہ بھی جائز نہیں کہ خلیفہ اولادِ حسن و حسین سے ہو۔

پھر اس میں بھی اختلاف ہے کہ امام کی کیا شان ہونی چاہیئے؟

معتزلہ کہتے ہیں کہ امام و خلیفہ کا معصوم ہونا لازم ہے اور اگر فاسق ہو تو اس کے پیچھے نماز جائز و صحیح نہ ہو گی۔

روافض کا مذہب

روافض کہتے ہیں کہ امام کا تعلیم یافتہ ہونا ضروری ہے، اس نے خدا سے بلاواسطہ علم سیکھا ہو یا بواسطۂ جبریل۔

امامِ شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد

امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ امام و خلیفہ فاسق نہیں ہو سکتا کہ اگر خلیفہ ظلم کرے یا فاسق ہو جائے تو خود بخود معزول ہو جائے گا۔

اور ایسے ہی ہر قاضی (جسٹس) اور امیر جب کہ امام کی نیابت سے مقرر کیا گیا ہو، ظلم کرے یا فسق و فجور میں مبتلا ہو جائے یا رشوت لے یا ظلم کرے تو معزول ہو جائے گا، ایسے ہی امام صلوۃ اگر فاسق ہو جائے تو امامت سے معزول ہو جائے گا۔ امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ امام خلیفہ کے بنانے سے ہوتا ہے، امام بھی وہ جس کو لوگوں نے قبول کیا ہو یا اس کی امامت اجماعِ امت سے ہو تو امامت جب صحیح ہو گی جب کہ قریش سے ہو، نیک ہو یا بد مگر قریشی ہو تو امامت اس کی صحیح ہے۔

اصل اختلاف کیا ہے؟

اور اصل مسئلہ یہ ہے کہ امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک فاسق اہل ولایت سے نہیں، حتیٰ کہ اگر فاسق اپنی چھوٹی بیٹی نابالغہ کا نکاح کر دے تو وہ نکاح صحیح نہیں ہو گا اس لئے کہ فاسق کو ولایت حاصل نہیں۔

فاسق امام بن سکتا ہے

اور امام ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ نکاح صحیح ہو گا اس لئے کہ فاسق اہل ولایت سے ہے اور حضور پر نور سید عالم ﷺ نے فرمایا کہ صلوا خلف کل بر و فاجر۔ یعنی ہر نیک و بد کے پیچھے نماز پڑھو (اگرچہ بوجہ فسق مکروہ تحریمہ ہو گی لیکن اصل فرض ہو جائیں گے۔)

پھر ائمہ اور امراء سے عہد صحابہ و تابعین میں ہی فسق ظاہر ہوا اور ظلم پھیلا جیسا کہ یزید اور اس کی اولاد، اسی طرح مروان کی اولاد کہ ان میں فسق اور جور و ستم عام تھا لیکن اس کے باوجود صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم نے ان کے پیچھے نماز پڑھی اور ان کی معیت میں حج کئے اور اسی طرح تابعین نے نمازیں پڑھیں، حج کئے اور ان پر خروج نہیں کیا حالانکہ انہیں قدرت و شوکت حاصل تھی تو ثابت ہوا کہ فسق و فجور سے امامت زائل نہیں ہوتی جب کہ مسلمان ہوں اور قریشی ہوں۔ علاوہ ازیں اگر امام کا معصوم ہونا واجب ہو تو نبی اور امام میں فرق نہ رہے گا۔ امام بھی معصوم اور نبی بھی معصوم حالانکہ معصوم ہونا خصائص نبوت سے ہے اور نیز فسق سے ایمان زائل نہیں ہوتا تو فسق موجب زوال امامت نہیں ہو سکتا اور عصمت ثابت کرنا امام سے پہلے شرط ہے اور نہ ہی امام ہونے کے بعد، مطلب یہ ہے کہ امامت کے لئے عصمت شرط نہیں ہے۔

بعض حضرات کی طرف سے عائد کردہ امامت (کبریٰ) کی شرائط کا بیان اوران پر بحث و نظر

بعض نے کہا کہ امام کا اولاد حسن وحسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے ہونا ضروری ہے اور براہِ راست خدا سے تعلیم یافتہ ہوں یا جبرائیل علیہ السلام کے واسطہ سے، انہوں نے خدا سے علم سیکھا ہو بہر حال ان کا تعلیم یافتہ ہونا ضروری ہے۔

اس کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ یہ قول صحیح نہیں اس لئے کہ حضرت امام حسن وحسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے امامت حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو سونپ دی اور دونوں نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بیعت کی تو اگر امام کا اولادِ حسن وحسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے ہونا ضروری تھا اور بغیر اولاد حسنین کریمین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے امام نہیں ہو سکتا تو یہ خطاء اور معاذاللہ کفر ہو گا اس لئے کہ امام قائم کرنا بغیر حق کے کفر ہو گا (اور ظاہر ہے کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اولاد حسنین کریمین رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے نہیں تو وہ مستحق امامت بھی نہیں، غیر مستحق کو حق دینا کفر ہو گا۔ **العیاذباللہ**)۔

علاوہ بریں امام کا تعلیم یافتہ ہونا خدا سے یا جبریل علیہ السلام سے مستوجب نبوت ہے کیونکہ تعلیم الٰہی یا تعلیم جبریل علیہ السلام وحی ہوتی ہے اور جو حضور ﷺ کے بعد نبوت یا وحی تشریعی باستثناء حضرت عیسیٰ علیہ السلام کسی کے لئے جائز سمجھے وہ کافر ہے تو ثابت ہوا کہ حقیقت امر وہی ہے جو ہم نے بیان کیا۔

دوسرا قول: حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کا بیان

اہل سنت وجماعت فرماتے ہیں کہ امامت وخلافت کسی کے لئے منصوص نہیں (کہ قرآن وحدیث میں خلافت کے لئے کسی کو نامزد کیا ہو)۔

بعض نے کہا کہ خلافت حضرت سیدنا عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا حق تھا کہ وہ حضور ﷺ کے چچا اور عصبہ ہیں تو وہ دوسروں سے مقدم ہیں۔

اور روافض نے کہا کہ خلافت وامامت حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لئے منصوص ہے، اس لئے کہ حضور ﷺ نے انہیں اپنے بعد اپنا خلیفہ اور وصی بنایا، جیسا کہ فرمایا: **اما ترضی ان تکون منی بمنزلة هارون من موسیٰ الا انه لا نبی بعدی** "حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا: تم راضی نہیں کہ تم مجھ سے وہ تعلق رکھتے ہو جو ہارون علیہ السلام کو موسیٰ علیہ السلام سے تھا؟ مگر میرے بعد کوئی نبی نہ ہو گا۔" ہارون علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلیفہ تھے اور تو ایسے ہی حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور ﷺ کے خلیفہ ہوئے۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ حضور ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو سب لوگوں کا والی بنایا، جب مکہ معظمہ سے واپس ہوئے اور خم غدیر پر نزول اجلال فرمایا، حکم دیا کہ اونٹوں کے کجاوے جمع کر کے منبر کی طرح بنادیں، اس پر حضور ﷺ چڑھے اور فرمایا: **السنا باولی المؤمنین من انفسھم فقالوا نعم۔** "یعنی فرمایا کہ کیا ہم مؤمنین کے جانوں سے زیادہ قریب نہیں؟ سب نے کہا: ہاں۔

پھر حضور ﷺ نے فرمایا:

من کنت مولاہ فعلی مولاہ اللھم وال من والاہ وعاد من عاداہ وانصر من نصرہ واخذل من خذلہ۔

جس کا میں دوست ومددگار ہوں علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی اس کے دوست ومددگار ہیں، الٰہی جو علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے محبت کرے تو اس سے محبت کر اور جو علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے دشمنی رکھے تو بھی اس سے دشمنی رکھ اور جو علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مدد کرے تو بھی اس کی مدد فرما اور جو علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بے ادب ہو تو اس کو ذلیل فرما۔

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُولُهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُمْ رَاكِعُونَ (المائدۃ ۵۵)

"تمہارے دوست نہیں مگر اللہ اور اس کا رسول اور ایمان والے کہ نماز قائم کرتے ہیں اور زکوۃ دیتے ہیں اور اللہ کے حضور جھکے ہوئے ہیں۔"

یہ آیت حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شان میں نازل ہوئی تو ثابت ہوا کہ حضرت مولیٰ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور ﷺ کے بعد سب سے افضل ہیں اور حدیث شریف میں وارد ہوا ہے کہ سب سے پہلے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایمان لائے، تو ثابت ہوا کہ خلافت کے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سب سے زیادہ حقدار ہیں۔

اہل سنت وجماعت کے دلائل

اہل سنت وجماعت کی دلیل یہ ہے کہ امامت وخلافت منصوص نہیں، اس لئے کہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اسی دن جس دن حضور ﷺ کا وصال ہوا، سقیفۂ بنی ساعدہ میں مہاجرین وانصار جمع ہوئے اور انصار نے کہا: **منا امیر** "ہم میں سے امیر ہوگا۔ مہاجرین نے کہا: ہم میں سے امیر ہوگا۔ تو اگر خلافت منصوص ونامزد ہوتی تو ہرگز نہیں باور کر سکتے کہ ایسی جلدی حضور ﷺ کے وصال کے بعد دفن سے پہلے ہی سب حضور ﷺ کے وصال کے بعد دفن سے پہلے ہی سب حضور ﷺ کے امر اور وصیت کی مخالفت کرتے، صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے یہ گمان ناممکن ہے۔

اور مروی ہے کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: نحن بیضة رسول اللہ (ﷺ) اور تم نے بھی اور ہم نے بھی سنا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: الائمة من قریش امام وخلیفہ قریش میں سے ہوگا۔ فمنا الامراء تو ہم میں سے امیر ہوں گے۔ ومنکم الوزراء اور تم میں سے وزراء ہوں گے۔ سعد بن معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: ہم اس پر راضی ہیں۔ تم میں سے امراء اور ہم میں سے وزراء ہوں گے، تو سب کا اتفاق ہوگیا۔ پھر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ میرا گمان ہے کہ قوم کے نزدیک حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ امامت وخلافت کی زیادہ صلاحیت رکھتے ہیں۔ یہ سن کر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی تلوار سونت لی اور کھڑے ہو کر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا: قم یا خلیفة رسول اللہ (ﷺ) اے رسول اللہ ﷺ کے خلیفہ اٹھیے۔ قدمک رسول اللہ فمن ذالذی یؤخرک اے ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ! جب حضور ﷺ نے آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو (نماز کے لئے) آگے کیا تھا، پھر کون ہے جو آپ کو پیچھے کرے۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: اے علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ! تم امیر ہو، اے خلیفۂ رسول اللہ ﷺ! آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حضور ﷺ نے حکم دیا تھا مجھ کو حضور ﷺ نے حکم نہیں دیا (اشارہ تھا نماز کے لئے)، آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حکم دیا تھا کہ صل بالناس کہ لوگوں کو نماز پڑھاؤ۔ ہم اپنے دنیاوی امور میں راضی ہیں، اس شخص سے جس سے حضور ﷺ ہمارے دین کے معاملہ میں راضی ہوئے اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خلیفہ رسول اللہ ﷺ کہا۔ اس لئے کہ حضورِ اقدس ﷺ نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو نماز کے لئے اپنا خلیفہ بنایا۔

بعض روایات میں ہے: سات دن یعنی پینتیس (۳۵) نمازوں میں خلیفہ بنایا، بعض میں تین دن ہے یعنی پندرہ (۱۵) نمازوں میں۔ یہ دلائل سن کر سب صحابہ مہاجرین وانصار رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بیعت کرلی اور کسی ایک نے بھی مخالف نہیں کی اور بیعت منعقد ہوگئی، اس کے بعد حضور ﷺ کے دفن میں مشغول ہوگئے۔ اس سے ثابت ہوا کہ خلافت منصوص نہیں، اس لئے کہ اگر منصوص ہوتی تو صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم ہرگز اختلاف نہ کرتے اور اگر دوسروں کو شک تھا تو مولیٰ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ہرگز شبہ نہ ہونا چاہیئے تھا اور جب حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ نے خود بیعت کی، تو ثابت ہوا کہ منصوص نہ تھی، بلکہ خلافت اجماعِ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے منعقد ہوئی۔

اور بعض کہتے ہیں: حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تین دن کے بعد بیعت کی اور بعض کہتے ہیں: چھ مہینہ کے بعد بیعت کی، مگر یہ اقوال صحیح نہیں۔ بہرحال مخالفت کے اقوال مردود ہیں بوجہ موافقت کرنے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اور بالفرض اگر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بیعت نہ بھی کی ہو تو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سکوت کیا اور مخالفت نہ کی تو بھی حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ

موافقت ثابت ہوئی، حالانکہ ہم نے ثابت کر دکھایا کہ مولیٰ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیعت کی ہے اور اگر بالفرض حضرت سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت صحیح نہ ہو اور وہ امام برحق نہ ہوں تو مولیٰ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا سکوت و چشم پوشی ہرگز جائز نہیں، اس لئے کہ جو باطل امام کی امامت پر راضی ہو وہ کافر ہے۔

مولیٰ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خلیفہ بنا کر خوش تھے

اور اس امر کی دلیل کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت پر راضی تھے اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے امام برحق سمجھ کر صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بیعت کی، یہ ہے کہ مولیٰ علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم جہادوں میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اطاعت کرتے اور مال سے حصہ لیتے رہے اور یہ بھی روایت ہے کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مولیٰ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ایک لونڈی مال غنیمت سے عطا فرمائی، حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسے قبول فرمایا اور اس کے ساتھ صحبت بھی کی اور اگر خدا نخواستہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلیفۂ برحق نہ ہوتے اور ان کی خلافت حق نہ ہوتی تو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ہرگز صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اطاعت و فرماں برداری جائز نہ تھی اور نہ مال غنیمت سے لینا حلال تھا اور غنیمت سے حصہ لینا جائز تھا۔

اور اگر ایسا ہوتا تو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جاریہ (لونڈی) سے وطی وصحبت کرنا حلال نہ ہوتا بلکہ معاذاللہ زنا ہوتا تو ان وجوہ سے ثابت ہو گیا کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت برحق تھی اور وہ خلیفۂ برحق تھے اور مولیٰ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خلیفۂ برحق سمجھ کر بیعت کی، ان کی اطاعت کی، غزوات میں شرکت کی، غنیمت سے اپنا حصہ لیا، جاریہ (لونڈی) سے حلال سمجھ کر وطی کی۔

روافض کے دلائل کا جواب

روافض کا یہ کہنا کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور ﷺ کے وصی تھے۔ ہم کہتے ہیں: آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ مطلقاً وصی نہ تھے بلکہ حضور ﷺ نے قرضوں اور امانتوں کی ادائیگی کے لئے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو وصی بنایا تھا، لہذا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ خلافت کے لئے بھی وصی تھے۔

روافض کا یہ کہنا کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حضور ﷺ نے خلیفہ بنایا اور وہ بہ منزلۂ حضرت ہارون علیہ السلام کے تھے تو یہ حدیث بجائے خود ان کی تردید ہے اور ان کے خلاف جاتی ہے، اس لئے کہ جب حضور اقدس ﷺ غزوۂ تبوک میں تشریف لے جانے لگے تو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مدینہ طیبہ میں اُمور داخلہ اور خانگی انتظامات وانصرامات کے لئے اپنے

پیچھے چھوڑ دیا تو منافقوں نے زبان درازی اور طعنہ زنی شروع کی کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس قابل نہ سمجھا کہ جہاد میں ساتھ لے جائیں، ان کو گھر میں چھوڑ گئے۔ جب مولیٰ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو منافقوں کی ان باتوں کا علم ہوا تو مغموم ہوئے اور حضور ﷺ کے پیچھے جانے لگے۔ حضور ﷺ نے دیکھا کہ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی پیچھے آرہے ہیں، فرمایا: کیا ہم نے تم کو پیچھے رہنے کا حکم نہیں دیا تھا؟ عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! آپ ﷺ مجھے عورتوں اور بچوں میں چھوڑ گئے اور منافقین زبان درازی کرتے ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس لئے عورتوں اور بچوں میں چھوڑ گئے ہیں کہ آپ ﷺ نے اس قابل نہ سمجھا کہ جہاد میں اپنے ساتھ لے جاتے۔ اس موقع پر حضور ﷺ نے فرمایا: **اماترضی ان تکون منی بمنزلة هارون من موسیٰ الا انه لا نبی بعدی** ”حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا: تم راضی نہیں کہ تم مجھ سے وہ تعلق رکھتے ہو جو ہارون علیہ السلام کو موسیٰ علیہ السلام سے تھا؟ مگر میرے بعد کوئی نبی نہ ہو گا۔“ سو ہم کہتے ہیں کہ اس حدیث سے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حضرت ہارون علیہ السلام پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے بلکہ متعدد فرق ہیں۔

(۱) ہارون علیہ السلام نبی ہیں اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی نہیں ہیں۔

(۲) حضرت ہارون علیہ السلام حیات ظاہری میں خلیفہ تھے اور وفات کے بعد خلیفہ نہ تھے اس لئے کہ ہارون علیہ السلام کا موسیٰ علیہ السلام کے سامنے انتقال ہو گیا اور مولیٰ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ شیر خدا رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور ﷺ کے بعد زندہ رہے۔

(۳) نیز ہارون علیہ السلام، موسیٰ علیہ السلام کے بڑے بھائی تھے اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور ﷺ کے چھوٹے بھائی تھے۔

(۴) نیز ہارون علیہ السلام حقیقی بھائی تھے اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ چچازاد بھائی تھے۔

(۵) حضرت ہارون السلام معصوم تھے اور مولیٰ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ معصوم نہیں، لہذا ان کے مشابہ نہیں ہو سکتے۔

(۶) اوران کا یہ کہنا کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو والی بنایا تو ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ہاں والی بنایا، یعنی عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بعد آپ (علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ) والی ہیں اور زمانۂ معاویہ رضی اللہ تعالی عنہ میں وہ ہی خلیفہ برحق تھے، یہی ہمارا عقیدہ ہے اور **اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُولُهٗ (المائدة ۵۵)** ”سے بھی یہی معنی مراد ہیں۔

نیز ہم کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ والی، خلیفہ وامام ہیں اپنے وقت میں اور اپنے زمانہ میں، وہ زمانہ ہے حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بعد، پہلے نہیں۔

سب سے پہلے کون اسلام لائے تھے؟

یہ کہنا کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سب سے پہلے اسلام لائے تو اس کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ اس میں روایتیں مختلف ہیں۔ ایک روایت میں ہے: سب سے پہلے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایمان لائے۔

ایک روایت میں ہے: سب سے پہلے خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اسلام لائیں اور بعض روایت میں ہے کہ زید بن حارثہ اسلام لائے اور بعض روایت میں ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اسلام لائے۔ ان اختلافات کی بناء پر مطلقاً یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سب سے پہلے ایمان لائے۔ ہاں! ان روایات میں تطبیق یوں ہو سکتی ہے کہ عورتوں میں خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور بچوں میں سے پہلے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اسلام لائے اور غلاموں میں سب سے پہلے زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایمان لائے اور عاقلوں، آزادوں میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایمان لائے پھر اس وقت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلافت کے لئے زیادہ مناسب، موزوں ترین اور زیادہ حق دار تھے اگر خلافت کی حاجت ہوتی اس لئے کہ عورت، بچے، غلام خلافت کی صلاحیت واہلیت نہیں رکھتے تو جب حضور اقدس ﷺ کے بعد خلافت کی ضرورت وحاجت ہوئی تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی زیادہ حق دار اور صلاحیت مند تھے تو ثابت ہوا کہ ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی خلافت کے حق دار اور بہتر صلاحیت رکھنے والے تھے۔

تیسرا قول: حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کا بیان

اس پر ہمارا اجماع ہے کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عمر ابن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خود خلیفہ مقرر کیا، حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے وصال کے دن فرمایا کہ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حاضر کرو۔ جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ حاضر ہوئے، فرمایا: لکھو اور وصیت فرمائی کہ لکھو: بسم اللہ الرحمن الرحیم، یہ وصیت نامہ ابو بکر (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کی طرف سے ہے جو رسول کریم ﷺ کے خلیفہ ہیں، یہ میرا دنیا میں آخری دن ہے اور آخرت کا پہلا دن ہے، جس دن کافر بھی ایمان لے آتا ہے اور فاسق وفاجر اپنے فسق وفجور سے رک جاتا ہے۔ میں تم پر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خلیفہ بناتا ہوں، اگر وہ عدل وانصاف کریں اور ان کے متعلق میرا یہی گمان ہے اور اگر ناانصافی کریں تو غیب کا علم اللہ تعالیٰ کو ہے۔ وَسَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَيَّ مُنْقَلَبٍ يَنْقَلِبُونَ (الشعراء ۲۲۷) اور اب جانا چاہتے ہیں ظالم کہ کس کروٹ پر پلٹا کھائیں گے۔" اور چند لوگوں کے سوا سب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت پر رضامند ہو گئے اور سوید بن علقمہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ میں راضی ہونے والوں میں ہوں۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رضامندی اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ اپنی صاحبزادی ام کلثوم بنت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا نکاح حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کر دیا اور جو لوگ خلافتِ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو پسند نہیں کرتے تھے، حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالی عنہ سے کہنے لگے: جب آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اللہ تعالیٰ کے سامنے جائیں گے کیا جواب دیں گے کہ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ہم پر ایسے شخص کو مسلط کر دیا جو درشت خو اور تند مزاج ہے؟ صدیق اکبر رضی اللہ تعالی عنہ نے جواب دیا: مجھ کو میرے رب سے نہ ڈراؤ، میں یہ جواب دوں گا کہ میں نے ان پر خیر اہل اللہ کو مسلط کیا ہے اور یہ جملہ میں نے حضور ﷺ سے سنا، حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: عمر خیر اہل اللہ ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں سے ہیں اور حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے وصال فرمانے سے قبل خلافت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر سب راضی ہو گئے تھے اور رسول اللہ ﷺ کے حیاتِ ظاہری سے پردہ فرمانے کے بعد تمام صحابہ کرام صدیق و عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کی خلافت پر متفق ہو گئے، اس لئے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا کہ میرے بعد صدیق و فاروق کی اقتداء کرنا اور حضور ﷺ نے فرمایا: داخل ہوا میں اور ابو بکر و عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما، اور کھایا میں نے اور ابو بکر و عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے، اور حضور ﷺ سے مروی ہے کہ ایک دن حضور اقدس ﷺ مسجد میں تشریف لائے درآں حالیکہ دایاں ہاتھ صدیق اکبر کے کاندھے پر اور بایاں ہاتھ فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے کاندھے پر تھا اور فرمایا: اسی طرح ہم زندہ رہیں گے اور اسی طرح ہم دنیا سے جائیں گے اور اسی طرح ہم دفن ہوں گے اور اسی طرح ہم قبروں سے اٹھائے جائیں گے تو ثابت ہوا کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تمام احوال میں تیسرے درجہ میں ہیں تو جب ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا وصال ہوا تو عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی خلافت کے حق دار تھے، جب خلافت صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ختم ہو گئی۔

نیز رسول کریم ﷺ سے مروی ہے کہ جب میں شب اسراء بالائے آسمان پر تشریف لے گیا اور جنت میں فروکش ہوا تو میں نے ایک جاریہ (لونڈی) کو دیکھا جو اوصاف حمیدہ سے موصوف تھی، میں نے اس لونڈی سے کہا: تو کس کے لئے ہے؟ اس نے کہا: خلیفہ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لئے، تو حضور ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خلیفہ کا لقب عطا فرمایا، اس سے ثابت ہوا کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلافت کے حق دار تھے اور یہ حدیث صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت پر بھی دلیل ہے، اس لئے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ،صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خلیفہ بنانے سے خلیفہ بنے تو اگر صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت صحیح اور حق نہ ہوتی تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت بھی صحیح نہ ہوتی ،ان کے خلیفہ بنانے سے اور جب فاروقِ اعظم کی خلافت صحیح و ثابت اور حق ہے اور اس امر کی دلیل ہے کہ خلفاء اربعہ (ابو بکر،

عمر، عثمان، علی) کی خلافت حق اور ثابت ہے۔ حضور ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: "الخلافة من بعدی ثلاثون سنة" خلافت علی منہاج النبوة تیس سال رہے گی اوران تیس سالوں میں انہی چاروں خلفاء راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی خلافت رہی۔

پھر ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالی عنہ کو خلیفہ رسول اللہ ﷺ کے نام سے بلایا جاتا اور فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خلیفہ خلیفۃ رسول اللہ ﷺ، تو ایک دن فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سوچا کہ مجھ کو خلیفہ خلیفۃ رسول اللہ ﷺ کہا جاتا ہے اور میرے بعد خلفاء کا نام خلیفۃ خلیفۃ رسول اللہ ﷺ رکھیں گے اوراس پے در پے اضافات میں لوگوں کو تکلیف ہو گی تو منبر پر تشریف لاکر فرمایا: میں تمہارا سچا امیر ہوں؟ سب نے کہا: ہاں، پھر فرمایا: تم سچے مؤمن ہو؟ سب نے کہا: ہاں۔ تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ مجھ کو امیر المؤمنین کہا کرو، اس دن سے امیر المؤمنین مشہور ہو گئے۔

چوتھا قول: حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کا بیان

امت مسلمہ کا اس پر اجماع ہے کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بعد خلیفہ بر حق باجماع الامۃ حضرت عثمان ذوالنورین ہیں اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بذات خود کسی کو خلیفہ منتخب نہیں کیا، بلکہ پانچ جلیل القدر صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے مشورے پر چھوڑا کہ یہ حضرات جس کو چاہیں منتخب کرلیں۔ وہ پانچ افراد کی نفری یہ ہے: عثمان، علی، عبد الرحمن ابن عوف، طلحہ اور زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔ پھر جب فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا انتقال ہو گیا تو عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: میں اپنا حق (خلافت) چھوڑتا ہوں اور حضرت زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: میں اپنا حق خلافت چھوڑتا ہوں۔ حضرت طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: میں بھی دستبردار ہوتا ہوں۔

اب رہ گئے عثمان وعلی رضی اللہ تعالیٰ عنہما، اب خلافت دونوں کے درمیان رہ گئی تو عبد الرحمن ابن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا: اپنا ہاتھ بڑھائیے میں آپ (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) سے بیعت کرتا ہوں اس شرط پر کہ آپ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ (ﷺ) اور سیرت شیخین (ابوبکر وعمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما) کے مطابق ہمارے معاملات میں حکم کریں گے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: میں اس شرط پر بیعت لیتا ہوں کہ میں کتاب وسنت اور سیرت شیخین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے مطابق حکم کروں گا اور اجتہاد بھی کروں گا۔ چنانچہ حضرت عبد الرحمن ابن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پھر یہی بات دہرائی تو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پھر وہی فرمایا جو پہلی مرتبہ فرمایا تھا۔ پھر تیسری بار حضرت عبد الرحمن ابن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم سے وہ بات دہرائی جو پہلے کہی تھی، حضرت مولیٰ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی وہی فرمایا جو پہلی مرتبہ فرمایا تھا۔ پھر حضرت عبد الرحمن ابن عوف

رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ہاتھ چھوڑ دیا اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ہاتھ پکڑ کر کہا: آپ ہمارے ساتھ بیعت کریں کہ آپ (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) ہمارے درمیان کتاب اللہ، سنت رسول اللہ ﷺ اور سیرت شیخین (ابو بکر وعمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما) کے موافق حکم کریں گے۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: میں نے یہ عہدہ قبول کیا اور میں بیعت کرتا ہوں کہ کتاب وسنت رسول اللہ ﷺ کے مطابق حکم کروں گا۔ حضرت عبد الرحمن ابن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی معیت میں تمام صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے بیعت کی اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی بیعت کرلی۔ پھر عبد الرحمن ابن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: میں پسند کرتا تھا کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہمارے امام بنیں لیکن ان کو چھوڑ دیا، ان کے اس "اجتهد فیه برای" میں اس میں اپنا اجتہاد بھی کروں گا فرمانے سے، پھر کسی صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیعت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں نہ انکار کیا اور نہ مخالفت کی۔

پھر لوگ جمع ہوئے اور اس (میٹنگ) میں کچھ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم بھی تھے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس اجلاس میں کسی وجہ سے شرکت نہ فرما سکے، یہ اسی دن کا واقعہ ہے جس دن حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ شہید ہوئے تو لوگوں نے اس سے یہ گمان کر لیا کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیعت خلافت کے مخالف ہیں لیکن پھر جب ان کو یقین ہو گیا کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ مخالف نہیں تو انہوں نے توبہ کی اور جتنے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم تھے سب نے رجوع کیا اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس وقت موجود نہیں تھے، جب آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ تشریف لائے تو آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حسنین کریمین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مدد کے لئے بھیجا۔ پھر تمام صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم مجمع میں سے چلے گئے تو مصری لوگ تنہا رہ گئے اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں سے ایک بھی ان کے ساتھ نہ رہا تو مصری بلوائیوں نے دیوار میں نقب لگایا اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مظلوماً شہید کر دیا اور حضرت امام عالی مقام سید نا حسن اور سید نا حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما دونوں شہزادے دروازے پر کھڑے حفاظت فرما رہے تھے اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مدد ونصرت کے خیال سے دروازہ پر ہی رہے اور حضرت شیر خدا مولیٰ علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے شہید ہونے سے قبل تلوار وہتھیار لے کر بلوائیوں (تخریب کاروں، فتنہ پردازوں) کے قتل کا ارادہ کر رہے تھے، جب آپ سامانِ حرب تیار کر چکے تو حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس وقت تک قضائے الٰہی سے شہید ہو چکے تھے، اس ظالمانہ قتلِ عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا گناہ اور بوجھ مصریوں کے سر باقی رہ گیا، اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے حکم فرماتا ہے اور وہ ہر شئے پر قادر ہے۔ "إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ (البقرة ١٥٦)"

پانچواں قول: حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کا بیان

حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالی عنہ کے شہید ہونے کے بعد حضرت علی کرم اللہ تعالی وجہہ الکریم امام و خلیفہ مقرر ہوئے، صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور دیگر انسانوں نے جو اس وقت مدینہ منورہ میں حاضر تھے، ان کی بیعت کی اور آپ رضی اللہ تعالی عنہ کی خلافت متحقق ہوگئی اور (اس وقت) حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی اس خلافت کے لئے اولیٰ اور احق تھے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: "اللھم ادر الحق مع علی" الٰہی! حق کو علی کے ساتھ دائر کر۔" نیز حضور اقدس ﷺ سے مروی ہے آپ ﷺ نے فرمایا: جہاں علی جائیں ان کے ساتھ حق ہے۔" حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کبھی ایسا کام نہیں کیا جو موجب انکار ہو اسی لئے کسی صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے انکار نہیں کیا۔ پھر اس امر کی دلیل کہ عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بعد حضرت مولیٰ علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم امامِ برحق تھے، یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے کنکر اٹھائے تو ان کنکریوں نے حضور ﷺ کے ہاتھ مبارک میں تسبیح کی اور ان کی وہ تسبیح سنی جاتی تھی وہ یہ پڑھتی تھیں: "سبحان اللہ و الحمدللہ" اللہ تعالیٰ پاک ہے اور تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں۔ پھر وہ کنکریاں رکھ دیں اور ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا: تم ان کنکریوں کو اٹھاؤ، جب انہوں نے کنکریوں کو اٹھایا تو آپ کے ہاتھ میں تسبیح (یعنی سبحان اللہ و الحمدللہ کا ورد) کرنے لگیں۔

اسی طرح حضرت عمر، حضرت عثمان غنی، حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے ہاتھوں میں تسبیح کرتی تھیں۔ اس مجلس میں حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی تھے، حضور اقدس ﷺ نے فرمایا: اے ابو ذر (رضی اللہ تعالیٰ عنہ)! تم بھی اٹھاؤ، جب انہوں نے اٹھائیں تو ان کے ہاتھوں میں تسبیح نہیں کی۔ ابو ذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! یہ کیا بات ہے کہ ان حضرات کے ہاتھ میں کنکریوں نے تسبیح کی اور میرے ہاتھ میں تسبیح نہیں کی؟ فرمایا: اے ابو ذر (رضی اللہ تعالیٰ عنہ)! تم خلفائے راشدین (علیہم الرضوان) کے برابر ہونا چاہتے ہو؟ تو نبی کریم ﷺ نے ان چاروں کو خلفاء راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم فرمایا اور علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان میں داخل ہیں، تو ثابت ہوا کہ علی رضی اللہ تعالی عنہ خلیفۂ برحق تھے۔

چھٹا قول: اس بارے میں کہ بعض صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو بعض صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم پر فضیلت حاصل ہے

اہل سنت وجماعت فرماتے ہیں: نبیوں، رسولوں اور فرشتوں (علیہم السلام) کے بعد مخلوق میں سب سے افضل ابو بکر صدیق ہیں، پھر عمر فاروق، پھر عثمان غنی، پھر علی رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔

حضرت سیدناامام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: سنت سے ثابت ہے کہ شیخین (ابو بکر و عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما) کو تو فضیلت دے اور خَتَنین (دونوں دامادوں یعنی عثمان و علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما) سے محبت کرے اور ان ہی سے روایت ہے کہ فرمایا: تم ابو بکر و عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو فضیلت دو اور عثمان و علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے محبت کرو۔ ایک روایت میں ہے کہ علی و عثمان سے محبت کرو اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی فضیلت حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر وارد نہیں اس لئے کہ ترتیب فی الذکر ترتیب فی الحکم (یعنی اس روایت میں علی رضی اللہ تعالی عنہ کا نام مبارک عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے چونکہ پہلے مذکور ہے، لیکن اس سے یہ دلیل نہیں دی جاسکتی کہ ان کو عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر فضیلت حاصل ہے کیونکہ ذکر میں پہلے کسی نام کا آجانا فضیلت کی دلیل نہیں ہوتی) کو واجب نہیں کرتی۔

فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ کی ایک جماعت سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے متعلق حضرت سیدنا امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قول سے زیادہ اچھا قول ہم نے نہیں دیکھا۔

جیسا کہ علی ابن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کوفہ میں منبر پر تشریف فرما تھے، آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے صاحبزادے محمد بن حنفیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ اس امت میں حضور ﷺ کے بعد بہترین شخص کون ہے؟ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ، کہا: پھر کون؟ فرمایا کہ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، پھر کون؟ فرمایا: عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ، کہا: پھر کون؟ تو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ خاموش ہو گئے، پھر فرمایا کہ اگر تم چاہتے ہو کہ میں تمہیں چوتھے کی خبر دے دوں؟ لیکن پھر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ خاموش ہو گئے، اس پر آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے صاحبزادے محمد بن حنفیہ رضی اللہ تعالی عنہ نے کہا: آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں؟ تو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تواضعاً فرمایا: تیرا باپ ایک شخص ہے مسلمانوں میں سے اور نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: میں علم کا شہر ہوں اور اس کی بنیاد ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں اور اس شہر کی دیوار حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں اور اس کی چھت حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں اور اس کا دروازہ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں اور بسند سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالی عنہ سے مروی ہے کہ ہم حضور ﷺ کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے کہ ابو بکر رضی اللہ تعالی عنہ آگئے، حضور اقدس ﷺ نے فرمایا: مرحبا! اس کو جو اپنے جان و مال سے مجھ کو ایثار کرتا ہے۔

پھر عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ آئے تو فرمایا: مرحبا! میرے وزیر کو مرحبا، حق و باطل میں فرق کرنے والے پر، مرحبا! اس کو جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے دین کو کامل کیا اور جس کے واسطے تمہارا نام مؤمنین رکھا۔ پھر عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ

آئے تو فرمایا: مرحبا! میرے داماد کو، میری بیٹی کے شوہر کو، وہ جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے دو نور جمع کیے، وہ جو سعید اور شہید ہے، ویل (ہلاکت و جہنم) ہے اس کے قاتل کے لئے۔

پھر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: مرحبا! میرے بھائی اور میرے چچا کے بیٹے کو اور میرے بیٹے کے باپ کو اور میں اور وہ ایک ہی نور سے پیدا ہوئے۔

اے لوگو! ان چاروں کی محبت جمع نہ ہو گی مگر مؤمن کے دل میں اور جس کے دل میں ان کی محبت نہ ہو گی وہ منافق ہے جو ان سے محبت کرے گا تو وہ مجھ سے محبت کرے گا اور جو ان سے بغض رکھے گا تو وہ مجھ سے بغض رکھے گا۔ یہ چاروں مؤمنوں کے دنیا و آخرت میں سردار ہیں، ان سے بغض رکھنے والا شقی (بدبخت) ہے اور ان سے محبت کرنے والا مؤمن تقی ہے، الٰہی ! میں نے تبلیغ کر دی تو دیواروں کی جانب اور عتبہ باب مسجد سے آواز آئی کہ الٰہی جو ان سے بغض رکھے ان پر لعنت کر تو دیواروں نے کہا: آمین، اس معجزہ کو دیکھ کر اس دن تیس یہودی اور پچاس منافق ایمان لائے اور فضائل صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم بے شمار ہیں۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ تمام صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے افضل ہیں

اس کی دلیل کہ سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سب صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے افضل ہیں، وہ حدیث ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو فضیلت زیادہ نمازیں پڑھنے اور کثرت سے روزے رکھنے کی وجہ سے نہیں ہے یعنی کثرت صوم وصلوٰۃ ان کی وجہ ٔفضیلت نہیں ہے بلکہ (ان کی وجہ ٔفضیلت) ایک چیز ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں بھر دی ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم حضور ﷺ کے در اقدس پر جمع ہوئے اور ان میں حضرت سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نہیں تھے، ہر ایک اپنی فضیلت بیان کرتا تھا جب آوازیں بلند ہوئیں۔ حضور ﷺ کا شانہ ٔاقدس سے باہر تشریف لائے اور فرمایا: کیا باتیں کرتے تھے کہ تمہاری آواز بلند ہوئی؟ عرض کیا: ہم فضیلت کا ذکر کرتے تھے، فرمایا کہ تم میں ابو بکر (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) بھی تھے یا نہیں؟ عرض کی نہیں، فرمایا: پھر تم میں کسی کو فضیلت نہیں۔ اگر کہا جائے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت سیدنا ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے افضل تھے، اس لئے کہ انہوں نے کبھی شرک نہیں کیا اور بت پرستی نہیں کی۔

جواباً ہم کہیں گے کہ یہ صحیح نہیں، حضرت علی تبعاًللوالدین پہلے مسلمان نہ تھے اور اگر وہ غیر مسلم نہ تھے تو دعوتِ اسلام کی ضرورت نہ ہوتی حالانکہ حضور ﷺ نے ان پر اسلام پیش کیا، اگر وہ مسلمان ہوتے تو اسلام پیش کرنے کی حاجت نہیں ہوتی پھر جب ان کا اسلام صحیح ہے تو یہ بھی صحیح ہے کہ ان کا کفر ثابت ہے والدین کی تبعیّت میں۔

توہم کہتے ہیں کہ ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ افضل الصحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم ہیں، پھر عمر فاروق اعظم، پھر عثمان غنی، پھر علی رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔ پھر چاروں خلفاءراشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے بعد افضل الناس اہل بیت ہیں اور اہل بیت وہ حضور ﷺ کے گھر والے ہیں اور پھر وہ جن کو جنت کی بشارت وشہادت دی، پھر اہل بدر، پھر اہل حدیبیہ پھر بقیہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم تمام امت سے افضل ہیں۔ پھر تابعین، پھر تبع تابعین (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) جیسا کہ نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ فرمایا "خیر القرون قرنی" یعنی بہترین زمانہ میرا ہے، پھر صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا، پھر تابعین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا، پھر تبع تابعین رضی اللہ تعالیٰ عنہم، پھر اس کے بعد جھوٹ عام ہو جائے گا کہ کذب ودروغ گوئی پھیل جائیں گے (یہ حدیث طویل ہے)۔

ام المؤمنین حضرت سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی فضیلت

ام المؤمنین حضرت سیدہ عائشہ صدیقہ عفیفہ عتیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا تمام جہان کی عورتوں سے افضل ہیں جو گزر چکی ہیں اور جو موجود اور آنے والی ہیں، سب سے افضل ہیں اور جو حضرت سیدہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو حضرت سیدہ عائشہ صدیقہ عفیفہ عتیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے علی الاطلاق افضل کہے تو یہ شیعہ وروافض کا مذہب ہے بلکہ ام المؤمنین حضرت سیدہ عائشہ صدیقہ عفیفہ عتیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا افضل ہیں، اگرچہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہاشمی ہیں اور بنی ہاشم کا نسب بنی تمیم کے نسب سے افضل ہے۔

رافضیوں نے کہا کہ اہل بیت وہ حضرت علی اور فاطمہ وحسن وحسین رضی اللہ تعالیٰ عنہم ہیں اور یہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے بھی افضل ہیں اور علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں داخل نہیں اس لئے کہ وہ قرابت دار ہیں اور اصحاب غیر رشتہ دار و قرابت دار سے ہوتے ہیں اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی کریم ﷺ کے بعد سب سے افضل ہیں اور وہ (علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ) صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں سے نہیں اور صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں افضل ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں، لیکن ان کا قول مردود ہے، اس لئے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم

سے تھے۔ دلیل یہ ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ "اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اھتدیتم "میرے اصحاب رضی اللہ تعالیٰ عنہم ستاروں کی مانند ہیں تم جس کی پیروی کرو ہدایت پا جاؤ گے، اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی ان میں داخل ہیں۔

اور اگر ہم یہ کہیں کہ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان میں داخل نہیں تو اس میں ان کی توہین و منقصت ہے تو صحیح وہی ہے جو ہم نے کہا کہ ابو شکور سالمی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں رافضیوں میں پھنس گیا اور میں ان سے زدو کوب کے خطرہ سے کانپ رہا تھا، انہوں نے مجھ سے پوچھا: حضور ﷺ کے بعد سب سے افضل کون ہے؟ میں نے جواب دیا کہ نبی کریم ﷺ کے اصحاب رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور اہل بیت میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ افضل ہیں، یہ سن کر بہت خوش ہوئے، اس لئے کہ وہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اصحاب میں داخل نہیں مانتے۔ علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم کو اہل بیت میں داخل مانتے ہیں اور اہل بیت افضل الصحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم ہیں۔ میرا عقیدہ (دل میں گمان) یہ تھا کہ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اصحاب رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں داخل ہیں اور اہل بیت رضی اللہ تعالیٰ عنہم بھی ہیں اور ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان سے افضل ہیں اور خلفاء راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم اہل بیت رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے افضل ہیں اور روایت ہے کہ ایک رافضی قاضی ابو یوسف رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ ان چار کے بارہ میں آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کیا فرماتے ہیں کہ پانچویں ان کے نبی (ﷺ)، چھٹے ان کے جبریل صلوات اللہ علیہم اجمعین ہیں۔ اس کی مراد اصحاب رضی اللہ تعالیٰ عنہم نہیں تھے، ابو یوسف قاضی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پہچان لیا کہ یہ ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر طعن کرتا ہے تو آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے برجستہ فرمایا: تو ان دو کے بارے میں کیا کہتا ہے جن کا تیسرا خدا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے: ثَانِيَ اثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ (التوبۃ ۴۰) "صرف دو جان سے جب وہ دونوں غار میں تھے۔" اور فرمایا: إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا (التوبۃ ۴۰) "بے شک اللہ ہمارے ساتھ ہے۔"

اور ہم سب کا اجماع ہے کہ جو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حضور ﷺ کا صحابی نہ مانے وہ کافر ہے۔ اس لئے کہ وہ اس نص قرآنی کا منکر ہے۔ إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ لَا تَحْزَنْ (التوبۃ ۴۰) "جب اپنے یار سے فرماتے تھے غم نہ کھا۔" اور یہی قول حضرت امام شافعی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ہے اور محمد ابن حسن سے بھی ایسے ہی مروی ہے۔

اور بعض فقہاء رحمھم اللہ تعالیٰ کافر نہیں کہتے، اس لئے کہ نص میں یہ وارد نہیں کہ یہاں صاحب سے مراد ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔

فضیلت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ، آیت مصداق ابو بکر میں

اور روایت ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضور ﷺ نے ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا: "لقد بلغت من اللہ مبلغ الافتخار حیث اثنی علیک الملک الجبار بقولہ ثَانِيَ اثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ (التوبۃ ۴۰)" اے ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ! تم مبلغ افتخار کو پہنچے کہ ملک جبار (اللہ جل جلالہ کے فرشتے) جل جلالہ نے فرمایا: ان دو میں کا دوسرا جب کہ وہ دونوں غار میں تھے۔

عربوں سے محبت کی تین وجوہ

یہ اظہر من الشمس اور اجلی من الامس ہے کہ غار ثور میں بالاتفاق ہجرت کے دن حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی حضور ﷺ کے ہم رکاب اور رفیق سفر تھے۔ پھر عرب، موالی سے تین وجوہ سے افضل ہیں۔

(۱) پہلی وجہ تو یہ ہے کہ قرآن پاک عربی زبان میں نازل ہوا۔

(۲) دوسری وجہ یہ ہے کہ حضور ﷺ بھی عربی ہیں۔

(۳) اور حضور ﷺ ربیعہ و مضر سے تھے اور پھر قریش سے تھے، اس لئے بھی عرب کو شرف و بزرگی حاصل ہے۔

عربوں سے محبت رکھنے والا جنتی اور بغض رکھنے والا دوزخی ہے

اور نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا: تم مجھ سے بغض نہ رکھنا ورنہ جہنم میں جاؤ گے۔ سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا: حضور (ﷺ)! میں کس طرح بغض رکھ سکتا ہوں ؟ خدا نے آپ ﷺ کی بدولت مجھ کو ہدایت بخشی ہے۔ فرمایا: جب تو عرب سے بغض رکھے گا تو گویا مجھ سے بغض رکھتا ہے اور حضور ﷺ نے فرمایا: عرب کی محبت ایمان کا حصہ ہے تو ہم عرب سے محبت رکھتے ہیں اللہ تعالیٰ کے لئے اور رسول ﷺ کے لئے کہ وہ رسول ﷺ انہیں سے بھیجے گئے۔

ساتواں قول: حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی امارت، بغاوت اور ان کے پیچھے لگنے والوں کا بیان

اہل سنت وجماعت فرماتے ہیں کہ حضرت مولیٰ علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم کی زندگی مبارک میں حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کے ساتھ جو صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم تھے وہ سب دعوئ امارت اور بیعت میں خطاوار تھے اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ مقاتلہ میں سب باغی تھے۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ خطا پر تھے

اور یہ جو ہم نے کہا کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالی عنہ اوران کے ساتھی خطاوار تھے اس کی دلیل یہ ہے کہ انہوں نے جو اجتہاد میں خطا کی ہے وہ محل اجتہاد میں خطا کی ہے نہ کہ وقتِ اجتہاد میں کیوں کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالی عنہ حضرت مولیٰ علی کرم اللہ تعالی وجہہ الکریم کے بعد خلافت کے اہل تھے، اگر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان سے پہلے خلیفہ نہ ہوتے تو اس وقت ان کی خلافت صحیح تھی، اس لئے کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ قریشی ہیں اور حضور ﷺ نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا تھا، جب حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور ﷺ کے ہاں داخل ہوئے: اے معاویہ (رضی اللہ تعالی عنہ) جب تم والی بنائے جاؤ تو میری امت کے ساتھ رفق ونرمی کرنا اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دل میں یہ بات پیدا ہوئی کہ میں مستحق خلافت ہوں، اس لئے قبل ازوقت خلافت کے مدعی ہوئے اور من وجہ (ایک پہلو سے) مصیب (برحق) تھے، اس لئے کہ خلافت کے اہل تھے اور من وجہ (ایک پہلو سے) خطا کی، اس لئے کہ (اس وقت) خلافت وبیعت حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا حق تھا اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان سے سابق اور افضل واحق تھے کہ خلافت ان کی ہو، مولیٰ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے وقت کسی کو خلافت کرنا جائز نہ تھا۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت اور قریش میں سے دوسرے لوگوں کی خلافت کا وقت حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بعد تھا۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالی عنہ باغی تھے؟

اور ہمارا یہ کہنا کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جنگ کرنے میں باغی تھے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا فَإِنْ بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَى فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّى تَفِيءَ إِلَى أَمْرِ اللهِ (الحجرات ۹)

"اور اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑیں تو ان میں صلح کراؤ پھر اگر ایک دوسرے پر زیادتی کرے تو اس زیادتی والے سے لڑو یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف پلٹ آئے۔"

اللہ تعالیٰ نے طائفوں میں سے ایک کو باغی فرمایا، پس جو حق پر نہ ہو وہ باغی اور اس پر دلیل کہ وہ باغی تھے، یہ ہے کہ قاضی جلیل ابن احمد سنجری سمرقندی رحمہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ سے روایت کی کہ حضور ﷺ نے عمار ابن یاسر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا تھا۔ "تقتلک الفئة الباغية" کہ تجھے باغی گروہ قتل کرے گا اور ان کو حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لشکر نے شہید کیا تو حضور اقدس ﷺ نے اس لشکر کا نام باغی رکھا۔

امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حبِ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ

امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ اپنے اصحاب و تلامذہ رحمہم اللہ تعالیٰ سے فرمایا کہ تم جانتے ہو کہ اہل شام ہم سے کیوں بغض رکھتے ہیں؟ انہوں نے کہا: نہیں۔

فرمایا: اس لئے کہ ہم یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اگر ہم اس زمانہ میں ہوتے تو حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مقابلہ میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مدد کرتے اور ان کے ساتھ ہو کر حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حمایت میں جنگ کرتے۔

بایں ہمہ (ان سب باتوں کے وجود) ہم کہتے ہیں کہ باغی کی نہ ہم تکفیر کرتے ہیں نہ تفسیق، اس دلیل سے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا (الحجرات ۹) یعنی دونوں گروہوں کو مؤمن فرمایا اور دو طائفے یہی حضرت معاویہ اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے لشکری ہیں۔

اور نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے حضرت سیدنا حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا: **ان ابنی هذا سید سیصلح الله به بین الفئتین من المؤمنین۔** "یہ میرا بیٹا سردار ہے اور عنقریب اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے دو مسلمان جماعتوں میں صلح کرا دے گا۔" تو نبی کریم ﷺ نے دونوں جماعتوں کو مؤمن فرمایا اور اس میں دلیل ہے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بعد حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خلافت کا حق تھا، اس لئے کہ حضور ﷺ نے ان دونوں کے درمیان صلح کو جائز رکھا اور حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ صلح کرنے کے بعد عادل ہو گئے۔

ہم کہتے ہیں کہ باغی کی تفسیق نہیں کی جائے گی اس لئے کہ اس کی شہادت بالاتفاق جائز ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ باغی اپنے دعویٰ میں مأوّل ہوتا ہے۔

باغی کسے کہتے ہیں؟

باغی کی تعریف یہ ہے کہ وہ اپنا حق طلب کرتا ہے شبہ کے ساتھ اور حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنے دعویٰ میں شبہ ہو گیا تھا اور وہ تاویل کرتے تھے اور تاویل کرنے میں ان لوگوں نے خطاء کی اور ان کی خطاء کبیرہ گناہ نہیں حتی کہ مرتکب کبیرہ کی تفسیق کی جائے یا تکفیر۔

پھر حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ کچھ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم بھی تھے جیسے حضرت طلحہ، حضرت زبیر، ام المؤمنین حضرت سیدہ عائشہ صدیقہ عفیفہ عتیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور ان کے متعلق ہم اس بات کا وہم بھی

نہیں کر سکتے کہ وہ دیدہ و دانستہ ایسے امر کے مرتکب ہوں، جو موجبِ فسق و کفر ہو باوجود یکہ یہ لوگ اہل دیانت اور صاحبِ فقہ و دانش تھے، پھر اس پر اصرار بھی کریں حالانکہ یہ سب عادل اور فقیہ و مجتہد تھے اور اس لئے بھی کہ باغی کی جانب سے ایامِ جمعہ، جماعتِ صلوٰت، حج اور تولیت قضاء وغیرہ کی ولایت جائز ہے، ثابت ہوا کہ وہ فاسق نہیں تھے۔

پھر حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی توبہ حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم کے زمانہ میں ظاہر نہیں ہوئی لیکن حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ تعالی عنہ سے صلح کر لی تھی، اس بناء پر ہم کہتے ہیں کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر لعن طعن جائز نہیں، اس لئے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ نے صلح کر لی تھی اور اگر وہ مستحقِ لعنت ہوتے تو ان سے صلح کرنا جائز نہ ہوتا۔

پھر حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ تعالی عنہما نے بغاوت سے توبہ کر لی اور رجوع کر لیا اور ان کی توبہ ظاہر ہو گئی، اسی بناء پر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے جنازہ کی نماز پڑھی کہ وہ بغیر بغاوت ناحق قتل کئے گئے اور حضرت زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ لشکر معاویہ رضی اللہ تعالی عنہ سے نکل کر اپنے شہر جا رہے تھے، حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لشکر کے ایک آدمی نے ان کو قتل کر دیا اور اس کو معلوم نہ تھا کہ یہ توبہ کر کے جا رہے ہیں، لاعلمی میں قتل کر کے ان کا سر حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ کے سامنے اٹھا کر لے گیا تو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ حدیث پڑھی کہ حضور صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے فرمایا ہے: "قاتل الزبیر فی النار" زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قاتل جہنم میں ہو گا اور قصہ لمبا ہے۔ کتب سیر و تاریخ میں مذکور ہے۔

ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ عفیفہ عتیقہ رضی اللہ تعالی عنہا لشکر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں تھیں لیکن آپ رضی اللہ تعالی عنہا بغاوت کے لئے نہیں نکلیں بلکہ مصالحت کے لئے تشریف لائیں تھیں۔ یہ جو بعض لوگوں نے کہا کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مقابلہ میں بغاوت کے لئے نکلیں صحیح نہیں، لہٰذا ہم کہتے ہیں کہ وہ لشکر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے واپس ہو گئیں، انہوں نے بغاوت نہیں کی اور اس کا تو ہم تصور بھی نہیں کر سکتے کہ وہ باوجود علم و فصاحت اور فقہ و فراست کے حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ پر بغاوت کے لئے دل سے راضی ہوئی ہوں، ایسا وہم بھی نہیں کیا جا سکتا اس لئے کہ انہوں نے حضور اقدس صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم سے سنا تھا کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا: تم سے محبت نہ کرے گا مگر مؤمن اور تم سے بغض نہ رکھے گا مگر منافق، تو ایسے میں ناممکن ہے کہ وہ بغاوت کی وجہ سے تشریف لائیں، اس کا وہم بھی نہیں ہو سکتا۔

آٹھواں قول: حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کا بیان

اہل سنت و جماعت کہتے ہیں کہ حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ حق پر تھے اور ظلماً شہید کئے گئے۔

اور متقشفہ کہتے ہیں کہ حضرت حسین (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) باغی تھے، انہوں نے اپنے امام پر خروج کیا۔ ہمارا اس پر اجماع ہے کہ خلافت حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بعد حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لئے تھی اور حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان سے مصالحت کرلی اور حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تمام مسلمانوں کے ساتھ بیعت کرلی اور تمام صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے بیعت کرلی۔

کیایزید کو خلافت کا حق تھا؟

یزید بن معاویہ کے متعلق بعض حضرات کہتے ہیں کہ یزید کی خلافت حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خلیفہ بنانے سے تھی اور صحابہ رضی اللہ تعالی عنہم اور مسلمانوں کی بیعت سے تھی تو قیاس کی رو سے حضرت امام حسین رضی اللہ تعالی عنہ پر یزید کی بیعت واجب تھی اوراسی طرح تمام مسلمانوں پر کہ وہ یزید کی بیعت کریں۔

مگر ہم یہ کہیں گے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ عالم متدین تھے، فاسق نہ تھے ان میں دیانت تھی اور اگر وہ متدین نہ ہوتے تو ہر گز ان سے صلح نہ کی جاتی اوران سے سوائے بغاوت کے اور کوئی بات نہیں پائی گئی۔ پھر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مصالحت کی، اس لئے کہ دورانِ بغاوت میں مسلمانوں پر ظلم نہیں کیااور وہ مدعیٔ حق تھے اور اللہ تعالیٰ کے دین میں اور لوگوں کے معاملات میں عادل تھے اور یزید اس کے بر خلاف تھا اس لئے کہ مروی ہے کہ وہ شرابی تھااور لہو ولعب کا رسیا تھا، گانے بجانے کا حکم کرتا تھا، حق داروں کے حق کو روکتا تھا اور فسق وفجور کرتا تھا۔

بعض فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ امام جب فسق وفجور میں مبتلا ہو تو عزل (معزول وبر طرف کرنا) کے خود معزول ہو جاتا ہے، اس لئے امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ فاسق اہل شہادت نہیں اور جب وہ اہل شہادت نہیں تو اہل ولایت کس طرح ہو سکتا ہے اور اہل حکم (حکمران) کس طرح ہو سکتا ہے؟ اور امام کو جائز ہے کہ سوائے حدود کے اپنی ذاتی رائے اور ذاتی علم کی بناء پر حکم کرے، پھر فاسق جب کہ اس کا علم دوسروں پر بوجہ ٔشہادت کے نافذ نہیں تو ایسے ہی بوجہ ٔولایت کے بھی نافذ نہیں ہو گا اس لئے کہ ولایت شہادت سے اقویٰ ہے۔

جب وہ فاسق مردود الشہادۃ ہے تو اس کی امارت وولایت بھی ناجائز ہو گی۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہ صحیح نہیں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کو خلیفہ بنایا، دلیل یہ ہے کہ اگر اس کو خلیفہ بنایا ہو تا تو وہ عمرو بن العاص سے بیعت طلب نہ کرتا، پھر بیعت صحابہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) و مسلمین یزید پر متفق نہیں جیسے عبد اللہ ابن زبیر اور محمد بن حنفیہ اور حسین ابن علی رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین اور بہت سے اہل بیت یزید پر متفق نہیں ہوئے۔ ثابت ہوا کہ وہ امام عادل نہ تھا۔

اس سے واضح طور پر معلوم ہو گیا کہ امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہر گز باغی نہ تھے اور انہوں نے امام بر حق پر خروج نہیں کی، اس کی دلیل درج ذیل ہے:

یزیدیوں کو حضور ﷺ نے باغی فرمایا تھا

جب حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ پیدا ہوئے تو حضور اقدس ﷺ آبدیدہ ہو گئے، عرض کیا گیا: حضور! آپ کے رونے اور گریہ فرمانے کا سبب؟ فرمایا: اس کو (یعنی حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو) باغی جماعت قتل کرے گی۔ حضور ﷺ نے یزیدیوں کو "فئة باغية" (باغی گروہ) فرمایا اور ان کا نام باغی رکھا، ثابت ہوا کہ حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ حق پر تھے۔

یزید مستحق لعنت ہے؟

اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ یزید پر لعنت جائز ہے یا نہیں؟

۱) بعض نے کہا: لعنت جائز نہیں اس لیے کہ کئی سال تک مسلمانوں کا امام بنا رہا۔

۲) بعض نے کہا کہ یزید پر لعنت جائز ہے، اس لیے کہ اس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کیا کہ امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قتل کو جائز رکھا اور اس پر راضی ہوا۔

۳) اور بعض نے کہا کہ یزید نے لوگوں کو امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قتل کا حکم نہیں دیا تھا بلکہ حکم دیا تھا کہ ان سے بیعت لے لو یا ان کو اٹھا کر میرے پاس لے آؤ۔ ان خوش آمدیوں اور بدبختوں نے اس کے حکم کے بغیر قتل کر دیا اور یہ بھی ثابت نہیں کہ وہ قتل حسین پر راضی ہوا۔ پس صحیح یہ ہے کہ اگر یزید نے قتل حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا حکم دیا اور ان کے قتل پر راضی ہوا اور اس نے اہل بیعت پر لعنت کو جائز رکھا تو یزید پر لعنت جائز ہے ورنہ پھر نہیں۔

اور ایسے ہی جس نے قتل کیا اور قتل کو حلال نہیں سمجھا اس پر بھی لعنت جائز نہیں اور قتل حلال سمجھا تو وہ کافر ہے، اس پر لعنت بھی جائز ہے۔ واللہ تعالیٰ جل شانہٗ اعلم بحقیقۃ الحال۔

نواں قول: عباسیوں کو خلافت سونپنے کا بیان

اہل سنت وجماعت فرماتے ہیں کہ خلافت بنی عباس کے لیے حق ہے اور ان کا حکم نافذ ہو گا۔

روافض اور مسئلہ خلافت

رافضیوں نے کہا کہ خلافت اولاد علی کرم اللہ وجہہ الکریم کے لیے ہے، کسی کی خلافت قبول کرنا جائز نہیں اور وہ بنی عباس پر لعنت کرتے ہیں کہ انہوں نے خلافت قبول کیوں کی اور ان کے یہاں جب تک اولاد علی رضی اللہ تعالیٰ عنہم کہ مخالفوں پر لعنت نہ کرے، نماز جائز نہیں۔

اور (روافض) کہتے ہیں کہ لعنت کرنا ان پر واجب ہے اور جو ان سے دوستی کرے ان پر بھی لعنت واجب ہے اور یہ صحیح نہیں اس لیے کہ خلافت دو حال سے خالی نہیں، بطور وراثت ہو گی یا بطور تفویض ہو گی۔ اگر بطور توریث ہو تو حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ چونکہ حضور ﷺ کے چچا ہیں وہ بہ نسبت حضرت علی کرم علی وجہہ کے کہ وہ چچازاد بھائی ہیں، خلافت کے زیادہ حق دار ہیں کہ چچا کے ہوتے ہوئے بھائی مستحق میراث نہیں اور اگر تفویض کے طور پر ہے تو خلافت حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو سپرد کی گئی۔

خلافت میراث نہیں

پھر اس کی دلیل کہ خلافت میراث نہیں اس لیے کہ حضرت عباس و علی اور ابن عباس رضوان اللہ تعالیٰ عنہم نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بیعت کی، سب اس بیعت پر متفق تھے اور راضی تھے تو یہ چیز دلالت کرتی ہے کہ خلافت تفویضاً تھی توریثاً نہ تھی۔

پھر جب امت کی طرف سے تفویض خلافت حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ کے لیے جائز ہوتی تو امت کی طرف سے تفویض خلافت اولاد عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لیے بھی جائز ہوتی، اس لیے کہ یہ قریشی ہیں اور رسول کریم ﷺ نے فرمایا ہے: "الائمۃ من قریش" خلفاء قریش ہوں گے۔

پھر جب کہ اجماع امت حجت ہے اور تفویضِ خلافت مستحق خلافت کو صحیح ہے تو اس میں کوئی فرق نہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالی عنہم تفویض کریں یا غیر صحابہ تفویض کریں، اس لئے کہ اجماع امت معتبر ہے بالاجمال تفصیل کی ضرورت نہیں۔

قرآن کریم میں ہے کہ:

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (البقرة ۱۴۳)

اور بات یوں ہی ہے کہ ہم نے تمہیں کیا سب امتوں میں افضل کہ تم لوگوں پر گواہ ہو اور یہ رسول تمہارے نگہبان و گواہ۔

اس میں صحابہ کرام اور غیر صحابہ کرام کی تفصیل اور فرق نہیں اور لفظ 'امت' عام ہے، سب کو شامل ہے۔ اول سے آخر تک اور ایمان کے حق میں سب مساوی ہیں تو جب تفویض خلافت باجماع متقدمین صحیح ہوئی تو متاخرین کے اجماع سے بھی تفویض خلافت صحیح ہونا چاہیے۔

اس لیے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

"لاتجتمع امتی علی الضلالة"۔

میری امت گمراہی پر جمع نہیں ہو سکتی۔

اور جب لوگوں نے اختلاف کیا ہے وہ غرض فاسد کی بناء پر کیا ہے وہ معتبر نہیں، جیسے دنیاوی غرض کے لیے اجماع معتبر نہیں، تو ثابت ہوا کہ روافض کا خلاف موجب طعن نہیں، خلافت بنی عباس میں باوجود اولاد علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ کے اور اگر خلافت اولاد علی کو ہوتی تو بھی جائز تھی ہم اس کے منکر نہیں۔

اولاد علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ اور بنی عباس رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین میں سے مستحق خلافت کون؟

حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ آپ سے ابو جعفر دوانقی نے سوال کیا کہ مستحق خلافت اور اولیٰ بالخلافت کون ہے؟

امام صاحب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: جعفر بن محمد الصادق رضی اللہ تعالیٰ عنہ پھر جب امامت و خلافت صحیح ہوئی باوجود اس کے کہ ان سے بہتر موجود تھے اور اس لیے کہ امارت کی بناء قہر و غلبہ پر ہے، خصوصاً امام ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے

نزدیک، تو جب امامت صحیح ہوئی تو ان کی امارت صحیح ہوئی اور جب امارت صحیح ہوئی تو تقلید و تولیت قضاء، نیابت، تمام اشغال و اعمال میں صحیح ہوئی اور جمعہ و عیدین اور حج و جہاد ان کی معیت میں جائز ہے اور ان کے جمیع احکام نافذ ہیں، جمیع معانی میں جس طرح خلفاء راشدین کے احکام نافذ تھے اور جب جمعہ و عیدین، حج اور جہاد کرنا اور جمیع احکام باغی کے ساتھ جائز ہیں تو عادل و مستحق کے ساتھ بہ طریق اولیٰ جائز ہیں۔ اور بعض فقہاء نے فرمایا کہ حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بعد عادل و باغی کے درمیان پہچان نہ رہی اور لیکن یہ قول صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ اگر یہ بات صحیح ہو تو مسلمانوں کے تمام لشکروں پر بغاوت کا حکم جاری کیا جائے کیونکہ بعض نے بعض کے ساتھ مقاتلہ کیا تو چاہیے کہ بغاوت کی وجہ سے مسلمان لشکروں کا خون مباح ہو جائے اور یہ صحیح نہیں۔

اور بعض لوگوں نے کہا کہ امام جب تک مطاع نہ ہو اور اسے قہر و غلبہ حاصل نہ ہو، وہ امام نہیں ہو سکتا۔ ہم نے جواباً کہا: یہ صحیح نہیں کیونکہ اطاعت امام لوگوں پر فرض ہے اور لوگ امام کی اطاعت نہ کریں تو وہ گنہگار ہوں گے اور ان کی نافرمانی اور عصیان امامت کو نقصان نہیں دیتے، پھر لوگوں کے تمرد و سرکشی کی وجہ سے امام کو غلبہ حاصل نہ ہو تو اس کی امامت کو ٹھیس نہیں لگتی، کیا تم نے نہیں دیکھا کہ ابتدائے اسلام کے وقت حضور ﷺ کی اطاعت سب نے نہیں کی اور دشمنوں پر غلبہ اور قہر بھی ممکن نہ تھا اور کافروں نے تمرد و سرکشی کی، آپ کی امداد اور نصرت دین سے اعراض کیا تو کیا ہوا؟ حضور ﷺ کی امامت و سیادت میں کیا فرق آیا اور معاذ اللہ ثم معاذ اللہ نبوت سے معزول نہ ہوئے تو اسی طرح امام برحق کی کوئی مخالفت کرے تو امامت سے معزول نہیں کیا جا سکتا اس لیے کہ خلیفہ اور امام لا محالہ حضور ﷺ کا خلیفہ و نائب ہوتا ہے اور ایسے ہی حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم تمام مسلمانوں کے مطاع نہیں تھے اور باوجود اس کے وہ معزول نہیں ہوئے تو جو ہم نے کہا وہ صحیح ہے اور بالفرض تمام مسلمان مرتد ہو جائیں، العیاذ باللہ، تو امام اپنی امامت سے معزول نہیں ہوتا تو اسی طرح ان کی عصیان و نافرمانی سے معزول نہیں ہونا چاہیے۔ پھر امراء و سلاطین کے تمام نائبین کی نیابت صحیح ہوتی ہے، اگرچہ وہ ظلم و جور کریں اور ان کا حکم نافذ ہوتا ہے۔

سوائے اللہ تعالیٰ کی معیت کے قرآن پاک میں ہے:

"يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللّٰهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ" (النساء: ۵۹)

اے ایمان والو حکم مانو اللہ کا اور حکم مانو رسول (ﷺ) کا اور ان کا جو تم میں حکومت والے ہیں۔

تو جیسے امام کا حکم واجب الاتباع ہے، اسی طرح اس کے نائب کا امر واجب الاتباع ہے، اس لیے کہ امام کا نائب شرع کی جانب سے بہ منزلہ امام کے ہوتا ہے۔ پھر امام کے امر کو ترک کرنا اور اس پر خروج کرنا عصیان و بدعت کا موجب ہے تو اسی طرح نائب کے حق میں عدم اطاعت امر اور بغاوت موجب بدعت و نافرمانی ہے۔ دلیل یہ ہے کہ محمد بن سلام نے عبد الرحیم ابن یزید قمی سے اور انہوں نے چالیس تابعین سے جنہوں نے ایک بدری یا دو بدریوں سے ملاقات کی، سب کے سب حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا: سات (صفات) ہدایت کی ہیں اور ان میں نجات ہے، جو ان سے نکلا وہ جماعت سے خارج ہو گیا۔

کسی اہل قبلہ کی کفر و شرک پر گواہی نہ دو، ان کے باطن اور اندرونی معاملات کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دو اور جو اہل قبلہ سے مر جائے اس کے جنازے کی نماز نہ چھوڑو اور جمعہ اور پنجگانہ نمازیں باجماعت ہر امام کے ساتھ ادا کرو اور ہر خلیفہ کے ساتھ ہو کر جہاد کرو، خواہ نیک ہو یا بد تم کو تمہارے جہاد کا ثواب ملے گا اور ان کو ان کے گناہ کی سزا ملے گی اور اپنے امام پر تلوار لے کر خروج نہ کرو اگرچہ وہ جور کریں اور ان کے لیے صلاح و فلاح (نیکی و کامیابی) اور عفو و مغفرت (درگزر و بخشش) کی دعا کرتے رہا کرو اور ان کے حق میں بد دعا نہ کرو اور خواہشات نفسانی سے پرہیز کرو، اس لیے کہ اس کا اول و آخر آغاز و انجام باطل اور برا ہے۔

اور نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ فرمایا: جس نے میری اطاعت کی، اس نے خدا کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی، اس نے خدا کی نافرمانی کی اور جس نے میرے امیر کی اطاعت کی، اس نے میری اطاعت کی اور جس نے میرے امیر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی اور نبی کریم ﷺ احوال امت کو جانتے تھے اور خداوند تعالیٰ نے حضور ﷺ کو مبین بنا کر بھیجا ہے اور حضور اقدس ﷺ جو کچھ فرماتے ہیں، حق فرماتے ہیں اور اس لیے کہ نفی امارت میں اور اس کے چھوڑنے میں احکام کی نفی ہے اور احکام کی تعطیل ہے اور بنو عباس کی خلافت پر امت کا اجماع و اتفاق ہے تو ضروری ہوا کہ ان کی خلافت حق ہو اور ان کے اوامر و نواہی اور احکام نافذ ہوں اور اس کی اصل (دلیل) یہ ہے کہ حضور ﷺ نے اپنے چچا حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کی اولاد کو جامہ امارت پہننے کی خبر دی اور ان کو امارت کی خوشخبری دی تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ (امارت) ان کا حق تھا۔

(٦) باب نمبر چھ: اہل سنت والجماعت اور بدعتیوں کے رد کا بیان

اس میں سولہ اقوال ہیں۔

پہلا قول: اس بارے میں کہ دین صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے

ہدایت کا طالب ابو شکور سالمی کہتا ہے کہ دین صرف اور صرف اور خالص اللہ تعالیٰ کے لیے ہے جس کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: "وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ" (البینہ: ۵) "اور انہیں صرف اس بات کا حکم دیا گیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں، دین کو اسی کے لیے خالص کرتے ہوئے" اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: " أَلَا لِلَّهِ الدِّينُ الْخَالِصُ" (الزمر: ٣) "آگاہ ہو جاؤ! دین خالص اللہ تعالیٰ کے لیے ہے"۔

پھر دین (اسلام) یہ اللہ تعالیٰ، فرشتوں، رسولوں، نبیوں، اولیاء اللہ اور تمام مسلمانوں کا دین ہے اور جو ان تمام سے جدا ہوا وہ دین سے بھٹکنے والا ہو گا۔

اس پر دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا" (آل عمران: ١٠٣)

"اور اللہ کی رسّی مضبوط تھام لو سب مل کر اور آپس میں پھٹ نہ جانا (فرقوں میں بٹ نہ جانا)"۔

یعنی اللہ تعالیٰ کے دین، سنت وجماعت سے جدا نہ ہو جاؤ۔

بہر حال سنت وجماعت سے جدا ہونا بدعت وگمراہی ہے اور بدعت وگمراہی والا دوزخیوں میں سے ہو گا۔

اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد دلیل ہے:

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا (آل عمران: ١٠٥)

"کہ تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو جدا ہو گئے"۔

پھر فرمایا:

وَأُولَئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ (آل عمران: ١٠٥)

"یہی لوگ ہیں جن کے لیے بڑا عذاب ہے"۔

اور نبی کریم ﷺ سے روایت ہے کہ عنقریب میری امت میرے بعد تہتر (۷۳) فرقوں میں بٹ جائے گی سوائے ایک کے سب دوزخی ہیں، تو وہ ایک (فرقہ ناجیہ) اہل السنت والجماعت ہیں۔

اور حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے ارشاد فرمایا: میری امت گمراہی پر کبھی بھی جمع نہیں ہو گی اور یہ کہ اللہ تعالیٰ کا ہاتھ جماعت کے ساتھ ہے اور اسی طرح جماعت پر ہے، پس تم بڑی جماعت کی پیروی کرو۔

اور حضرت عبد اللہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے ایک دن اپنے دونوں ہاتھوں میں ایک سیدھی لکیر کھینچی اور فرمایا: یہ اللہ تعالیٰ کا دین ہے، پھر (ہتھیلی کے) دائیں اور بائیں کئی خط کھینچے اور فرمایا: یہ کئی راستے ہیں اور ان میں سے ہر راستے پر شیطان ہے جو اپنی طرف دعوت دیتا ہے۔

پھر آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد تلاوت فرمایا:

وَ أَنَّ هَذَا صِرَاطِي مُسْتَقِيمًا فَاتَّبِعُوهُ وَ لَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيلِهِ (الانعام ۱۵۳)

"اور یہ کہ یہ ہے میرا سیدھا راستہ تو اس پر چلو اور اَور راہیں نہ چلو کہ تمہیں اس کی راہ سے جدا کر دیں گی۔"

پھر سواد اعظم (بڑی جماعت) کے اصول رسول اللہ ﷺ کے اصحاب، ان کے پیرو تابعین اور تبع تابعین ہیں، جیسے حضرت ابو سعید خدری، حسن بن ابو سعید بصری، سفیان ثوری، اوزاعی، علقمہ اسود، ابراہیم نخعی، شعبی، مالک، حماد بن ابو لیلیٰ، امام ابو حنیفہ رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین اور متاخرین اور ان کے شاگردوں میں سے جنہوں نے ان کی پیروی کی، جیسے ابو یوسف قاضی، محمد بن حسن شیبانی، زفر، حسن بن زیاد، داود طائی، محمد بن ادریس شافعی اور ابو عبد اللہ مزنی رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین اور خراسان کے فقہاء میں سے جیسے ابو مطیع بلخی، ابو سلیمان جرجانی، ابو حفص الکبیر بخاری، شقیق بن ابراہیم اور ابراہیم بن ادھم رضوان اللہ علیہم اجمعین یہ سب امام جعفر صادق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور امام ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے شاگرد تھے۔

اور فقہاء دین رحمہم اللہ تعالیٰ میں سے جس نے ان کی پیروی کی اور رسول اللہ ﷺ کے زمانہ سے آج تک کے مسلمانوں میں سے ایک جماعت اور انہوں نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور ان کے علاوہ ایک جماعت کی زبان اور ہاتھوں سے دین کو بغیر کسی تنازع اور اختلاف کے لیا۔ پھر یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اہل سنت والجماعت یہی مذکورہ شخصیات ہیں یعنی صحابہ کرام، آئمہ اور مسلمین اور آئمہ میں سے جنہوں نے ان کی پیروی کی کیونکہ اہل اھواء اور اہل بدعت بہتر (۷۲) فرقوں میں تقسیم

ہو گئے اور ان میں سے ہر فرقہ جب ایک مسئلہ میں اختلاف کرے گا تو اکہتر (۷۱) فرقے ہمارے ساتھ اس بات پر اتفاق کریں گے کہ ایک فرقہ ان کے مقابلہ میں خطاء کار ہے اور اپنے دین میں نئی چیز نکالنے والا ہے۔

اور اسی طرح جب دوسرا فرقہ کسی مسئلہ میں اختلاف کرے گا تو پہلا فرقہ اپنی خطا اور بدعت میں ہمارے ساتھ موافقت کرے گا۔

ایک کی مخالفت ایک مسئلہ میں معتبر نہیں، اسی پر رد کر دیا جائے گا تو ثابت ہوا کہ اہل سنت والجماعت صحابہ اور تابعین اور تبع تابعین رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور ان کے متبعین کے ساتھ ہیں، قیامت تک فقہاء سے اور مسلمانوں سے اور متابعت و موافقت متحقق ہے، ہمارے مشائخ و آئمہ ہدیٰ بلاد شرق و چین میں فقہاء خراسان اور ماوراء النہر اور بلاد غزنیہ اور دیار ترکمیں اور ان سب کے ایک ہی طریق اور ایک وتیرہ پر قواعد دین اور ارکان اسلام ثابت کیے ہیں، اپنی حجتوں اور کتاب و سنت اور سیرت صحابہ و تابعین کے دلائل کے ساتھ، جن کا ذکر پہلے ہو چکا اور ان کے نام بھی بتا دیے گئے، یہی سبیل اللہ (اللہ کا راستہ) پہلی سبیل مرسلین اور سبیل مسلمین ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: قُلْ هَذِهِ سَبِيلِي أَدْعُو إِلَى اللَّهِ عَلَى بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي (یوسف ۱۰۸) "تم فرماؤ یہ میری راہ ہے میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں میں اور جو میرے قدموں پر چلیں دل کی آنکھیں رکھتے ہیں۔" اس کے معنی یہ ہیں کہ تم فرما دو کہ یہ میرا دین ہے جو کہ حجت، رویت، دلیل، نور، ضیاء اور بصیرت پر مبنی ہے پھر جو بغیر حجت کے راہ اختیار کرے گا وہ گمراہ ہو گا اور خطاء کار و مبتدع ہو گا۔

دوسرا قول: بدعت کا حکم کیا ہے؟

اہل سنت وجماعت فرماتے ہیں: بدعت حرام ہے اور اس پر قائم رہنا فسق میں مبتلا رہنے سے برا ہے۔

مبتدع پر لعنت اور اس کی بے عزتی کرنا جائز ہے۔ نوح بن ابی مریم، ابو یزید قمی سے اور وہ سعید ابن جبیر سے، وہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے اللہ کے لیے عمل کیا جماعت میں، اگر وہ عمل درست ہے تو اللہ تعالیٰ قبول فرماتا ہے اور اگر خطا کی تو اللہ تعالیٰ معاف کر دیتا ہے اور جس نے اللہ کے لیے کوئی عمل انفرادی طور پر کیا تو اگر وہ درست ہوا تو اللہ اسے قبول نہیں کرے گا اور اس نے خطا کی تو وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں ڈھونڈے۔

اور اوزاعی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا: ابلیس نے اپنے لشکر سے کہا: تم بنی آدم کے پاس کس طرح آتے ہو؟ لشکریوں نے جواباً کہا: ہم ہر طرح سے ان کے پاس آتے ہیں مگر وہ اللہ تعالیٰ سے معافی مانگتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو توحید

کی حرمت سے بخش دیتا ہے۔ ابلیس نے کہا: میں انہیں ایسے گناہ میں ڈالتا ہوں کہ وہ توبہ کو نہ دیکھیں گے اور خواہشات ان میں ثابت ہو جائیں گی (یعنی خواہشات نفسانی کے پیرو ہو کر یہ سمجھیں گے کہ جو ہم کر رہے ہیں درست ہے۔

کیا بدعت فسق سے بری ہے؟ یہ جو ہم نے کہا کہ بدعت فسق سے بری ہے، اس لیے کہ فاسق اپنے فسق پر اصرار نہیں کرتا اور اپنے اوپر توبہ کو واجب جانتا ہے، مبتدع اپنی بدعت پر مصر رہتا ہے اور اس بدعت کا معتقد ہوتا ہے اور توبہ کو واجب نہیں جانتا ہے، اس لیے کہ وہ اپنی بدعت کو حق گمان کرتا ہے۔ فسق میں رہنا شیعہ ہونے سے اچھا ہے؟ کم برا ہے۔

ابن الحصین نے اپنے بھتیجے کو جب وہ اپنے فسق سے تائب ہو کر شیعیت میں داخل ہوا تو کہا پہلی حالت اچھی تھی۔

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ عفیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نبی کریم ﷺ سے راوی ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا: جس نے بدعتی کی عزت کی اس نے گویا اسلام کے منہدم کرنے پر اعانت کی، نیز حضور ﷺ نے فرمایا: جس نے اسلام میں نئی بات کا احداث کیا یا بدعتی کو اپنے یہاں ٹھہرایا اور پناہ دی، اس پر اللہ، فرشتوں اور تمام لوگوں کی لعنت ہے، اللہ تعالیٰ اس کے فرض کو قبول کرے اور نہ نوافل مقبول ہوں۔ نیز حضور ﷺ نے فرمایا: تین آدمیوں کے عیب بیان کرنا عیب نہیں: فاسق معلق و مبتدع اور ظالم بادشاہ۔

نیز حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"أترغبون عن ذكر الفاجر اذكروا الفاجر بما فيه كي يحذره الناس"۔

"کیا تم فاجر کے ذکر سے اعراض کرتے ہو فاجر میں جو عیب ہیں ان کا چرچا کرو تا کہ لوگ اس سے حذر کریں۔"

پس جو ہم نے کہا وہ صحیح ہے۔

تیسرا قول: اہل بدعت کے ساتھ مناظرہ کرنے کا بیان

اہل سنت وجماعت فرماتے ہیں کہ اہل بدعت اور اہل اھواء کے ساتھ مناظرہ و مجادلہ جائز ہے۔

اور اہل ظواہر کہتے ہیں کہ کہ جائز نہیں اس لیے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے اس بارے میں کچھ نہیں فرمایا، اگر جائز ہوتا تو وہ بھی شروع کرتے اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جھگڑا چھوڑ دے اگرچہ تو حق پر ہو۔ اس کا جواب یہ ہے کہ صحابہ کرام رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے زمانہ مبارک میں مبتدعین نہ تھے، اس لیے وہ مناظرہ میں شروع نہ ہوئے اور ان کے پاس تلوار تھی، کفار سے جہاد کرتے تھے اور ہمارے زمانے میں مبتدعین کثرت سے پیدا ہو گئے اس لیے مناظرہ کی

ضرورت ہے اور مروی ہے کہ حضرت خلیفہ اول ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے "مسئلہ قدر" میں حضرت خلیفہ ثانی عمر ابن خطاب فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مناظرہ کیا، اس کی تفصیل سے پہلے ذکر ہو چکا ہے، اگر مناظرہ ناجائز ہوتا شیخین کریمین مناظرہ نہ فرماتے۔

اور حدیث ودع المراء وإن كنت محقا۔ آمی کو چھوڑدے اگرچہ تو سچا ہو، کا جواب یہ ہے کہ ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ مناظرہ اظہار حق کے لیے ہوتا ہے اور جب حق ظاہر ہو گیا تو جھگڑا کی ضرورت نہیں اور نہ مناظرہ اور حق ظاہر ہو جانے کے بعد بھی خصم حق کو قبول نہ کرے اور توبہ نہ کرے تو تلوار سے مقابلہ کیا جائے۔

جھگڑا ظہور حق کے بعد جائز نہیں اور مبتدعین سے مناظرہ کے جواز کی دلیل یہ ہے:

وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ (النحل ۱۲۵)

"اور ان سے اس طریقہ پر بحث کرو جو سب سے بہتر ہو"۔

دوسری دلیل:

وَلَا تُجَادِلُوا أَهْلَ الْكِتَابِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ (العنكبوت ۴۶)

"اور اے مسلمانو! کتابیوں سے نہ جھگڑو مگر بہتر طریقہ پر"۔

اللہ تعالیٰ نے مجادلہ مباح فرمایا، مگر صفت مذکورہ یعنی بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ۔

تیسری دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَمِنَ الْإِبِلِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْبَقَرِ اثْنَيْنِ قُلْ آلذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ أَمِ الْأُنْثَيَيْنِ (الانعام ۱۴۴)

"اور ایک جوڑا اونٹ کا اور ایک جوڑا گائے کا تم فرماؤ کیا اس نے دونوں نر حرام کیے یا دونوں مادہ یا وہ جسے دونوں مادہ پیٹ میں لیے ہیں۔"

حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم سے مجادلہ کیا، فرمایا:

قَالُوا يَانُوحُ قَدْ جَادَلْتَنَا فَأَكْثَرْتَ جِدَالَنَا (هود ۳۲)

"بولے اے نوح تم ہم سے جھگڑے اور بہت ہی جھگڑے تو لے آؤ۔"

حضرت ابراہیم علی نبینا وعلیہ السلام نے نمرود بن کنعان سے مناظرہ کیا، اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کے مناظرہ کی خبر دی:

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِي حَاجَّ إِبْرَاهِيمَ فِي رَبِّهِ أَنْ آتَاهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ إِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّيَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ قَالَ أَنَا أُحْيِي وَأُمِيتُ قَالَ إِبْرَاهِيمُ فَإِنَّ اللّٰهَ يَأْتِي بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَأْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِي كَفَرَ (البقرة ۲۵۸)

"اے محبوب کیا تم نے نہ دیکھا تھا اسے جو ابراہیم سے جھگڑا اس کے رب کے بارے میں اس پر کہ اللہ نے اسے بادشاہی دی جب کہ ابراہیم نے کہا کہ میرا رب وہ ہے کہ جِلاتا اور مارتا ہے بولا میں جِلاتا اور مارتا ہوں ابراہیم نے فرمایا تو اللہ سورج کو لاتا ہے پورب (مشرق) سے تو اس کو پچھم (مغرب) سے لے آ تو ہوش اُڑ گئے کافر کے۔"

علم کو چھپانے والا بہت بڑا مجرم ہے

جابر بن عبد اللہ سے رسول کریم ﷺ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: جب آخری میری امت پہلی میری امت کی نفی کرے، تو جس کے پاس علم ہو، وہ اپنے علم کا اظہار کرے، اس وقت علم کو چھپانے والا ایسے ہے جیسے میری وحی کو چھپانے والا۔

حضرت حماد بن ابی حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ انہوں نے اپنے والد امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے دریافت کیا کہ اگر میں علم کلام کو نہ سیکھوں تو کیا مجھے نقصان ہو گا؟ فرمایا: من وجہ نقصان ہو گا اور من وجہ نقصان نہ ہو گا۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ مجھ سے یہ سوال نہیں کرے گا کہ علم کلام کیوں نہیں سیکھا؟ اس لحاظ سے تو نقصان نہیں اور اس حیثیت سے کہ جب تم علم کلام نہیں جانو گے تو لوگوں سے مناظرہ نہیں کر سکو گے، اس پہلو سے نقصان ہے۔

اور حضور ﷺ نے فرمایا: اسلام کی مضبوط ترین گرہ "الحب فی اللہ و البغض فی اللہ" ہے یعنی اللہ کے لیے محبت اور اللہ کے لیے بغض ہو اور جب تک تم مبتدع اور غیر مبتدع کو نہ پہچانو گے تو کیسے اللہ کے لیے محبت کرو اور اللہ کے لیے بغض کرو گے؟

اے بیٹے! اس کی مثال اس کنویں کی سی ہے جو اوپر سے ڈھکا ہوا ہو اور جب تک تجھے علم نہ ہو تو تو کنویں میں گر جائے گا۔

پھر فرمایا: اے عالم! لوگ مجھے کہتے ہیں: اصحاب رسول ﷺ علم کلام نہیں جانتے تھے، تو اے معلم تو اس کا جواب دے کہ اصحاب رسول ﷺ کے دروالے پر دشمن تلوار سونت کر نہیں حاضر ہوتا تھا اور ہماری یہ حالت ہے کہ دشمن شمشیر

بکف ہو کر ہمارے دروازہ پر حاضر ہوتا ہے تو جس کے دروازہ پر دشمن ننگی تلوار لے کر آجائے تو اس پر واجب ہے کہ اس سے مقابلہ کرے اور جس کے دروازے پر دشمن تلوار سونت کر حاضر نہ ہو تو اس پر جنگ کی تیاری واجب اور ضروری نہیں ہے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ جب اہل قدر سے ملاقات ہو تو پہلے سوال کرو، معلوم ہوا کہ اہل بدعت سے مناظرہ جائز و مباح ہے اور اگر ھواء اور اہل بدعت اور دوسرے کافروں سے مناظرہ اور مجادلہ جائز نہ ہوتا تو یہ مذاہب باطلہ اہل اسلام پر غالب آجاتے اور حق و باطل میں فرق ظاہر نہ ہوتا، اس لیے کہ حق دلیل و حجت کے ظاہر ہونے سے ظاہر ہوتا ہے اور دلیل و حجت کا اظہار مناظرہ سے ہوتا ہے، لہٰذا ابوقت ضرورت مناظرہ جائز ہے اور اس غرض سے علم کلام و علم مناظرہ، علم مجادلہ پڑھنا، پڑھانا جائز ہے، بلکہ فی زمانہ ضروری ہے۔ واللہ تعالیٰ جل شانہٗ اعلم۔

چوتھا قول

اہل اھواء اور اہل بدعت کی تکفیر کا بیان

بعض فقہاء نے کہا کہ بدعت کفر ہے اور مبتدع کافر ہے، اس لیے کہ بدعت حرام ہے اور جس نے بدعت کا اعتقاد کیا اور جس نے حرام کو حلال جانا وہ کافر ہے۔

اور بعض نے کہا: مبتدع کافر نہیں۔ دلیل یہ ہے کہ امام ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ اہل اھواء کی گواہی مقبول ہے تو جب ان کی گواہی مقبول ہے تو ثابت ہوا کہ وہ مسلمان ہیں۔

اور محمد ابن حسن رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: مبتدع کے پیچھے نماز جائز ہے، مگر مکروہ تحریمہ ہے، اس لیے کہ اس نے بدعت کو اپنے زعم میں حق سمجھا اور حلال جانا اور دوسری دلیل یہ ہے کہ وہ موول اور تاویل سے اس مسئلہ کو حلال جانا، لہٰذا تکفیر نہیں کی جائے گی۔

اور بعض نے کہا کہ جب اس کی خطاء ظاہر ہو جائے اور توبہ نہ کرے، اپنے اس اعتقاد سے تو تکفیر کی جائے گی اور بعض نے کہا کہ جب اس کی خطاء ظاہر ہو جائے اور توبہ نہ کرے، اپنے اس اعتقاد سے تو تکفیر کی جائے گی اور صحیح یہ ہے کہ تکفیر مطلقاً جائز نہیں، اس لیے اہل اھواء اور اہل بدعت کے احوال مختلف ہیں اور اہل اھواء کئی قسم کے ہیں تو بعض جگہ ان کی تکفیر کی جائے گی اور بعض مسائل میں ان کی تفسیق کی جائے گی اور بعض حالتوں میں ان کی بدعت سیئہ ہو گی، اس سے توبہ واجب ہو گی بعض مسائل میں بدعت حسنہ ہو گی تو توبہ کی بھی ضرورت نہیں۔

ہم کہتے ہیں: بدعت کے بارے میں پانچ وجہ پر کلام کیا جائے گا:

(۱) ایک کلام اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کے متعلق۔

(۲) دوسرے کلام اللہ تعالیٰ کے کلام کے بارے میں۔

(۳) تیسرے کلام خدا کے قضاء وقدر میں۔

(۴) چوتھے کلام بندوں کے افعال کے بیان میں۔

(۵) پانچواں کلام اصحاب رسول ﷺ کے متعلق۔

تو جو شخص اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات میں یا کلام اللہ میں یا قضاء و قدر میں ناحق کلام کرے تو وہ بلا خلاف کافر ہے اور جو بندوں کے افعال میں یا اصحاب کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے بارے میں کلام کرے تو اگر نص صریح یا خبر متفق علیہ یا اجماع کے خلاف ہے تو بلا خلاف کافر ہے اور اگر اس کا کلام قیاس، خبر واحد کے خلاف ہے یا تاویل کرتا ہے تو محل تاویل میں بایں حیثیت کہ شبہ کی گنجائش ہے تو یہ موجب کفر نہیں، بدعت سیئہ ہو گی، اس سے توبہ واجب ہے۔

لیکن بدعت حسنہ جیسے قرآن پاک کو روانی اور غناء کے ساتھ پڑھنا جب کہ حد قراءت سے نہ نکلے، قرآن پاک کا جمع کرنا، قرآن پاک کا لکھنا، قرآن پاک کو تیس پاروں میں تقسیم کرنا، قرآن پاک پر اعراب لگانا، رکوع ومنزل اور رموز لکھنا، اذان غنا (گا کر) کے ساتھ دینا، جب کہ حد سے باہر نہ ہو۔ یہ سب بدعت ہیں مگر بدعت حسنہ کہ (ان سے) توبہ واجب نہیں۔

پھر اہل اھواء اور اہل بدعت سے جنگ و قتال کرنا جب کہ ان کی بدعت حد کفر تک پہنچے تو اگر رجوع کر لیں اور توبہ کر لیں تو فبہا (بہتر) ورنہ سب کا قتل کرنا مباح ہے، اور اگر توبہ کر لیں اور تجدید اسلام کر لیں تو ان کی توبہ قبول کر لی جائے گی اور بعض نے کہا: سب کی توبہ قبول کی جائے گی مگر رافضیوں اور شیعوں میں سے جو اباحیہ اور غالیہ ہیں ان کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی، ایسے ہی قرامطہ اور زنادقہ فلاسفہ کے فرقے ہیں کہ ان کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی بلکہ توبہ کے بعد بھی قتل کر دیا جائے گا، جیسے توبہ سے پہلے قتل کیا جاتا، اس لیے کہ وہ صانع (پیدا کرنے والا) کے معتقد نہیں تو توبہ کس کی بارگاہ میں کریں گے؟

اور بعض نے کہا: اگر پکڑنے سے پہلے اور اپنی بدعت کے اظہار سے قبل تائب ہو جائیں تو توبہ قبول کر لی جائے گی اور اگر گرفتار کرنے کے بعد اور اظہار عقائد کے بعد توبہ کریں تو توبہ قبول نہیں کی جائے گی، قتل ہی کیے جائیں گے، یہی امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول ہے۔

کیا بدعتی پر ٹیکس لگایا جائے؟

اور مبتدع پر جزیہ مقرر نہیں کیا جائے گا، اگرچہ کافر ہے بدعت حد کفر تک پہنچی ہو اور نہ ان کو غلام بنایا جائے اور جب بدعت موجب کفر نہ ہو تو زجر و توبیخ اور منع واجب ہے اور تعزیر جس قدر ممکن ہو کی جائے کہ تعزیر سے وہ (بدعت سے) باز آ جائیں گے اور اگر بغیر قید کرنے اور کوڑے لگانے کے زجر و منع ناممکن ہو تو حبس (نظر بند) اور زدو کوب کرنا جائز ہے۔

بدعتیوں کے سرغنے اور لیڈر کو قتل کر دو

اور ایسے ہی بغیر تلوار کے باز آنا ناممکن ہو تو اگر وہ اس فرقہ کا سرغنہ اور رئیس و لیڈر ہے اور ان کا مقتداء ہے تو اسے بدعات سے باز رکھنے کے لیے از روئے سیاست قتل کرنا روا اور جائز ہے اور ایسے ہی اہل شہر (اسلامی شہروں میں سے) دارالاسلام میں جب جمعہ و عیدین اور جماعت ترک کر دیں یا اذان و اقامت ترک کر دیں یا حکم و قضاء (عدالتی نظام اور فیصلوں) کو ترک کر دیں یا قراءت قرآن مجید کو ترک کر دیں تو ان کو تکلیف دی جائے اور اگر زجر و توبیخ اور ڈانٹ ڈپٹ وغیرہ کی پرواہ نہ کریں تو تلوار سے سیدھے کیے جائیں۔ سو اگر ان کو قتل کر دیا تو گناہگار نہ ہوں گے اور ان کے قتل میں مضائقہ نہیں۔

اور ایسے ہی اگر کوئی شخص نماز، روزہ، جمعہ اور عیدین، اذان و اقامت اور قراءت قرآن وغیرہ احکام مذکورہ میں کسی ایک کو چھوڑ دے تو اس کو تکلیف دی جائے اور اگر وہ زجر و توبیخ اور تہدید سے بھی باز نہ آئے اور اس کو قتل کر دیا جائے تو اس کا خون ساقط ہے، قصاص نہیں لیا جائے گا۔

اور مہتدی ابو شکور سالمی رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا کہ میں نے شیخ امام زاہد ابو بکر محمد ابن حمزہ سمرقند سے ۴۶۵ء کے لگ بھگ سنا، جب کہ ان سے فقہ پڑھتا تھا اور ان سے "کتاب السرقہ" وغیرہ پڑھیں۔

جب قطاع الطریق (ڈاکوؤں) کے متعلق مسائل و احکام بیان فرمائے جو اس آیت کریمہ کا معنی تھا:

إِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا أَنْ يُقَتَّلُوا أَوْ يُصَلَّبُوا أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ مِنْ خِلَافٍ أَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْأَرْضِ ذَٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ (المائدة ۳۳)

وہ کہ اللہ اور اس کے رسول سے لڑتے اور ملک میں فساد کرتے پھرتے ہیں ان کا بدلہ یہی ہے کہ گن گن کر قتل کیے جائیں یا سولی دیئے جائیں یا اُن کے ایک طرف کے ہاتھ اور دوسری طرف کے پاؤں کاٹے جائیں یا زمین سے دور کر دیئے جائیں یہ دنیا میں اُن کی رُسوائی ہے اور آخرت میں اُن کے لیے بڑا عذاب۔

تو فرمایا: (امام صاحب نے) ڈاکو اگر بغاوت سے راستہ کی ناکہ بندی کر دے، پھر فرمایا: میں نے شیخ الاسلام رکن الدین والاسلام شمس الائمہ ابو محمد عبد العزیز احمد بخاری رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ سے ذکر کیا، انہوں نے اپنی "امالی" میں ذکر کیا کہ ڈاکو جب راستہ بند کر دے اور مال لوٹ لے اور قتل نہ کرے اور اپنے خروج (بغاوت) سے راستہ منقطع (ناکہ بندی سے) نہ کرے تو سلطان کو ازروئے سیاست اور زجراً اس کا قتل کر دینا جائز ہے اور اس معنیٰ میں ہم کہتے ہیں کہ بدعتی جب بدعت کی دعوت دے اور لوگوں کو بدعت کی طرف بلائے اور اس سے ملک میں بدعت پھیلنے کا اندیشہ ہے تو اگرچہ اس کے کفر کا حکم نہیں دیا جائے گا لیکن سلطان کو حق پہنچتا ہے کہ زجراً و سیاستہً اس کو قتل کر دے، اس لیے کہ اس کا فساد بڑھ گیا عام ہو گیا اور موثر فی الدین ہے، لوگوں کا دین خراب کرے گا اور جب بدعت کفر کے درجہ میں ہو تو اس کا قتل عام جائز و مباح ہے اور اگر بدعت درجہ فسق میں ہو تو ان کا قتل عام مباح نہیں بلکہ جو ان کا رئیس و سردار اور سرغنہ اور معلم ہو تو قتل کر دیا جائے، زجر و امتناع کے لیے اہل سنت و جماعت کے نزدیک اہل قبلہ کا خون بہانا مباح نہیں، مگر تین باتوں میں سے اگر کوئی بات پائی جائے تو قتل جائز و مباح ہے: (۱) ایمان کے بعد مرتد ہو جائے (۲) احصان کے بعد زنا کا مرتکب ہو (۳) یا ناحق مسلمان کو قتل کرے۔

اور معتزلہ کے نزدیک اہل قبلہ کا قتل چار باتوں میں سے کوئی بات پائی جائے تو مباح ہے: (۱) گناہ کبیرہ کا مرتکب ہو (۲) بدعت پیدا کرے (۳) سلطان پر تلوار سونتے (۴) یا فرائض میں سے کسی فرض کو معطل کر دے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

پانچواں قول: فرقوں کا بیان

جان لو کہ دین جماعت کے ساتھ ہے اور جماعت سواد اعظم ہے۔

سواد اعظم کون ہیں؟

اور سواد اعظم جبر و قدر، تشبیہ و تعطیل اور نصب و رفض کے درمیان ہے۔

اہل سنت کون ہیں؟

امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے دریافت کیا کہ اہل سنت و جماعت کون ہے؟ فرمایا: جس میں نصب و رفض، جبر و قدر اور تشبیہ و تعطیل نہ ہو، وہ سواد اعظم ہے۔

امام ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ امام جعفر ابن محمد صادق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے دریافت کیا کہ اے ابن رسول ﷺ! کیا اللہ تعالیٰ نے تمام امور بندوں کے سپرد کر دیے ہیں؟ فرمایا: اللہ تعالیٰ اجل و اعلیٰ (بلند و بالا) ہے کہ ربوبیت بندوں کے سپرد کر دے۔

پھر سوال کیا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر جبر کرتا ہے؟

فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اعدل ہے کہ بندوں کو مجبور کرے اور پھر ان کو عذاب دے۔

عرض کیا: پھر کیا معاملہ ہے؟

فرمایا: بین بین ہے، نہ جبر ہے، نہ تفویض اور نہ اکراہ ہے، نہ تسلیط۔

نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ بنی اسرائیل حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد اکہتر فرقوں میں بٹ گئے، سب فرقے جہنمی ہیں اور میری امت کے میرے بعد تہتر فرقے ہو جائیں گے، ایک کے سوا سب ناری ہیں۔ عرض کیا گیا: وہ ایک فرقہ ناجیہ کون سا ہے؟ فرمایا: جس پر میں اور میرے اصحاب ہیں، آج کے دن جو اس طریق پر قائم ہو گا وہ نجات پانے والا فرقہ ہے۔

حضور ﷺ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ بنی اسرائیل موسیٰ علیہ السلام کے بعد اکہتر فرقے ہو گئے اور عیسیٰ علیہ السلام کے بعد بہتر فرقے ہو گئے اور میرے بعد میری امت کے تہتر فرقے ہو جائیں گے، ایک فرقے کے سوا سب جہنمی ہوں گے اور روایت کیا گیا ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا: بہتر فرقے ہلاک ہو جائیں گے اور ان میں سے ایک فرقہ ناجی ہو گا۔ نیز مروی ہے کہ بہتر فرقے ناری ہوں گے اور ایک جنت میں اور یہ بھی مروی ہے کہ کل جنتی ایک ناری عرض کیا گیا: ناری کون ہے؟ فرمایا: قدریہ۔ اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ قدریہ خدائے قدوس کی وحدانیت کے منکر ہیں۔

اور عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا:

إِنَّ الْمُجْرِمِينَ فِي ضَلَالٍ وَسُعُرٍ (القمر ۴۷)

"بے شک مجرم گمراہ اور دیوانے ہیں۔"

یعنی دنیا میں گمراہی میں، آخرت میں جہنم میں۔

إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ (القمر ۴۹)

"بے شک ہم نے ہر چیز ایک اندازہ سے پیدا فرمائی۔"

اور قدریہ فرقہ اس کے منکر ہیں، اس سے پتا چلا کہ قدریہ کفار ہیں۔

حضرت عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا کہ ابلیس نے چالیس دن تک سمندر میں غوطہ لگایا، ھاویہ میں داخل ہو کر درکات جہنم کو دیکھا اور ہر قوم کے "درکہ" کو دیکھا: مالک علیہ السلام نے بہ حکم الہیٰ اس کو علم و علامت دی اور اس کو بہتر رقعے دیئے، ہر رقعہ پر ہر بدعت کا نام لکھا۔ ابلیس نے ان رقعوں کو لے کر ان اہل بدعت میں پھیلا دیا، پھر یہ فرقے بہتر ہیں اور یہ چھ فرقوں سے نکلے ہیں: رافضیہ، ناجیہ، قدریہ، جبریہ، مشبہہ، معطلہ۔ پھر ہر صنف سے بارہ فرقے نکلے تو یہ بہتر فرقے ہو گئے، ہم ان کے اصل اور اعتقاد کو ذکر کریں گے اور ان کے نام بھی ذکر کریں گے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

چھٹا قول: روافض کا بیان: رافضی کہنے کی وجہ

جاننا چاہیے کہ ان کو رافضی کیوں کہا جاتا ہے؟ اس لیے کہ انہوں نے دین اسلام کے اصولوں کو توڑا ہے، خداوند تعالیٰ نے ان کا نام کفار رکھا ہے، جیسا کہ قرآن حکیم میں فرمایا: لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ (الحجرات ۲۹) "تاکہ اُن سے کافروں کے دل جلیں۔" اور نبی کریم ﷺ نے ان کا نام مشرکین رکھا، فرمایا: میرے بعد ایک قوم نکلے گی، ان کو رافضی کہا جائے گا، جب تم ان سے ملاقات کرو ان کو قتل کر دینا، اس لیے کہ وہ مشرک ہیں۔ ان رافضیوں کے مختلف اقوال ہیں۔ بعض کفریہ اقوال ہیں، بعض فسق اور بدعت ہیں، ہم ان کے اقوال بالترتیب بیان کرتے ہیں۔

بعض (رافضیوں) کا عقیدہ ہے کہ حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ آسمان سے اترے اور صورت لاہوتیہ سے نکل کر صورت ناسوتیہ کو اختیار کیا اور ایسے افعال کیے جن سے ربوبیت ثابت ہوتی ہے۔ پھر اپنی یعنی آسمان پر چڑھ گئے، اس قوم نے حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ کو خدا کہا تو حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ نے ان کو جلا دیا اور جو لوگ باقی رہ گئے، انہوں نے اعتقاد کیا کہ حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ خدا نہ ہوتے تو آگ کا عذاب نہ دیتے، اس عقیدہ والے کافر ہیں، اس میں کسی کو اختلاف کی گنجائش نہیں ہے۔

اور بعض نے کہا کہ حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ نبوت میں حضور ﷺ کے شریک تھے اور یہ عقیدہ کفر ہے، اس لیے کہ جو نبی کا انکار کرے تو وہ کافر ہے اور جو نبی نہیں اور اس کو نبی مانے تو وہ بھی کافر ہے اور جو شخص غیر نبی کو نبوت میں شریک کرے، وہ بھی کافر ہے۔

بعض کا عقیدہ یہ ہے کہ نبوت حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ کے لیے تھی مگر جبرئیل خطا اور غلطی سے نبی کریم ﷺ پر وحی نازل کر گئے اور جبرائیل حضور ﷺ کی صداقت کی وجہ سے حضور ﷺ کی طرف مائل ہو گئے اور یہ کفر ہے اور بعض کا عقیدہ یہ ہے کہ نبوت حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر قیامت تک متصل ہے اور یہ بھی کفر ہے۔

اور بعض نے کہا: جو اہل بیت کے علم کا حامل ہے خواہ نبوت کا دعویٰ کرے یا اپنی نبوت کا اظہار نہ کرے یہ عقیدہ بھی کفر ہے۔

بعض کا عقیدہ ہے کہ زمانہ کسی وقت امام سے خالی نہیں ہوتا اور امام اولاد حسن و حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے ہوتا ہے اور وہ براہ راست خدا سے علم حاصل کرتا ہے یا جبرئیل علیہ السلام سے اور جو اس امام کو نہ پہچانے اور اس پر ایمان نہ لائے اور اسی حالت میں مر جائے تو وہ جاہلیت کی موت مرتا ہے، یہ عقیدہ بھی کفر ہے، اس لیے کہ یہ نبوت کا ثابت کرنا ہے۔

بعض کا عقیدہ ہے کہ حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ اور ان کی اولاد اور اصحاب دنیا کی طرف رجوع کریں گے اور اپنے دشمنوں سے انتقام لیں گے، یہ بھی کفر ہے اس لیے کہ نص اور قیامت کا انکار ہے۔

بعض کا عقیدہ ہے کہ حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ اور ان کی اولاد کی روح دوسرے جسم میں داخل ہو کر دنیا میں لوٹ آئے گی اور اپنے دشمنوں سے انتقام لے گی اور وہ امام ہوں گے، یہ بھی کفر ہے۔

اور بعض خلاف ما انزل اللہ کتاب کی تاویل کرتے ہیں، یہ بھی کفر ہے۔

بعض کا عقیدہ ہے کہ مولیٰ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے انتقال نہیں فرمایا کہ وہ اپنے روح و جسم کے ساتھ آسمان میں ہیں اور ہر آسمان میں علی موجود ہیں اور رعد حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ کی آواز ہے، یہ بھی کفر ہے۔

بعض کے نزدیک بغیر گواہوں کے نکاح جائز ہے، اس لیے کہ حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ اور ان کی اولاد حاضر ہوتے ہیں، یہ بھی کفر ہے اور بعض نے کہا کہ شراب، متعہ، لواطت حرام نہیں اور جو اپنی بیوی کو حیض کی حالت میں طلاق دے تو وہ طلاق واقع نہیں ہو گی اور جو دفعۃً واحدۃً (یک بارگی) اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے تو واقع نہ ہوں گی اور یہ کفر ہے اور بعض نے کہا: حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ حضور ﷺ سے زیادہ جاننے والے، زیادہ فصیح اور زیادہ بہادر شجاع تھے، یہ بھی کفر ہے۔

اور بعض کا عقیدہ ہے کہ حضرت ابو بکر و عمر و عثمان رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے کفر کیا کہ حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ سے پہلے خلافت کو قبول کیا اور جن لوگوں نے ان سے بیعت کی وہ کافر ہیں۔

اور بعض نے کہا: حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ نے بھی کفر کیا کہ انھوں نے خلافت وامارت کو چھوڑ دیا حالانکہ ان کا حق تھا اور جو حق کو چھوڑ دے اور حق کو چھپائے وہ کافر ہے، یہ عقیدہ بھی کفر ہے۔

اور بعض کہتے ہیں کہ امت نے اماموں کو نہیں پہچانا حالانکہ وہ بارہ امام ہیں، ان میں سے آٹھ نے تو اپنی امامت کا دعویٰ کیا اور اپنا امام ہونا ظاہر کیا اور تین امام چھپے ہوئے ہیں اور ایک باقی ہیں وہ مہدی ہیں۔ ان سب کی بیعت واجب ہے اور جو ان کی مخالفت کرے وہ کافر ہے۔ ان کا یہ عقیدہ بھی کفر ہے۔

اور بعض نے کہا کہ حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ حضور ﷺ کے وصی قائم تھے، جو ان کے سوا غیر کی بیعت کرے وہ کافر ہے، یہ عقیدہ بھی کفر ہے۔ یہ مسائل اور ان جیسے اور مسائل کفریہ ہیں اور بعض باتیں کفر نہیں بدعت ہیں، جیسے کہ حضرت علی، ابو بکر، عمر، عثمان سے افضل ہیں، اگرچہ ان کی خلافت بالاجماع صحیح ہے۔

اور بعض نے کہا: جن صحابہ کرام نے حضرت علی پر خروج کیا (یعنی آپ کے خلاف بغاوت کی) ان پر لعنت کرنا واجب ہے، جیسے حضرت معاویہ وطلحہ وزبیر رضوان اللہ علیہم اجمعین اور حضرت ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما۔

اور بعض نے کہا کہ فاجر کے پیچھے نماز مطلقاً جائز نہیں۔

اور بعض نے کہا: وصیت واجب ہے۔

اور بعض نے کہا: کچھ لوگ بنات آدم سے پیدا ہوئے ہیں اور کچھ لوگ حور العین سے پیدا ہوئے ہیں اس لیے کہ شیث علیہ السلام نے حور العین سے نکاح کیا تھا، عربوں کی اصل ان ہی سے ہے۔

اور بعض نے کہا کہ آدم علیہ السلام کے زمانہ میں بہن سے نکاح جائز نہ تھا، ان کا نکاح حور العین سے ہوتا تھا۔

انسان شریف یا شریر کیوں ہوتا ہے؟

بعض لوگوں کا عقیدہ ہے کہ جب نطفہ صدق نیت سے ہیجان کرتا ہے تو اولاد انسان ہوتی اور جب نطفہ وسوسہ شیطان سے ہیجان کرتا ہے تو اولاد شیطان ہوتی ہے اور شیطان شریک ہوتا ہے" اللہ تعالیٰ کے اس قول کی وجہ سے کہ: وَشَارِكْهُمْ فِي الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلَادِ (الاسراء ۶۴) "اور ان کا ساجھی ہو مالوں اور بچوں میں۔" یہ تمام مسائل غیر صحیح ہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ (النساء ۱) "جس نے تمھیں ایک جان سے پیدا کیا۔" اور رسول اللہ ﷺ نے

فرمایا:إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِثْلُكُمْ (الكهف ۱۱۰)اور وَشَارِكْهُمْ فِي الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلَادِ (الاسراء ۶۴) کے متعلق حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ اس سے مراد زنا ہے، شرکت نہیں اس لیے کہ زنا شیطان کے وسوسہ سے ہوتا ہے۔

بعض لوگوں کا عقیدہ ہے کہ حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ، حضرت ابو بکر و عمر و عثمان رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے زیادہ علم رکھتے ہیں اور بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ اور اہل بیت کی محبت سب سے زیادہ ہونی چاہیے۔ یہ مسائل سب کے سب فسق وبدعت ہیں، کفر نہیں۔

اصل ان مسائل میں یہ ہے کہ جس نے کلام کیا یا اعتقاد کیا ان امور کا، جس نے نص قطعی کا یا نص قطعی اس کے قائم مقام جیسے "سنت ظاہرہ ثابتہ" اور اجماع امت کا انکار کیا وہ کافر ہے یا کوئی مومن شخص کسی مومن کو کہے: اوئے کافر! تو کہنے والا کافر ہو جائے گا یا مومن کے کفر کی شہادت دی تو وہ بہ طریق اولیٰ کافر ہے اور حضور ﷺ نے فرمایا: جو اپنے مسلمان بھائی کو بلا وجہ کافر کہے تو وہ کفر اس کہنے والے پر لوٹتا ہے اور جو کوئی ایسا کلمہ کہے یا اس کا اعتقاد کرے کہ عامتہ الناس اس کے خلاف ہوں یا خبر واحد کے خلاف کرے اور اس کو اس میں شبہ ہو تو یہ بدعت ہو گا، کفر نہ ہو گا۔

ساتواں قول: ناصبیہ کا بیان

معلوم ہونا چاہیے کہ ناصبیہ، فرقہ خارجیہ ہی ہے اور انہی کو حروریہ کہتے ہیں، اس لیے کہ انہوں نے حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم کے خلاف مقام حرورا میں بغاوت کی تھی اور حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم کو معاذ اللہ کافر کہتے ہیں اور جو (حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم) کو کافر کہے، وہ خود کافر ہے۔

اور ان (حروریہ) میں سے بعض وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو تو مسلمان سمجھتے ہیں، باقی تمام امت میں ہم کسی کو نہیں جانتے کہ مسلمان ہے یا کافر ہے؟ بلکہ سب منافق ہیں ان کا یہ عقیدہ کفر ہے اور بعض کہتے ہیں کہ ایمان مجہول ہے اور لوگ پورا ایمان نہیں جانتے، اس لیے وہ مومن نہیں، یہ بھی کفر ہے۔

اور بعض کہتے ہیں کہ جہاد ہمیشہ فرض ہے، مسلمانوں اور مومنوں میں سے کسی کو جہاد ترک کرنا جائز نہیں، مرد ہو یا عورت، فقیر ہو یا غنی اور جو جہاد نہ کرے، وہ کافر ہے۔

اور بعض کہتے ہیں کہ زکوۃ کسی کو دینا جائز نہیں، اس لیے کہ فسق وفجور اور منکرات ظاہراً ہو رہے ہیں، ہم کافر و مومن کو نہیں پہچان سکتے اور یہ بھی کفر ہے۔

اور ان میں سے بعض کہتے ہیں کہ عورتیں پھولوں کی مانند ہیں تو ہر ایک کو ان کا سونگھنا جائز ہے اور ان سے وطی کرنا بغیر نکاح اور بغیر ملک یمین کے جائز ہے، یہ بھی کفر ہے۔

بعض ان میں سے وہ ہیں کہ جس نے کہا: "تحاکم" جائز نہیں، اس لیے کہ حکم صرف اللہ کا ہے۔

یعنی: إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ (الانعام ۵۷)

جو اپنوں میں سے کسی کو حاکم بنائے وہ کافر ہے اور انہوں نے کہا کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ابو موسیٰ اشعری کو "حکم" بنایا، یہ بھی عقیدہ کفر ہے۔

ان میں سے بعض کا عقیدہ ہے کہ امام اور خلیفہ حق نہیں، باطل ہے اور امراء و قضاۃ (ججوں) کو مقرر کرنا جائز نہیں۔ حکم (فیصلہ کرنا)، جمعہ کا قیام اور جماعت جائز نہیں، اس لیے کہ ہم نہیں جانتے کہ مسلمان کون ہے، کافر کون ہے؟ اور نہ ہی ہم یہ جان سکتے ہیں کہ امامت کا اہل کون ہے؟ یہ عقیدہ بھی کفر ہے۔

ان میں سے بعض یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے آپس میں اختلاف کیا اور ایک دوسرے کے خلاف جنگیں کیں تو ہم پر معاملہ مشتبہ ہو گیا، ہم حق و باطل کو پہچان نہیں سکتے، لہٰذا ہم توقف کریں گے، نہ بیزاری کا اظہار کرتے ہیں اور محبت کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ عقیدہ بھی کفر ہے، اس لیے کہ انہوں نے اجماع کو توڑا ہے اور انہوں نے کسی کو امام مقرر نہیں کیا اور ایسے مدعی امارت پر خروج کرنا جائز رکھا اور ایسے ہی انہوں نے کہا کہ مومن جب چھوٹا یا بڑا گناہ کرتا ہے تو کافر ہو جاتا ہے، یہ سب کلمات ان کے کفریہ ہیں کیونکہ ان میں نص کا انکار ہے اور خرق اجماع ہے۔

حضرت علی ابن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے، فرمایا کہ میرے سبب سے دو جماعتیں ہلاک ہوں گی: محب مفرط اور مبغض مفرط۔

اور روایت کیا گیا ہے کہ حضرت علی اور حضرت عثمان رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین اکٹھے مسجد میں داخل ہوئے تو حضور ﷺ نے فرمایا: اسی طرح تم دونوں جنت میں داخل ہو گے اور جو تم دونوں سے محبت کرے گا وہ مومن ہے اور جو تم سے بغض رکھے گا وہ منافق ہے، پھر ان کے بعض کلمات بدعت ہیں لیکن موجب کفر نہیں، مثلاً ان کا یہ کہنا کہ زندوں کی دعائیں اور صدقات مُردوں کو نفع نہیں دیتے۔

اور ایسے ہی ان کا یہ کہنا کہ زمین پر پیشاب کرنا جائز نہیں، اس لیے کہ تمام زمین ہمارے لیے مسجد ہے، واجب ہے کہ کوزے میں پیشاب کرکے اس کو پانی میں ڈالے۔

بعض کہتے ہیں کہ کسی کے ساتھ ملنا جلنا، کھانا پینا جائز نہیں، اس لیے کہ ہم نہیں جانتے کہ پاک ہے یا ناپاک؟

بعض کہتے ہیں کہ لوہے کی وصیت کرنا واجب ہے کہ جس سے جہاد کرنا ممکن ہو، جس نے وصیت نہیں کی وہ ظالم ہے۔

بعض نے کہا کہ گوز باقی رہتا ہے، اس لیے پاجامے میں نماز جائز نہیں کیونکہ ممکن ہے اس میں گوز باقی ہو اور اسی طرح کی باتیں ہیں، سب بدعت ہیں، ان سے توبہ واجب ہے اور تکفیر واجب نہیں۔

آٹھواں قول: قدریہ کا بیان

فرقہ قدریہ کا گمان یہ ہے کہ قیاس "دلیل شرعی" سے اقویٰ ہوتا ہے، اگرچہ نص ہی کیوں نہ ہو اور اس طرح (ان کے نزدیک) قیاس سنت مشہورہ سے بھی اقویٰ ہے، لہٰذا اسی معنی کے لحاظ سے انہوں نے شر کے مقدر من اللہ ہونے کا انکار کر دیا اور انہوں (قدریہ) نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں کے کام بندوں کے سپرد کر دیے ہیں اور ان کو اپنے کاموں کی تخلیق اور ان کے بجالانے کا خالق ومالک بنا دیا ہے، گویا کہ تمام افعال کے خالق وہ خود ہیں اور امر ونہی ان کے لیے بیان کر دی ہے اور تخلیق، ارادہ، مشیت، قضاوقدر غرضیکہ ان کے افعال میں سے کسی چیز میں اللہ تعالیٰ کا کوئی امر بھی جائز نہیں ہے حتیٰ کہ وہ عذاب دینے میں حکیم وعادل کہلائے اور یہ ان کا کفر ہے، اس لیے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے علاوہ دوسرا خالق ثابت کیا۔

دو خالق ماننا کفر ہے

بعض لوگوں نے کہا کہ خیر اللہ کی طرف سے اور اس کی قضاء سے ہے اور شر (برائی) ہماری طرف سے یا ابلیس کی طرف سے ہے اور یہ عقیدہ کفر ہے، اس لیے کہ انہوں نے اللہ کی ربوبیت کی نفی کر دی ہے۔

قدریہ کے چند چیدہ چیدہ عقائد باطلہ کی نشاندہی

ان میں سے بعض وہ ہیں جنہوں نے تمام صفات کا انکار کیا ہے

اور ان میں سے بعض وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ قرآن مخلوق ہے۔

اور بعض یہ کہتے کہ جنت ودوزخ مخلوق ہیں نہ باقی ہیں۔

بعض وہ ہیں جو صراط، میزان اور حساب کا انکار کرتے ہیں اور یہ سب کفریات ہیں۔ ایسے عقائد رکھنے والے کافر ہیں اس لیے کہ انہوں نے نص اور ربوبیت کا انکار کیا ہے۔

بعض یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ خیر روح لاھوتی سے ہے اور شر روح شیطان سے ہے، یہ بھی کفر ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ اعمال کو ہم نہیں جانتے کہ وہ اللہ کی جانب سے ہیں یا بندوں کی جانب سے ہیں اور یہ بھی نہیں جانتے کہ ان کو ثواب دیا جائے گا یا عذاب دیا جائے گا۔ یہ بھی کفر ہے اس لیے کہ نص کا انکار کیا اور اعمال پر ثواب وعتاب کے عقیدہ رکھنے کا انکار کیا ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ شیطان کو اللہ تعالیٰ نے پیدا نہیں کیا کیونکہ شیطان کے پیدا کرنے میں تخلیق کفر، ارادہ کفر اور ارادہ شر پایا جاتا ہے۔ یہ عقیدہ کفر ہے اس لیے کہ اس میں نص کا انکار ہے اور دو قدیم ثابت کرنا لازم آتا ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ ایمان وکفر کے سوا تمام اعمال مخلوق ہیں۔ یہ بھی کفر ہے اس لیے کہ انہوں نے اللہ کے سوا دوسرا خالق مان لیا۔

بعض کہتے ہیں: نسخ جائز نہیں اور آسمان سے نازل ہونے والی ہر کتاب پر عمل کرنا واجب ہے۔ یہ بھی کفر ہے اس لیے کہ نص کا انکار کرے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَاللّٰہُ خَلَقَکُمۡ وَمَا تَعۡمَلُونَ (الصافات ۹۶) ''اور اللہ نے تمہیں پیدا کیا اور تمہارے اعمال کو۔'' دوسرا قول اللہ تعالیٰ ابلیس کے قول کی حکایت کرتے ہوئے فرماتا ہے خَلَقۡتَنِي مِنۡ نَارٍ وَخَلَقۡتَهُ مِنۡ طِينٍ (ص ۷۶) تو نے مجھے آگ سے بنایا اور اسے مٹی سے پیدا کیا۔''

صحیح یہ ہے کہ جو خدا کے سوا دوسرا خالق ثابت کرے وہ کافر ہے، اور جس نے قدر کا انکار کیا اس نے اللہ کے سوا دوسرا خالق ثابت کیا تو وہ اللہ کے ساتھ کفر کرنے والا ہے۔

بعض کہتے ہیں: لوگوں سے عہد وپیماں کرنا اور بیعت صحیح نہیں۔

اور بعض کہتے ہیں: ہر حال میں کسب واجب ہے، یہ بدعت ہے اس سے توبہ کرنا واجب ہے، کفر نہیں ہے کہ اس میں تاویل ہو سکتی ہے۔

نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ فرمایا:

''اذا رایتم القدریۃ فاقتلوھم فانھم مجوس ھذہ الامۃ''۔

یعنی جب قدریوں کو دیکھو تو ان کو قتل کر دو کہ وہ اس امت کے مجوس ہیں (یعنی آتش پرست)۔

نواں قول: فرقہ جبریہ کا بیان

جبریہ کا عقیدہ ہے کہ مخلوق کو نیکی کا ثواب ملے گا اور لیکن برائی پر عتاب نہیں کیا جائے گا۔ کفار اور گنہگار معذور ہیں، ان سے سوال نہیں ہوگا، اس لیے کہ تمام افعال اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں اور بندہ اس میں مجبور ہے اور یہ عقیدہ کفر ہے۔

روایت ہے کہ ایک شخص ابن مسعود اور عبد اللہ ابن عباس اور عبد اللہ ابن زبیر اور عبد اللہ ابن عمر رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے پاس حاضر ہوا اور ان سے کہا کہ جیسے کفر کے ساتھ طاعت نفع نہیں دیتی، ایمان کے ساتھ معصیت بھی نقصان نہیں دیتی، ان سب نے فرمایا۔

اور اس مسئلہ کا نام مسئلہ عبادلہ ہے۔

نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ مرجیہ پر ستر پیغمبروں نے لعنت کی۔

مرجیہ کے دو گروہ ہیں: (۱) مرجیہ مرحومہ (۲) ملعونہ۔

مرجیہ مرحومہ، وہ اصحاب رسول ﷺ ہیں اور مرجیہ ملعونہ جن پر لعنت کی گئی، یہ وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ معصیت نقصان نہیں دیتی اور عاصی پر عذاب نہیں ہوگا۔

عثمان بن ابی لیلیٰ سے مروی ہے کہ انہوں نے ابو حنیفہ رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ کو لکھا کہ آپ مرجیہ ہیں؟ آپ نے جواب میں لکھا کہ مرجیہ دو قسم کے ہیں۔ ملعونہ، ہم اس سے بیزار ہیں اور ایک مرجیہ مرحومہ وہ اصحاب رسول ﷺ ہیں، آپ نے اس میں یہ بھی لکھا کہ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام نے بھی ایسا ہی کہا۔

آپ نے دیکھا نہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام نے عرض کی:

إِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَإِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (المائدة ۱۱۸)

"اگر تو انہیں عذاب کرے تو وہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو انہیں بخش دے تو بے شک تو ہی ہے غالب حکمت والا۔"

پھر مرجیہ اور جبریہ کے کلام سے جو کفر ہے وہ یہ ہے کہ نیکی اور برائی حقیقت میں بندے کے افعال نہیں ہیں اور جو بندہ کرتا ہے فاعل اللہ تعالیٰ ہے، یہ کفر ہے اس لیے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کو موصوف بہ قبائح کیا ہے، زنا وغیرہ سے کہ جیسے وہ خالق ہے ایسے ہی وہ فاعل بھی ہے، انہوں نے کہا کہ اگر ان کو قبائح اور زنا وغیرہ پر عذاب دے تو یہ ظلم ہوگا اور یہ عقیدہ کفر ہے۔

اور بعض کہتے ہیں کہ فعل بندے سے مجازاً ظاہر ہوتا ہے اور حقیقت میں ہمیں استطاعت نہیں، بندہ درخت کی مانند ہے، جب ہوا اس کو حرکت دیتی ہے تو وہ ہلتا ہے تو ایسے ہی بندہ درخت کی طرح مجبور ہے اور یہ کفر ہے، اس لیے کہ یہ تثلیث ہے اور کفر و معاصی اور برائیوں پر مجبور کرنا ہے تو اللہ تعالیٰ کے لیے جائز نہیں کہ وہ سزا دے اور جو یہ عقیدہ رکھے وہ کافر ہے۔

بعض نے کہا کہ اللہ تعالیٰ تمام چیزوں کو پیدا کر کے فارغ ہو گیا ہے اور تخلیق کر کے اب آرام کر رہا ہے اور قلم خشک ہو گیا ہے اور جو چیز اپنے وقت میں ظاہر ہو رہی ہے، بغیر اللہ تعالیٰ کے حکم کے ہو رہی ہے اور یہ کفر ہے۔ اس لیے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کو شغل اور فراغت کے وصف سے موصوف کیا ہے اور انہوں نے امر و نہی کے زوال کا عقیدہ رکھا اور اسی طرح ربوبیت و فعل کے زوال کا اعتقاد کیا، یہ کفر ہے۔

بعض نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کافروں کو آگ میں جلائے گا اور انہیں مارے گا اور زندہ کرے گا، پھر ان کو جلا اور مرا ہوا باقی رکھے گا اور یہ عقیدہ کفر ہے، اس لیے کہ انہوں نے نص کا انکار کیا۔ بعض نے کہا: اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو عذاب دے گا مگر افعال پر نہیں، یہ بھی کفر ہے۔

بعض نے کہا کہ جو دل میں خیر و شر کا خطرہ گزرے تو اس کا اتباع جائز ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو گا، یہ بھی کفر ہے۔ اس لیے کہ انہوں نے وحی اور امر کو دل کے ساتھ ثابت کیا اور الہام کو جائز رکھا اور یہ کفر ہے۔

بعض نے کہا کہ بندہ جب غایت محبت کو پہنچتا ہے اور اس کا دل صاف ہو جاتا ہے اور جام محبت نوش کرتا ہے تو اس سے شرعی تکلیف ساقط ہو جاتی ہے اور اس سے عبادت اٹھ جاتی ہے اور تفکر ہی اس کی عبادت ہے۔ یہ بھی کفر ہے۔ بعض نے کہا: تفکر ادائے فرض سے افضل ہے، یہ بھی کفر ہے۔

بعض کا عقیدہ یہ ہے کہ دنیا کا مال مشترک ہے، تمام بنی آدم اس میں شریک ہیں۔ مال دنیا آدم و حوا کی وراثت ہے اور جو کوئی جس چیز کو لے لے وہ اسی کا حق ہے اور کسی کو منع کرنے کا حق اور جواز نہیں ہے، یہ بھی کفر ہے۔

بعض نے کہا کہ جس نے علم سیکھا تو وہ لوگوں کے مال میں شریک ہے اور کہتے ہیں کہ جو اس کو منع کرے کافر ہو جائے گا اور یہ عقیدہ بھی کفر ہے۔

بعض نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کچھ فرض نہیں، اگر چاہیں کریں، اگر چاہیں چھوڑیں اور یہ بھی کفر ہے۔

بعض نے کہا کہ بندہ ایمان اور کفر کے بغیر اور کسی چیز کا مکلف نہیں ہے، یہ بھی کفر ہے۔

بعض نے کہا کہ عبادات کا امر تکرار کو واجب نہیں کرتا اور یہ کفر ہے۔

اور بعض نے کہا کہ مومن حقیقت میں مومن نہیں ہے اور نہ ہی کافر، حقیقت میں کافر ہے کیونکہ آخر میں ان میں تغیر جائز ہے اور یہ بھی کفر ہے۔

بعض نے کہا: اپنے ایمان میں بھی شک ہے اور انہوں نے کہا کہ ایمان اور شہادت کیا یہ ایمان ہے، کیا کفر زائل ہو جائے گا؟ یہ بھی کفر ہے۔ ان کے کلام میں کچھ چیزیں وہ ہیں جو بدعت ہیں کفر نہیں ہیں مثلاً جیسے کہ ان کا کہنا کہ ثواب اور عتاب تقسیم کر دیا گیا ہے نہ زیادہ ہو نہ کم برابر ہے کوئی کرے یا نہ کرے اور یہ بدعت سیئہ ہے اس لیے کہ افعال کے لیے تاثیر ہے جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "کل میسر لما خلق لہ" ہر ایک کے لیے آسان کر دیا گیا ہے جس کے لیے وہ پیدا ہوا ہے۔

بعض نے کہا کہ قضاء سبقت کر گئی ہے، نیک بخت کے لیے نیک بختی ہے اور بد بخت کے لیے بد بختی ہے۔

بعض (مرجیہ) کہتے ہیں: ایمان یہ ہے کہ حق و باطل میں سے تمام چیزوں کی پہچان ہو جائے اور اس کا وہ عالم ہو تو مومن ہے ورنہ نہیں اور یہ مسئلہ مسئلہ تقلید ہے۔

اور بعض نے کہا: ایمان عمل ہے، اقرار اور تصدیق کا کچھ اعتبار نہیں۔ یہ بھی کفر ہے، اس لیے کہ انہوں نے نص کا انکار کیا ہے۔ بعض کہتے ہیں: ایمان میں کمی زیادتی ہوتی ہے اور بعض نے کہا کہ ایمان میں استثناء و تخصیص جائز ہے اور اس کا ذکر ہو چکا ہے۔

اور بعض کہتے ہیں کہ قیاس حجت نہیں، ایسے ہی رافضیوں نے قیاس کا انکار کیا کہ وہ حجت نہیں تو اگر ہر قیاس مراد ہے اور ہر قیاس کا انکار کیا تو یہ کفر ہے اس لیے کہ قیاس حجت ہے اور اس کا حجت ہونا نص سے ثابت ہے اور اگر بعض قیاس مراد ہے تو کفر نہیں، بدعت ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

دسواں قول: معطلہ کا بیان

سب سے پہلا فرقہ سوفسطائیہ کا ہے اور وہ تین قسم کے ہیں۔

بعض نے کہا: اشیاء اور اسماء کی کوئی حقیقت نہیں جیسے آگ اور پانی کو آگ اور پانی کہا جاتا ہے اور بسا اوقات اس کا الٹ اور برعکس ہو جاتا ہے یعنی آگ پانی ہو جائے اور پانی آگ ہو جائے، یہ بھی کفر ہے، اس لیے کہ اس میں نص کا انکار ہے اور یہ عبودیت و ربوبیت اور احکام نبوت سب کے معطل ماننے کے عقیدہ کی طرف پہنچا دینے والی بات ہے۔

اس لیے ممکن ہے کہ جو مُرسل ہے وہ مرسل ہو جائے اور یہ بھی جائز ہے کہ بندہ رب ہو جائے اور رب بندہ ہو جائے۔

جواب میں یوں کہا جائے کہ تمہارے نزدیک نفی حقائق کی بھی کچھ حقیقت ہے یا نہیں؟ اگر وہ کہیں کہ ہے تو انہوں نے اپنے ہی قول کا باطل کر دیا کہ انہوں نے حقیقت کو ثابت کیا اور اگر وہ کہیں کہ نہیں تو ان سے کہا جائے گا کہ اگر نفی حقائق کی حیثیت نہیں ہے تو پھر ثبوت صحیح ہو گیا، یعنی حقائق اشیاء کا ثبوت ہو گیا۔

اور دوسری بات ہم کہتے ہیں کہ تم جانتے ہو کہ عالم کی کوئی حقیقت نہیں؟ تو اگر وہ کہیں کہ ہاں کوئی حقیقت ہے تو انہوں نے عالم کو ثابت کیا اور اپنے کلام کو باطل کیا اور اگر وہ کہیں کہ نہیں، تو پھر ہم کہیں گے کہ تم نے نفی عالم کا حکم کس لیے کیا حالانکہ تم جانتے ہی نہیں؟

اور بعض نے حقائق اشیاء اور اسماء اشیاء میں شک کیا اور کہا کہ ہم نہیں جانتے کہ آیا اشیاء کی حقیقت ہے یا نہیں؟ تو ہم کہیں گے کہ تمہیں اپنے "وجود" میں بھی شک ہے؟ اگر کہیں: ہاں، تو یہ اور فرقہ اولیٰ ایک (تھیلی کے چٹے بٹے) ہو گئے اور اگر کہیں کہ ہمیں اپنے وجود میں شک نہیں تو انہوں نے حقائق کو ثابت کر دیا۔

بعض نے گمان کیا کہ اشیاء کی حقیقت ہے لیکن جو جس نے اعتقاد کیا کہ کسی چیز کی حقیقت کا، وہی اس کی حقیقت ہے لیکن ان کا یہ کہنا صحیح نہیں، اس لیے کہ بعض لوگوں نے اعتقاد کیا ہے کہ عالم قدیم ہے اور بعض نے اعتقاد کیا ہے کہ عالم حادث ہے اور اگر ایسا ہی ہو جیسا وہ کہہ رہے ہیں تو ہم اعتقاد کرتے ہیں کہ ان کا قول باطل ہے تو ہمارا قول درست ہو جائے گا اور بعض نے کہا کہ صانع عالم حقیقت کو نہ پہچانتا ہے اور نہ ادراک کرتا ہے تو یہ بھی کفر ہے کیونکہ اوصاف معرفت نص سے ثابت ہیں اور جب حقیقتاً وہ پہچانا ہی نہیں جانتا تو عالم میں کسی کا ایمان صحیح نہیں اور حالانکہ اللہ تعالیٰ نے مومن کا نام مومن رکھا ہے۔

اور بعض نے کہا کہ ہم نہیں کہتے کہ اللہ تعالیٰ شے ہے یا شے نہیں بلکہ اس میں توقف کرتے ہیں اور یہ کفر ہے، اس لیے کہ نص کا انکار کیا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ أَيُّ شَيْءٍ أَكْبَرُ شَهَادَةً قُلِ اللَّهُ شَهِيدٌ (الانعام ۱۹) "تم فرماؤ سب سے بڑی گواہی کس کی تم فرماؤ کہ اللہ گواہ ہے۔" پھر شے اور ذات ایک چیز ہے یعنی شے کا انکار کرنا ذات کا انکار کرنا ہے۔

بعض کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر مکان (جگہ) میں اترا ہوا ہے اور اس سے کسی چیز کا بیان نہیں، یہ بھی کفر ہے۔

بعض کہتے ہیں: اپنے نفس کے لیے رب کا ثابت کرنا اور اس کا انکار کرنا جائز نہیں۔ یہ بھی کفر ہے، اس لیے کہ اس نے صانع اور نص کا انکار کیا۔

بعض کہتے ہیں کہ چار صفتیں: علم، قدرت، تخلیق اور مشیت غیر مخلوق ہیں، باقی صفات مخلوق ہیں۔ یہ بھی کفر ہے، اس لیے کہ ذات وصفات میں تغیر وزیادت کو جائز ماناجو کہ کفر ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ ہم قرآن کو مخلوق یا غیر مخلوق نہیں کہتے۔ یہ بھی کفر ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ كَلَّمَ اللّٰهُ مُوسَىٰ تَكْلِيمًا (النساء ۱۶۴) "اور اللہ نے موسیٰ سے حقیقتاً کلام فرمایا۔" اور اس نے اس میں شک کیا، یہ بھی کفر ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ قراءت و قرآن ایک ہے، لفظ و ملفوظ ایک ہے، یہ بھی کفر ہے اس لیے کہ تخلیق قرآن کو جائز مانا۔ بعض نے قرآن کو مخلوق مانا، یہ بھی کفر ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ جنت و نار فنا ہو جائیں گی، یہ بھی کفر ہے۔

اور بعض کہتے ہیں کہ مومن جہنم میں نہیں جائے گا اور "ورود" کے معنیٰ حضور کے ہیں دخول کے نہیں۔ یہ بھی کفر ہے، اس لیے کہ نص کا انکار کیا ہے "ورود" بامعنی دخول ہے، اس کی دلیل یہ آیت ہے: ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِينَ اتَّقَوْا وَنَذَرُ الظَّالِمِينَ فِيهَا جِثِيًّا (مریم ۷۲) پھر ہم ڈر والوں کو بچالیں گے اور ظالموں کو اس میں چھوڑ دیں گے گھٹنوں کے بل گرے۔"

بعض کہتے ہیں: حوض، صراط اور میزان در حقیقت وہ نہیں جو ہم جانتے ہیں، اس کے خلاف ہے۔ حوض سے مراد پانی ہے، صراط سے مراد دین ہے، میزان سے مراد عدل ہے اور عرش سے مراد ملک ہے اور کرسی سے مراد علم ہے۔ یہ کفریات نہیں، اس لیے کہ انہوں نے محل تاویل میں تاویل کرتے ہوئے خطا کی ہے کیونکہ ان چیزوں کے نام نص سے ثابت ہیں اور ان کی کیفیت معلوم نہیں۔ بعض نے عذاب قبر کا انکار کیا۔ بعض فقہاء نے فرمایا کہ کفر ہے کہ نص کے منکر ہیں۔ بعض فقہاء نے فرماتے ہیں کہ کفر نہیں کیونکہ یہ خبر واحد سے ثابت ہوا ہے اور صحیح یہ ہے کہ کفر ہے۔ بعض نے دیدار الٰہی کا انکار کیا اور اس کا ذکر ہو چکا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

گیارہواں قول: مشبہہ کا بیان

جاننا چاہیے کہ مشبہہ نے اللہ تعالیٰ کی صفات ثابت کی ہیں اور اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے اور انہوں نے اپنی رائے سے دو حدیثوں پر تجاوز کیا بغیر علم کے اور بغیر معنیٰ کے انہوں نے سماع سے تجاوز کیا جب کہ یہ دونوں طریقے فاسد ہیں اس لیے کہ علم و حکمت کے لحاظ سے جائز نہیں کیونکہ مجرد رائے موجب علم نہیں جب تک کسی شے کا احاطہ دلیل سے یا خبر سے نہ کیا جائے اور ایسے ہی سماع بغیر معنیٰ کے نہیں سمجھا جاتا اور ان لوگوں نے دلیل و احاطہ کو قیاس کے ساتھ چھوڑ دیا مجرد سماع سے۔ اسی وجہ سے بعض نے کہا: صانع عالم جوہر ہے اس لیے کہ موجود ہے اور ان کی یہ بات "رائے بلا علم" اور قیاس بالواسطہ ہے اور یہ کفر ہے۔

بعض (مشبہہ) کا عقیدہ یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ انبیاء کی صورت پر ہے اور ان کا یہ عقیدہ کفر ہے اور بعض کہتے ہیں کہ خدا (معاذ اللہ) جسم ہے مگر جسموں کی طرح نہیں، یہ بھی کفر ہے، اس لیے کہ انہوں نے اپنی رائے سے خدا کا وہ وصف بیان کیا جس

سے اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو موصوف نہیں کیا اور نہ ہی علماء کا اس پر اتفاق ہوا۔ بعض کہتے ہیں کہ خدا انسان کی صورت ہے اور یہ کفر ہے۔

اور بعض نے کہا: اللہ تعالیٰ کے لیے ”معاذ اللہ“ گوشت وخون، ہاتھ، ہتھیلی، انگلی (یعنی تمام لوازمات جسم) ثابت ہیں۔ جیسا کہ حضور اقدس ﷺ سے مروی ہے کہ فرمایا: ”**قلوب العباد بين اصبعين من اصابع الرحمٰن**“ بندوں کے دل رحمٰن کی انگلیوں میں ہیں۔ یہ ان کا کفر ہے اس لیے کہ سماع ہے اور معنٰی کچھ اور ہیں۔

حضرت اصمعی رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: اصابع سے مراد لغت میں اثر ہے (یعنی اصابع از روئے لغت اثر سے عبارت ہے)۔ بعض نے کہا کہ اللہ کی صورت ہے مگر ہم نہیں جانتے، یہ بھی کفر ہے، اس لیے کہ معرفت کا انکار کیا۔

بعض کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ چمکتا ہوا نور ہے، یہ بھی کفر ہے، اس لیے کہ نص کا انکار کیا۔

نص یہ ہے:

لَيۡسَ كَمِثۡلِهٖ شَىۡءٌ (الشوریٰ ۱۱)

”اس جیسا کوئی نہیں۔“

بعض (مشبہہ) کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اترتا اور آتا ہے، اب اگر انہوں نے آنا اور اترنا انتقال مکانی کے ساتھ کہا ہے تو یہ کفر ہے، اس لیے کہ انتقال جائز رکھا اور اگر نزول ومجئیی (اترنا اور آنا) بغیر کیف وانتقال ہے تو کفر نہ سی، خطا ضرور ہے۔

بعض (مشبہہ) نے کہا کہ خدا عرش پر موجود ہے، اس نے عرش پر قرار پکڑا اور تکیہ لگایا۔ یہ کفر ہے، اس لیے کہ نص کا انکار کیا اور ذات خداوندی کو عرش پر یا فوق العرش ثابت کرنا یہ کفر ہے اور جہت ثابت کرنا بھی کفر ہے اس لیے کہ مخلوق سے تشبیہ دی اور اس کے لیے حد ونہایت، جانب وجہت ثابت کی اور یوں کہتے کہ اللہ تعالیٰ علی العرش بلا کیف اور بغیر ذات کے ہے تو کافر نہ ہوتے بلکہ خطاوار ہوتے۔

بعض نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کے قدم (پاؤں) ہیں، اس لیے کہ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا: جہنم پکارتا رہے گا: ”**هل من مزيد حتى يضى الرب قدميه فيها**“ کیا اور ہے؟ حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ اپنے دونوں قدم اس میں رکھ دے گا۔

ہم کہتے ہیں کہ اس سے مراد قدم بمعنی قدیم علم ہے، جو کافر وفاجر اس کے علم قدیم میں (جہنمی ہیں) ان کو جہنم میں داخل فرمادے گا۔

دلیل یہ ہے کہ:

وَجَاءَ رَبُّکَ وَالْمَلَکُ صَفًّا صَفًّا (الفجر ۲۲)

"اور تمہارے رب کا حکم آئے اور فرشتے قطار قطار۔"

اگر کہا جائے کہ حدیث میں تو آیا ہے:۔۔۔اس کا جواب یہ ہے کہ یہ روایت ثابت نہیں اور بالفرض اگر ثابت ہو تو ہم کہتے ہیں کہ "رجل" کے معنٰی جماعت کے ہیں، جیسے عرب کا مقولہ ہے: "مررت برجل جراد" کہ میں ٹڈیوں کے لشکر و جماعت کے پاس سے گزرا۔

پھر ہم کہتے ہیں کہ "نزول" بمعنی "انزال" ہے، جیسے "**ضرب الامیر فلانا یعنی امر بالضرب**" امیر نے فلاں کو مارا یعنی مارنے کا حکم دیا، اسی طرح یہاں بھی نزول و انزال کا حکم دیا نہ کہ خود اترا۔ دوسرے حضور سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: "**ینزل بضم الیاء**" اور اگر یہ روایت صحیح ہے تو اشکال ہی اٹھ گیا۔

حضرت علی ابن ابی طالب کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم سے مروی ہے کہ "**النزول من الرب الافضال علی العباد**" نزول اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں پر فضل فرمانا ہے، اگر کہا جائے: اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَجَاءَ رَبُّکَ وَالْمَلَکُ صَفًّا صَفًّا (الفجر ۲۲)

"اور تمہارے رب کا حکم آئے اور فرشتے قطار قطار۔"

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

فَأَتَى اللَّهُ بُنْيَانَهُمْ مِنَ الْقَوَاعِدِ (النحل ۲۶)

تو اللہ نے ان کی چنائی کو نیو (بنیاد) سے لیا۔

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

إِلَّا أَنْ يَأْتِيَهُمُ اللَّهُ فِي ظُلَلٍ مِنَ الْغَمَامِ (البقرۃ ۲۱۰)

مگر یہی کہ اللہ کا عذاب آئے چھائے ہوئے بادلوں میں۔

ہم نے کہا: اس کے معنٰی "**وجاء ربک**" "**ای حکم ربک و امر ربک**" یعنی تمہارے رب کا امر اور حکم اور معنٰی **فَأَتَى اللَّهُ بُنْيَانَهُمْ مِنَ الْقَوَاعِدِ (النحل ۲۶)** یعنی "**استهلکهم اللہ**" اللہ تعالیٰ نے ان کو ہلاک کر دیا "**و استاصلهم**" اور ان کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا اور "**هل ینظرون**" الخ اور "**ظلل**" کے معنٰی ابر کے ہیں جو تحت العرش ہے، نیز انہوں نے کہا کہ "**یاتیهم اللہ**" کا معنی ہے: "**یاتی اللہ حکم من الاحکام**" اللہ تعالیٰ کے احکام میں سے حکم آ جائے۔

پھر کلام لوٹتا ہے حرف واحد کی طرف (یعنی پورے کلام کا تال کا را یک نکتہ ہے)۔

وہ یہ کہ اشکال از روئے لغت واقع ہوا ہے، لفظاً جو کہ معنیٰ کے موافق نہیں اور اہل لغت و اہل تفسیر خوب جانتے سمجھتے ہیں اور ان کا جہاد معتبر ہے اور ان کا اجماع اس پر حجت ہے۔

اور ارباب لغت اور ارباب تفسیر متفق ہیں کہ ان آیات کو ظاہر پر محمول کرنا جائز نہیں، ابہام ان میں اولیٰ ہے۔ تاویل ان میں حسن ہے۔ اللہ تعالیٰ کو ایسی چیز کے ساتھ موصوف کرنا کہ جس سے تشبیہ اور تغیر و حدوث ثابت ہو یا مخلوق کی صفات کے مشابہ ہو خواہ نص میں ہو یا غیر نص میں، بلا خلاف کافر ہو جائے گا۔ ایسی نصوص میں یقیناً تاویل کرنا ضروری ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

بارہواں قول: کفر و شرک کا بیان

جاننا چاہیے کہ مخلوق تیرہ قسموں میں متفرق ہو گئی ہے۔
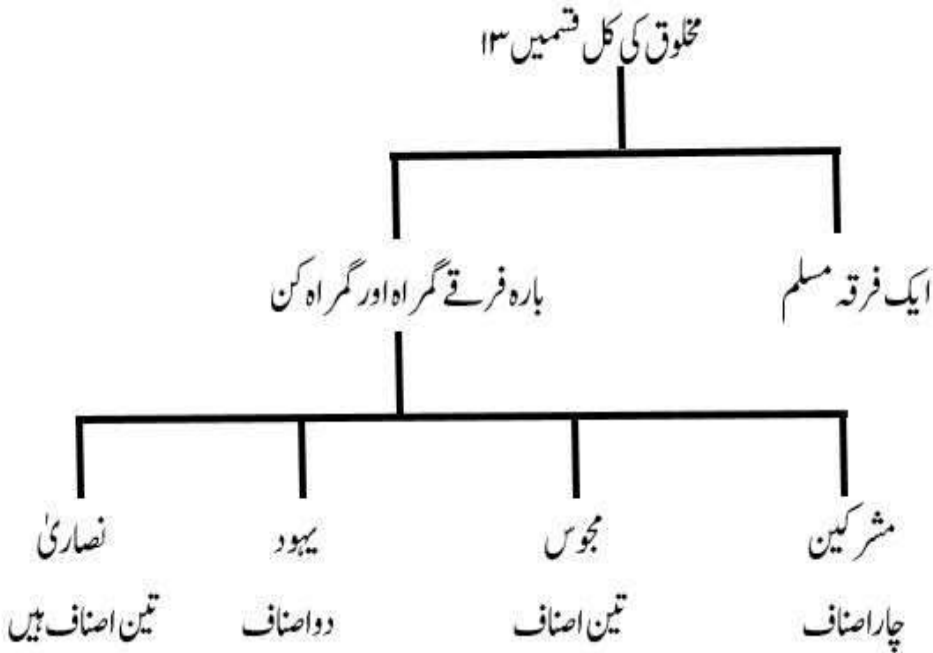
لیکن اصل شرک حضرت اخنوخ علیہ السلام جن کو ادریس علیہ السلام کہتے ہیں، ان کے زمانہ میں ظاہر ہوا۔ حضرت آدم علیہ السلام کے وقت سے ادریس علیہ السلام تک مخلوق میں سے کسی نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا۔

بعض نے ذکر کیا کہ حضرت آدم علیہ السلام کے وقت میں کفر ہوا کہ قابیل اور اس کی اولاد نے آدم علیہ السلام کے حکم کو رد کر دیا لیکن اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کیا۔

کفر و شرک میں فرق

فرق یہ ہے کہ کفر کے معنیٰ حق کو چھپانا ہے اور شرک اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا ہے۔

یہود و نصاریٰ کون ہیں؟

یہود و نصاریٰ کفار ہیں مشرک نہیں۔ فرق اسم وصفت کے اعتبار سے ہے لیکن حقیقت اور حکم میں شرک اور کفر کے درمیان کچھ فرق نہیں سوائے چند جگہوں کے وہ مقامات اور مواقع یہ اہل کتاب کا ذبیحہ ہمارے لیے حلال ہے، ایسے ہی ان کی عورتوں سے نکاح کرنا مسلمانوں کے لیے حلال ہے، اگرچہ کافر ہیں۔

بعض فقہاء نے فرمایا: کفر و شرک الگ الگ دو چیزیں ہیں، یہاں تک کہ اہل کتاب میں سے کوئی ایک یا کوئی مجوسی اپنی ملت کو چھوڑ کر شرک میں داخل ہو جائے تو اس کو مجبور کیا جائے گا اور تکلیف دی جائے گی کہ اپنی ملت کی طرف لوٹ جا اور یہ قول امام شافعی رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ کا ہے اور امام ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ مجبور نہیں کیا جائے گا اس کو چھوڑ دیا جائے، اس لیے کہ کفر و شرک ایک چیز ہے۔

اور بعض کہتے ہیں کہ حقیقت میں کفر و شرک میں کچھ فرق نہیں اور یہ اختلاف اس معنیٰ کے لحاظ سے واقع ہوا کہ اہل کتاب سے جزیہ (ٹیکس) لیا جائے گا اور جو ان کی مثل ہیں مثلاً مجوسی اور صابی وغیرہ سے اور مشرکین پر جزیہ (ٹیکس) مقرر نہیں کیا جائے گا، یہ حکم امام شافعی رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ کے نزدیک ہے۔

امام ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نزدیک تمام کافر خواہ یہود و نصاریٰ ہیں یا ہنود و مجوس سب پر جزیہ مقرر کیا جائے گا۔ اگر اہل کتاب میں سے کوئی اپنی ملت چھوڑ کر مشرکین کی ملت میں داخل ہو جائے تو امام شافعی کے نزدیک اس میں بیت المال کا حق باطل کرنا ہے اور اہل بیت المال کا نقصان کرنا اور انہیں ضرر پہنچانا ہے تو اس کو مجبور کیا جائے گا کہ اپنی ملت میں واپس آئے اور امام اعظم رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ کے نزدیک جزیہ لیا جائے گا، رجوع پر مجبور کرنے کی ضرورت نہیں، لیکن حقیقت میں کفر و شرک ایک چیز ہے۔ دلیل یہ ہے کہ سب جہنمی ہیں اور ہمیشہ جہنم میں رہیں گے۔

شرک کب شروع ہوا؟

یہ جو ہم نے کہا کہ شرک اخنوخ علیہ السلام کے زمانہ سے شروع ہوا اس لیے کہ یہ پہلے نبی ہیں، ان پر اللہ تعالیٰ نے کتاب اتاری، جس میں تیس صحیفے تھے اور ان کو اسی وجہ سے ادریس کہتے ہیں کہ درس و تدریس میں کثرت سے مشغول رہتے تھے اور وہ علم نجوم بھی جانتے تھے۔

کیا ادریس علیہ السلام حیات ظاہری کے ساتھ زندہ ہیں؟ اس میں اختلاف ہے، بعض کہتے ہیں کہ ادریس علیہ السلام نے موت کا ذائقہ چکھا اور دوزخ کو دیکھا اور وہ (ادریس علیہ السلام) جنت میں ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ انہوں نے موت کا ذائقہ نہیں چکھا، وہ زندہ ہیں اور ان کے شاگرد لوگوں کو ہدایت کرتے تھے اور انھوں (شاگردوں) نے حضرت ادریس علیہ السلام سے علم حاصل کیا اور وہ پانچ شخص تھے: ایک کا نام ود تھا، دوسرے کا نام سواع، تیسرے کا نام یغوث، چوتھے کا نام یعوق اور پانچویں کا نام نسر تھا۔ جب ادریس علیہ السلام آسمان کی طرف اٹھائے گئے تو یہ پانچ شاگرد باقی رہ گئے۔

حضرت ادریس علیہ السلام کی جدائی اور مفارقت میں بہت غمگین تھے اور آپ کو انہوں نے نہیں دیکھا، اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے۔ حضرت ادریس علیہ السلام کے آسمان کی طرف اٹھائے جانے کے بعد لوگوں کو علم سکھاتے، جب ان پانچوں شاگردوں کا بھی انتقال ہو گیا تو لوگ حیران و پریشان تھے کہ کس سے احکام سیکھیں؟ اور اس پر ان کو بہت غم اور فکر تھا چنانچہ ان میں سے ایک گروہ نے کہا کہ اگر ہم ان پانچوں کی تصویر بنا کر رکھ لیں تاکہ ہمیں تسلی ہو اور عبادت میں مشغول ہوں تو انہوں نے ان پانچوں کی تماثیل بنا کر انہی کے نام سے ہر ایک کو موسوم کر دیا اور ان کی طرف دیکھا کرتے اور اللہ تعالیٰ کی مورتیاں عبادت کرتے، ان کو بھی اللہ تعالیٰ نے وفات دی اور یہ دین اسلام پر تھے۔ پھر جب ان کی اولاد (جوان) ہوئی تو ابلیس ان کے پاس آیا اور ان مورتیوں کے پیٹ میں داخل ہو کر کہنے لگا کہ "انا ربکم و رب ابائکم فاعبدونی" میں تمہارا اور تمہارے باپ دادا کا رب ہوں، میری عبادت کرو کہ تمہارے باپ دادا بھی مجھ کو پوجتے تھے اور ان کو یہ علم نہ ہوا کہ ان کے باپ دادا بت پرستی نہیں کرتے تھے۔ اس کے بعد اعتقاد کر لیا اور ان کی مثل سونے چاندی اور تانبے کی صورتیں بنالیں اور ان پانچوں کے نام رکھ دیے اور نوح علیہ السلام کے زمانہ تک انہی بتوں کو پوجتے رہے اور اپنی اولاد کو بھی وصیت کرتے رہے کہ انہی بتوں کو پوجتے رہنا اور ود، سواع، یعوق، نسر، یغوث کو نہ چھوڑنا۔

حضرت نوح علیہ السلام ان کو اسلام کی دعوت دیتے لیکن انہوں نے حضرت نوح علیہ السلام کی اطاعت نہیں کی تو نوح علیہ السلام نے دعا کی: رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكَافِرِينَ دَيَّارًا (نوح ۲۶) اے میرے رب زمین پر کافروں میں سے کوئی بسنے

والا نہ چھوڑ۔" تو اللہ تعالیٰ نے ان سب کو غرق کر دیا، ان میں سے اسی اشخاص باقی بچے جو اسلام پر قائم رہے۔ چالیس مرد اور چالیس عورتیں، پھر سب کا انتقال ہو گیا اور تین شخص باقی رہے جن کے نام درج ذیل تھے:

(۱) سام (۲) حام (۳) یافث۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی پشتوں سے اولاد آدم کو نکالا اور وہ اصنام (بت) کیچڑ میں چھپا دیے گئے۔

پھر جب حضرت اسماعیل علیہ السلام مبعوث ہوئے تو ابلیس نے ان پانچ بتوں کو کیچڑ سے نکال کر ایک غطفان نامی قبیلے کو دیے، پھر اور بت تراشتے گئے یہاں تک کہ ان کی تعداد ۳۶۰ ہو گئی تو مشرکین کی چار اصناف ہو گئیں: (۱) ایک صنف نے کہا: فرشتے اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں۔ نعوذ باللہ۔ (۲) ایک صنف نے کہا: اصنام (بت) اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں۔ (۳) ایک نے کہا: اصنام اللہ تعالیٰ کے شریک ہیں۔ (۴) ایک نے کہا: فرشتے اور اصنام دونوں اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں نہیں ہیں نہ اس کے شرکاء ہیں، لیکن انہوں نے کہا کہ اصنام آسمان کی طرح ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ہماری سفارش کرنے والے ہیں۔ جب یہ بت ہم سے راضی ہوتے ہیں تو آسمان کا خدا ہم سے راضی ہوتا ہے اور یہ ان کو پوجتے تھے۔

پھر ہمارا اجماع ہے کہ کفر ابغض المبغوضات ہے اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہاں تک کہ کافر جب کفر کرتا ہے تو قریب ہے کہ زمین و آسمان پھٹ جائیں اور اللہ تعالیٰ تمام مخلوق کو ہلاک کر دے، ان کی نحوست کی وجہ سے اور ان کی وجہ سے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

تَكَادُ السَّمَاوَاتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنشَقُّ الْأَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا (۹۰) أَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمَٰنِ وَلَدًا (مریم ۹۱)

قریب ہے کہ آسمان اس سے پھٹ پڑیں اور زمین شق ہو جائے اور پہاڑ گر جائیں ڈھ (مسمار ہو) کر اس پر کہ انہوں نے رحمٰن کے لیے اولاد بتائی۔

اسی وجہ سے ہم کہتے ہیں کہ جو شخص کفر نہ کرے لیکن دوسرے کے کفر پر راضی ہو، اگرچہ ایک ساعت کے لئے ہو تو وہ کافر ہو جائے گا، یہاں تک کہ اگر کوئی کافر کہے: مسلمان کر لو اور یہ کہے کہ ایک ساعت صبر کر دیا کہے کہ فلاں کے پاس جا تو کافر ہو جائے گا۔

ایسے ہی اگر ظلم و معصیت پر راضی ہو تو کافر ہو جائے گا اور اگر کفر و معصیت اور ظلم کو پسند کرے تو کافر ہو جائے گا اور ایسے ہی جو کفر و اسلام میں یا معصیت و طاعت میں فرق نہ کرے کافر ہو جائے گا یا حلال و حرام میں فرق نہ کرے تو کافر ہو جائے گا اور

ایسے ہی اگر نیت کی کہ کفر کرے گا تو فی الفور کافر ہو جائے گا۔ ایسے ہی اگر کسی مسلمان کے کفر پر گواہی دے تو اسی وقت کافر ہو جائے گا اور اسی طرح اگر بغیر تقیہ کے شعائر کفر کا اظہار کیا تو کافر ہو جائے گا۔ اعاذنا اللہ تعالیٰ۔

تیرہواں قول: آتش پرستوں کا بیان

جان لیجئے کہ مجوس (آتش پرست) تین قسم کے ہیں ایک زمزمیہ اور وہ یہ کرتے ہیں کہ جب آتش کدہ میں داخل ہوتے ہیں تو منہ سے سیٹی بجاتے ہیں اور اصل میں ان کی ابتداء اس وقت سے ہوئی جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ نے نہیں جلایا تو ابلیس نے آکر ان سے سرگوشی کی اور کہا: حکیم و علیم کے لئے یہ اچھا اور مستحسن نہیں کہ ایک چیز کو پیدا کرے اور پھر اس کی ضد کو پیدا کرلے اور اس پر ضد کو مسلط کردے یہاں تک کہ اس کو ہلاک کردے لیکن (بلکہ) ہر حسین و جمیل نافع ہوں، نور ہے وہ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اور قبیح گمراہ اور گمراہ کن چیز نقصان دہ اور نار ہے اور وہ ابلیس کی طرف سے ہے اور یہ دونوں بھائی ہیں (یعنی اچھی چیزوں کو پیدا کرنے والا خدا ہے اور بری اور نقصان دہ اشیاء کا پیدا کرنے والا شیطان ہے)۔

ایک کا نام یزدان ہے اور دوسرے کا نام اہرمن ہے اور ان دونوں میں پہلے سے عداوت تھی یہ (متذکرہ بالا فرقہ مجوس) اس پر اعتقاد رکھتے ہیں اور آپ کی پوجا کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام کو آگ نے اس لئے نہیں جلایا کہ وہ آگ کی پوجا کرتے تھے اور ہم بھی اس لئے آگ کی پوجا کرتے ہیں تاکہ آگ ہمیں آخرت میں نہ جلائے۔

اور بعض نے ایک دوسری علت نکالی کہ قابیل کی قربانی کو آگ میں اس لئے جلایا کہ آتش پرست تھے اور ہابیل کی قربانی کو آگ نے جلادیا کہ وہ آتش پرست نہ تھا اور یہ لوگ منہ بند رکھتے ہیں تاکہ آگ کو ان کے سانس سے تکلیف نہ پہنچے اور نیز آگ کے سامنے سوتے نہیں اور آگ بجھنے نہیں دیتے۔

مجوسیوں کے ایک فرقے کا نام شماسیہ ہے، وہ آفتاب پرست ہیں۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ سورج اللہ تعالیٰ کا بڑا نور ہے۔

اور تیسری صنف کو شمسیہ کہتے ہیں یہ قوم ہر نور کو پوجتی ہے جیسے سورج، چاند، ستارے، آگ وغیر ذلک۔ اور کہتے ہیں کہ یہ تمام انوار اصل میں ایک ہی نور تھا جب مخلوق یعنی عرش، لوح، آسمان پیدا نہیں ہوئے تھے جب اللہ تعالیٰ نے ان اشیاء کو پیدا کیا یہ انوار متفرق ہو گئے اور یہ دیکھنے میں متفرق ہیں اور حقیقت میں ایک ہی نور ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کا نور ہے۔

اور اس قول کا مآل و مرجع بھی دراصل تناسخ ہی قرار پاتا ہے اور جوہر بسیط میں قول فلاسفہ کے مشابہ ہے۔

دیگر فرقوں کا بیان

اور ایسے ہی وثنیہ ، برامہ اور ثمنیہ اہل ہیبت میں سے اور حلولیہ بلادِ خاقانیہ سے، سب یہی عقیدہ رکھتے ہیں اور پھر مجوس کا حکم رتبہ میں اہل کتاب کی طرح ہے۔ اس لئے کہ ان کے پاس شبہۃ الکتاب ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ مجوس کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے کتاب ہے اوران میں ایک عادل بادشاہ تھااور لوگ اس سے اس کے عدل کی وجہ سے محبت کرتے تھے، پھر یہ بادشاہ اپنی بہن پر عاشق ہو گیااوراس سے صحبت کر بیٹھا، اس (بہن) نے لوگوں سے راز فاش کر دیااور (اپنے بھائی) بادشاہ کی شکایت کی اور لوگ یہ سن کر بادشاہ کے خلاف نکل کھڑے ہوئے۔

بادشاہ اپنے محل پر چڑھااور کہنے لگا: اے لوگو! ہم جنات کی اولاد ہیں ؟ سب نے کہا: ہم آدم (علیہ السلام) کی اولاد ہیں۔ بادشاہ نے کہا: کیا آدم علیہ السلام کی شریعت تھی سب نے کہا: ہاں تھی تو بادشاہ نے کہا: ان کی شریعت اولیٰ ہے (یعنی اس میں بہن سے نکاح جائز تھا)۔

سب نے کہا تو سچ کہتا ہے، پھر بادشاہ لوٹ آیااور اپنی بہن سے نکاح کر لیااور اپنے حبالۂ نکاح میں لے لیا، پھر جب رات کو سویا تو اللہ تعالیٰ نے کتاب اٹھالی۔

اور بعض نے کہا کہ ان کے پاس کتاب کے مشابہ ہے، اس معنی کے لحاظ سے کہ ان میں متنبی تھا، اس کو زردشت کہتے ہیں، اس نے نبوت کا دعویٰ کیا تھااور ایک کتاب اس نے لوگوں کے سامنے پیش کی اس کو ژند و پاژند کہا جاتا تھااور اس نے کہا: یہ کتاب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، اس میں احکام وقصص اور امر و نہی وغیرہ بہت سی باتیں ہیں جو سب خلاف شرع ہیں اور اس کتاب (ژند و پاژند) کی زبان ایسی ہے کہ کسی نے اس زبان کے ساتھ تکلم نہیں کیا اور یہ تین قسم ہیں:

(۱) زرادشتہ (۲) مرد کیہ (۳) نوشیروانیہ اور ان کا کفر ظاہر ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے دامن رحمت میں پناہ دے۔

چودھواں قول: یہودیوں کا بیان

معلوم ہونا چاہیے کہ یہود کی دو قسمیں ہیں۔ (۱) عزیزیہ (۲) سامریہ، اسی کو سماریہ بھی کہا جاتا ہے۔ یہود حضرت عزیر علیہ السلام کے زمانے میں ظاہر ہوئے اس لئے کہ بخت نصر نے جب بیت المقدس کو خراب کیا اور ان کے بچوں کو قیدی بنالیا اور حضرت عزیر علیہ السلام بھی قیدیوں میں تھے اور وہ کم سن تھے اور ان کو قید کر کے سرزمین عراق پہنچا دیا تھا، چنانچہ جب

بخت نصر فوت ہو گیا اور اس کی جگہ دوسرا بادشاہ تخت نشین ہوا اور اس نے بنی اسرائیل کی ایک عورت سے نکاح کر لیا اور وہ عورت اسے بہت محبوب تھی، اس کو بہت چاہتا تھا۔

ایک دن بادشاہ نے کہا: مانگ جو تیری حاجت ہو۔ اس پر وہ (اس کی محبوب بیوی) کہنے لگی: بنی اسرائیل (جو قید تھے) مجھے بخش دے۔ اسی نے بنی اسرائیل اسے بخش دیئے اور ان سب کو بیت المقدس بھیج دیا اور حضرت عزیر علیہ السلام جب جوان ہو گئے، حضرت جبرائیل علیہ السلام تشریف لائے اور ان کے دہن اقدس میں دم کیا، پھونک ماری تو حضرت عزیر علیہ السلام کو تمام ''تورات'' حفظ ہو گئی، پھر جب تمام قیدی بیت المقدس بھیج دیئے گئے اور بیت المقدس میں کچھ بچے کچھے بوڑھے آدمی رہ گئے تھے، ان قیدیوں نے ان مشائخ کو خبر دی کہ ہم میں ایک شخص ''تورات'' کا حافظ ہے تو مشائخ نے کہا کہ ہاں! ہم نے بھی سنا ہے کہ قیدیوں میں ایک شخص ہے جس کو ''تورات'' حفظ ہے تو انہوں نے ''تورات'' طلب کی، آپ نے ''تورات'' پڑھ پڑھ کر سنائی تو ان میں سے ایک آیا اور کہنے لگا: میں نے اپنے والد سے سنا ہے کہ اس نے ایک جگہ ''تورات'' چھپا رکھی ہے چنانچہ نو آدمیوں نے مزید گواہی دی اور اس کی تصدیق کی کہ جہات مصفوفہ میں ''تورات'' چھپائی ہوئی ہے، جو ایک انگور کے باغ میں ہے، لہٰذا سب وہاں گئے اور تلاش و جستجو کے بعد انہیں ''تورات'' کا ایک نسخہ مل گیا، اب انہوں نے اس دریافت شدہ نسخہ کا اس نسخہ سے مقابلہ کیا جو حضرت عزیر علیہ السلام نے لکھوایا تھا تو انہوں نے اس میں ایک لفظ کی بھی زیادتی یا کمی نہ پائی تو اب ابلیس اور اس شیطان مردود نے لوگوں کو اس طرح بہکایا کہ کہنے لگا کہ اگر عزیر علیہ السلام خدا کے بیٹے نہ ہوتے تو ''تورات'' انہیں حفظ نہ ہوتی، یہ اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں، متبنی بنے ہوئے ہیں اور ''تورات'' چالیس جزوں پر مشتمل تھی، چار آدمیوں کو پوری حفظ تھی: (۱) موسیٰ (۲) ہارون (۳) یوشع (۴) عزیر علیہم السلام اجمعین اور ان یہودیوں کے پاس ایک دو صحیفہ تھے۔ ابلیس نے کہا کہ یہ ابن اللہ (اللہ تعالیٰ کے بیٹے) ہیں، خدا نے ان کو بیٹا بنایا ہے، لوگ معتقد ہو گئے اور ''عزیر ابن اللہ'' کہنے لگے۔

یہود کی دوسری قسم

یہود کی صنف ثانیہ سامریہ ہے، یہ وہ لوگ ہیں جو گوسالہ پرستی کرتے یعنی بچھڑے کی پوجا کرتے تھے، یہ اس لیے کہ سامری نے ایک بچھڑے کا مجسمہ بنایا جو آواز نکالتا تھا اور سامری نے کہا تھا کہ ہمارے جسم ناپاک ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی خدمت کی صلاحیت نہیں رکھتے اور یہ گائے پاک ہے، ہم اس کی عبادت کریں تاکہ یہ اللہ تعالیٰ کے حضور ہماری شفاعت کرے، یہ لوگ اور بت پرست برابر ہیں۔ ان یہودیوں اور بت پرستوں میں کچھ فرق نہیں۔

اور یہودیوں میں سے بعض یہ کہتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت سے پہلے کوئی شریعت نہ تھی اور ان کے بعد بھی کوئی شریعت نہیں اور موسیٰ علیہ السلام کے سوا کوئی پیغمبر صاحب شریعت نہیں اور کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا دیدار نہ ہوگا، اگر دیدار جائز وممکن ہوتا تو موسیٰ علیہ السلام کو کیوں منع کیا گیا اور جب منع کیا گیا تو یہی صحیح ہوا کہ خدا کا دیدار نہ ہوگا۔

بعض یہودی وہ ہیں جو حضور اقدس ﷺ کو عرب و عجم کے لیے صاحب شریعت مانتے ہیں کیونکہ ان (عرب و عجم) کے پاس شریعت نہ تھی تو اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ کو ان کی طرف بھیجا اور بنی اسرائیل کے پاس تو کتاب و شریعت تھی، لہٰذا کتاب و شریعت کا نسخ جائز نہیں۔

اور اس کا جواب پہلے دیا جا چکا ہے اور یہی منصوص ہے، اللہ تعالیٰ کے اس قول سے کہ:

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا" (سبا:۲۸)

اور ہم نے آپ کو نہیں بھیجا مگر تمام لوگوں کے لیے خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا۔ **والحمدللہ بکرۃ و اصیلا۔**

پندرھواں قول: نصاریٰ کا بیان

نصاریٰ کی تین قسمیں ہیں: (۱) ملکائیہ (۲) نسطوریہ (۳) ماریعقوبیہ۔

اور یہ فرقے اس لیے ظاہر ہوئے کہ ان کے اور یہود کے درمیان عداوت تھی اور سخت لڑائی جھگڑے رہتے تھے اور بے شمار یہودیوں کو نصاریٰ نے قتل کر دیا تھا۔

ایک یہودی عالم تھا، اس کے سبب سے منازعت تھا، اس نے از راہ عذر تدبر کیا اور اپنا ہاتھ اپنے چہرے پر مارا اور اپنی آنکھ پھوڑ دی، پھر نصاریٰ کے پاس آیا اور کہا: تم مجھ کو پہچانتے ہو؟ سن نے کہا: ہاں! پہچانتے ہیں۔ کہا کہ عیسیٰ علیہ السلام فلاں رات آسمان سے اترے اور فرمایا: ای فلاں! تو نے میری امت کے ساتھ کیا کیا اور ایک تھپڑ رسید کیا تو میری آنکھ پھوڑ دی تو میں نے اسی وقت یہودیت سے توبہ کر لی اور یہودی مذہب کا بطلان مجھ پر ظاہر ہو گیا، اب میں عیسائی ہوں۔ لوگوں نے اس کو سچا جان لیا اور اپنے بیٹوں کو جمع کیا اور اس کے سپرد کر دیا کہ اس سے تعلیم حاصل کریں، اس (یہودی عالم) نے ان میں سے تین آدمی چن لیے: ملکا، نسطور اور ماریعقوب۔ جب ان تینوں نے خوب علم حاصل کر لیا اور اس کے معتقد ہو گئے تو ایک دن ملکا کہ تو عیسیٰ کو جانتا ہے؟ اس نے کہا کہ ہاں! وہ اللہ تعالیٰ کے رسول اور نبی اور روح اللہ ہیں۔ اس یہودی نے کہا: ایسی بات نہ کرو، کیا کسی نے مادرزاد اندھوں کو بینا کیا؟ کوڑھی اور برص زدہ لوگوں کو اچھا کیا؟ اور مردہ کو زندہ کیا؟ اور پرندہ کو پیدا کیا؟

بلکہ وہ اللہ تعالیٰ ہیں، آسمان سے اتر کر جو کچھ کیا کر گزرے اور پھر آسمان پر چڑھ گئے۔

اور یہ بات کسی سے نہ کہنا صرف اپنے دل میں رکھنا اور اس نے اپنے دل میں رکھا اور اعتقاد کیا۔

نسطور سے علیحدہ ہو کر کہا کہ عیسیٰ علیہ السلام کو جانتا ہے؟ اس نے کہا: ہاں! وہ اللہ کے نبی اور روح اللہ ہیں اور اس کے بندے تھے۔ اس یہودی نے کہا: ایسی بات نہ کرو کیا کسی نبی نے ایسا ایسا کیا؟ وہی بات اس سے بھی کہی جو ملکا سے کہی تھی اور کہا کہ وہ اللہ کے بیٹے ہیں، آسمان سے اتر کر انہوں نے ایسا ایسا کیا اور پھر آسمان کی طرف لوٹ گئے۔ نسطور نے یہ بات مان کر اعتقاد کر لیا۔

پھر ماریعقوب سے کہا کہ عیسیٰ علیہ السلام کو جانتا ہے؟ اس نے کہا: ہاں! وہ اللہ کے نبی اور رسول اور اس کی روح ہیں، رومیوں میں سے تھے۔ یہودی نے کہا کہ اس بات سے توبہ کرو اور یہ اعتقاد کرو کہ وہ الٰہ اور ابن الٰہ تھے، اس لیے کہ لاہوت آسمان سے اتر کر ناسوت میں داخل ہوئے اور پھر عیسیٰ بن کر نکلے اور وہ تین میں کا تیسرا ہے اور اللہ تعالیٰ نے ان کے قول کی خبر دی:

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ ثَالِثُ ثَلَاثَةٍ (المائدة ۷۳)

”بے شک کافر ہیں وہ جو کہتے ہیں اللہ تین خداؤں میں کا تیسرا ہے“۔

اور پھر ان کے قول کا ابطال فرمایا:

مَا الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ (المائدة ۷۵)

مسیح ابن مریم نہیں مگر ایک رسول اس سے پہلے بہت رسول ہو گزرے۔

پھر وہ حبر (عالم) ان کے پاس سے چلا گیا۔ ایک دن تینوں شاگرد جمع ہوئے اور ہر ایک نے کہا: دین یہ ہے، دوسرے نے کہا: دین یہ ہے۔ تیسرے نے کہا: دین اس طرح ہے۔ پھر ان میں اختلاف ہوا اور قتل و قتال شروع ہو گیا یہاں تک کہ ان کے چالیس ہزار افراد ہلاک ہو گئے اور یہ اختلاف ان میں اسی طرح باقی رہا۔

اختلاف کی دوسری وجہ

بعض فقہاء نے فرمایا کہ ان میں اختلاف اس لیے پیدا ہوا کہ عیسیٰ علیہ السلام بیت المقدس میں داخل ہوئے اور نبوت کا دعویٰ کیا اور عزیر علیہ السلام کا سو سال پہلے انتقال ہو چکا تھا اور ”تورات“ ان کے پاس موجود نہ رہی تھی تو بنی اسرائیل نے عیسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ اگر اللہ کے نبی ہیں تو ”تورات“ لائیے، اس لیے کہ عزیر علیہ السلام ہم سے ”تورات“ لے گئے۔ پھر عیسیٰ علیہ السلام نے اول سے آخر تک ”تورات“ بغیر کسی کمی و بیشی کے لکھ دی، پھر اس میں لوگوں نے اختلاف کیا۔

بعض نے کہا: اس میں کمی بیشی ہے اور تغیر ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت عزیر علیہ السلام کو زندہ فرمایا۔ آپ اٹھے اور بیت المقدس میں داخل ہوئے اور لوگ عیسیٰ علیہ السلام سے مناظرہ کرنے لگے۔ صحرہ کے پاس جو مسجد میں ہے لوگوں نے آپ

کو پہچان لیا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے حضرت عزیر علیہ السلام سے دریافت کیا کہ اے عزیر! تورات کہاں رکھی ہے؟ عزیر علیہ السلام نے فرمایا: اسی مسجد میں فلاں ستون کے نیچے۔ انہوں نے وہ جگہ کھودی اور وہاں سے "تورات" مل گئی پھر اس "تورات" کا مقابلہ اس "تورات" سے کیا جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے لکھوائی تھی اس کو ہو بہو وہی پایا بغیر زیادتی و نقصان کے، ایک لفظ بھی بدلا ہوا نہ پایا۔

ابلیس آیا اور ان کو بہکایا کہ عزیر علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں، اس لیے کہ جو انسانوں میں سے مر گیا وہ قیامت کو اٹھایا جائے گا اور عزیر علیہ السلام مرے ہی نہ تھے بلکہ وہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے پاس چلے گئے تھے اور اب آسمان سے اترے ہیں۔

اور بعض نے کہا: مسیح ابن اللہ ہیں، اس لیے کہ اگر وہ ابن اللہ نہ ہوتے تو "تورات" کے حافظ نہ ہوتے حالانکہ وہ بغیر حفظ کیے حافظ تھے تو ان میں اختلاف رونما ہوا۔ **نعوذ باللہ من وسوسۃ الشیطٰن**

سولہواں قول: تناسخیہ کا بیان

تناسخیہ کی چار قسمیں ہیں، پھر ان سے (ذیلی شاخیں) چوراسی نکلتی ہیں گویا کہ ان کی چوراسی اصناف ہیں۔

صنف اول کے عقائد و نظریات

پہلی صنف اللہ کو نور مانتی ہے، اس کا کہنا ہے کہ تمام انوار اللہ تعالیٰ (جو کہ نور) کے نور سے نکلے ہیں، سورج، چاند، ستاروں کا نور اور اسی طرح آنکھ کا نور اور سماعت، قوت، کلام وغیر ذلک تمام اللہ تعالیٰ کے نور سے ہیں اور روح، اللہ تعالیٰ کے نور سے ہے (یونہی) نار اور دوسرے انوار بھی اللہ تعالیٰ کے نور سے ہیں اور یہ سب انوار کی عبادت کرتے ہیں اور بلاد ہند اور کشمیر میں براہمہ کا یہ مذہب ہے اور عرب و عجم میں مجوس کا یہی مذہب ہے اور ایسے ہی مجوس نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو نار سے پیدا کیا اور نار اللہ تعالیٰ کے نور سے ہے تو ابلیس اللہ تعالیٰ کا بھائی ہے اور اللہ تعالیٰ ان کی بکو اس سے بلند و بالا ہے۔ اسی وجہ سے وہ آگ کو پوجتے ہیں کہ ابلیس آگ سے پیدا ہوا ہے۔

دوسری صنف

یہ کہتے ہیں کہ تمام ارواح اور تمام اعیان صانع کا جز ہیں، اس لیے کہ جب صانع نے تمام اشیاء کو پیدا کیا تو صانع کا فعل اور صنع اس سے شروع ہو کر مصنوع تک منتہیٰ پزیر ہوا اور صنع و فعل مصنوع میں حلول کیے ہوئے ہیں، پس مفعولات صانع کے جز سے حاصل ہوتے ہیں اور جو یہ کہے کہ تکوین اور مکون اور تفصیل اور مفعل ایک ہیں تو یہ قول تناسخیہ سے لازم آتا ہے۔

مانویہ کہتے ہیں کہ باری تعالیٰ بذات خود ہر مکان میں حلول کیے ہوئے ہیں۔

اور بعض کہتے ہیں کہ ہر شاہد (نظر آنے والی چیز) میں اللہ تعالیٰ حلول کیے ہوئے ہے اور وہ ہر ایسی چیز کی عبادت کرتے ہیں جو ان کو آنکھوں سے محسوس ہوتی ہے، جیسے انوار واعیان، پہاڑ اور پانی، درخت، گھوڑا، اونٹ، گائے، بکری اور نباتات، مرد و زن وغیرہ اور یہ حلاجیہ میں حلولیہ کا مذہب ہے اور غالیہ روافض کا بھی یہی مذہب ہے اور اسی وجہ سے انہوں نے کہا کہ حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ خدا ہیں۔

اسی وجہ سے "فرقہ مانویہ" جو بلاد چین، ختن، تبت، ختا اور خاقانیہ وغیرہ کی طرف ہیں، وہ کہتے ہیں کہ انسان کو جس چیز کی بھی خواہش ہو مثلاً غیروں کی عورتیں اور ان کی لونڈیاں، ان کی بیٹیاں، بیٹے یہ سب مباح ہیں اور کہتے ہیں کہ جو منع کرے وہ کافر ہو جائے گا، اس لیے کہ یہ اشتہاء اللہ کی طرف سے ہے اور اللہ تعالیٰ اشتہاء کرتا ہے اپنے نفس کے لیے اپنی طرف سے، بعض نصاریٰ کا بھی یہی مذہب ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے خواہش کی مریم علیہ السلام سے اور مریم علیہ السلام میں داخل ہوا اور مریم علیہ السلام سے عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے، یہ (نصاریٰ) اس اعتقاد و بکواس کی وجہ سے کافر ہو گئے اور اللہ تعالیٰ ان خرافات اور صفات مخلوقات سے منزہ و مبرا ہے۔

تیسری صنف

انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نفس سے نور لیا اور اس کی تین قسمیں کیں تو پہلی قسم سے تو جنت کو پیدا کیا اور اس کا نام "مکان الاماکن" رکھا اور قسم ثانی سے فرشتوں کو پیدا کیا اور ان کا نام "نفس روحانیہ" رکھا اور تیسری قسم سے آدمیوں کی روحیں پیدا کیں اور اس کا نام "نفس انسانی" رکھا۔

اور اس معنیٰ کے لحاظ سے کہا کہ جنت قدیم ہے اور ملائکہ قدیم ہیں اور ارواح قدیم ہیں ان کا کفر ظاہر ہے۔

پھر کہا کہ اللہ تعالیٰ نے ارواح اور جنت سے نور لے کر دنیا جہاں کو پیدا کر ڈالا، اس لیے کہ وہ کہتے ہیں کہ زمیں و آسماں حادث ہیں تو پھر ان میں کون وفساد کہاں سے داخل ہو گا؟

پھر اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کا مکان جنت ٹھہرایا اور آدمیوں کی ارواح کا مکان دنیا میں اور آدمیوں کی ارواح نے اپنے بارے میں سوچا کہ ہمارا درجہ اور ہماری فضیلت فرشتوں کی روحوں سے زیادہ ہے اور مکان ان کا اعلیٰ و پائیدار ہے تو ہم محدث کیسے ہوئے؟

تو پھر انہوں نے آسمان پر چڑھنے کا عزم کیا، یہ گمان کرتے ہوئے کہ ہم زبردستی فرشتوں سے وہ مکان لے لیں گے جو کہ جنت ہے اور یہ عزم تمام روحوں نے کیا، بلکہ کافروں اور سرکشوں کی روحوں نے کیا اور ایمان والوں کی ارواحنے خوف وامید کے

ساتھ بغیر قصد کے ان کی فرماں برداری کی اور ارواح انبیاء علیہم السلام جانتی تھیں کہ ایسا نہیں ہو گا اور اللہ تعالیٰ کے ارادہ کے خلاف نہیں ہو سکتا تو مجبوراً انہوں نے بھی متابعت کی۔

پھر جب یہ سب روحیں آسمان پر چڑھیں اور ارواح ملائکہ کے ساتھ جمع ہوئیں تو انبیاء و علماء کی روحوں نے حکمت سیکھ لی، اس لیے کہ وہ مکرمین ہیں تو ان کو فضیلت حاصل ہے اور انہوں نے کہا کہ وحی و انباء (خبر دینا) اس علم و حکمت سے ہے۔ پھر قرآن و کلام وغیرہ روحوں کے لیے ہے اور وہ اس کے کلام اللہ ہونے اور جبریل علیہ السلام کے لیے وحی کا انکار کرتے ہیں اور انہوں نے کہا کہ نبی علیہ السلام نے فرمایا ہے: "**الارواح جنود مجندة فما تعارف هناک ایتلف ههنا وما تنا کرهناک اختلف ههنا**" انہوں نے اس حدیث کے پیش نظر کلام کے یہ معنیٰ مذکورہ بالا لیے اور انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو سزا دی اور ان کو آسمان سے زمین کی طرف دفع کر دیا اور انہیں زمین میں دھنسا دیا اور وہ مٹی اور کیچڑ میں خلط ملط ہو گئے اور یہ معنیٰ ہیں اس آیت کے:

"**ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ**" (التین ۵)

"پھر اسے ہر نیچی سے نیچی سی حالت کی طرف پھیر دیا۔"

پھر اللہ تعالیٰ نے روئے زمین سے ایک مٹھی لی مع اجزاء و ارواح کے اور اس مشت خاک سے روحوں کو ظاہر کیا اور آدم علیہ السلام کو پیدا کیا، پھر نبات و زرع اور درخت اور پتھروں اور متحرک چیزوں کو جو بھی زمین سے نکلتی ہے، یہ نکلی ہوئی روحیں اور ان کی نشو و نما روحوں کی تاثیر سے ہوتی ہے تو ہر وہ روح جس کے گناہ مٹا دیے گئے۔

اس لیے کہ آدمی کل کو کھاتا ہے اور یہ جز آدمی کی روح سے متصل ہو جاتا ہے اور بعض بہائم کھا جاتے ہیں بعینہ گناہ کی وجہ سے، پھر آدمی جب اس حیوان کو کھاتا ہے تو بسا اوقات پرندوں اور درندوں کو کھاتا ہے۔

اور بعض اوقات کوئی بھی نہیں کھاتا، نباتات یا پھل اور بہیمہ مر جاتا ہے نجس، تو جو روح اس میں تھی وہ زمین کی طرف لوٹ جاتی ہے یا درندے اور کتے کی طرف تو پھر ایک شخص سے دوسرے شخص کی طرف اور ایک شئ سے دوسری شے کی طرف ہمیشہ منتقل ہوتی رہتی ہے، یہاں تک کہ گناہوں سے پاک ہو جانے کے بعد آدمی تک پہنچ جاتی ہے۔ پھر آدمی جب گناہ کرتا ہے اور مر جاتا ہے تو اس کی روح اس کے جسم سے نکل کر کتے یا خنزیر یا کافر کے جسم میں داخل ہوتی ہے تو اس میں اسے عذاب دیا جاتا ہے، اس کلام کا ماحصل یہ ہے کہ آخر کار تمام روحیں گناہوں سے پاک ہو جاتی ہیں، کیونکہ سب نے اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹ جانا ہے اور دنیا میں کسی روح نے باقی نہیں رہنا تو اس وقت عالم فنا ہو جائے گا اور تمام روحیں بغیر عقاب و عذاب جنت میں ہوں گی اور یہ (سب بکواس) کفر ہے۔

اور سب کچھ انہوں نے اس بنیاد پر کہا کہ انسان کبھی گھاس ہوتا ہے اور کبھی چوپایہ اور درندہ اور کبھی کافر و فاجر اور کبھی مومن ہوتا ہے اور کبھی نبی ہوتا ہے اور یہ اہل مصر وغیرہ کے بعض روافض کا مذہب ہے۔

صنف چہارم کے عقائد و نظریات

صنف چہارم کے نزدیک ارواح تین ہیں: (۱) روح کلی (۲) روح جزئی (۳) روح متصل۔

روح کلی وہ ہے جس کے ساتھ اشیاء قائم ہیں، فلاسفہ اس کو جوہر بسیط کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور مراد اس سے صانع لیتے ہیں۔

روح جزئی، وہ حیوان اور آدمی ہے۔

تیسری روح متصل ہے جز سے کل کی طرف اور وہ ہوا ہے اس لیے کہ کلام و سمع و بصر اور علم و حکمت اور برہان اور ذہن و عقل یہ سب روح کلی کے ساتھ اور روح جزئی کی طرف بواسطہ ثالث اثر کرتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہی معنٰی وحی کے ہیں اور دوسری وحی کی حاجت نہیں اور یہ کفر ہے۔

اور بعض نے کہا: ارواح مخلوق و محدث ہیں، لیکن ہر جسد کے لیے علیحدہ روح کی حاجت نہیں، روح ایک جسم سے نکلتی ہے اور دوسرے جسم میں داخل ہو جاتی ہے اور قیامت کے دن روحیں بغیر جسد کے اٹھائی جائیں گی اور ثواب و عقاب روح کو بغیر جسد کے ہوگا۔

اور بعض نے کہا کہ جسد روح کے لیے اسی طرح ہے، جیسے بدن کے لیے کپڑا اور لباس ہوتا ہے، اس لیے کہ روح ایک جسم سے نکلتی ہے اور دوسرے جسم میں داخل ہوتی ہے تو اس کے دردمند ہونے سے اس کو درد و الم سے دوچار ہونا پڑتا ہے اور اس کے متلذذ ہونے سے اس کو بھی لذت حاصل ہوتی ہے اور اس کے احساس کرنے سے یہ بھی احساس کرتی ہے اور یہ لوگ بھی قیامت کے منکر ہیں اور انہوں نے یہ بھی کہا کہ خصومات (جھگڑے) کے فیصلے اور قرض کی ادائی سب کے سب دنیا میں ہوتے ہیں، اس کا بیان یہ ہے کہ جو شخص مر گیا اور دوسرے شخص کے ذمہ اس کے لیے مال ہے، پھر اس کی روح دوسرے شخص میں داخل ہوگی اور اس بدن میں واقع ہوگی، اگرچہ بہیمہ حیوان ہے یا انکار کرے اس کے پاس جب کہ درندہ ہو یا آدمی کسی وجہ سے بھی ہو، بہرحال یہ اپنا قرض اس سے لے گا اور وصول کر کے چھوڑے گا، خواہ ظلم سے لے خواہ ہدیہ یا ہبہ سے یا چوری وغیرہ کر کے، اس سے لے گا ضرور اور اگر اس کی روح حیوان میں داخل ہوئی مثلاً گائے، بیل، اونٹ، گھوڑے وغیرہ میں تو اگر اس نے کوئی حق لینا ہے تو وہ بغیر خدمت کے مر جائے گا۔

پھر ان کے ساتھ مناظرہ کرنے میں اس بات کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ صانع کی معرفت اور اس کا ثابت، صفات باری تعالیٰ کا اثبات اور یہ کہ صانع صفات محدثات سے منزہ ہے، پس اس لیے جائز نہیں کہ وہ متحیز یا متبعض ہو، اس کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں۔

اس کے بعد اثبات وحی اور صاحب وحی کے سچا ہونے کے متعلق گفتگو اور کلام کرنا چاہیے، تو اس نے ان کے کلام کے خلاف خبر دی ہے اور صاحب وحی کی خبر صدق (سچی) ہے اور حجت ہے اور نص ناطق ہے اور ان کے کلام کے خلاف ثبوت اللہ تعالیٰ کا یہ قول مبارک ہے کہ:

لَتُبعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ (التغابن ۷)

”تم ضرور اٹھائے جاؤ گے پھر تمہارے (اعمال) تمہیں جتا دیئے جائیں گے۔“

اور اللہ تعالیٰ کا یہ قول کہ:

الْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُونِ بِمَا كُنْتُمْ تَقُولُونَ (الانعام ۹۳)

آج تمہیں خواری کا عذاب دیا جائے گا بدلہ اس کا کہ (اللہ پر جھوٹ) لگاتے تھے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

الْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلَى أَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَا أَيْدِيهِمْ وَتَشْهَدُ أَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ (یس ۶۵)

آج ہم ان کے مونہوں پر مُہر کر دیں گے اور ان کے ہاتھ ہم سے بات کریں گے اور ان کے پاؤں ان کے کیے کی گواہی دیں گے۔

اور اس لیے کہ اجساد روح کے ساتھ گناہ کرنے میں شریک ہیں تو جزا میں بھی یقیناً شریک ہوں گے۔

اور دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے کہ:

يَوْمَ تَأْتِي كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَفْسِهَا (النحل ۱۱۱)

”جس دن ہر جان اپنی ہی طرف جھگڑتی آئے گی۔“

یعنی نفس روح کے ساتھ مجادلہ (جھگڑا) کرے گا بایں طور کہ نفس کہے گا: تو نے گناہ کیا ہے اور روح کہے گی کہ تو نے گناہ کیا ہے اور اللہ تعالیٰ کا یہ قول کہ

ثُمَّ إِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عِنْدَ رَبِّكُمْ تَخْتَصِمُونَ (الزمر ۳۱)

”پھر تم قیامت کے دن اپنے رب کے پاس جھگڑو گے۔“

اس کی تفسیر میں ذکر کیا گیا ہے کہ روح جسم سے اور جسم روح سے یعنی روح اور جسم آپس میں جھگڑا کریں گے اور حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے روح کو نور، نار اور ریح سے پیدا کیا ہے، یعنی آدمیوں کی روح کو نور سے پیدا کیا ہے اور اور شیاطین کی روحوں کو آگ سے اور پرندوں کی روحوں کو ہوا سے پیدا کیا ہے۔

پھر ہم کہتے ہیں کہ ہر جسم میں جدا روح ہے اس لیے کہ ارواح جسموں کے ساتھ قیامت کے دن محشور میں ہوں گی اور حساب لینے کے بعد بدلہ دیا جائے گا۔

اور اگر ہر جسم کے لیے علیحدہ روح نہ ہو تو اس صورت میں حقیقت یہ ہے کہ نہ تو حشر ہو سکے گا اور نہ ہی ہر جسم اور روح کو علیحدہ علیحدہ حساب اور انہیں جزاء وسزا دی جا سکے گی۔

اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ:

كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ (المدثر ۳۸)

”ہر جان اپنی کرنی میں گروی ہے۔“

پھر اس پر دلیل ہے کہ قیامت کے دن تمام اجساد حاضر ہوں گے اور ہر جسم گواہی دے گا، روح، اعضاء اور نفس پر جو کچھ انھوں نے عمل کیا۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَقَالُوا لِجُلُودِهِمْ لِمَ شَهِدْتُمْ عَلَيْنَا قَالُوا أَنْطَقَنَا اللَّهُ الَّذِي أَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ (فصلت ۲۱)

”اور وہ اپنی کھالوں سے کہیں گے تم نے ہم پر کیوں گواہی دی وہ کہیں گی ہمیں اللہ نے بلوایا جس نے ہر چیز کو گویائی بخشی۔“

اور اگر بعض اجساد حاضر ہوں اور بعض حاضر نہ ہوں تو جزا وسزا بعض کو ہو گی اور بعض کو نہیں تو یہ عدل نہ ہو گا اور ہم نے دلائل منصوصہ سے ثابت کر دیا کہ جسم جلد اور تمام اعضاء سمیت حاضر ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

الْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلَى أَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَا أَيْدِيهِمْ وَتَشْهَدُ أَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ (یٰس ۶۵)

”آج ہم ان کے مونہوں پر مُہر کر دیں گے اور ان کے ہاتھ ہم سے بات کریں گے اور ان کے پاؤں ان کے کیے کی گواہی دیں گے“۔

پھر اس پر دلیل کہ روح مخلوق ہے، یہ ہے کہ:

وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي (الاسراء ۸۵)

"تم فرماؤ روح میرے رب کے حکم سے ایک چیز ہے"۔

یعنی تم فرماؤ کہ روح مخلوق ہے اور جسم میں داخل ہوتی ہے میرے رب کے حکم سے۔ پھر یہ بھی ہے کہ روح مامور ہے اور مامور مخلوق ہوتا ہے۔

اس پر دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَقَدَّرَ فِيهَا أَقْوَاتَهَا فِي أَرْبَعَةِ (فصلت ۱۰)

"اور اس میں اس کے بسنے والوں کی روزیاں مقرر کیں یہ سب ملا کر چار دن میں۔" حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ رزقوں کا اندازہ فرمایا، ان کے جسموں کے پیدا کرنے سے چار دن پہلے اور ہر دن ایک ہزار برس کے برابر ہے، تو یہ روح کے مخلوق ہونے کی دلیل ہے۔

روح کے مخلوق ہونے پر عقلی دلیل

اور روح کے مخلوق ہونے پر عقلی دلیل یہ ہے کہ وہ جسم میں داخل ہوتی ہے اور جسم سے نکلتی ہے تو یہ تحویل اور انتقال ہے اور تحویل اور انتقال حدث ہے اور جو حدث کو قبول کرے وہ محدث اور مخلوق ہے۔

(۷)باب نمبر سات: کافروں، منافقین اور بدمذہبوں پر سختی کرنا خلق عظیم میں داخل ہے

قرآن حکیم میں ارشاد ربانی ہے:

وَإِنَّکَ لَعَلَی خُلُقٍ عَظِیمٍ (القلم ۴)

ترجمہ: اور بیشک تمہاری خوبو بڑی شان کی ہے۔

اللہ تعالیٰ اس خلق عظیم والے حبیب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کو فرمارہاہے:

وَاغْلُظْ عَلَیْهِمْ (التوبۃ ۷۳)

(اے محبوب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم) کافروں اور منافقوں پر سختی کرو۔

معلوم شد کہ غلظت بایشاں داخل خلق عظیم است۔ (مکتوبات مجددیہ)

یعنی معلوم ہوا کہ کافروں، منافقوں پر سختی کرنا بھی خلق عظیم میں داخل ہے، اور رحمت للعالمین کی رحمت کا ہی حصہ ہے۔ کیونکہ کافروں اور منافقوں پر سختی کرنے سے وہ اپنا نامۂ اعمال مزید گندا کرنے سے بچ جائیں گے۔

اس لئے جب اللہ تعالیٰ نے حکم نازل فرمایا:

یَاأَیُّهَا النَّبِیُّ جَاهِدِ الْکُفَّارَ وَالْمُنَافِقِینَ وَاغْلُظْ عَلَیْهِمْ (التوبۃ ۷۳)

ترجمہ: اے غیب کی خبریں دینے والے (نبی) جہاد فرماؤ کافروں اور منافقوں پر اور ان پر سختی کرو۔

تو رسول اکرم، رحمتِ دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم نے جمعہ مبارک کے دن مسجدِ نبوی سے منافقوں کا نام لے لے کر باہر نکالا۔ فرمایا اے فلاں تو منافق ہے اٹھ مسجد سے نکل جا، اے فلاں تو بھی منافق ہے اُٹھ مسجد سے نکل جا۔

(۱)

چنانچہ سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا:

قام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یوم جمعة خطیبا فقال قم فلان فإخرج فإنک منافق أخرج یا فلان فإنک منافق فأخرجهم بأسمائهم ففضحهم ولم یک عمر بن الخطاب شهد تلک الجمعة لحاجة کانت له فلقیهم وهم یخرجون من المسجد فإختبأ منهم إستحیاء أنه لم یشهد الجمعة وظن أن الناس قد إنصرفوا وإختبأوا هم منه وظنوا أنه قد علم بأمرهم فدخل المسجد فإذا الناس لم ینصرفوا فقال له رجل: أبشر یا عمر فقد فضح اللہ تعالی المنافقین الیوم۔

یعنی رسول اکرم رحمت دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم جمعہ کے دن جب خطبہ کے لئے کھڑے ہوئے تو فرمایا اے فلاں تو منافق ہے، لہٰذا میری مسجد سے نکل جا، اے فلاں تو بھی منافق ہے نکل جا مسجد سے چنانچہ بہت سارے منافقوں کے نام لے لے کر مسجد شریف سے نکالا اور ان کو سب کے سامنے رسوا کیا۔

اتفاق سے اس جمعہ کو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کسی وجہ سے دیر سے آئے تو دیکھا کہ کچھ لوگ مسجد سے نکل کر جا رہے تھے ان کو دیکھ کر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ یہ سمجھے کہ شاید جمعہ ہو گیا ہے اور وہ شرم کے مارے چھپ رہے تھے اور منافق لوگ اپنی رسوائی کی وجہ سے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے چھپ رہے تھے۔

پھر جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ مسجد میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ ابھی جمعہ نہیں ہوا۔ اچانک ایک صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا اے عمر خوشخبری ہو کہ آج اللہ تعالیٰ نے منافقوں کو رسوا کر دیا ہے۔[1]

(۲)

سیرت ابن ہشام میں عنوان ہی یوں قائم کیا گیا ہے:

طَرْدُ الْمُنَافِقِینَ مِنْ مَسْجِدِ الرَّسُولِ صَلّی اللّٰہ عَلَیْہِ وَسَلّمَ۔

یعنی منافقوں کو مسجد نبوی سے دھتکار دینا۔

اور پھر یہ بیان فرمایا:

فَأَمَرَ بِھِمْ رَسُولُ اللّٰہِ صَلّی اللّٰہ عَلَیْہِ وَسَلّمَ فَأُخْرِجُوا مِنْ الْمَسْجِدِ إخْرَاجًا عَنِیفًا۔

یعنی منافقوں کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم نے مسجد سے نکل جانے کا حکم دیا تو ان کو سختی کے ساتھ مسجد سے نکال دیا گیا۔[2]

(۳)

جب رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم نے منافقوں کو مسجد شریف سے نکل جانے کا حکم دیا تو سیدنا ابو ایوب اور سیدنا خالد بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہما اُٹھ کھڑے ہوئے اور عمر بن قیس کو ٹانگ سے پکڑ کر گھسیٹتے گھسیٹتے مسجد سے باہر پھینک دیا۔ (سیرت ابن ہشام)

(۴)

حضرت ابو ایوب صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رافع بن ودیعہ منافق کو پکڑا اس کے گلے میں چادر ڈال کر زور سے کھینچا اور اس کے منہ پر طمانچہ مارا پھر اس کو مسجد سے نکال دیا اور ساتھ ساتھ وہ صحابی فرماتے جاتے: **اف لک منافقًا خبیثًا۔** ارے خبیث منافق تجھ پر افسوس ہے۔ (سیرت ابن ہشام)

---

[1] (روح المعانی، ج ۱۱، ص ۱۱، تفسیر ابن کثیر، ج ۲، س ۳۸۴، تفسیر روح البیان، ج ۳، ص ۴۹۳، تفسیر خازن، ج ۳، ص ۱۱۵، تفسیر مظھری، ج ۴، ص ۲۸۹، تفسیر بغوی علی الخازن، ج ۳، ص ۱۱۵)

[2] (سیرت ابن ھشام، ص ۵۲۸)

(۵)

زید بن عمرو منافق کی لمبی داڑھی تھی تو سیدنا عمارہ بن حزم صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کی داڑھی کو پکڑ کر زور سے کھینچا اور کھینچتے کھینچتے مسجد شریف سے باہر نکال کر اس کے سینے پر دونوں ہاتھوں سے تھپڑ مارا وہ گر گیا پھر وہ منافق بولا اے عمارہ تو نے مجھے بہت عذاب دیا ہے۔

(۶)

ایک نوجوان منافق قیس بن عمرو اس کو حضرت ابو محمد نجاری بدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پکڑا اور اس کی گدی پر مارنا شروع کر دیا حتیٰ کہ اسے مسجد نبوی شریف سے باہر نکال دیا۔ (سیرت ابن ہشام)

(۷)

سیدنا عبد اللہ بن حارث صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جب یہ فرمان عالی شان سنا کہ اے منافقو! مسجد سے نکل جاؤ تو آپ نے حارث بن عمرو کو پکڑا اس کے سر پر بالوں کا گھپا تھا اسے سر کے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹنا شروع کر دیا۔ حتیٰ کہ اسے مسجد شریف سے باہر پھینک دیا تو وہ منافق کہہ رہا تھا اے عبد اللہ تو نے مجھ پر بہت سختی کی ہے، تو صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا اے منافق! تو اسی لائق ہے۔ اے اللہ کے دشمن! آئندہ مسجد شریف کے قریب نہیں آنا کیونکہ تو پلید ہے۔ (سیرت ابن ہشام)

(۸)

سیدنا عمرو بن عوف اور ان کا بھائی زوی بن حارث جو کہ منافق تھا، یہ دونوں مسجد میں بیٹھے تھے تو جب فرمان جاری ہوا کہ اے منافقو! مسجد سے نکل جاؤ تو حضرت عمرو بن عوف نے بھائی سے فرمایا اے منافق! تجھ پر افسوس ہے تجھ پر شیطان کا غلبہ ہے۔

پھر اسے گھسیٹ کر سختی کے ساتھ مسجد شریف سے باہر نکال دیا۔ (سیرت ابن ہشام)

یہ تھا نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم اور ان کے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم ہدایت کے ستاروں کا کردار، مگر آج کل کا پیدائشی مفتی مسلمان یہی رٹ لگائے جا رہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم نے کسی سے نفرت کا حکم نہیں دیا، گویا انسان اللہ تعالیٰ اور اس کے حبیب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم پر۔۔۔۔۔۔۔ لگا رہا ہے۔

لا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم

نیز سیدنا امام ربانی مجدد الف ثانی قدس سرہٗ نے مزید فرمایا:

دوستی والفت با دشمنان خدا منجر بدشمنی خدائے عزوجل ودشمنی پیغمبر او علیہ الصلوٰۃ والسلام مے شود۔

یعنی خدا تعالیٰ کے دشمنوں کے ساتھ دوستی اور محبت کرنا اللہ تعالیٰ اور اس کے حبیب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کے ساتھ دشمنی کی طرف لے جاتی ہے۔[1]

لہٰذا اے مسلمان بھائیو! غور کرو ولی، غوث، قطب بلکہ خود اللہ تعالیٰ کے حبیب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم فرمائیں بچو، بچو، بچو۔ لیکن آج کا مسلمان کہے نہیں جی کسی سے نفرت نہیں کرنی چاہیئے۔

ببیں تفاوت راہ است از کجا تا بکجا

حسبنا اللہ و نعم الوکیل

(۲)

اور اس کی تائید دوسری حدیث پاک سے ہو رہی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم نے سیدنا ابو امامہ باہلی کو ارشاد فرمایا:

لاتجالس قدریًا ولا مرجیًا ولا خارجیًا انهم یکفون الدین کمایکفأ الاناء ویغلون کماغلت الیهود والنصاری۔

یعنی اے ابو امامہ! کسی قدری، کسی مرجئی، کسی خارجی (یہ تین گمراہ فرقوں کے نام ہیں) کے پاس مت بیٹھو، کیونکہ یہ لوگ دین کو یوں الٹ دیتے ہیں جیسا کہ برتن الٹ دیا جاتا ہے۔ اور یہ لوگ یہود و نصاریٰ کی طرح دین میں غلول کرتے ہیں۔[2]

خاص کر خارجی لوگوں نے دین میں ایسا غلو کیا ہے کہ کافروں اور بتوں والی آیات مبارکہ پڑھ پڑھ کر اللہ تعالیٰ کے نبیوں، ولیوں کو بالکل نکمے، ناکارہ ثابت کیا ہے۔ پڑھ کر دیکھو "تعارف تقویۃ الایمان"۔

(۱) اسی لئے سیدنا عبد اللہ بن عمر صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہما خارجیوں کو ساری مخلوق سے بدتر قرار دیتے تھے۔

جیسے کہ بخاری شریف میں ہے:

وَكَانَ ابْنُ عُمَرَ يَرَاهُمْ شِرَارَ خَلْقِ اللهِ وَقَالَ إِنَّهُمْ انْطَلَقُوا إِلَى آيَاتٍ نَزَلَتْ فِي الْكُفَّارِ فَجَعَلُوهَا عَلَى الْمُؤْمِنِينَ۔

---

[1] (مکتوبات مجددیہ، ص ۱۶۳)

[2] (فتاویٰ الحرمین، احباب کے نام کھلا خط، ص ۱۶)

یعنی حضرت عبد اللہ بن عمر صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہما خارجیوں کو ساری خدائی سے بد تر جانتے تھے اور فرماتے یہ اس لئے ہے کہ یہ خارجی لوگ وہ آیتیں جو کہ کافروں کے بارے میں نازل ہوئی ہیں ان آیات مبارکہ کو ایمان والوں (یعنی نبیوں اور ولیوں) پر چسپاں کرتے ہیں۔[1]

نیز یہ ارشاد گرامی کسی وعظ کی کتاب سے نہیں لیا گیا بلکہ یہ اس کتاب میں ہے جس کا درجہ قرآن پاک کے بعد ہے یعنی صحیح بخاری۔ اللہ تعالیٰ مان لینے کی توفیق عطا کرے۔

نیز اس ارشاد مبارکہ سے ثابت ہوا کہ جو شخص یہ کہے کہ نبی ولی کچھ نہیں کر سکتے وہ اہل سنت و جماعت میں سے ہر گز ہر گز نہیں ہو سکتا، بلکہ ایسا شخص پکا خارجی ہے۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو ہدایت عطا فرمائے، تاکہ وہ اپنے بیگانے کو پہچانیں۔

نیز رحمت کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کا یہ فرمانا کہ مرجی، قدری، خارجی دین میں یوں غلو کرتے ہیں جیسے کہ یہود و نصاریٰ نے غلو کیا ہے۔ بے شک خارجیوں کا دین میں غلو ایسا ہی ہے جیسے کہ یہودیوں کا غلو ہے۔

قرآن مجید میں ہے:

وَ قَالَتِ الْیَهُوْدُ یَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ (المائدة ۶۴)

یعنی یہودی کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے پاس سب کچھ ہے لیکن وہ دیتا کسی کو کچھ نہیں۔ یوں ہی خارجی کہتے ہیں اللہ تعالیٰ کے پاس علم غیب بھی ہے، اختیار بھی۔ لیکن وہ نہ تو کسی نبی، ولی کو غیب کا علم دیتا ہے اور نہ اختیار دیتا ہے **(العیاذ باللہ)** صدق رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم۔

(۳)

حضرت نافع فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عمر صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے پاس ایک آدمی حاضر ہوا اور عرض کیا حضور آپ کو فلاں آدمی نے سلام بھیجا ہے۔ یہ سُن کر فرمایا مجھ تک یہ بات پہنچی ہے کہ اس نے دین میں ایک نیا ہی مذہب ایجاد کیا ہے، اگر واقعی ایسا ہے تو اسے میرا سلام مت کہو۔

(۴)

ایک صاحب جن کا نام ایوب تھا وہ فرماتے ہیں میں طلق بن حبیب (بے ادب) کے پاس بیٹھا تھا تو مجھے حضرت محمد بن سیرین نے دیکھ لیا تو فرمایا:

لم اراک جلست الی طلق بن حبیب لا تجالسه۔ (فتاوی الحرمین)

---

[1] (صحیح بخاری، باب قتل الخوارج، ج ۲، ص ۲۵۰، المکتبة الفاروقية)

یعنی اے ایوب تو طلق بن حبیب کے پاس کیوں بیٹھا تھا، آئندہ اس کے پاس مت بیٹھو۔

(۵)

اسامہ بن عبید فرماتے ہیں کہ حضرت ابن سیرین رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی خدمت میں دو بد عقیدہ مولوی حاضر ہوئے اور عرض کیا حضور ہم احادیث مبارکہ بیان کریں، تو فرمایا اجازت نہیں۔ پھر انہوں نے عرض کیا حضور ہم قرآن پاک کی آیات مبارکہ بیان کریں تو فرمایا نہیں۔ نیز فرمایا تم اٹھ جاؤ یا میں اٹھ جاتا ہوں۔ یہ سن کر وہ دونوں اٹھ کر چلے گئے۔

ان کے جانے کے بعد کچھ احباب نے عرض کیا:

یا ابا بکر و ما کان علیک ان یقرأ علیک آیۃ من کتاب اللہ قال انی خشیت ان یقرأ علیک آیۃ من کتاب اللہ قال انی خشیت ان یقرأ علی آیۃ فیحر فانها فیقر ذلک في قلبي۔ (فتاویٰ حرمین)

یعنی احباب نے عرض کیا حضور اگر وہ مولوی صاحبان قرآن پاک کی کوئی آیت مبارکہ سنا دیتے تو کیا حرج تھا، یہ سن کر فرمایا مجھے ڈر تھا کہ وہ اپنے نظریئے کے مطابق ہیر اپھیری کر کے آیت پاک بیان کرتے تو وہ کہیں میرے دل پر نہ بیٹھ جاتا۔

یہ واقعہ بیان کر کے بعض بزرگوں نے فرمایا مسلمانو! ہوش کرو کہ حضرت محمد بن سیرین ولیوں کے ولی امام المعبرین وہ تو اتنی احتیاط کریں کہ کسی بد عقیدہ سے قرآن پاک کی ایک آیت مبارکہ ایک حدیث پاک سننا گوارہ نہ کریں اور تم کہتے ہو کہ ہر کسی کی سننی چاہیئے اس سے بچو، بچو۔

(۶)

سلام بن مطیع فرماتے ہیں:

ان رجلا من اهل الاهواء قال لایوب یا ابابکر اسالک عن کلمة قال فولی وهو یشیر باصبعه و لا نصف کلمة اشار لنا سعید ینصره الیمنی۔ (فتاویٰ الحرمین)

یعنی ایک بد عقیدہ آدمی نے حضرت ایوب کی خدمت میں عرض کیا اے ابو بکر میں آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں تو حضرت ایوب پشت پھیر کر چل دیئے، اور چھنگلی سے اشارہ کر کے فرمایا میں آدھی بات بھی نہیں سنتا۔

اللہ تعالیٰ ایسے اکابر کو ہماری طرف سے جزائے خیر عطا کرے جنہوں نے اپنے کردار اور اپنے اقوال مبارکہ سے صلح کلیت کے سامنے بند باندھ دیا ہے۔

(۷)

سیدنا عبد اللہ بن مبارک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے وصال کے بعد کسی نے عالم رؤیا میں آپ سے ملاقات کی اور عرض کیا حضور کیا حال ہے، تو فرمایا:

عاتبني و أوقفني ثلاث سنة بسبب اني نظرت باللطف يوما الى مبتدع فقال انک لم تعاد عدوی۔

یعنی فرمایا مجھے میرے رب نے عتاب کیا (ڈانٹ دی) اور مجھے تین سال کھڑا رہنے کا حکم دیا اور یہ اس لئے کہ میں نے ایک دن ایک بد عقیدہ کی طرف شفقت سے دیکھا تھا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے عبد اللہ تو نے میرے دشمن کے ساتھ دشمنی کیوں نہ کی (کیوں شفقت سے دیکھا تھا)۔[1]

یہ واقعہ لکھ کر صاحب روح البیان فرماتے ہیں یہ تو صرف شفقت سے دیکھنے کا وبال ہے تو جو لوگ ان کے ساتھ بیٹھتے اٹھتے ہیں ان کا کیا حال ہو گا؟ **(الامان الحفیظ)**

اے میرے عزیز بھائیو! بچو، بچو، بچو بعد میں پچھتانے اور کف دست ملنے سے کچھ حاصل نہ ہو گا۔

ان اريد الا الاصلاح ماستطعت

(۸)

سیدنا عبد اللہ بن عمر صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہما راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم نے فرمایا:

وان مرضوا فلاتعودوهم وان ماتوا فلاتشهدواهم۔ (رواه ابو داؤد، فتاوی الحرمین)

یعنی اگر (بے ادب) بیمار ہو جائے تو ان کی بیمار پرسی مت کرو، اگر وہ مر جائیں تو ان کے جنازہ میں مت شریک ہو۔

آج کل کا جاہل مسلمان فورًا کہہ دیتا ہے کہ ہر کسی کا جنازہ پڑھ لینا چاہیئے تو کیا (معاذ اللہ خاک بد ہن گستاخ) اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں غلط فرمایا ہے:

وَلَا تُصَلِّ عَلَى أَحَدٍ مِنْهُمْ مَاتَ أَبَدًا وَلَا تَقُمْ عَلَى قَبْرِهِ (التوبة ۸۴)

یعنی اگر کوئی بھی منافق مر جائے تو اے حبیب آپ اس کا جنازہ نہ پڑھیں اور نہ کبھی اس کی قبر پر کھڑے ہوں۔

[1] (تفسیر روح البیان، ج۷، ص ۴۵۴)

(۸) باب نمبر آٹھ: حضرت سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی افضلیت کا بیان

بعض علماء حضرت سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی باقی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر فضیلت سے انکار کرتے ہیں حالانکہ حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ مبارک فرماتے ہیں:

لا اجد احدًا فضلنی علیٰ ابی بکرٍ و عمر الا جلدته حدّ المفتری۔

یعنی میں جسے پاؤں گا کہ مجھے ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما سے افضل کہتا ہے، اسے الزام تراشی کی سزا کے طور پر اسّی کوڑے ماروں گا۔[1]

عن علیٍّ رضی اللہ عنه قال خیر النّاس بعد رسول اللہ ﷺ ابو بکرٍ و خیر النّاس بعد ابی بکرٍ عمر۔

یعنی حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد تمام لوگوں سے افضل ابو بکر رضی اللہ عنہ ہیں اور ابو بکر رضی اللہ عنہ کے بعد سب سے افضل عمر رضی اللہ عنہ ہیں۔[2]

سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ تمام صحابہ مہاجرین و انصار رضی اللہ عنہم کا اس بات پر اجماع ہے کہ نبی کریم ﷺ کے بعد اس امت میں سب سے افضل ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں۔[3]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بھی فرماتے ہیں:

کنّا معاشر اصحاب رسول اللہ ﷺ و نحن متوافرون نقول افضل هٰذه الامّة بعد نبیّنا ابو بکر ثم عمر ثم عثمان رواه ابن عساکر۔

یعنی ہم صحابہ رسول کا گروہ اور ہم وافر تعداد میں ہوتے تھے، کہا کرتے تھے کہ اس امت میں ہمارے نبی ﷺ کے بعد سب سے افضل ابو بکر رضی اللہ عنہ ہیں پھر عمر رضی اللہ عنہ پھر عثمان رضی اللہ عنہ۔[4]

نبی کریم ﷺ کی موجودگی میں اجماع کی ضرورت نہیں ہوتی تھی لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ صحابہ کرام علیہم الرضوان کا کسی مسئلہ پر متفق ہونا منع تھا۔ یہی وجہ ہے کہ علماء اہل سنت نے اس حدیث میں مذکور اجماع کو تسلیم کیا ہے۔

چنانچہ حضرت علامہ عبد العزیز پرہاروی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

قوله ﷺ کنّا نخیر تصریح علی الاجماع۔

---

[1] (دار القطنی، صواعق محرقہ ص ۶۰)

[2] (ابن ماجہ حدیث رقم ۱۰۶، مسند احمد حدیث رقم ۸۳۶)

[3] (بخاری حدیث رقم ۳۶۹۷، ابو دائود حدیث رقم ۴۶۲۷)

[4] (مرام الکلام ص ۴۶ از علامہ پرہاروی علیہ الرحمہ)

یعنی اس حدیث کے الفاظ کنا نخیر میں اجماع پر تصریح موجود ہے۔[1]

امام اہل سنت علیہ الرحمۃ نے الفصل الاول فی الاجماع کا عنوان قائم کر کے سب سے پہلے اسی حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہما کو نقل فرمایا ہے۔[2]

حضرت ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے نقل کرتے ہیں:

وعنہ قال اجتمع المھاجرون والانصار علیٰ ان خیر ھذہ الامّۃ بعد نبیھا ابو بکر و عمر و عثمان۔

یعنی تمام مہاجرین اور انصار کا اس پر اجماع ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد اس امت میں سب سے بہتر ابو بکر ہیں اور عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم۔[3]

امام اعظم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

افضل الناس بعد رسول اللہ ﷺ ابو بکر الصّدّیق رضی اللہ عنہ ثم عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ ثم عثمان بن عفّان رضی اللہ عنہ ثم علیّ بن ابی طالب رضی اللہ عنہ۔

یعنی رسول اللہ ﷺ کے بعد سب سے افضل ابو بکر ہیں پھر عمر پھر عثمان پھر علی رضی اللہ عنہ۔[4]

امام اعظم رضی اللہ عنہ نے اہل سنت کی علامت یہ بیان فرمائی ہے کہ شیخین کو افضل مانا جائے اور ختنین سے محبت کی جائے۔ گویا یہ مسئلہ امام صاحب کے نزدیک قطعی ہے اسی لئے اس کا منکر سنیت کی علامت کھو بیٹھتا ہے۔

حضرت مخدوم محمد ہاشم ٹھٹھوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

فی کلامہٖ دلالۃ علیٰ انّ من فضل علیّا علی الشّیخین فھو خارج من اھل السنّۃ و الجماعۃ۔

یعنی امام صاحب کے کلام میں اس بات پر دلالت موجود ہے کہ جس نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو شیخین سے افضل کہا وہ اہل سنت سے خارج ہے۔[5]

تمام علماء و صوفیاء اہلسنت کا اجماع:

امام شرف الدین نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

اتّفق اھل السّنّۃ انّ افضلھم ابو بکر ثم عمر۔

---

[1] (مراحم الکلام ص ۴۶)
[2] (مطلع القمرین قلمی ص ۶۷)
[3] (مرقاۃ جلد ۱۱ ص ۳۳۴)
[4] (فقہ اکبر مع شرح ص ۶۱، ۶۲)
[5] (الطریقۃ الاحمدیہ فی حقیقۃ القطع بالافضلیہ ص ۶)

یعنی اس پر اہل سنت کا اتفاق ہے کہ صحابہ میں سب سے افضل ابو بکر ہیں پھر عمر رضی اللہ عنہ۔[1]

حضرت علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

اجمع اھل السنۃ ان افضل الناس بعد رسول اللہ ﷺ ابو بکر ثم عمر ثم عثمان ثم علیؓ ثم سائر العشرۃ ثم باقی اھل البدر ثم باقی اھل احد ثم باقی اھل البیعۃ ثم باقی الصحابۃ، ھٰکذا حکی الاجماع علیہ ابو منصور البغدادی۔

یعنی اہل سنت کا اس پر اجماع ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد تمام لوگوں میں افضل ابو بکر رضی اللہ عنہ ہیں، پھر عمر رضی اللہ عنہ، پھر عثمان رضی اللہ عنہ پھر علی رضی اللہ عنہ، پھر باقی عشرہ مبشرہ پھر باقی اہل البدر، پھر باقی اہل احد پھر باقی اہل بیعتِ، پھر باقی صحابہ رضی اللہ عنہم۔ ابو منصور بغدادی نے بھی اسی ترتیب پر اجماع نقل کیا ہے۔[2]

حضرت ملا علی قاری علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں:

ھو افضل الاولیآء من الاوّلین والاخرین وقد حکی الاجماع علیٰ ذٰلک ولا عبرۃ بمخالفۃ الروافض ھنالک۔

یعنی صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ اگلے پچھلے تمام اولیاء سے افضل ہیں، اس پر اجماع ہے اور اس کی مخالفت کرنے والے رافضی ہیں۔ ان کی مخالفت کا یہاں کوئی اعتبار نہیں۔[3]

امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کو افضل نہ ماننے والا رافضی ہے اور اس کا عقیدہ خبیث ہے۔[4]

امام ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

وفی الروافض انّ من فضل علیّاً علیٰ الثلاثۃ فمبتدع۔

یعنی روافض کے بارے میں یہ حکم ہے کہ جس نے سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو تین خلفاء پر فضیلت دی تو وہ بدعتی ہے۔[5]

اس عبارت میں ایسے تفضیلیوں کو رافضی کہا گیا ہے۔ تبیین الحقائق میں بھی یہی عبارت ہے:

وفی الروافض انّ من فضل علیّاً علیٰ الثلاثۃ فمبتدع۔[6]

---

[1] (شرح نووی ج ۲ ص ۲۷۲)

[2] (تاریخ الخلفاء ص ۳۷)

[3] (شرح فقہ اکبر ص ۶۱)

[4] (الحاوی للفتاویٰ ج ۱ ص ۳۱۸)

[5] (فتح القدیر ج ۱ ص ۳۶۰)

[6] (تبیین الحقائق ج ۱ ص ۱۳۵)

امام سید ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

انّ رافضی اذا کان یسبّ الشیخین ویلعنهما فهو کافر وان کان یفضل علیا علیهما فهو مبتدع۔

یعنی رافضی اگر شیخین کو گالی دیتا ہو اور ان پر لعنت بھیجتا ہو تو کافر ہے اور اگر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو شیخین پر فضیلت دیتا ہو تو بدعتی ہے۔[1]

[1](فتاویٰ شامی ج۳ ص ۳۲۱)

(۹) باب نمبر نو: حضور علیہ الصلوۃ والسلام کے والدین کریمین (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) کے ایمان کا بیان

نبی کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کے والدین کریمین، طیبین، طاہرین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا دوبارہ زندہ ہونا

نحمدہ و نصلی و نسلم علیٰ رسولہ الکریم و علیٰ آلہ و اصحابہ اجمعین

اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ سے مردوں کو زندہ کرنا کچھ بعید نہیں۔ قرآن پاک گواہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے زمانے کا مقتول دوبارہ زندہ ہوا یوں ہی سیدنا خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بلاوے پر مردہ جانور زندہ ہو گئے۔

ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَأْتِينَكَ سَعْيًا (البقرۃ ۲۶۰)

نیز اللہ تعالیٰ نے حضرت عزیر علیہ السلام کے گدھے کو دوبارہ زندہ کیا اور سیدنا عیسیٰ علیہ السلام مردوں کو زندہ کیا کرتے تھے یوں ہی اللہ تعالیٰ کے حبیب رحمت کائنات صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کے بلاوے پر اللہ تعالیٰ نے مردہ لڑکی کو زندہ کیا۔[1]

یوں ہی اللہ تعالیٰ قادر و قیوم جل جلالہٗ نے اپنے حبیب رحمۃ اللعالمین اکرم الاولین والآخرین صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کے اعزاز و اکرام کی خاطر آپ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کے والدین کریمین کو دوبارہ زندہ کیا

تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

سید العالمین صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کے والدین کریمین اعزازاً زندہ کئے گئے اور ان دونوں نے تفصیلی ایمان قبول کیا

جیسے خالق کائنات جل جلالہٗ نے اپنے حبیب رحمت کائنات صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کی وساطت سے مردوں کو زندہ کیا یوں ہی اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب مکرم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کے اعزاز و اکرام کے لئے آپ کے والدین کریمین کو دوبارہ زندہ کیا۔

ائمہ حدیث و فقہ و تفسیر نے اس مسئلہ کو بھی وضاحت کے ساتھ بیان فرما دیا ہے۔ **(فجزاھم اللہ تعالیٰ عنا احسن الجزاء)** چنانچہ علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے نو کتابیں تحریر کی ہیں جن کا نام رسائل تسعہ رکھا گیا ہے ان میں چھ کتابیں صرف جان دو عالم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کے والدین کریمین کے ناجی (ہونے) کے متعلق ہیں۔ **(فجزاہ اللہ عنا خیر الجزاء و جعل الجنۃ مثواہ)** ان میں امام سیوطی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے دلائل قاہرہ سے اور متعدد وجوہ سے ثابت کیا ہے کہ سرور کونین صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کے والدین کریمین جنتی ہیں۔

---

[1] (شفاء قاضی عیاض، ج ۱، ص ۳۰۲، دلائل النبوۃ بحوالہ حجۃ اللہ علی العالمین، ص ۴۲۲)

ایک وجہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب اکرم ﷺ کے اعزاز واکرام کے لئے آپ کے والدین کریمین کو ان کے وصال کے بعد زندہ فرمایا اور ان دونوں حضرات نے تفصیلاً اللہ تعالیٰ جل جلالہ ورسول اللہ ﷺ پر ایمان کا اقرار کیا۔

جیسے کہ حدیث پاک میں ہے:

عن عروۃ عن عائشة: أن رسول الله صلى الله عليه وسلم سأل ربه أن يحيي أبويه فأحياهما له فآمنا به، ثم أماتهما۔

حضرت عروہ بن زبیر، ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ بنت الصدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے رب کریم سے دعا کی یا اللہ میرے والدین کو زندہ کر تو رب ذوالجلال نے اپنے حبیب ﷺ کی دعا کو قبول فرمایا دونوں کو زندہ کیا، اور وہ دونوں (والدین کریمین) اپنے لخت جگر رحمۃ للعالمین ﷺ پر ایمان لائے اور پھر اپنی اپنی آرامگاہوں میں آرام فرما ہو گئے۔[1]

اس حدیث پاک کے متعلق بڑے بڑے جلیل القدر ائمہ حدیث نے فقہاء کرام اور علماء راسخین نے اپنے اپنے تاثرات بیان کیے ہیں جو کہ مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ یہ حدیث پاک ان پہلی حدیثوں کے لئے ناسخ ہے جو حدیثیں منکرین بیان کرتے ہیں کیونکہ یہ حدیث پاک بعد کی ہے اور بعد والی حدیثیں پہلی مخالف حدیثوں کے لئے ناسخ ہوا کرتی ہیں۔

اس بات کو آسان الفاظ میں یوں سمجھیے کہ پہلے رحمت کائنات ﷺ کے والدین کریمین کے متعلق کوئی بات واضح اور ثابت نہ تھی کہ ان کا کیا حال ہے کیونکہ جب ان دونوں حضرات کا وصال ہوا تھا اس وقت امت کے والی ﷺ نے ابھی اعلان نبوت نہیں کیا تھا۔ کیونکہ جب والد ماجد کا انتقال ہوا تھا تو آپ ابھی شکم مادر میں تھے اور جب والدہ ماجدہ کا وصال ہوا اس وقت آپ ﷺ کی عمر مبارک تقریباً پانچ چھ سال کی تھی اور نبوت ورسالت کا اعلان عمر شریف کے چالیس سال ہونے پر کیا اور ان کے وصال کے وقت کسی بھی نبی کی نبوت ظاہر نہ تھی تو کوئی دلیل موجود نہ تھی کہ سرور کونین ﷺ کے والدین کریمین کا کیا حال ہے اور اس وقت مختلف روایات (منفی اور مثبت) چل رہی تھیں مثلاً یہ کہ وہ زمانۂ فترت تھا اور اہل فترت کی بخشش کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ انہوں نے شرک اور بت پرستی نہ کی ہو اور یہ امر مسلم ہے کہ حبیب خدا ﷺ کے والدین کریمین اہل فترت سے تھے اور یقیناً انہوں نے کبھی بھی بت پرستی نہ کی تھی اور یہ بات ان دونوں کے جنتی ہونے کے لئے کافی تھی۔

---

[1] (شرح الزرقاني على المواهب اللدنية بالمنح المحمدية، ج ۱، ص ۳۱۶)

لیکن اللہ رب العالمین نے اپنے حبیب رحمت کائنات ﷺ کے اعزاز و اکرام کے لئے آپ کے والدین (ماں، باپ) کو دوبارہ زندہ کیا اور دونوں حضرات نے تفصیلاً اور صراحتہً ایمان قبول کیا اور کلمہ پڑھا اور پھر اپنی آرام گاہوں میں آرام فرما ہو گئے۔

یہ حدیث پاک جس میں دوبارہ زندہ ہو کر ایمان قبول کرنے کا ذکر ہے پہلی سب مخالف مفہوم کی احادیث کے لئے ناسخ ثابت ہوئی پہلی حدیثیں منسوخ ہو گئیں اور اب کسی ایمان والے کو اس بات میں شک نہ رہا کہ ہمارے آقا ﷺ کے والدین جنتی ہیں۔

والحمدللہ رب العلمین والصلاۃ والسلام علی حبیبہ سید العالمین وعلیٰ آلہٖ واصحابہ اجمعین۔

ائمہ حدیث اور علماء اعلام کے تأثرات

قال الزرقانی فی شرح المواھب بعد ذکر احیائھما وقد جعل ھؤلاء الأئمة ھذا الحدیث ناسخًا للأحادیث الواردة بمایخالفه ونصوا علی أنه متأخر عنھا فلاتعارض بینه وبینھا۔

یعنی امام عبد الباقی زرقانی نے مواہب لدنیہ کی شرح میں فرمایا کہ یہ حدیث پاک جس میں شاہ کونین ﷺ کے والدین کریمین کے وصال کے بعد زندہ ہونے اور تفصیلاً ایمان قبول کرنے کا ذکر ہے اس حدیث پاک کو ائمہ حدیث نے اس حدیث پاک سے پہلے کی مخالف مفہوم کی احادیث مبارکہ کے لئے ناسخ قرار دیا ہے۔ یعنی پہلی حدیثیں منسوخ ہو گئیں اور صراحۃً فرمایا کہ یہ حدیث پاک بعد کی ہے لہٰذا کوئی (تعارض) ٹکراؤ نہ رہا۔[1]

اللھم صلی وسلم وبارک علیٰ حبیبک سید العلمین وعلی آلہٖ واصحابہ اجمعین

علامہ حقی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا ارشاد گرامی

وفی الاشباہ والنظائر مَنْ مَاتَ عَلَى الْكُفْرِ أُبِيحَ لَعْنُهُ إلَّا وَالِدَيْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، لِثُبُوتِ أَنَّ اللَّهَ تَعَالَى أَحْيَاهُمَا لَهُ حَتَّى آمَنَا بِهِ كَذَا فِي مَنَاقِبِ الْكَرْدَرِيِّ۔

[1] (شرح الزرقاني على المواهب اللدنية بالمنح المحمدية، ج ۱، ص ۳۱۸)

یعنی کتاب الاشباہ والنظائر میں ہے کہ جس کسی کو کفر پر موت آجائے اس کو لعنت کرنا جائز ہے لیکن رسول اکرم ﷺ کے والدین کریمین پر (ہرگز) لعنت جائز نہیں ہے کیونکہ یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سرکار ﷺ کے والدین کو دوبارہ زندہ کیا اور وہ اللہ تعالیٰ جل جلالہ ورسول اللہ ﷺ پر ایمان لائے جیسے کہ مناقب کردری میں ہے۔[1]

صلی اللہ علی النبی الکریم و علیٰ الہٖ و اصحابہٖ اجمعین

علامہ ابن حجر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا ارشاد گرامی

قال الشھاب ابن حجر فی مولدہ و فی شرح الھمزیۃ ان الحدیث غیر ضعیف بل صححہٗ غیر واحد من الحفاظ۔

امام شہاب الدین ابن حجر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا: شرح ھمزیہ میں ہے کہ یہ حدیث پاک ضعیف نہیں ہے بلکہ اس حدیث پاک کو بہت سارے حفاظ حدیث نے صحیح کہا ہے۔[2]

والحمد للہ رب العالمین والصلاۃ والسلام علیٰ من اتخذہ اللہ حبیبًا فی الدنیا والاخرۃ و اعلیٰ الہٖ و اصحابہٖ اجمعین

امام تلمسانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا ارشاد گرامی

قال التلمسانی روی اسلام امہٖ ﷺ بسندٍ صحیح و کذا روی اسلام ابیہ علیہ السلام و کلاھما بعد الموت تشریفا لہٗ ﷺ۔

علامہ تلمسانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کی والدہ ماجدہ کا دوبارہ زندہ ہو کر اسلام قبول کرنا اور یونہی سرکار ﷺ کے والد ماجد کا اسلام قبول کرنا صحیح سند کے ساتھ ثابت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دونوں کو ان کے وصال کے بعد اپنے حبیب ﷺ کے اعزاز و اکرام کے لئے زندہ کیا تھا۔[3]

اللھم صل و سلم و بارک علی النبی الکریم و علیٰ آلہٖ و اصحابہٖ اجمعین۔

علامہ اسماعیل حقی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا ارشاد گرامی

سرکار دوعالم ﷺ کے والدین کریمین کا زندہ ہونا اور ایمان لانا نہ عقلاً ممتنع ہے نہ ہی شرعاً کیونکہ قرآن مجید میں بنی اسرائیل کے مقتول کا زندہ ہونا اور اپنے قاتل کی خبر دینا مذکور ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مردوں کو زندہ فرمایا کرتے تھے۔

[1] (الْأَشْبَاہُ وَالنَّظَائِرُ، ج ۱، ص ۲۸۸)

[2] (حجۃ اللہ علی العلمین، ص ۴۱۲)

[3] (زرقانی علی المواھب، ج ۱، ص ۱۶۹، حجۃ اللہ علی العلمین، ص ۴۱۳)

اسی طرح ہمارے نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے دست اقدس پر اللہ تعالیٰ نے متعدد مردے زندہ فرمائے ہیں۔ پس جب یہ ثابت ہے تو نبی اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے والدین کریمین کے دوبارہ زندہ ہو کر ایمان قبول کرنے میں کون سی چیز مانع ہے۔[1]

ایک محب نبی کا قول مبارک

قال بعضهم: ایقنت ان ابا النبی و امهٔ احیاهما الرب الکریم الباری حتی لهٔ شهدا بصدق رسالة سلم فتلک کرامة المختار هذا الحدیث و من یقول بضعفهٖ فهو الضعیف عن الحقیقه عاری۔

بے شک نبی رحمت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے والد ماجد اور والدہ ماجدہ ان دونوں کو ان کے رب کریم نے زندہ کیا حتیٰ کہ دونوں نے رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے سچے ہونے کی گواہی دی۔

اے عزیز اس بات کو مان لے کہ یہ مختار نبی کی کرامت ہے (عزت افزائی کے لئے ہے) اور دوبارہ زندہ ہو کر ایمان قبول کرنا یہ حدیث سے ثابت ہے اور جو کوئی اس حدیث پاک کو ضعیف کہے وہ خود ضعیف ہے (اس کا ایمان ضعیف ہے) ایسا شخص حقیقت سے عاری ہے۔[2]

اللهم صل و سلم و بارک علی النبی المختار سید الابرار زین المرسلین الاخیار و علیٰ الهٖ و اصحابه الیٰ یوم القرار

حب الرسول علامہ نبہانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا ارشاد مبارک

ان الله احیاهما لهٔ صلی اللہ علیہ والہٖ وسلم حتی آمنا بهٖ و هذا السبیل مال الیه طائفة "کثیرة" من الائمة الحفاظ منهم الحافظ ابو بکر الخطیب البغدادی و الحافظ ابو القاسم ابن عساکر و الحافظ ابو حفص بن شاهین و الحافظ ابو قاسم السهیلی و الامام القرطبی و الحافظ محب الدین الطبری و العلامة ناصر الدین بن المنیر و الحافظ فتح الدین بن سید الناس۔

اس بات میں شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب مکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے اعزاز و اکرام کے لئے آپ کے والدین کو زندہ فرمایا اور وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم پر ایمان لائے۔ اس امر کی (زندہ ہو کر ایمان لانے کی) حدیث پاک کو بہت سارے اماموں اور حفاظ حدیث نے اپنایا ہے، مثلاً:

۱۔ حافظ الحدیث ابو بکر خطیب البغدادی

۲۔ حافظ الحدیث ابو القاسم ابن عساکر

۳۔ حافظ الحدیث ابو حفص بن شاہین

---

[1] (روح البیان ج ۱، ص ۲۱۷)

[2] (حجۃ اللہ علی العالمین، ص ۴۱۳)

۴۔ حافظ الحدیث ابو القاسم سہیلی

۵۔ امام قرطبی

۶۔ حافظ الحدیث محب الدین طبری

۷۔ علامہ ناصر الدین بن منیر

۸۔ حافظ الحدیث فتح الدین بن سید الناس[1]

اللھم صل و سلم و بارک علی النبی المختار سید الابرار و علی آلہ و اصحابہ الی یوم القرار

الحافظ السیوطی رحمۃ اللہ تعالیٰ جزاہ عن الاسلام و المسلمین خیر الجزاء فانہ الف فی ذلک جملۃ مولفات اثبت فیھا نجاتھما ببراھین کثیرۃ و اقام النکیر علی من زعم خلاف ذلک من اھل الجمود و الجحود۔

اللہ تعالیٰ حافظ الحدیث امام جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو تمام مسلمانوں کی طرف سے بہتر سے بہتر جزائے خیر عطا کرے کہ انہوں نے کئی کتابیں اس موضوع پر لکھی ہیں اور دلائل قاہرہ سے نبی کریم ﷺ کے والدین کریمین کا جنتی ہونا ثابت کیا ہے اور جن لوگوں نے اپنی ضد تعصب اور جمود کی وجہ سے اس کے خلاف باتیں کی ہیں ان کی خوب خبر لی ہے۔[2]

رحمہ اللہ رحمۃ و اسعۃ تامۃ الی یوم الدین

اہل جمود کا ایک واقعہ

و حکی أن بعض الفضلاء مکث متفکر لیلتہ فی أبویہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ و آلہ و اصحابہٖ و سلم و اختلاف العلماء فی حدیث احیائھما و ایمانھما بہ فمن مضعف و من مصحح و ھل یمکن الجمع بین الاقاویل أم لا فاستھوتہ الفکرۃ حتی مال علی السراج فأحرقہ فلما کانت صبیحۃ تلک اللیلۃ أتاہ رجل من الجند یسألہ أن یضیفہ فتوجہ الی بیتہ فمر فی اثناء الطریق علی رجل خضری قد جلس بباب خزانۃ تحت حانوت بھا موازینہ و باقی آلات البیع فقام ھذا الرجل حتی أخذ بعنان دابۃ الشیخ و قال لہ شعرا:

آمنت ان ابا النبی و امہ — احیاھما الحی القدیر الباری

حتی لقد شھدا لہٗ برسالتہٖ — صدق فتلک کرامۃ المختار

و بہ الحدیث و من یقول بضعفہ — فھو الضعیف عن الحقیقۃ عاری

ثم قال خذھا الیک أیھا الشیخ و لا تسھر و لا تتعب نفسک متفکرا حتی یحرقک السراج و لکن امض الی المحل الذی انت قاصد لتأکل منہ لقمۃ حراما فبھت الشیخ لذلک ثم طلب الرجل فلم یجدہ فاستخبر عنہ جیرانہ من

---

[1] (زرقانی علی المواھب، ج ۱، ص ۱۲۹، حجۃ اللہ علی العالمین، ص ۴۱۳)

[2] (حجۃ اللہ علی الغلمین، ص ۴۱۳)

اهل السوق فلم يعرفه منهم احد وأخبروا بأنه لا عهد لهم برجل يجلس بهذا المحل أصلا ثم ان الشيخ رجع الى منزله ولم يمض لدار الجندی لما سمعه من مقالة هذا الاستاذ۔

العلامہ السید احمد الطحطاوی الحنفی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اور سید شریف مصی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک عالم دین کو اس مسئلہ میں تردد تھا کہ رحمت کائنات صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے والدین جنتی ہیں یا نہیں (اس کا جمود ٹوٹا نہیں تھا) اسی تردد میں مطالعہ کرتے کرتے چراغ پر جھک گئے اور بدن جل گیا۔ صبح ہوئی تو ایک (فوجی) لشکری آیا اور دعوت کی درخواست کی کہ میرے ہاں آپ کی دعوت ہے۔

گھوڑے پر سوار ہو کر دعوت کھانے جارہے تھے کہ ایک سبزی فروش اپنی دکان کے سامنے ترازو اور باٹ لئے بیٹھا تھا اس نے اٹھ کر گھوڑے کی لگام پکڑ کر شعر پڑھنا شروع کر دیے جو یہ ہیں:

آمنت ان ابا النبی و امه　　　احیاهما الحی القدیر الباری

حتی لقد شهدا لهٔ برسالته　　　صدق فذک کرامة المختار

وبه الحدیث ومن یقول بضعفه　　　فهو الضعیف عن الحقیقة عاری

یعنی میرا ایمان ہے کہ نبی اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے والد ماجد اور والدہ ماجدہ ان دونوں کو اس ذات نے زندہ کیا جو کہ حیٌ وقدیر اور پیدا فرمانے والا ہے۔ حتیٰ کہ دونوں نے رسول اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی رسالت کی گواہی دی۔ اس بات کو مان لے کیونکہ یہ اس مختار نبی کے اکرام کے لیے ہے، اور دوبارہ زندہ ہو کر ایمان قبول کرنا یہ حدیث سے ثابت ہے اور جو کوئی اس حدیث پاک کو ضعیف کہے وہ خود ضعیف ہے (اس کا ایمان ضعیف ہے) ایسا شخص حقیقت سے عاری ہے۔

جب عالم دین مذکور نے یہ سنا تو خیال کیا کہ یہ حدیث تو ضعیف ہے۔ فوراً اس سبزی فروش نے شعر پڑھ دیا۔ مولانا یہ بات حدیث پاک سے ثابت ہے اور جو اس حدیث کو ضعیف کہے وہ خود ضعیف ہے (اس کا اپنا ایمان ضعیف ہے) اور حقیقت سے عاری ہے۔

یہ شعر سنا کر اس نے اس عالم دین سے کہا اے شخص ان باتوں کو مضبوط پکڑ لے اور راتوں کو نہ جاگ اور اپنے جسم کو نہ جلا اور مولانا یہ بھی سنتے جائیں کہ دعوت پر نہ جائیں کیونکہ وہ حرام پکا ہوا ہے۔

اس سبزی فروش کے اس فرمانے سے مولانا صاحب بے خود ہو کر سوچتے ہی رہ گئے پھر خیال آنے پر اس سبزی فروش کی تلاش شروع کر دی اور دکانداروں سے پوچھا کہ وہ سبزی فروش کہاں گیا دوکاندار بولے مولانا یہاں تو کبھی کوئی سبزی فروش نہیں بیٹھا۔ زاں بعد وہ عالم دین وہیں سے واپس آ گئے اور دعوت پر نہ گئے۔ [1]

---

[1] (شمول الاسلام، ص ۳۷، حاشیۃ الطحطاوی علی الدر المختار، ج ۲، ص ۱۸، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ جل جلالہٗ اس زمانے کے علماء کو بھی جمود توڑ کر اس اعجازی شان کو مان لینے کی توفیق عطا فرمائے اور رحمت کائنات ﷺ کے والدین کریمین کو معاذ اللہ۔۔۔۔ ثابت کرکے دوزخ نہ خریدیں۔

حسبنا اللہ و نعم الوکیل و لا حول و لا قوۃ الا باللہ العلی العظیم

امام سہیلی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا ارشاد مبارک

امام سہیلی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے یہ حدیث پاک لکھ کر کہ حبیب خدا ﷺ نے اپنے رب کریم سے دعا کی یا اللہ! میرے والدین کو زندہ فرما، اللہ تعالیٰ نے زندہ کر دیا اور وہ دونوں ایمان لائے پھر وصال فرمایا:

و اللہ قادر علی کل شئ و لیس تعجز رحمتہٗ و قدرتہٗ عن شئی و نبیہ علیہ الصلاۃ و السلام اھل "ان یخصہٗ بما شآء من فضلہ و ینعم علیہ بما شآءَ من کرامتہ و قد جعلہٗ ھٰؤلآءِ الائمۃ ھذا الحدیث ناسخاً للاحادیث الواردۃ بما یخالف ذلک و تصوا علیٰ انہٗ متاخر" عنھا فلا تعارض بینہٗ و بینھما۔

اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے اس کی رحمت اور اس کی قدرت کسی چیز سے عاجز نہیں اور اس کے نبی ﷺ اس بات کے اہل ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو جس فضیلت کے ساتھ چاہے خاص کر دے اور جو چاہے اپنے حبیب ﷺ پر انعام کرے اور پھر یہ کہ ائمہ حدیث نے اس حدیث پاک کو دوسری حدیثوں کے لئے ناسخ قرار دیا ہے اور اس پر نص فرمائی ہے کہ حدیث پاک بعد کی ہے (اس وجہ سے دوسری احادیث مبارکہ منسوخ ہو گئیں) لہٰذا ان کا آپس میں کوئی تعارض (ٹکراؤ) نہیں ہے۔[1]

مولای صلی و سلم دائماً ابداً — علی حبیبک خیر الخلق کلھم

امام علامہ قرطبی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا ایمان افروز قول مبارک

امام قرطبی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا کہ سید العالمین ﷺ کے فضائل مبارکہ بڑھتے ہی چلے گئے اور وصال شریف تک زیادہ سے زیادہ ہوتے گئے اور یہ سرکار ﷺ کے والدین کا زندہ ہو کر ایمان قبول کرنا یہ بھی ان فضائل میں سے ہی ہے نیز فرمایا کہ والدین کریمین کا زندہ ہونا یہ نہ تو عقلاً بعید ہے نہ شرعاً ناممکن ہے کیا قرآن پاک میں بنی اسرائیل کے قتیل کا دوبارہ زندہ ہونا اور اپنے قاتل کا پتہ بتانا ثابت نہیں اور کیا قرآن پاک سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مردوں کو زندہ کرنا ثابت نہیں اور کیا ہمارے نبی ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے مردے زندہ نہیں کیے؟ اور جب یہ ثابت ہے تو کون سی چیز مانع ہے کہ سرکار ﷺ کے والدین زندہ کیے جائیں جبکہ یہ سب کچھ سرور کونین ﷺ کے اعزاز و اکرام کے لیے ہیں۔[2]

اللھم صل و سلم و بارک علی حبیبک الذی کرمتہ و فضلتہ علی العٰلمین و علیٰ آلہ و اصحابہ اجمعین

---

[1] (زرقانی علی المواھب، ج ۱، ص ۱۶۸، حجۃ اللہ علی العالمین، ص ۴۱۴)

[2] (زرقانی علی المواھب، ج ۱، ص ۱۷۰، حجۃ اللہ علی العالمین، ص ۴۱۴)

ایک سوال

یہ ان علماء سے سوال ہے جو کہ رحمت کائنات ﷺ کے والدین کریمین کے متعلق کہہ جاتے ہیں کہ وہ مسلمان نہیں تھے بلکہ وہ۔۔۔۔۔۔تھے۔ سوال یہ ہے کہ آپ مولوی صاحبان میں سے کوئی نو مسلم ہو اس کا باپ مسلمان نہیں تھا اور اس کا لڑکا مسلمان ہو کر کسی دینی درسگاہ میں داخل ہو گیا۔ علم دین حاصل کر کے عالم دین کہلایا اس عالم دین کو کوئی کہہ دے کہ آپ کا باپ تو بے ایمان اور کافر تھا اور وہ کافر ہی مر گیا تو دل پر پتھر رکھ کر بتائیں کہ آپ کی عزت افزائی ہوئی یا بے عزتی ہوئی۔ فقیر اپنی غیرت ایمانی کی وجہ سے ایسے عالم دین سے پوچھتا ہے کہ خدارا سچ سچ بتاؤ تمہارا دل اس بات کے سننے سے کہ آپ کا باپ تو بے ایمان کافر تھا وہ تو کفر پر ہی مر گیا دل دکھا یا کہ دل خوش ہوا؟ یقیناً آپ کا دل دکھا (حالانکہ بات سچی ہے جھوٹی نہیں) تو کیا نبیوں کے نبی سید العالمین باعث ایجاد عالم ﷺ ہی رہ گئے ہیں کہ تم لوگ ان کے والدین کے متعلق جو کچھ مرضی کہو اور ان کا رب کریم تمہیں جنت بھیج دے۔ ہرگز ہرگز نہیں ہو سکتا کیونکہ ایسا کہنے سے جو تم کہتے ہو یقیناً انہیں ایذاء پہنچتا ہے، ان کا دل مبارک دکھتا ہے۔ جیسے کہ قاضی ابو بکر مالکی کا قول گزرا۔ مولوی صاحبان ہوش کرو عقل کے ناخن لو اور ضد، ہٹ دھرمی کو چھوڑ دو، تعصب کا راستہ اختیار نہ کرو ورنہ اس کڑے حکم کا انتظار کرو:

وَالَّذِینَ یُؤْذُونَ رَسُولَ اللهِ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِیمٌ (التوبۃ ۶۱)

اور وہ جو رسول اللہ کو ایذا دیتے ہیں ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

صلی اللہ علی النبی الکریم و علیٰ الہٖ و اصحابہٖ اجمعین

بزرگان دین کے سرکار ﷺ کے والدین کریمین کے متعلق اقوال مبارکہ

(۱) سیدنا عمر بن عبد العزیز قدس سرہٗ کے تاثرات

سیدنا عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے کاتب نے کہہ دیا کہ اگر میرا باپ کافر تھا تو رسول اللہ ﷺ کا باپ بھی۔۔۔۔۔۔ تھا۔ یہ سن کر فغضب غضباً شدیداً و عزلہ من الدیوان۔

سیدنا عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سخت غضبناک ہوئے اور اس کاتب کو اس کے عہدے سے معزول کر دیا۔[1]

و صلی اللہ تعالیٰ علی النبی الکریم و علیٰ آلہٖ و اصحابہٖ اجمعین

[1] (الدرج المنیفہ للسیوطی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ، ص ۲۱)

(۲) قاضی ابو بکر مالکی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا ارشاد مبارک

حضرت قاضی ابو بکر مالکی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے کسی نے پوچھا جو یہ کہے کہ رسول اللہ ﷺ کے والدین۔۔۔۔۔۔۔ تھے اس کے متعلق کیا حکم ہے؟ یہ سن کر فرمایا: ایسا شخص ملعون ہے (لعنتی) ہے کیونکہ قرآن مجید میں ہے:

إِنَّ الَّذِينَ يُؤْذُونَ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ (الاحزاب ۵۷)

نیز فرمایا کہ:

ولا اذی اعظم من ان یقال عن ابیہ انہ فی النار۔

یعنی اس سے بڑا کوئی ایذا نہیں کہ کسی کے باپ کے متعلق کہا جائے کہ وہ دوزخی ہے۔[1]

حسبنا اللہ و نعم الوکیل

(۳) حب الرسول علامہ نبہانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا ارشاد مبارک

قد الف کثیر "من العلماء مؤلفات مستقلۃ" فی نجاۃ ابویہ ﷺ۔

تحقیق سے ثابت ہوا کہ بہت سارے اور کثیر علماء کرام نے رحمت کائنات ﷺ کے والدین کریمین کے جنتی ہونے کے متعلق مستقل کتابیں لکھی ہیں۔[2] (رحمھم اللہ تعالیٰ)

حسبنا اللہ و نعم الوکیل و لا حول و لا قوۃ الا باللہ العلی العظیم

(۴) امام المتکلمین امام رازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا ایمان افروز ارشاد

امام المفسرین امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے ارشاد فرمایا:

انھما لم یکونا مشرکین بل کانا علی التوحید و ملۃ ابراھیم علیہ السلام۔

یعنی شاہ کونین ﷺ کے والدین کریمین مشرک نہیں تھے، بلکہ وہ دونوں توحید پر اور سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے دین پر تھے۔[3]

والحمد للہ رب العٰلمین والصلاۃ والسلام علیٰ حبیبہ سید المرسلین وعلیٰ آلہٖ و اصحابہٖ اجمعین

---

[1] (مسالک الحنفاء، ص ۶۷)

[2] (حجۃ اللہ علی العالمین، ص ۴۱۳)

[3] (المقاصد السنیہ، ص ۹)

امام رازی کون تھے؟

اور امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے متعلق علامہ سیوطی فرماتے ہیں:

و ناھیک بہ امامۃ و جلالۃ فانہ امام اھل السنۃ فی زمانہ۔۔۔ وھو العالم المبعوث علیٰ رأس المائۃ السادسۃ لیجدد لھذہ الامۃ امر دینھا۔

اے عزیز امام رازی کا امام ہونا اور ان کی جلالت شان کافی ہے کیونکہ امام رازی اہل سنت کے اپنے زمانہ کے امام تھے۔ نیز امام رازی چھٹی صدی کے مجدد تھے (رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ) ان کو اللہ تعالیٰ نے بھیجا تھا تاکہ دین مصطفیٰ ﷺ کی تجدید کریں۔

رحمھما اللہ رحمۃ واسعۃ دائمۃ و صلی اللہ علی خیر البریۃ و سید العٰلمین و علیٰ آلہ و اصحابہ و سلم

میرے عزیز مقام غور ہے کہ امام رازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ جیسے امام المتکلمین اور صدی کے مجدد دین وملت ایسے ایسے ایمان کے موتی بکھیریں کہ ان کی خوشبو ایمان والوں کے مشام دل کو تاقیامت معطر کرتی رہے گی تو بھی اپنے دل کو پاک وصاف کر تاکہ تجھے بھی یہ ایمانی وروحانی خوشبو معطر کرے اور عقیدے کی میل کچیل دور ہو۔

حسبنا اللہ و نعم الوکیل

(۵) علامہ سیوطی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا قول مبارک

حافظ الحدیث علامہ عبد الرحمٰن سیوطی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا:

فاقول ذھب کثیر "من الائمۃ الاعلام الیٰ انھما ناجیان و محکوم" لھا بالنجاۃ فی الآخرۃ۔

بہت بڑے مشہور ائمہ کرام نے یہ اختیار کیا ہے کہ سرور کونین ﷺ کے والدین کریمین جنتی ہیں اور ان اماموں کا یہ فیصلہ ہے کہ دونوں (ماں، باپ) آخرت میں نجات یافتہ ہیں۔[1]

صلی اللہ علی الحبیب المنیب اللبیب و علیٰ آلہ و اصحابہ اجمعین

نیز امام سیوطی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا جن لوگوں نے اس مسئلہ میں مخالفت کی ہے یہ ائمہ کرام ان لوگوں کے اقوال کو ان سے بہتر جانتے ہیں اور یہ ائمہ کرام ان مخالفین سے درجہ میں (علم میں) کم نہیں ہیں۔ نیز فرمایا یہ ائمہ کرام احادیث مبارکہ اور آثار شریفہ کو مخالفین سے زیادہ جانتے ہیں یاد رکھتے ہیں اور دلائل کو پرکھتے ہیں۔ یہ ائمہ کرام مخالفین سے سبقت رکھتے ہیں کیونکہ یہ آئمہ کرام ہر قسم کے علم کے ماہر ہیں۔ (رحمھم اللہ تعالیٰ)

[1] (الدرج المینفہ، ص ۱)

(۶) علامہ سید محمود آلوسی

صاحب تفسیر روح المعانی کا قول مبارک

صاحب تفسیر روح المعانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا آیت مبارک سے سید العلمین ﷺ کے والدین کریمین کے مؤمن ہونے پر استدلال کیا گیا ہے جیسے کہ اہل سنت کے بہت سارے جلیل القدر علماء اور ائمہ کرام کا مسلک ہے۔

نیز فرمایا:

و أبو نعيم عن ابن عباس أيضا إلا أنه رضي الله تعالى عنه فسر التقلب فيهم بالتنقل في اصلابهم حتى ولدته أمه عليه الصلاة و السلام وجوز على حمل التقلب على التنقل في الأصلاب أن يارد بالساجدين المؤمنون و استدل بالآية على إيمان أبويه صلى الله تعالى عليه وسلم كما ذهب اليه كثير من أجلة أهل السنة و أنا أخشى الكفر على من يقول فيهما رضي الله تعالى عنهما على رغم أنف على القاري ءو اضرابه بضد ذلک۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ابو نعیم نے "تقلب" کی تفسیر یہ کی ہے کہ آپ ﷺ اپنے اباؤ اجداد کی پشتوں میں منتقل ہوتے رہے، یہاں تک کہ آپ ﷺ کی والدہ نے آپ ﷺ کو جنا اور تقلب کے اس معنی سے "الساجدین" سے مراد مؤمنین لینا پڑے گی۔ اس آیت سے رسول کریم ﷺ کے والدین کے ایمان دار ہونے پر استدلال کیا گیا ہے۔ جیسا کہ یہ اہل سنت کے جلیل القدر بکثرت علماء کرام کا مذہب ہے۔ اور میں اس شخص کے کفر کا خوف رکھتا ہوں جو آپ ﷺ کے والدین کریمین کے بارے میں ملا علی قاری اور اس کے ساتھیوں کی طرح اس عقیدہ کے خلاف کا قائل ہے۔[1]

اللھم صل و سلم و بارک علی حبیبک الکریم و علی ابائہ و آلہ و اصحابہ اجمعین

المراد منه تقلبک من أصلاب الطاهرين الساجدين لله إلى أرحام الطاهرات الساجدات و من أرحام السجدات إلى أصلاب الطاهرين أى الموحدين و الموحدات حتى يدل على ان اباء النبي صلى الله عليه وسلم كلهم كانوا مؤمنين۔

اس سے مراد یہ ہے کہ آپ ﷺ پاکیزہ اور اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرنے والے مردوں کی پشت سے ان عورتوں کی رحم کی طرف منتقل ہوئے جو طاہرہ اور سجدہ کرنے والی تھیں۔ اور پھر ان طاہرات و ساجدات کے رحم سے ایسے پاکیزہ افراد کی طرف منتقل ہوئے، جو سبھی اللہ تعالیٰ کی توحید پر قائم تھے۔ یہ آیت کریمہ اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ آپ ﷺ کے تمام اباء و اجداد صاحبان ایمان و توحید تھے۔[2]

---

[1] (تفسیر روح المعانی، ج ۱۹، ص ۱۳۷، ۱۳۸)

[2] (تفسیر مظھری، ج ۷، ص ۸۹)

(۷) شیخ المحدثین شاہ عبد الحق دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا قول مبارک

حضرت شاہ عبد الحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا کہ رحمت دو عالم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کے والدین کریمین کے متعلق علماء متقدمین نے اختلاف کیا ہے۔

واما متاخرین پس تحقیق کردہ اند اسلام والدین بلکہ تمام آبا و امھات آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم را تا آدم علیہ السلام۔

یعنی علمائے متاخرین نے تحقیق سے ثابت کیا ہے کہ جان دو عالم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کے والدین کریمین مسلمان تھے بلکہ سرور دو عالم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم سے لے کر حضرت آدم علیہ السلام تک سب آبائے کرام وامہات ذیشان کا مسلمان ہونا ثابت کیا ہے۔[1]

اللھم صل و سلم بارک علیٰ حبیبک سید الاولین والآخرین و علیٰ آلہٖ و اصحابہٖ اجمعین

(۸) نیز فرمایا:

وحدیث احیائے والدین اگرچہ در حد ذات خود ضعیف است لیکن تصحیح و تحسین کردہ اند بتعدد طرق۔

یعنی سرکار صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کے والدین کریمین کے زندہ ہو کر ایمان قبول کرنے والی حدیث اگرچہ بذات خود ضعیف ہے لیکن اس کی سندیں اس قدر کثیر ہیں کہ یہ حدیث حسن بلکہ صحیح کے درجہ تک پہنچ گئی ہے۔[2]

نوٹ: اگر کسی سند حدیث میں ضعف ہو تو تعدد طرق اور تلقی بالقبول سے اس حدیث کا ضعف ختم ہو جاتا ہے اور وہ حدیث صحیح کے درجے تک پہنچ جاتی ہے جیسے کہ حدیث پاک مذکور ہے۔

و صلی اللہ علی النبی الکریم و علیٰ آلہٖ و اصحابہٖ اجمعین

(۹) نیز شیخ المحدثین رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا:

وایں علم گویا مستور بود از متقدمین پس کشف کرد آنرا حق تعالیٰ بر متاخرین **واللہ یختص برحمتہ من یشاء بما شاء من فضلہ۔**

---

[1] (اشعۃ اللمعات، ج ۱، ص ۷۱۸)

[2] (اشعۃ اللمعات، ج ۱، ص ۷۱۸)

یعنی یہ وہ علم ہے جو متقدمین پر پوشیدہ رہا لیکن اللہ تعالیٰ نے یہ متاخرین پر منکشف کر دیا ہے اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہے جس انعام کے ساتھ چاہے اپنے فضل سے خاص کر لیتا ہے۔[1]

والحمدللہ رب العٰلمین والصلاۃ والسلام علیٰ حبیبہ اکرم الاولین والآخرین وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ اجمعین

(۱۰) علامہ ابن حجر ہیتمی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا ارشاد مبارک

علامہ ابن حجر ہیتمی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ کے والدین کریمین کو اللہ تعالیٰ نے زندہ فرمایا اور وہ دونوں ایمان لائے اور پھر اپنی اپنی آرام گاہوں میں آرام فرما ہو گئے۔ یہ حدیث پاک صحیح ہے۔ اور جن محدثین کرام نے اس حدیث پاک کو صحیح فرمایا ہے ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں: امام قرطبی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ، شام کے حافظ الحدیث ابن ناصر الدین رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اور اس میں طعن کرنا بے جا ہے کیونکہ کرامات و خصوصیات کی شان ہی یہ ہے کہ وہ قواعد اور عادات سے خلاف ہوتی ہیں۔

چنانچہ رسول اکرم ﷺ کے والدین کریمین کا وصال کے بعد زندہ ہو کر ایمان لانا ان کے لئے نافع ہے دوسروں کے لئے نہیں۔[2]

(۱۱) سند الفقہاء سید ابن عابدین رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا ارشاد گرامی

سیدی وسندی ابن عابدین علامہ شامی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے رد المحتار میں فرمایا ہے:

أَلَا تَرَى أَنَّ نَبِيَّنَا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ أَكْرَمَهُ اللّٰهُ تَعَالَى بِحَيَاةِ أَبَوَيْهِ لَهُ حَتَّى آمَنَا بِهِ كَمَا فِي حَدِيثٍ صَحَّحَهُ الْقُرْطُبِيُّ وَابْنُ نَاصِرِ الدِّينِ حَافِظُ الشَّامِ وَغَيْرُهُمَا۔

یعنی کیا تجھے معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب ﷺ کے اعزاز و اکرام کے لئے ان کے والدین کریمین کو زندہ کیا حتیٰ کہ وہ دونوں اپنے لخت جگر پر ایمان لائے جیسا کہ اس حدیث پاک میں ہے جس کو علامہ قرطبی نے اور ابن ناصر الدین شامی رحمہما اللہ نے اور دیگر آئمہ حدیث نے صحیح ثابت کیا ہے۔[3]

فجزاھم اللہ تعالیٰ عنا احسن الجزاء

---

[1] (اشعۃ اللمعات، ج ۱، ص ۷۱۸)

[2] (تفسیر اکلیل علی مدارک، ج ۲، ص ۱۰، سیرت مصطفی ﷺ، ص ۵۴)

[3] (ردالمحتار، ج ۴، ص ۲۳۱)

مندرجہ بالا اقوال مبارکہ سے مندرجہ ذیل فوائد حاصل ہوئے

(۱) رحمت کائنات ﷺ کے والدین کریمین رضی اللہ تعالیٰ عنہما دوبارہ زندہ کئے گئے اور وہ اللہ تعالیٰ جل جلالہٗ اور اس کے حبیب ﷺ پر ایمان لائے۔

(۲) اور یہ جان دو عالم ﷺ کے اعزاز و اکرام کے لئے زندہ کیے گئے اور اگر نہ بھی زندہ کئے جاتے تو پھر وہ جنتی تھے کیونکہ وہ اہل فترت سے تھے اور ان دونوں نے کبھی بھی نہ شرک کیا نہ بت پرستی کی۔

(۳) والدین کریمین کا دوبارہ زندہ ہونا یہ صحیح حدیث سے ثابت ہے اور اس حدیث کو بڑے بڑے جلیل القدر ائمہ حدیث نے صحیح کہا ہے۔

(۴) یہ حدیث پاک مخالفین کی پیش کردہ احادیث مبارکہ کی ناسخ ثابت ہوئی یعنی اس حدیث پاک سے پہلے کی ساری مخالفت حدیثیں منسوخ قرار پائیں۔

(۵) سید المرسلین ﷺ کے والدین کریمین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو کافر یا دوزخی کہنے والا ملعون ہے، لعنتی ہے ایسا کہنے سے یقیناً یقیناً حبیب خدا ﷺ کو ایذا پہنچتی ہے اور ایسے شخص کے لئے دردناک عذاب تیار ہے۔

(۶) ڈر اس بات کا ہے کہ ایسے شخص کا ایمان چھن جائے۔ (معاذ اللہ)

دعوت فکر

چند حقائق عشق و محبت والوں کی خدمت میں پیش کیے جاتے ہیں وہ خود اپنے ایمان سے پوچھ کر فیصلہ کرتے جائیں:

(۱) وعن معاذ الجهني: أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: من قرأ القرآن وعمل بما فيه ألبس والداه تاجا يوم القيامة ضوءه أحسن من ضوء الشمس۔

حضرت معاذ صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے قرآن پاک پڑھا اور اس کے مطابق عمل کیا اس کے ماں باپ کو ایسا تاج پہنایا جائے گا جس کا نور سورج کے نور سے بھی زیادہ ہو گا۔

اے عزیز اگر صرف قرآن مجید پڑھنے اور عمل کرنے والے کے والدین کو یہ اعزاز ملے گا تو جس کے وسیلہ سے قرآن پاک ملا ہے اور جس کی ہدایت سے ساری خدائی قرآن پاک کے مطابق عمل پیرا ہے، اس کے والدین کو کیا کیا انعام ملنے چاہئیں۔ یہ تو اپنے ایمان سے پوچھ کر بتا۔

اللھم صل و سلم و بارک علیٰ النبی الکریم و علیٰ آلہٖ و اصحابہٖ اجمعین

(۲) ایک بار حضرت ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا تنور میں روٹیاں لگا رہی تھیں ایک روٹی حبیب خدا ﷺ نے اپنے ہاتھ مبارک سے لگائی تو باقی ساری روٹیاں پک گئیں، مگر جس روٹی کو شاہ کونین ﷺ کا دست مبارک لگا اس روٹی کو آنچ تک نہ آئی۔[1]

میرے عزیز غور کر جس روٹی کو امت کے والی ﷺ کا ہاتھ مبارک لگ جائے اسے تو آگ اثر نہ کر سکے تو جس شکم پاک میں رحمت کائنات ﷺ نو مہینے رہیں اس کے متعلق کیا رائے ہے تو اپنے ایمان سے پوچھ لے۔

اللھم صل و سلم و بارک علی النبی المختار سید الابرار و علیٰ آلہٖ و اصحابہ الی یوم القرار

(۳) سیدنا انس صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے رومال کے ساتھ رحمت والے نبی اکرم ﷺ نے ہاتھ صاف کیے تو اس رومال کو آگ نہیں جلاتی تھی۔ جب میلا ہو جاتا حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ اسے تنور میں ڈال دیتے میل چلا جاتا مگر اس رومال کا ایک تار بھی نہ جلتا۔[2]

عزیز من غور کر جس کپڑے کے ساتھ جان دو عالم ﷺ کا دست مبارک لگ جائے اسے تو آگ نہ جلا سکے اور جس شکم پاک میں سرور عالم ﷺ خود جلوہ گر ہو رہے ہوں اس کے متعلق تیرا کیا ایمان کیا کہتا ہے۔

صلی اللہ علی النبی الکریم و علیٰ آلہٖ و اصحابہ اجمعین

(۴) سیدنا یوسف علیہ السلام نے اپنا کرتہ مبارک بھیجا اور فرمایا:

اذْهَبُوا بِقَمِيصِي هَذَا فَأَلْقُوهُ عَلَى وَجْهِ أَبِي (یوسف ۹۳)

میرا یہ کرتا لے جاؤ اسے میرے باپ کے منہ پر ڈالو۔

عزیز من جو کپڑا سیدنا یوسف علیہ السلام کے جسم پاک کے ساتھ لگ گیا اس کی برکت سے بینائی واپس آ جائے تو نبی الانبیاء ﷺ کے جسم اطہر کے ساتھ جو چیز لگ جائے اس کا کیا حال ہونا چاہیئے اور جس شکم پاک میں خود اللہ تعالیٰ کا حبیب مہینوں رہا اس کے متعلق تو اپنے ایمان سے پوچھ کر بتا کہ کہاں ہونا چاہیئے۔

مولای صلی و سلم دائمًا ابدًا　　　علیٰ حبیبک خیر الخلق کلھم

(۵) ایک گنہگار شخص نے حضرت خواجہ بہاؤ الحق ملتانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی دست بوسی کی تو اللہ تعالیٰ نے اسے اس ادب کی وجہ سے جنت میں بھیج دیا۔[3]

---

[1] (حالات مشائخ نقشبندیہ، ص ۱۱۲)

[2] (خصائص کبریٰ، ج ۲، ص ۸۰، مثنوی شریف، تفسیر روح البیان، سیرت رسول عربی ﷺ)

[3] (خلاصۃ العارفین)

غور کر ایک ولی کے ہاتھ مبارک کے ساتھ منہ لگ جانے سے جنت حاصل ہو جائے تو جن کے وسیلہ سے ولی ولی بنتا ہے ان کے جسم مقدس و معطر کے ساتھ جو لگ جائے وہ کہاں ہونا چاہیئے اپنے ایمان سے پوچھ کر بتاتا جا۔ (صلی اللہ علیہ والہ وسلم)

(۶) ایک (قاضی) فوت ہو گیا اس کی بیوی حاملہ تھی۔ اس قاضی کو بداعمالیوں کی وجہ سے قبر میں عذاب ہو رہا تھا اور جب اس کی بیوی نے بچہ جنا اور پھر اس بچے کو اس کی ماں مسجد میں لے گئی اور مولانا صاحب سے کہا یہ میرا بیٹا ہے اسے قرآن پاک پڑھاؤ۔ مولانا صاحب نے بچے سے فرمایا: پڑھ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ بچے نے بِسْمِ اللّٰہ پڑھی تو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا اب اس کے باپ سے عذاب اٹھالو کیونکہ اس کے بچے نے مجھے رحمٰن و رحیم کہا ہے۔[1]

اسی قسم کا ملتا جلتا واقعہ تفسیر بیضاوی میں بھی ہے:

مقام غور ہے کہ بچے نے بسم اللہ پڑھی باپ کو یہ انعام ملا کہ اس سے عذاب معاف ہو گیا تو جن کے بچے نے سارے جہان کو بسم اللہ پڑھا دی اس کے والدین کو کیا انعام ملنا چاہیئے۔

صلی اللہ علی النبی الکریم و علیٰ آلہ و اصحابہ اجمعین

(۷) سیدنا یونس علیہ السلام چند دن مچھلی کے پیٹ میں رہے تین دن یا دس دن یا چالیس دن تو وہ مچھلی جنت میں جائے گی۔[2]

یہ بات اگرچہ قطعی نہیں مگر مویدات میں سے ضرور ہے۔ قابل غور بات ہے کہ اس مچھلی نے کوئی نماز نہیں پڑھی کوئی روزہ نہیں رکھا صرف اور صرف اس وجہ سے جنت کی حقدار ہو گئی کہ اس کے پیٹ میں ایک اللہ تعالیٰ کا نبی چند دن رہا تو جس شکم پاک میں نبیوں کے نبی رسولوں کے امام کئی مہینے رہے اس کے متعلق آپ کا ایمان کیا فتویٰ دیتا ہے، ان کو کیا انعام ملنا چاہیئے۔

فقیر ابو سعید ولوالدیہ والاحبابہ عرض کرتا ہے کہ اس رحمت والے نبی ﷺ کے والدین کریمین طیبین طاہرین کو یہ انعام ملنا چاہیئے جس کا تذکرہ ۲۱ جنوری ۱۹۷۸ء کے اخبارات مثلاً نوائے وقت اور مشرق میں شائع ہوا تھا وہ یہ ہے کہ حکومت سعودی عرب نے مسجد نبوی شریف کی توسیع کا پروگرام بنایا اور رحمت کائنات ﷺ کے والد گرامی حضرت عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے جسد مبارک کو بمع چھ دیگر صحابہ کرام کے جنت البقیع میں منتقل کیا تو آپ کا جسم مبارک بالکل صحیح و سالم تھا کسی قسم کا تغیر واقع نہیں ہوا تھا۔ نیز فقیر مدینہ منورہ حاضر ہوا وہاں مورخہ ۲۹ نومبر ۱۹۹۴ء کو ٹھیکیدار عبد اللطیف سے ملاقات ہوئی اس

---

[1] (قلیوبی، ص ۴۱)

[2] (تفسیر روح البیان، ج ۵، ص ۲۲۶)

نے بتایا کہ جب رحمت دو عالم ﷺ کے والد ماجد سیدنا عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا جسد مبارک منتقل کیا گیا تو ہم نے بھی زیارت کی تھی، کچھ فاصلہ سے دیکھا کہ کفن مبارک بھی بالکل بے داغ تھا اور ایسی فضاء مہکی کہ بیان نہیں ہو سکتی۔

اللھم صل و سلم و بارک علی النبی المختار سید الابرار و علیٰ ابائہٖ الاخیار و آلہ و اصحابہٖ و ازواجہ الطاھرات المطھرت الیٰ یوم القرار و الحمد للہ رب العٰلمین

ایک مغالطہ

بعض لوگ امام الائمہ سراج الامہ سیدنا امام اعظم ابو حنیفہ قدس سرہٗ کو بھی اپنے ساتھ ملا کر بے ادبوں کی صف میں کھڑا کرنا چاہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ امام اعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنی کتاب فقہ اکبر میں فرمایا: **و والدا رسول اللہ ماتا علی الکفر۔** رسول اللہ ﷺ کے والدین دونوں کفر پر مرے تھے۔

لا حول و لا قوۃ الا باللہ العلی العظیم

جواب

پہلی بات یہ کہ فقہ اکبر کے متعلق اختلاف ہے کہ یہ کس کی تصنیف ہے کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ سیدنا امام اعظم ابو حنیفہ نعمان بن ثابت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی تصنیف ہے اور محققین نے جو تحقیق کی ہے وہ یہ ہے کہ فقہ اکبر ابو حنیفہ محمد بن یوسف بخاری کی تصنیف ہے اور جب یہ ثابت ہی نہیں کہ یہ تصنیف امام اعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی ہے تو ان کے سر پر اعتراض تھونپنا کہاں کی عقلمندی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر تسلیم بھی کر لیا جائے کہ یہ فقہ اکبر سیدنا امام اعظم قدس سرہٗ کی تصنیف ہے تو پھر عبارت میں اختلاف ہے جو فقیر کے پاس فقہ اکبر ہے اس میں ہے:

و والدا رسول اللہ ﷺ ماتا علی الفطرۃ۔

یعنی رحمت کائنات ﷺ کے والدین کریمین دونوں کا وصال فطرت (اسلام) پر ہوا ہے۔[1]

---

[1] (فقہ اکبر، ص ۱۵)

اور یہی بات انباء الاصطفاء فی حق اباء المصطفیٰ ﷺ لشیخ محمد بن قاسم بن یعقوب الاماسی میں بھی ص ۱۷۹ پر لکھی ہے۔

علی بن صادق الداغستانی لکھتے ہیں:

[بیان معنی قول الإمام الاعظم في الفقه الأكبر]

في أن الحق من مسألة الأبوين إذا كان هذا، فما معنى قول الإمام الأعظم في الفقه الأكبر: و والدا رسول الله ﷺ ماتا على الكفر؟

قلت: أولاً نسبة هذا الكتاب للإمام ليست ثابتة كما قال به بعض العلماء، فالتصنيف في زمنه ما كان مستفيضًا شائعًا، و إلا لم يقل هذا، فإنه ليس مما يجب اعتقاده، مع أنه لم يذكر في هذه الرسالة الاعتقادية إلا أهم المهمات الذي ليس منه بد، و ليس فيه تعظيم النبي ﷺ بل يوهم النقص۔

و بعد تسليم ثبوت النسبة نقول: لعل أصل النسخة كان "ما ماتا" كما وقع في نسخة بعض علماء عصرنا، فلما رأى النساخ تكرارها ظنوا إحداهما زائداً۔ قبل إمعان النظر۔ فتركوه و انتشرت النسخ، فحينئذٍ يكون ذكره لتعظيم حضرة الرسول عليه الصلوٰة و السلام، و إن لم يكن مما يجب اعتقاده، مع أن الحق أنه مما يجب اعتقاده بعد البلوغ۔

أو المراد: ماتا على زمن الكفر، كما قال به ابن الكمال۔

أول الكفر المجازي الذي لا يؤاخذ به صاحبه وهو الجهل بالأحكام الشرعية، لأنه معذور، لا الكفر الشرعي فإنه لا يتصور قبل ورود الشرع، كما قال به بعض علماء عصرنا، يؤيده تغيير الأسلوب وإلا كان الأوجز والأظهر أن يقال: ووالدا رسول الله ﷺ وعمه أبو طالب ماتوا كافرين۔
وهذه التاويلات وإن كانت بعيدة في بادئ النظر، لكنها أهون بكثير من نسبة الكفر إلى والدي خير البرية الذي خلق العالم وما فيه لأجله۔
(اثبات النجاة والإيمان لوالدي سيد بني عدنان، ص ۲۹۰، مكتبة دار الاحسان)

یقول العلامہ المحقق السید محمد بن رسول البرزنجی الحسینی المدنی:

فإن قلت: أليس قد صرح الإمام أبو حنيفة في "الفقه الأكبر" بأنهما على الكفر، فما جوابک عن هذا القول؟

والجواب عنه:

أما أولاً: فلا نسلم أن أبا حنيفة قال ذلک، فقد قال العلامة ابن حجر في "الفتاوى": وما نقل عن أبي حنيفة أنه قال في "الفقه الأكبر": إنهما ماتا على الكفر مردود (لقد نظرنا في نسخ كثيرة للفقه الأكبر فوجدنا أن هناک اختلافاً في ضبط العبارة، فقد كتبت في نسخ: ما ماتا على الكفر، وفي بعض نسخ الشروح للكتاب المذكور كتب في الحاشية عبارة: "ماتا على الكفر" بأن العبارة في الأصل: ما ماتا على الكفر وهذا يحصل من فعل النساخ غير المتقنين، فقد تسقط عبارة أو كلمة عند نسخهم لكتب۔)، بأن النسخ المعتمدة من الفقه الأكبر ليس فيها شيء من ذلک، وبأن الموجود فيها ذلک لأبی حنيفة محمد بن يوسف البخاري، لا لأبي حنيفة النعمان بن ثابت الكوفي، انتهى۔

أقول: قد حصلت نسخة صحيحة من "الفقه الأكبر" للإمام أبي حنيفة رضي الله تعالیٰ عنه رواية صاحبه أبي مطيع البلخي، رواه يحيى بن المطرف، عن أبي صالح محمد بن الحسين، عن أبی سعيد سعدان بن محمد البستي الجرمقي، عن أبي الحسن علي بن أحمد بن مروان الفارسي الفقيه، عن أبي بكر نصير بن يحيى، قال: سمعت أبا مطيع الحكم بن عبدالله، قال: سألت أبا حنيفة عن "الفقه الأكبر" قال فذكره (هذا الكتاب الذي ذكره المصنف هنا باسم "الفقه الأكبر" رواية أبي مطيع البلخي، وهو ما يعرف به "الفقه الأوسط" أيضًا، وقد وقفنا على نسخة منه خطيئة محفوظة بمكتبة شيخ الإسلام عارف حكمت، وقد طبع مع شرحه لأبي منصور السمرقندي بعنوان: "شرح الفقه الأكبر" والصواب أنه لأبي الليث السمرقندي المتوفى سنة ۳۷۳ھ، كما نبه عليه العلامة الكوثري في مقدمة كتاب "العالم والمتعلم" لأبی حنيفة، وهو يختلف في مادته وأسلوبه عن كتاب "الفقه الأكبر" الذي هو برواية حماد ابن الإمام أبي حنيفة، وتوجد نسخة خطيئة منه أيضًا بالمكتبة المذكورة مروية بالسند۔ ذكر الشيخ شعيب الأرناؤوط في تعليقه على كتاب "أقاويل الثقات"، ص ۶۳ عن ذكر المصنف لكتاب الفقه الأكبر ما نصه: "وفي صحة نسبة الكتاب للإمام أبي حنيفة رحمه الله تعالیٰ، وقفة۔۔۔۔ وقد نسب الكتب الإمام الذهبي في "العلو" إلى أبي مطيع الحكم بن عبدالله البلخي، وهو من كبار أصحاب أبي حنيفة وفقهائهم"۔ وقد بينا سبب هذا التوقف في النسبة)۔

وهي قد كتبت في مستهل صفر سنة إحدى وخمسين وست مئة، ومر عليها الحفاظ والعلماء، واتصل سندي بها ولله الحمد، وهي كما قال غير "الفقه الأكبر" هذا، فقد صح أن هذا ليس للإمام أبي حنيفة (هذا الحكم من المصنف صواب باعتبار ما سبق ذكره من توافق اسم المصنفين، ولعل المصنف لم يطلع على كتاب "الفقه الأكبر" برواية حماد بن أبي حنيفة الذي فيه الاختلاف حول وجود العبارة وعدمها، أو تحرفها)۔

غايته إنما نشأ الاشتباه من الاشتراک بالتأليفين في الإسم، واشتراک المؤلفين في الكنية، ولم يظفروا إلا بنسخة واحدة، فظنوا أنها هي التي للإمامُ۔

وأما ثانيا: فليس في هذا القول تصريح بذلک، لأن قوله: "ماتا على الكفر"، المراد بالكفر الفترة، فقد تقدم أن الكفر يطلق على الفترة مجازًا، فهو على وزان قوله تعالى: (عَلَىٰ فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ (المائدة ۱۹)) أي: ماتا في الفترة، وهذا قول صحيح، الا ترىٰ كيف غير العبارة في أبي طالب فقال في حقه، "مات كافرا"، فأطلق عليه الكافر حيث إنه بلغته الدعوة، فكان كفره حقيقيا نظر الظاهر الشرع، ولم يطلق ذلک عليهما، فلم يقل ماتا كافرين۔

فتنبه لذلک فإنه مهم، ولا تسترو ح في مثل هذه المزالق، فإنا نبرأ إلى الله تعالیٰ من هذه المقالة، وننزه جناب الإمام الأعظم أبي حنيفة رضي الله تعالیٰ عنه أن يعمد إلى مقدمة في الإعتقاد، ويرغب الناس في قراءتها ويسميها "الفقه الأكبر" ويجعلها أساس الشرع، ويكون مضمونها سب والدي النبي صلی اللہ تعالیٰ عليه وآلہ واصحابه وسلم الموجب لأذى النبي صلی اللہ تعالیٰ عليه وآلہ واصحابه وسلم، فإنا نبرئه من شناعة هذه العوراء، وبشاعة هذه الزوراء (مما يجب التنبيه عليه وتبرئة الإمام أبي حنيفة رضي الله تعالیٰ عنه منها تلک العبارة التي أوردها ملا علي القاري في شرحه "الفقه الأكبر" ص ۱۲۰، بقوله: "وفي نسخة زيد قوله: ورسول الله صلی اللہ تعالیٰ عليه وآلہ واصحابه وسلم مات على الإيمان۔۔" وهذه شناعة لا يقول بها مسلم فضلاً عن إمام مثل أبي حنيفة رضي الله تعالیٰ عنه)، كيف والإمام حافظ الدين النسفي ممن ذهب إلى نجاتهما، وروىٰ الحديث الوارد في احيائهما، وهو ممن شرح مناقب أبي حنيفة رضي الله تعالیٰ عنه، ولو كان هذا القول موجودًا (قدمنا تفصيل ذلک في مقدمة الكتاب، وكذا حاشية، ص ۸۹ فلتنظر) وكان صريحًا لما خالف إمامه، وهذا الشمني بنقل تلميذه السيوطي قد أقر ابن العربی المالكي على قوله فيمن قال: إنهما في النار، أنه ملعون، والشمنی من محققي الحنفية الجامعين بين الفقه والحديث والعربية، كما هو معلوم من تصانيفه۔

والحمدللہ رب العلمین۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ یہ کسی کی تحریف ہے کہ ماتاعلی الفطرۃ کو ماتاعلی الکفر کر دیا اور سیدنا امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خوامخواہ بے ادبوں میں کھڑا کر دیا ہے ورنہ سیدنا امام اعظم ابو حنیفہ قدس سرہٗ جو کہ پیکر ادب واحترام تھے ان سے کیسے بے ادبی کے الفاظ سرزد ہو سکتے ہیں۔ تیسری بات یہ ہے کہ اگر کوئی ضد کرے اور کہے کہ یہ الفاظ امام اعظم (رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ) کے ہی ہیں تو ہم کہیں گے تمہیں وہ مبارک اور ہمیں یہ مبارک الحمدللہ رب العلمین ہمارے پاس جو نسخہ فقہ اکبر ہے اس میں صاف صاف لکھا ہے: ماتاعلی الفطرۃ۔

اللہ تعالیٰ ہمیں با ادب رکھے اور ادب والوں میں ہمارا حشر ونشر کرے۔

وماذلک علی اللہ بعزیز وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ حبیبہ رحمۃ للعلمین وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ اجمعین

حضور ﷺ کے والدین کریمین کے کفر پر مرنے کے متعلق امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قول کی تحقیق

"فقہ اکبر" نامی کتاب کیا سیدنا امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تالیف وتصنیف ہے؟ علماء نے اس بارے میں اختلاف کیا ہے۔ اس اختلاف کو بالائے طاق رکھ کر ہم اگر یہ تسلیم بھی کر لیں کہ "فقہ اکبر" واقعی امام اعظم کی تصنیف ہے۔ تو پھر مذکورہ عبارت (ماتاعلی الکفر) کا اس میں پایا جانا ہرگز قابل تسلیم نہیں۔ کیونکہ علماء نے اس کی تصریح فرمائی ہے کہ مذکورہ عبارت کسی نے فقہ اکبر میں درج کر دی ہے۔ امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایسا لکھا اور نہ ہی کبھی اس کا اظہار فرمایا، خود ہمارے کتب خانہ میں فقہ اکبر کے دو مطبوعہ نسخے موجود ہیں۔ ایک ۱۳۴۲ھ کا چھپا ہوا ہے جو مطبوعہ دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن سے طبع ہوا۔ اور دوسرا نسخہ قدیمی کتب خانہ آرام باغ کراچی کا ہے۔ جو ابھی تازہ چھپ کر بازار میں آیا ہے۔ ان دونوں نسخہ جات میں مذکورہ عبارت کا نام ونشاں تک نہیں ہے۔ اگر "ماتاعلی الکفر" واقعی امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا کلام ہوتا۔ تو پھر فقہ اکبر کا کوئی

وقد دلت عبارۃ الفقہ الأکبر علی نجاۃ مثلھما، قال أبو مطیع: قلت لأبي حنیفۃ: لو أقر بجھلہ الإسلام في أرض الشرک، ولا یعلم شیئا من الفرائض والشرائع ولا بالکتاب، ولا بشيء من الشرائع فمات، أھو مؤمن؟

قال: نعم، قلت: ولو لم یعلم شیئا ولا یعمل بہ، إلا أنہ مقر بالإیمان فمات۔

قال: ھو مؤمن۔ انتھی بحروفہ۔

فانظر أنہ حکم بإیمان المقر بالتوحید قبل بلوغ الدعوۃ ولا شک أن الوالدین الشریفین الثابت عنھما التوحید دون الشرک کما سیأتي۔

فکیف یتصور أن یحکم بقاعدۃ کلیۃ، وھي نجاۃ من مات في الفترۃ موحداً، ثم یخالفھا في حق والدیہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم، ویحکم بکفرھما۔

ھذا مما لا یقبلہ عقل ولا نقل، وباللہ التوفیق۔ (سَرَادالدین وسِرَادالدین في اثبات النجاۃ والدرجات للوالدین، ص ۸۸ تا ۹۱)

نسخہ اس سے خالی نہ ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ اہل سنت کے فقہاء کرام نے اس کی پرزور تردید کی ہے، اور فقہ اکبر کے اصل مصنف کی عبارت اسے تسلیم نہیں کیا، حوالہ ملاحظہ ہو:

وَمَا فِي الْفِقْهِ مِنْ اَنَّ وَالِدَيْهِ ﷺ مَاتَا عَلَى الْكُفْرِ فَمَدْسُوْسٌ عَلَى الْإِمَامِ وَعَلَى النُّسَخِ الْمُعْتَمَدَةِ لَيْسَ بِهَا شَيْئٌ مِنْ ذَالِکَ۔

"فقہ اکبر" میں جو یہ الفاظ کہیں ملتے ہیں کہ حضور ﷺ کے والدین کریمین امام اعظم کے بقول کفر پر مرے، تو یہ الفاظ امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر بطور افتراء منسوب کر دیئے گئے ہیں۔ کیونکہ قابل اعتماد نسخہ جات فقہ اکبر میں ان الفاظ کا نام و نشاں تک نہیں ملتا۔[1]

جواب دوم:

امام جلال الدین سیوطی نے آپ ﷺ کے والدین کریمین کے ثبوت اسلام اور موحد ہونے پر چھ عدد رسالہ جات تصنیف فرمائے ہیں:

علامہ جلال الدین السیوطی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے سرکار ابد قرار ﷺ کے والدین ماجدین کریمین کے ثبوت اسلام پر اور موحد و جنتی ہونے پر چھ عدد رسالہ جات تصنیف فرمائے۔ ان میں علامہ موصوف نے ان عبارات کا جواب بھی تحریر فرمایا جو اس عقیدہ کے خلاف تھیں یعنی جن میں آپ ﷺ کے والدین کریمین کے عدم اسلام کی بات تھی۔ ہم نے علامہ موصوف کے تمام رسائل دیکھے، لیکن ان میں کہیں بھی امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف منسوب اس عبارت کا تذکرہ نہیں ملتا۔ اور پھر جب علامہ السیوطی نے ایک رسالہ فضائل و مناقب امام اعظم پر تصنیف فرمایا، جس کا نام تبییض الصحیفہ فی مناقب ابی حنیفہ ہے، اس میں بھی کوئی ایسا اشارہ نہیں ملتا جس سے یہ ثابت ہو کہ امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا حضور ﷺ کے والدین کریمین کے بارے میں "ماتاعلی الکفر" والا عقیدہ تھا۔ اس سے بھی معلوم ہوا کہ "فقہ اکبر" میں کسی نے اپنی طرف سے مذکورہ عبارت درج کر دی۔ یوں لوگوں نے اسے امام اعظم کا کلام سمجھ کر اُن پر طعن و اعتراض کرنا شروع کر دیا۔

---

[1] (طحطاوی، ج۲، ص۸۰: مطبوعہ بیروت طبع جدید)

جواب سوم

اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کی عبارات سے ماخوذ

اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی مولانا شاہ احمد رضا خان صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے مذکورہ عبارات پر ارشادات ملاحظہ ہوں:

المستند المعتمد بناء نجاۃ الابد:

لم یثبت ھذا عن سید الامام الامام الاعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال العلامۃ السید الطحطاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ فی حاشیۃ علی الرد المحتار من نکاح باب الکافر ما نصہ فیہ اساءت ادب و الذی ینبغی اعتقادہ حفظھما من الکفر و ذکر الکلام الیٰ ان قال و ما فی فقہ الاکبر من ان و الدیہ ﷺ ماتا علی الکفر فمدسوس علی الامام و یدل علیہ ان النسخ المعتمدۃ منہ لیس فیھا شیئ من ذالک قال ابن حجر المکی فی فتاواہ و الموجود فیھا ذالک لابی حنیفۃ محمد بن یوسف البخاری لابی حنیفۃ النعمان بن الثابت الکوفی و علی التسلیم ان الامام قال ذالک فمعناہ انھما ماتا فی ذمن الکفر و ھذا لا یقتضی اتصافھمابہ الیٰ اخر ما افاد و اجاد اقول و لھذہ العبارۃ قرینۃٌ اُخریٰ توجد مثلھا فی بعض النسخ دون الاُخری و ھی قولہ و رسول اللہ ﷺ مات علی الایمان و العلامۃ القاری نفسہ قد ارتاب فی صحۃ نسبتھا الی الکتاب حیث قال لعل مرام الامام علی تقدیر صحۃ ورود ھذا الکلام فالقطع بصحۃ ھذہ مع اشتراکھما فی خلوا النسخ المعتمدۃ عنھما ممایفضی الی التعجب۔

یہ قول حضرت امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ثابت نہیں ہے علامہ طحطاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے حاشیہ رد المختار میں کہا کہ یہ کہنا کہ حضور ﷺ کے والدین کا نکاح کفر کے ساتھ ہوا یہ بے ادبی ہے اور والدین رسول کریم ﷺ کے بارے میں ایک مسلمان کا جو عقیدہ ہونا چاہیئے وہ یہ کہ ان دونوں حضرات کو کفر سے محفوظ سمجھا جائے۔ سلسلۂ کلام چلاتے ہوئے علامہ موصوف نے یہ بھی لکھا کہ "فقہ اکبر" کے حوالہ سے جو یہ کہا جاتا ہے کہ امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: "حضور ﷺ کے والدین کا حالت کفر میں انتقال ہوا" یہ کہنا امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر ایک تہمت سے کم نہیں ہے، اور اس کے تہمت ہونے پر یہ بات دلالت کرتی ہے کہ فقہ اکبر کے جو نسخے قابل اعتماد ہیں ان میں ایسے الفاظ کا قطعًا وجود تک نہیں ملتا۔ علامہ ابن حجر مکی نے اپنے فتاویٰ میں کہا ہے کہ فقہ اکبر کے حوالہ سے جو مذکورہ عبارت پیش کی جاتی ہے وہ ابو حنیفہ محمد بن یوسف بخاری کی ہے، ابو حنیفہ نعمان بن ثابت یعنی امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نہیں ہے۔ اور اگر یہ تسلیم کر بھی لیا جائے کہ عبارت مذکورہ امام ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ہی ہے، تو پھر اس کا معنی یہ ہو گا کہ حضور اکرم ﷺ کے والدین کریمین کا انتقال زمانۂ کفر میں ہوا لیکن اس معنی سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ دونوں بزرگ کفر سے متصف تھے، الخ۔

میں (یعنی اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی قدس سرہٗ العزیز) کہتا ہوں کہ "ماتا علی الکفر" کا جو معنی ابن حجر مکی نے کیا، اس کا ایک اور قرینہ بھی موجود ہے، وہ یہ کہ فقہ اکبر کے بعض نسخہ جات میں اس عبارت کے ساتھ یہ عبارت بھی مذکور ہے: و رسول اللہ ﷺ مات علی الایمان یعنی رسول کریم ﷺ کا وصال شریف زمانۂ ایمان پر ہوا۔ ملا علی قاری کو تو خود اس عبارت "مات علی الایمان" کے بارے میں شک ہے کہ یہ نفس کتاب (فقہ اکبر) کی ہے، کیونکہ انہوں نے کہا ہے: شاید کہ امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مقصد اس عبارت سے بشرطیکہ اس عبارت کا آپ سے صدور تسلیم کیا جائے یہ ہو، لہٰذا اس عبارت کے صحیح ہونے پر یقین کر لینا حالانکہ قابل اعتماد نسخہ جات اس سے خالی ہیں، یہ ایسا یقین ہے جو تعجب میں ڈال دیتا ہے۔[1]

توضیح

اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی قدس سرہ العزیز کے قول کی وضاحت یہ ہے کہ "ماتا علی الکفر" کے الفاظ معتمد نسخہ جات میں موجود نہیں، اور فقہ اکبر کے جن نسخوں میں یہ عبارت ملتی ہے۔ وہ امام اعظم کی تصنیف نہیں بلکہ ابو حنیفہ محمد بن یوسف بخاری کی تصنیف ہے۔ علاوہ ازیں بشرط تسلیم اس عبارت کے ساتھ بعض نسخوں میں یہ عبارت بھی موجود ہے: و رسول اللہ ﷺ مات علی الایمان۔ اس جملہ کے بارے میں ملا علی قاری خود شک میں ہیں، ملا علی قاری کی عبارت یہ ہے:

شرح فقہ اکبر

ولیس ھذہ النسخۃ فی اصل شارح تصدر لھذا المیدان لکونہ ظاھرا فی معرض البیان ولا یحتاج ذکرہ لعلوہ فی ھذا الشان و لعل برام الامام علی تقدیر صحۃ ورود ھذا الکلام انہ ﷺ من حیث کونہ نبیًا من الانبیاء وھم کلھم معصومون عن الکفر فی الابتداء والانتھاء نعتقد انہ علیہ السلام مات علی الایمان۔

اور اس نسخہ کی یہ عبارت کسی اصل کی تشریح کے طور پر یہاں ذکر کرنا مناسب نہیں کیونکہ یہ بیان کرنے کے بغیر بھی ظاہر ہے۔ اور اس کے ذکر کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ سرکار دو عالم ﷺ کی شان اقدس اس بارے میں بلند و بالا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ شاید امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اس عبارت سے مقصد یہ ہو کہ چونکہ آپ ﷺ بھی دیگر انبیائے کرام علیہم السلام کی طرح ایک جلیل القدر پیغمبر ﷺ ہیں، اور وہ حضرات کفر سے ابتداء اور انتہاء دونوں میں معصوم ہیں، لہٰذا ہمیں اس بات کا معتقد ہونا چاہیئے کہ رسول اللہ ﷺ کا وصال شریف بھی ایمان پر ہوا۔[2]

---

[1] (المستند المعتمد بناء نجاۃ الابد، ص ۱۷۵)

[2] (شرح فقہ اکبر ملا علی قاری، ص ۱۳۱)

ملا علی قاری جب "مات علی الایمان" کے جملہ کے بارے میں مضطرب ہیں، کیونکہ رسول کریم ﷺ کا انتقال بحالت ایمان ہونا اظہر من الشمس ہے، اس لئے عقائد کی اہم باتوں میں اسے ذکر کرنا کوئی دانشمندانہ بات نہیں پھر ایک تعجب اس بات پر کہ ملا علی قاری اسے صاحب فقہ اکبر کی تحریر مانتے ہیں، اور پھر اس کی تاویل ایک ایسے انداز سے کر رہے ہیں جو عامیانہ ہے، بھلا کس مؤمن کا یہ عقیدہ ہو گا کہ وہ تمام انبیاء کرام کو اول و آخر مؤمن سمجھے لیکن حضور اکرم ﷺ کے انجام پر اسے شک و وہم گزرے۔ لہٰذا اس شک کو دور کرنے کے لئے امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک عقیدہ ذکر کیا۔ وہ یہ کہ ہر مؤمن کو یہ عقیدہ رکھنا چاہیئے کہ سرکار دوعالم ﷺ کا انتقال بحالت ایمان ہوا۔ ہاں اس کی ایک وجہ ہو سکتی تھی وہ یہ کہ کسی پیغمبر کی موت (معاذ اللہ) کفر پر ہوئی ہو یا سب انبیاء سابقین (معاذ اللہ) بوقت انتقال ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھے ہوں، تو امام ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ امت مسلمہ کے لئے یہ اصل بیان کر رہے ہوں کہ سرکار دوعالم ﷺ کے انتقال کے متعلق انبیاء سابقین کا سا عقیدہ نہیں رکھنا چاہیئے، بلکہ آپ ﷺ ان کے خلاف ایمان کی حالت میں اس دنیا سے تشریف لے گئے لیکن یہ وجہ خود مردود ہے۔

ملا علی قاری کا اس عبارت کو تعجب سے دیکھنا اور اس کو اولاً صاحب فقہ اکبر کی تحریر نہ کہنا اور پھر عجیب و غریب اس کا مقصد ان پر تھوپنا ان تمام باتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے امام اہل سنت مولانا احمد رضا خان بریلوی کہتے ہیں کہ اسی عبارت سے متصل عبارت (مات علی الکفر) بھی جب قابل اعتماد نسخوں میں موجود نہیں تو پھر اسے ملا علی قاری کا درست تسلیم کرنا اور اس کی تائید کرنا اور اس کے خلاف کی تردید کرنا کس قدر تعجب خیز بات ہے۔

فقہ اکبر کا تاریخی پس منظر

گزشتہ اوراق میں فقہ اکبر نامی کتاب کے مصنفین میں دو حضرات کے نام مذکور ہوئے ہیں، ایک سیدنا امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور دوسرے ابو حنیفہ محمد بن یوسف بخاری۔ اس ضمن میں یہ بھی گزرا کہ سرکار دوعالم ﷺ کے والدین کریمین کے متعلق جملہ جن نسخہ جات میں ہے وہ ابو حنیفہ محمد بن یوسف کی تصنیف ہے، امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تصنیف میں یہ بحث نہیں ہے، بہر حال جو فقہ اکبر امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تصنیف ہے۔ وہ ابو مطیع بلخی سے مروی ہے اسے ابن تیمیہ، علامہ ذہبی، ابن قیم، ابن حجر مکی، شیخ الاسلام ابو اسماعیل بخاری، ابن ابی حاتم، علامہ قونوی، ابن ابی قدامہ حنبلی شارح عقائد طحاوی، ابن عبد الرسول عبد السلا محمد برزنجی، طحطاوی اور صاحب کشف الظنون وغیرہ حضرات نے تسلیم بھی کیا ہے، اور اس کا تذکرہ بھی کیا۔ چونکہ دونوں مصنفین کی کنیت ابو حنیفہ تھی۔ اس لیے اشتباہ کی وجہ سے لوگوں نے امتیاز نہ کیا۔ اور بوجہ شہرت اس سے مراد امام اعظم کی ذات لے لی گئی۔ صاحب کشف الظنون کہتے ہیں۔

کشف الظنون

الفقه الاکبر فی الکلام للامام الاعظم ابی حنیفة نعمان بن ثابت الکوفی المتوفی ۱۵۰ ھ خمسین و مأته روی عنه ابو مطیع البلخی و اعتنی به جماعة من العلماء۔

علم کلام کے موضوع پر لکھی گئی کتاب "فقہ اکبر" امام اعظم ابو حنیفہ نعمان بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تصنیف ہے۔ جن کا ۱۵۰ھ میں انتقال ہوا۔ یہ کتاب آپ سے ابو مطیع البلخی نے روایت کی۔ علماء کی ایک جماعت نے اس کا اہتمام کیا۔[1]

نوٹ: صاحب کشف الظنون یہاں اس بات کی تفصیل بیان کرتے ہیں کہ لوگوں نے "ابو حنیفہ" کنیت کے اشتباہ کی وجہ سے مشہور فقہ اکبر کتاب کی بہت سی شروحات اس ارادے سے لکھیں کہ یہ کتاب امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تصنیف ہے۔ صاحب کشف الظنون نے یہاں اُن حضرات کے نام بھی گنوائے ہیں، جو اس مغالطہ کا شکار ہوئے۔ اور ان کی شروحات بازار میں آئیں۔ اگرچہ یہاں خود بھی صاحب کشف الظنون تحقیق سے ہٹ گئے۔ کیونکہ جب انہیں یہ علم تھا کہ امام اعظم کی تصنیف فقہ اکبر ابو مطیع بلخی سے روایت ہے اور جن شروحات کا ذکر کیا وہ اس فقہ اکبر کی نہیں۔ بلکہ ابو حنیفہ محمد بن یوسف بخاری کی تصنیف کی ہیں۔ لیکن تساہل کرتے ہوئے صاحب کشف الظنون نے انہیں امام اعظم کی فقہ اکبر کی شروحات کے طور پر پیش کیا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ جس فقہ اکبر کو شہرت ملی اور جس کی شروحات کی گئیں۔ وہ امام اعظم کی فقہ اکبر نہیں۔ لہٰذا ملا علی قاری نے بھی جس کی شرح لکھی۔ وہ بھی ابو حنیفہ محمد بن یوسف کی تصنیف ہے۔ اس لیے اس کے معتقدات امام اعظم کے عقائد نہیں کہلائے جاسکتے۔ اسی امر کی ایک اور دلیل پیش خدمت ہے۔

مشہور فقہ اکبر امام اعظم کی تصنیف نہیں

مہر انور: امام اعظم صاحب کا وہ رسالہ چونکہ فقہ اکبر کے نام سے مشہور ہے کہ جس کی روشنی سے مسلمانوں کے سینے منور ہوئے۔ اور جس کی بدولت لوگوں نے صراط مستقیم کو سر کی آنکھوں سے دیکھا۔ میں نے اس کے متعلق یہ خیال کیا کہ اس کا میں اردو ترجمہ لکھوں کہ جس سے عام لوگ فائدہ اٹھائیں۔ لیکن اتفاق سے وہ نسخہ مرویہ کوشش کے باوجود ہاتھ نہ لگا۔ لیکن میں اس کی جستجو میں رہا، اور اتفاقاً مفتی محمد سعید شافعی مدارسی کے کتب خانہ میں مجھے نظر آیا جسے دیکھ کر میں بھڑک اٹھا اور اس کے بعد میں نے اس کا ترجمہ کیا۔ اور چونکہ وہ عربی میں تھا جس کو عام لوگ نہیں سمجھتے تھے، اس لیے میں نے اس کا ترجمہ کیا۔۔۔۔ یہ جو مشہور فقہ اکبر ہے کہ جس کا ترجمہ ہی نہیں بلکہ شروح بھی بہت سے لوگوں نے لکھی ہیں، یہ امام ابو حنیفہ کی تصنیف نہیں ہے۔ بلکہ یہ ابو حنیفہ محمد بن یوسف بخاری کی تصنیف اور صاحب تصنیف کے نام اتفاق سے مشترک متحد پائے گئے۔ اور فقہ اکبر جو کہ

---

[1] (کشف الظنون، ج ۲، ص ۱۲۸۷)

ابو مطیع بلخی کی مروی ہے وہ بہت ہی کمیاب تھی۔ اس لیے لوگ اس مشہور فقہ اکبر کو امام اعظم کی تصنیف سمجھتے ہوئے اس کی طرف اس طرح دوڑے جس طرح پیاسا ریگستان کو دور سے پانی تصور کرتا ہے۔[1]

فقہ اکبر جو مشہور و معروف ہے، اس کی شروحات کا بکثرت وجود ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ سب شروحات نویں صدی کے بعد معرض وجود میں آئیں۔ یعنی ان کے شارحین میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جو نویں صدی سے قبل سے تعلق رکھتا ہو۔ حالانکہ امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا پہلی دوسری صدی کا زمانہ ہے۔

سات سو سال تک کسی نے ایسے عظیم شخص کی تصنیف کی شرح کی طرف توجہ نہ دی، عقل یہ باور نہیں کر سکتی کہ اتنا طویل عرصہ امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تصنیف سے اُن کے نام لیواؤں نے روگردانی کی۔ اور پھر نویں صدی کے بعد یکا یک فقہ اکبر اور اس کی شروحات عام ہو گئیں۔ علامہ طحطاوی، ابو اللیث سمرقندی اور علامہ کرخی جیسی شخصیات سے بھی اس کی کوئی شرح نظر نہ آئی۔ حالانکہ یہ حضرات امام صاحب کی تعلیمات کے خصوصی مبلغ اور شارح تھے۔ اس سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ فقہ اکبر امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تصنیف نہیں ہے۔ ابن تیمیہ نے امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تصنیف "فقہ اکبر" کے کچھ اقتباسات پیش کیے ہیں، ہم انہیں ذیل میں درج کر رہے ہیں، ان اقتباسات کو موجودہ فقہ اکبر کی عبارت سے ملا کر دیکھیں تو بات بالکل واضح ہو جائے گی کہ یہ فقہ اکبر متداولہ وہ نہیں جو امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تصنیف تھی۔

اقتباسات ملاحظہ ہوں:

الحموية الكبرىٰ

وفي كتاب " الفقه الأكبر " المشهور عند أصحاب أبي حنيفة ; الذي رووه بالإسناد عن أبي مطيع " الحكم بن عبد الله البلخي " قال: سألت أبا حنيفة عن الفقه الأكبر فقال: لا تكفرن أحدا بذنب ولا تنف أحدا به من الإيمان ; وتأمر بالمعروف وتنهى عن المنكر ; وتعلم أن ما أصابک لم يکن ليخطئک وما أخطأک لم يکن ليصيبک ولا تتبرأ من أحد من أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم ; ولا توالي أحدا دون أحد ; وأن ترد أمر عثمان وعلي إلى الله عز وجل. قال أبو حنيفة: الفقه الأكبر في الدين خير من الفقه في العلم ; ولأن يفقه الرجل كيف يعبد ربه خير له من أن يجمع العلم الكثير۔ قال أبو مطيع: " الحكم بن عبد الله " قلت: أخبرني عن أفضل الفقه. قال: تعلم الرجل الإيمان والشرائع والسنن والحدود واختلاف الأئمة. وذكر مسائل " الإيمان " ثم ذكر مسائل " القدر " والرد على القدرية بكلام حسن ليس هذا موضعه. ثم قال: قلت: فما تقول فيمن يأمر بالمعروف وينهى عن المنكر فيتبعه على ذلک أناس فيخرج على الجماعة هل ترى ذلک؟ قال لا. قلت: ولم وقد أمر الله ورسوله بالأمر بالمعروف والنهي عن المنكر وهو فريضة واجبة؟ قال هو كذلک ; لكن ما يفسدون أكثر مما يصلحون من سفک الدماء واستحلال الحرام۔

---

[1] (مہر انور، ص ۷، ۲)

کتاب فقہ اکبر میں ہے جو امام ابو حنیفہ کے اصحاب میں باسناد ابی مطیع الحکم بن عبد اللہ بلخی مشہور ہے کہ میں (ابو مطیع) نے حضرت امام ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فقہ اکبر کے بارے میں پوچھا آپ نے فرمایا: کسی شخص کو کسی گناہ کی وجہ سے کافر ہر گز نہ کہو، اور نہ ہی اس سے اس کا ایمان ختم ہونے کا قول کرنا تم ہر مسلمان کو معروف کا حکم کرو اور منکرات سے روکو۔ اور تمھیں اس بات کا یقین ہونا چاہیئے کہ جو چیز تمہیں پہنچ گی ہے، وہ تم سے ٹلنے والی نہ تھی، اور جو چیز تم تک نہ پہنچ سکی وہ تمہیں ملنے والی نہ تھی۔ حضور اکرم ﷺ کے اصحاب میں سے کسی سے بیزاری نہ کر، اور دوستی میں ان میں سے ایک کو دوسرے پر ترجیح مت دے، اور حضرت عثمان و علی المرتضیٰ کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دے۔ امام ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: دین میں فقہ اکبر علم کی فقہ اکبر سے بہتر ہے۔ اور بہت سا علم جمع کر لینے سے کسی آدمی کے لئے بہتر ہے کہ وہ اپنے رب کی عبادت کرنے کی کیفیت جان لے۔ ابو مطیع نے کہا: میں نے امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا کہ آپ مجھے بہترین فقہ بتائیں، فرمایا: وہ یہ ہے کہ تو کسی کو ایمان کی تعلیم دے۔ شریعتوں کا علم سکھائے اور سنتوں اور حدود اور ائمہ کے اختلاف سے آگاہ کرے، اس کے بعد آپ نے ایمان کے بہت سے مسائل ذکر کیے، پھر تقدیر کے مسائل بیان فرما کر قدریہ پر خوبصورت انداز میں رد فرمایا، جس کے ذکر کا یہ مقام نہیں ہے۔ پھر ابو مطیع نے ان سے پوچھا کہ ایک شخص امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتا ہے، بہت سے لوگ اس کے متبع ہو جاتے ہیں۔ پھر وہ سب مل کر کسی مومن جماعت پر خروج کر دیں اس کا کیا حکم ہے؟ اور فرمایا یہ درست نہیں۔ میں نے پوچھا آخر کیوں؟ حالانکہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حکم دیا ہے۔ اور یہ ایک واجب اور فرضی ذمہ داری ہے، فرمانے لگے: ہاں جو کہتے ہو وہ ٹھیک ہے، لیکن ان کے خروج کرنے والوں کا فساد ان کی اصلاح کی بہ نسبت بہت زیادہ ہے۔ کیونکہ اس طرح سے وہ مسلمانوں کا ناحق خون بہائیں گے اور حرام کو حلال ٹھہرائیں گے۔[1]

توضیح

قطع نظر اس سے کہ ابن تیمیہ نے مذکورہ اقتباسات کس مقصد کے ضمن میں پیش کیے ہیں، ہم یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ فقہ اکبر جو امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ذات کو مورد الزام ٹھہرانا حقائق سے چشم پوشی کے مترادف ہے اور اگر بالفرض اسی مشہور و معروف تصنیف کو امام اعظم کی تسلیم کر لیا جائے۔ تو پھر اس کے نسخوں میں کمی بیشی اس امر کی نشاندہی کرتی ہے کہ مذکورہ عبارت (ماتا علی الکفر، الخ) جن نسخہ جات میں پائی جاتی ہے، وہ کسی نے درج کر دی ہے، لہٰذا پھر بھی امام اعظم کی

[1] (العقیدۃ الحمویۃ الکبری، ج ۱، ص ۳۴)

ذات اس اعتراض والزام سے بری ہے۔ ملا علی قاری کو بھی جب یہ شک پڑا کہ "مات علی الایمان" اصل کتاب کی عبارت نہیں ہو سکتی تو پھر اس کے قبل کی عبارت بھی تو اس کے ساتھ بعض نسخہ جات میں نہیں ملتی، اسے اصل کتاب ٹھہرانے کی کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی۔ (فاعتبروا یااولی الابصار)

حضور ﷺ کے والدین کریمین کے عدم اسلام پر ملا علی قاری کے دلائل اور اُن کے مسکت جوابات

(وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: زَارَ النَّبِيُّ قَبْرَ أُمِّهِ) أَيْ بِالْأَبْوَاءِ بَيْنَ مَكَّةَ وَالْمَدِينَةِ (فَبَكَى) أَيْ عَلَى فِرَاقِهَا أَوْ عَلَى عَذَابِهَا أَوْ عَلَى مَوْتِهِ بِمَوْتِهَا، قَالَ ابْنُ الْمَلَكِ: يَدُلُّ عَلَى جَوَازِ الْبُكَاءِ عِنْدَ حُضُورِ الْمَقَابِرِ (وَأَبْكَى مَنْ حَوْلَهُ) قِيلَ: زِيَارَتُهُ - صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ - أُمَّهُ مَعَ أَنَّهَا كَافِرَةٌ تَعْلِيمٌ مِنْهُ لِلْأُمَّةِ حُقُوقَ الْوَالِدَيْنِ وَالْأَقَارِبِ، فَإِنَّهُ لَمْ يَتْرُكْ قَضَاءَ حَقِّهَا مَعَ كُفْرِهَا (فَقَالَ: اسْتَأْذَنْتُ رَبِّي فِي أَنْ أَسْتَغْفِرَ فَلَمْ يُؤْذَنْ لِي) قَالَ ابْنُ الْمَلَكِ: لِأَنَّهَا كَافِرَةٌ، وَالِاسْتِغْفَارُ لِلْكَافِرِينَ لَا يَجُوزُ، لِأَنَّ اللَّهَ لَنْ يَغْفِرَ لَهُمْ أَبَدًا (وَاسْتَأْذَنْتُهُ فِي أَنْ أَزُورَ قَبْرَهَا فَأَذِنَ لِي) بِنَاءً عَلَى الْمَجْهُولِ مُرَاعَاةً لِقَوْلِهِ " فَلَمْ يُؤْذَنْ لِي "، وَيَجُوزُ أَنْ يَكُونَ بِصِيغَةِ الْفَاعِلِ، ذَكَرَ ابْنُ الْجَوْزِيِّ فِي كِتَابِ الْوَفَاءِ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ - صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ - بَعْدَ وَفَاةِ أَبِيهِ كَانَ مَعَ أُمِّهِ آمِنَةَ، فَلَمَّا بَلَغَ سِتَّ سِنِينَ خَرَجَتْ بِهِ إِلَى أَخْوَالِهَا بَنِي عَدِيِّ بْنِ النَّجَّارِ بِالْمَدِينَةِ تَزُورُهُمْ، وَمِنْهُمْ أَبُو أَيُّوبَ، ثُمَّ رَجَعَتْ بِهِ إِلَى مَكَّةَ، فَلَمَّا كَانُوا بِالْأَبْوَاءِ تُوُفِّيَتْ فَقَبْرُهَا هُنَاكَ، وَقِيلَ: لَمَّا افْتَتَحَ رَسُولُ اللَّهِ - صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ - مَكَّةَ زَارَ قَبْرَهَا بِالْأَبْوَاءِ، ثُمَّ قَامَ مُسْتَعْبِرًا، فَقَالَ: " «إِنِّي اسْتَأْذَنْتُ رَبِّي فِي زِيَارَةِ قَبْرِ أُمِّي فَأَذِنَ لِي، وَاسْتَأْذَنْتُهُ بِالِاسْتِغْفَارِ لَهَا فَلَمْ يَأْذَنْ لِي» "، وَنَزَلَ {مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَنْ يَسْتَغْفِرُوا لِلْمُشْرِكِينَ وَلَوْ كَانُوا أُولِي قُرْبَى} [التوبة: 113] الْآيَةَ. وَأَغْرَبَ ابْنُ حَجَرٍ حَيْثُ قَالَ: وَلَعَلَّ حِكْمَةَ عَدَمِ الْإِذْنِ فِي الِاسْتِغْفَارِ لَهَا إِتْمَامُ النِّعْمَةِ عَلَيْهِ بِإِحْيَائِهَا لَهُ بَعْدَ ذَلِكَ حَتَّى تَصِيرَ مِنْ أَكَابِرِ الْمُؤْمِنِينَ، أَوِ الْإِمْهَالُ إِلَى إِحْيَائِهَا لِتُؤْمِنَ بِهِ فَتَسْتَحِقَّ الِاسْتِغْفَارَ الْكَامِلَ حِينَئِذٍ اهـ وَفِيهِ أَنَّ قَبْلَ الْإِيمَانِ لَا تَسْتَحِقُّ الِاسْتِغْفَارَ مُطْلَقًا، ثُمَّ الْجُمْهُورُ عَلَى أَنَّ وَالِدَيْهِ - صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ - مَاتَا كَافِرَيْنِ، وَهَذَا الْحَدِيثُ أَصَحُّ مَا وَرَدَ فِي حَقِّهِمَا، وَأَمَّا قَوْلُ ابْنِ حَجَرٍ: وَحَدِيثُ إِحْيَائِهِمَا حَتَّى آمَنَا بِهِ ثُمَّ تُوُفِّيَا حَدِيثٌ صَحِيحٌ، وَمِمَّنْ صَحَّحَهُ الْإِمَامُ الْقُرْطُبِيُّ، وَالْحَافِظُ ابْنُ نَاصِرِ الدِّينِ، فَعَلَى تَقْدِيرِ صِحَّتِهِ لَا يَصْلُحُ أَنْ يَكُونَ مُعَارِضًا لِحَدِيثِ مُسْلِمٍ مَعَ أَنَّ الْحُفَّاظَ طَعَنُوا فِيهِ، وَمَنَعُوا جَوَازَهُ أَيْضًا بِأَنَّ إِيمَانَ الْيَأْسِ غَيْرُ مَقْبُولٍ إِجْمَاعًا كَمَا يَدُلُّ عَلَيْهِ الْكِتَابُ وَالسُّنَّةُ، وَبِأَنَّ الْإِيمَانَ الْمَطْلُوبَ مِنَ الْمُكَلَّفِ إِنَّمَا هُوَ الْإِيمَانُ الْغَيْبِيُّ، وَقَدْ قَالَ تَعَالَى {وَلَوْ رُدُّوا لَعَادُوا لِمَا نُهُوا عَنْهُ} [الأنعام: 28] وَهَذَا الْحَدِيثُ الصَّحِيحُ صَرِيحٌ أَيْضًا فِي رَدِّ مَا تَشَبَّثَ بِهِ بَعْضُهُمْ بِأَنَّهُمَا كَانَا مِنْ أَهْلِ الْفَتْرَةِ، وَلَا عَذَابَ عَلَيْهِمَا مَعَ اخْتِلَافٍ فِي الْمَسْأَلَةِ، وَقَدْ صَنَّفَ السُّيُوطِيُّ رَسَائِلَ ثَلَاثَةً فِي نَجَاةِ وَالِدَيْهِ - صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ - وَذَكَرَ الْأَدِلَّةَ مِنَ الْجَانِبَيْنِ، فَعَلَيْكَ بِهَا إِنْ أَرَدْتَ بَسْطَهَا.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مکہ اور مدینہ کے درمیان واقع مقام ابواء پر اپنی والدہ ماجدہ کی قبر انور کی جب زیارت فرمائی تو آپ ﷺ رو پڑے، آپ ﷺ کا یہ رونا یا تو والدہ ماجدہ کی جدائی کی وجہ سے

تھا، یا انہیں عذاب میں دیکھ کر رو دیئے یا ان کی موت سے اپنی موت یاد آنے پر روئے۔ ابن الملک کہتے ہیں کہ اس حدیث کے واقعہ سے اس کا جواز نکلتا ہے کہ قبرستان میں جاتے وقت وہاں رونا درست ہے آپ اس قدر روئے کہ جو لوگ آپ کے ارد گرد تھے، انہیں بھی آپ ﷺ نے رلا دیا۔ کہا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا اپنی والدہ کی قبر کی زیارت کرنا باوجود اس کے کہ وہ کافرہ تھیں اس بات کی تعلیم دیتا ہے کہ امت کے ہر فرد کو اپنے والدین اور اقارب کے حقوق کا بہر حال خیال رکھنا چاہیئے۔ کیونکہ آپ ﷺ نے اپنی والدہ کے کافرہ ہونے کے باوجود ان کے حقوق پورے کیے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میں نے اپنے پروردگار سے والدہ کے لیے مغفرت کرنے کی اجازت طلب کی تو مجھے اجازت نہ دی گئی۔ ابن الملک نے کہا کہ اجازت نہ ملنا اس وجہ سے تھا کہ وہ کافرہ تھیں۔ اور کفار کے لیے دعائے مغفرت کرنا جائز نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انہیں کبھی بھی مغفرت نہیں مل سکتی اور فرمایا کہ میں نے اپنے رب سے والدہ کی قبر کی زیارت کا سوال کیا کہ اس کی اجازت دی جائے تو اس کی اجازت دے دی گئی۔ ابن الجوزی نے کتاب الوفاء میں ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنے والد گرامی حضرت عبد اللہ کے انتقال کے بعد اپنی والدہ محترمہ سیدہ آمنہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس تشریف فرما تھے، جب آپ ﷺ کی عمر شریف چھ برس کی ہوئی تو آپ ﷺ کی والدہ آپ کو لے کر مدینہ منورہ کی طرف تشریف لے گئیں کیونکہ وہاں بنی عدی بن النجار میں ان کے ماموں تھے۔ اُن کی زیارت کرنا چاہتی تھیں۔ ان ہی سے ابو ایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا تعلق بھی ہے، زیارت کے بعد واپس مکہ روانہ ہوئیں۔ جب یہ قافلہ مقام ابواء پر پہنچا تو یہاں آپ ﷺ کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ یہیں ان کی قبر بنائی گئی اور دفن کر دی گئیں، اور کہا گیا کہ جب رسول اللہ ﷺ نے مکہ فتح فرمایا تو مقام ابواء پر اپنی والدہ ماجدہ کی قبر کی زیارت کی پھر قبر سے ذرا ہٹ کر کھڑے ہو گئے اور خوب روئے اور فرمایا میں نے اپنے رب سے اپنی والدہ کی قبر کی زیارت کرنے کی اجازت مانگی، تو اس نے مجھے اجازت عطاء فرما دی۔ اور میں نے ان کے لیے استغفار کی اجازت بھی طلب کی تو یہ اجازت نہ ملی.

اور یہ آیت کریمہ نازل ہوئی:

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَنْ يَسْتَغْفِرُوا لِلْمُشْرِكِينَ وَلَوْ كَانُوا أُولِي قُرْبَى (التوبۃ ۱۱۳)

نبی اور ایمان والوں کو لائق نہیں کہ مشرکوں کی بخشش چاہیں اگرچہ وہ رشتہ دار ہوں۔

علامہ ابن حجر مکی نے یہاں ایک بڑی عجیب بات کہی وہ یہ کہ حضور ﷺ کو اپنی والدہ ماجدہ کے لیے استغفار کی اجازت اس وقت شاید اس لیے نہ دی گئی کہ اللہ تعالیٰ اُن پر اپنی نعمت مکمل طور پر اتارنا چاہتا تھا۔ وہ اس طرح کہ حضور ﷺ کی خاطر اللہ تعالیٰ انہیں دوبارہ زندہ فرمائے گا۔ پھر وہ ایمان لا کر اکابرین مومنین میں شمار ہوں گی یا یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے

اپنے حبیب ﷺ کو اس بات کی مہلت دینا تھی کہ آپ ﷺ کے لیے آپ ﷺ کی والدہ کو زندہ کر کے اُن کا آپ پر ایمان لانا مقصود تھا۔ تاکہ وہ مستحق استغفار کامل ہو جائیں۔

ابن حجر کے اس بیان میں ایک اشکال ہے کہ ایمان سے قبل آپ کی والدہ تو مطلقاً استغفار کی مستحق نہ تھیں۔ (حالانکہ آپ ﷺ نے استغفار کی اجازت ان کے ایمان لانے سے قبل ہی طلب کی تھی) پھر جمہور اس پر ہیں کہ حضور ﷺ کے والدین دونوں حالت کفر پر مرے ہیں اور یہ حدیث (دونوں کا حالت کفر پر مرنا) ان احادیث میں سے اصح ہے۔ جو اس موضوع پر مذکور ہیں، اور ابن حجر کا یہ قول کہ یہ حدیث کہ جس میں آپ ﷺ کے والدین کریمین کا دوبارہ زندہ ہونا اور آپ ﷺ پر دونوں کا ایمان لانا اور پھر فوت ہو جانا صحیح ہے۔ اور اس کی تصحیح کرنے والوں میں امام قرطبی اور الحافظ بن ناصر الدین بھی ہیں۔ تو اگر اس حدیث کی واقعی صحت تسلیم کر بھی لی جائے تو پھر بھی حدیث مسلم کی معارض بننے کی اس میں صلاحیت نہیں ہے باوجود اس کے بھی کہ حفاظ نے اس میں طعن بھی کیا اور اس کے جواز کو منع بھی کیا ہے، کہ ناامیدی کا ایمان بالاجماع غیر مقبول ہے۔ جیسا کہ کتاب و سنت اس پر دلالت کرتے ہیں۔ اور یہ بھی کہ جو ایمان کسی عاقل بالغ سے مطلوب ہے وہ ایمان غیبی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا قول ہے کہ اگر انہیں پھر سے دنیا میں لوٹا دیا جائے تو یہ لوگ پھر وہی کریں گے جس سے انہیں روکا گیا۔ اور یہ حدیث صحیح اس نظریہ کا بھی صراحتاً رد کرتی ہے، جو بعض علماء نے قائم کیا وہ یہ کہ آپ ﷺ کے والدین کریمین اہل فترت میں سے تھے اور اہل فترت پر عذاب نہیں، حالانکہ اس مسئلہ میں اختلاف ہے۔ علامہ السیوطی نے حضور ﷺ کے والدین کریمین کے نجات پانے اور جنتی ہونے پر تین رسائل لکھے ہیں، ان میں علامہ نے دونوں طرف کے دلائل پیش کیے ہیں۔ اگر اس مسئلہ کی تفصیل مطلوب ہے، تو پھر ان رسائل کی طرف رجوع کرو۔[1]

ملا علی قاری کی مذکورہ عبارت سے مندرجہ ذیل امور ثابت ہوئے

۱۔ بقول ابن الملک رسول اللہ ﷺ کا اپنی والدہ ماجدہ کی قبر کے پاس رونا اس وجہ سے تھا کہ آپ ﷺ نے انہیں عذاب میں گرفتار دیکھا۔

۲۔ آپ ﷺ نے اپنی والدہ کے کافر ہوتے ہوئے بھی ان کے حقوق (زیارت قبر) کا خیال رکھا۔

۳۔ والدہ کے لیے استغفار کی اجازت طلب کرنے پر مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَ الَّذِينَ آمَنُوا، الخ آیت اتری۔

---

[1] (مرقاۃ المفاتیح شرح مشکوۃ المصابیح ج۴ ص ۱۱۳ باب زیارۃ القبر مطبوعہ امدادیہ ملتان)

۴۔ ابن حجر نے استغفار کی اجازت نہ ملنے کی دو وجوہ ذکر کی ہیں۔ اول یہ کہ انہیں زندہ کر کے ایمان عطاء کیا جائے تا کہ اتمام نعمت ہو جائے، دوم یہ کہ جب زندہ ہو کر ایمان لائیں اور انتقال کریں تو اب استغفار کامل کے حق دار ہوں گے۔ ان دو وجوہ پر ملا علی قاری نے دو طرح سے اعتراض کیا۔ اول یہ کہ موت کے بعد ایمان غیر مقبول ہے، جس پر نص قرآنی موجود ہے، دوم زندہ کرنے والی حدیث کے مقابلہ میں مسلم شریف کی حدیث جس میں استغفار کی اجازت نہ ہونے کا ذکر ہے، اصح ہے، سوم یہ کہ جمہور کہتے ہیں کہ آپ ﷺ کے والدین حالت کفر پر مرے ہیں۔

۵۔ کفار کے بارے میں قرآن کہتا ہے کہ اگر انہیں دوبارہ دنیا میں بھیج دیا جائے تو اب بھی وہ وہی کچھ کریں گے جس سے انہیں منع کیا گیا۔ لہٰذا آپ کے والدین اگر دوبارہ آئے اور پھر انہوں نے ایمان قبول کیا۔ تو ایسا ہونا آیات قرآنیہ کو جھٹلاتا ہے۔

۶۔ استغفار کی اجازت نہ ملنے والی حدیث سے ان لوگوں کا بھی رد ہو گیا۔ جو آپ ﷺ کے والدین کو اہل فترت میں ہونے کی وجہ معذب نہیں کہتے۔

۷۔ اس مسئلہ پر علامہ السیوطی نے تین رسائل تحریر کیے۔ جن میں طرفین کے دلائل و جوابات موجود ہیں، ان کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔

امور مذکورہ کے بالترتیب جوابات

امر اول کا جواب:

سرکار دو عالم حضرت محمد ﷺ کا اپنی والدہ ماجدہ کی قبر کی زیارت کرنے کے وقت رونا مسلم ہے۔ اس رونے کی وجوہات کیا تھیں، ملا علی قاری نے (بحوالہ مرقاۃ شرح مشکوٰۃ) اس کی تین وجوہات بیان کیں۔ فراق، عذاب، موت ان میں سے فراق یعنی جدائی کو وجہ بنانا از روئے عقل و نقل درست اسی طرح موت کو بھی لیکن رونے کی وجہ والدہ کو عذاب میں ہونا دیکھنا عقلاً نقلاً قابل استشہاد نہیں عقلاً غیر مقبول ہونے کی صرف ایک مثال پیش خدمت ہے۔ وہ یہ کہ سیدنا حضرت یونس علیہ السلام جس مچھلی کے پیٹ میں چالیس روز تک پابند رہے، اور پھر باذن اللہ اس مچھلی نے آپ کو باہر کنارے پر اگال دیا۔ وہ مچھلی اس خدمت کے صلہ میں جنت میں جائے گی۔ اس کا جنتی ہونا تفاسیر میں موجود ہے، اس کے برعکس وہ خاتون کہ جس کے شکم میں نبی الانبیاء سید المرسلین ﷺ نو ماہ متواتر قیام پزیر رہیں، ان کی گود میں پرورش پائیں، ان کا دودھ نوش فرمائیں، وہ اس مچھلی کی طرح جنت میں نہ جاسکیں، عقل اسے تسلیم نہیں کرتی۔ لہٰذا از روئے عقل یہ بات بہت بعید ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے اپنی والدہ کو عذاب میں گرفتار ہوتے دیکھ کر گریہ فرمایا، اور نقلاً اس لیے باطل ہے کہ آپ ﷺ کی والدہ ماجدہ کا اس وقت انتقال ہوا جب آپ

ﷺ کی عمر شریف چھ برس کی تھی۔ گویا یقیناً انہوں نے آپ کی بعثت مبارکہ کا زمانہ نہ پایا جتنا عرصہ زندہ رہیں۔ اس میں کوئی ایک روایت ایسی نہیں ملتی جو ان کے شرک کرنے کی خبر دیتی ہو یا ان کے کفر پر دلالت کرتی ہو۔ جب کفر وشرک کے اثبات کی کوئی ضعیف روایت بھی نہیں، تو پھر اصل فترت کے پیش نظر انہیں کفر وشرک سے بری ثابت ماننا ضروری ہو گا۔ لہٰذا ان کے عذاب میں گرفتار ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہاں اگر زمانۂ بعثت پاتیں اور دعوت اسلام کو ٹھکراتیں تو پھر کفر وشرک کی وجہ سے معذب ہونا ہو سکتا تھا۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّى نَبْعَثَ رَسُولًا (الاسراء ۱۵)

اور ہم عذاب کرنے والے نہیں جب تک رسول نہ بھیج لیں۔

اس نص قرآنی کو مد نظر رکھا جائے تو آپ کی والدہ کے بارے میں عذاب ہونے کا عقیدہ سرے سے غلط ہو جاتا ہے، لہٰذا معلوم ہوا کہ ملا علی قاری کا سرکار دو عالم ﷺ کے زیارت قبر والدہ کے وقت گریہ فرمانا والدہ کے عذاب میں گرفتار ہونے کی وجہ سے تھا یہ ایک احتمال ہے۔ اس احتمال کے ثبوت کے لیے کوئی نص موجود نہیں۔

امر دوم کا جواب:

حضور ﷺ کا اپنی والدہ ماجدہ کی قبر کی زیارت کرنا باوجود اس کے آپ کی والدہ کافرہ تھی، اس پر ذہن میں ایک سوال ابھرتا تھا کہ حضور ﷺ کو اس کی کیا ضرورت تھی؟ اس مخفی سوال کا جواب اسی مفروضے کے پیش نظر ملا علی قاری نے "قیل" سے دیا ہے۔ وہ یہ کہ امت کو حقوق والدین کی تعلیم دینا مقصود تھی۔ یعنی اولاد کے لیے یہ ضروری ہے کہ والدین کے حقوق کا خیال رکھے اور ان کی ادائیگی ان کی زندگی تک ہی محدود نہ رکھے۔ بلکہ ان کے انتقال کے بعد بھی ان سے متعلقہ حقوق کی بجا آوری ہونی چاہیئے۔ چاہے اس کے والدین کفر وشرک کی موت مرے ہوں۔ یہ استدلال کس قدر بے تکا اور تار عنکبوت سے کمزور ہے۔ ماں کو تکلیف میں دیکھ کر رونا پڑا جس سے ماں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ اس طرح ماں کا کون سا حق پورا ہوا ہے۔ حق تو یہ تھا کہ اگر وہ عذاب میں گرفتار تھیں تو ان کی رہائی کروائی جاتی بقول ملا علی قاری حضور اکرم ﷺ اپنی والدہ کے کسی کام بھی نہ آسکے۔ بھلا اس میں امت کو کیا تعلیم دی گئی۔ اور والدہ کے حقوق کی بجا آوری کا کون سا طریقہ سکھایا گیا؟ علاوہ ازیں جب اللہ تعالیٰ واضح فرما رہا ہو، کہ ایسا مت کرو۔ تو اس کے حکم کو پس پشت ڈال کر والدہ کے حقوق کی ادائیگی کیونکر ممکن ہے؟

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَا تَقُمْ عَلَى قَبْرِهِ (التوبة ۸۴)

اور نہ اس کی قبر پر کھڑے ہونا۔

تفسیر مظہری میں اس کی تفسیر یوں مذکور ہے:

وَلاتَقُمْ عَلی قَبْرِهِ للدفن او للزيارة۔

یعنی مشرک کی قبر پر نہ تو اسے دفن کرنے کے لیے کھڑے ہوں اور نہ اس کی قبر کی زیارت کرنے کے لیے قیام ہو۔[1]

اس نص قرآنی کے ہوتے ہوئے آپ ﷺ کا تو اپنی والدہ ماجدہ (جبکہ انہیں کافریا مشرک سمجھا جائے) کی قبر پر جانا منع تھا۔ اب ملا علی قاری کی بات کو سامنے رکھا جائے تو یہ کہنا پڑے گا کہ سرکار دو عالم ﷺ اللہ تعالیٰ کے واضح حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے والدہ کی قبر کی زیارت کرنے گئے۔ لہٰذا ایسا کرنے سے انہوں نے والدہ کے کس حق کو ادا کیا۔ آخر والدین کے حقوق بھی تو اللہ کی طرف سے مقرر ہیں۔

امر سوم کا جواب:

جب سرکار دو عالم ﷺ نے اپنی والدہ ماجدہ کے لیے استغفار کی اجازت طلب لی، تو اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے آیت: مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَنْ يَسْتَغْفِرُوا لِلْمُشْرِكِينَ وَلَوْ كَانُوا أُولِي قُرْبَى (التوبة ۱۱۳) نازل فرمائی۔ اس واقعہ پر یہ آیت اترنے سے یہ معلوم ہو گیا کہ آپ ﷺ کی والدہ مشرکہ ہیں۔

ملا علی قاری نے آیت کے شان نزول کے ذریعہ اپنے نظریہ کی تائید کی۔ مختصر یہ کہ آیت مذکورہ کے نازل ہونے کا سبب یہی بنا کہ حضور اکرم ﷺ نے اپنی والدہ کے لیے مغفرت کی اجازت طلب کی تو ان کے مشرکہ ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے منع فرما دیا۔ آیت مذکورہ کا کیا یہی شان نزول ہے؟ محققین اور محدثین نے اس شان نزول کو غیر صحیح قرار دیا ہے۔ اور اس کے نزول کا صحیح اور اصل سبب ابو طالب کا معاملہ ہے۔ حوالہ ملاحظہ ہو:

روح المعانی:

والآية على الصحيح نزلت في أبي طالب فقد أخرج أحمد وابن أبي شيبة والبخاري ومسلم والنسائي وابن جرير وابن المنذر والبيهقي في الدلائل وآخرون عن المسيب ابن حزن قال: لما حضرت أبا طلب الوفاة دخل عليه النبي صلى الله عليه وسلم وعنده أبو جهل وعبدالله بن أبي أمية فقال النبي عليه الصلاة والسلام: أي عم قل: لا إله إلا الله أحاج لك بها عند الله فقال: أبو جهل: وعبدالله بن أبي أمية: يا أبا طالب أترغب عن ملة عبدالمطلب فجعل رسول الله صلى الله عليه وسلم يعرضها عليه وأبو جهل وعبدالله يعاودانه بتلك المقالة فقال أبو طالب آخر ما كلمهم: هو على ملة عبدالمطلب وأبى أن يقول: لا إله إلا الله فقال النبي صلى الله عليه وسلم: لأستغفرن لك مالم أنه عنك فنزلت ما كان

[1] (التفسير المظهري، ج۴، ص ۲۷۶)

للنبي الآية۔۔۔ وزعم بعضهم أن الآية نزلت في غير ذلک فقد أخرج البيهقي في الدلائل وغيره عن ابن مسعود قال: خرج النبي صلى الله عليه وسلم يوما إلى المقابر فجاء حتى جلس إلى قبر منها فناجاه طويلا ثم بكى فبكينا لبكائه ثم قام فصلى ركعتين فقام إليه عمر فدعاه ثم دعانا فقال: ما أبكاكم قلنا: بكينا لها فلم يأذن لي وأنزل علي ما كان للنبي إلخ فأخذني ما يأخذ الولد للوالدة من الرقة فذاک الذي أبكاني لا يخفى أن الصحيح في سبب النزول هو الأول۔

صحیح تحقیق کے مطابق آیت مذکورہ ابو طالب کے بارے میں نازل ہوئی امام احمد، ابن ابی شیبہ، بخاری، مسلم، نسائی، ابن جریر، ابن المنذر بیہقی نے الدلائل میں ان کے علاوہ دیگر مفسرین ومحدثین کرام نے مسیب بن حزن سے روایت ذکر کی کہ جب ابو طالب کا وقت مرگ قریب آیا تو رسول اللہ ﷺ اس کے پاس تشریف فرما ہوئے۔ اس وقت ابو طالب کے پاس ابو جہل اور عبد اللہ بن ابی امیہ بیٹھے ہوئے تھے۔ سرکار دوعالم ﷺ نے فرمایا: اے چچا! لا الہ الا اللہ پڑھ لے۔ میں اللہ تعالیٰ کے حضور تیرے بارے میں سفارش کروں گا۔ ابو جہل اور عبد اللہ بن ابی امیہ بولے: اے ابو طالب! کیا تو عبد المطلب کی ملت سے منہ موڑے گا؟ ایک طرف سے رسول اللہ ﷺ متواتر کلمہ پڑھنے کی پیشکش فرما رہے تھے اور دوسری طرف سے لگاتار عبد اللہ اور ابو جہل وہی بات کہے جا رہے تھے۔ ابو طالب نے ان کے ساتھ جو آخری بات کی وہ یہ تھی کہ وہ عبد المطلب کی ملت پر ہی ہے، اور لا الہ الا اللہ کہنے سے انکار کر دیا۔ سرکار دوعالم ﷺ نے فرمایا: میں تیرے لیے ضرور استغفار کروں گا۔ اور اس وقت تک کرتا رہوں گا جب تک مجھے روک نہیں دیا جاتا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی: مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَنْ يَسْتَغْفِرُوا لِلْمُشْرِكِينَ وَلَوْ كَانُوا أُولِي قُرْبَى (التوبة ۱۱۳) بعض اک زعم ہے کہ آیت مذکورہ اس قصہ کے علاوہ کسی اور موقع پر نازل ہوئی ہے۔ بیہقی نے دلائل میں اور کئی دوسرے حضرات نے ابن مسعود سے یہ روایت ذکر کی کہ نبی کریم ﷺ ایک دن قبرستان تشریف لے گئے۔ آپ ایک قبر کے پاس بیٹھ گئے۔ وہاں طویل مناجات کیں پھر رو پڑے۔ پس ہم بھی آپ ﷺ کے رونے کی وجہ سے رو پڑے۔ پھر آپ ﷺ اٹھے اور دوگانہ ادا کیا۔ اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اٹھ کر آپ ﷺ کے پاس حاضر ہوئے۔ آپ ﷺ نے دعا مانگی، ہم سب نے بھی دعا مانگی۔ پھر پوچھا: اے صحابہ! تمہیں کیوں رونا آیا؟ یا تمہیں کس بات نے رلایا؟ ہم نے عرض کیا: آپ ﷺ کو روتے دیکھ کر ہم بھی رو پڑے، فرمایا: وہ قبر جس کے پاس میں بیٹھا تھا، وہ میری والدہ آمنہ کی قبر ہے۔ میں نے اپنے پروردگار سے اس کی زیارت کرنے کی اجازت طلب کی تو اللہ تعالیٰ نے مجھے اجازت دے دی، پھر میں نے والدہ کے لیے استغفار کی اجازت مانگی، لیکن اس کی اجازت نہ دی گئی۔ اور اس کے جواب میں مجھ پر یہ آیت اتری ہے: مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَنْ يَسْتَغْفِرُوا لِلْمُشْرِكِينَ وَلَوْ كَانُوا أُولِي قُرْبَى (التوبة ۱۱۳) اس سے میرے

دل میں ویسی ہی رقت پیدا ہوئی جو کسی بیٹے میں اپنی والدہ کے متعلق پیدا ہوتی ہے۔ اس رقت نے مجھے رلایا، اور مخفی نہ رہے کہ صحیح سبب نزول وہ پہلا ہی ہے۔ [1]

امر چہارم کا جواب:

ملا علی قاری نے مسئلہ موجودہ میں علامہ ابن حجر کی تحقیق اور تاویل ذکر کرتے ہوئے اس پر تعجب کا اظہار کیا۔ جس سے یہ بتلانا مقصود ہے کہ ابن حجر کی اس تحقیق کو وہ لایعنی اور بہت کمزور سمجھتے ہیں۔ بلکہ اس طرح سے ان پر تعریض کی جارہی ہے کہ اتنا فاضل آدمی دیکھو کیسی گھٹیا باتیں کرتا ہے۔ حالانکہ یہی ابن حجر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ملا علی قاری کے شیخ واستاد بھی ہیں۔ اپنے استاد کے کلام پر تعجب اور پھر اس کا رد کرنا گستاخی سے کم نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض علماء نے یہ تصریح کی کہ ملا علی قاری نے کثیر تعداد میں جید علماء کی توہین کی ہے۔ علماء کی توہین تو اپنے مقام پر سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ ماجدہ کے بارے میں جو الفاظ ان کی کتب میں مسطور ہیں۔ انہیں دیکھ پڑھ کر ہر مسلمان چونک اٹھتا ہے۔ مولانا عبد العزیز فرہاروی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے ان کلمات کا یوں ذکر کیا ہے۔

مرام الکلام فی عقائد الاسلام:

والتعجب من علی القاری الهروی الف رسالة فی تکفیرهما وقال فیها ان امنة اللعینة کافرة خالدة فی النار۔

ملا علی قاری ہروی پر تعجب ہے کہ اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین کریمین کی تکفیر پر ایک رسالہ لکھا اور اس میں یہ الفاظ بھی لکھے۔ "بے شک آمنہ ملعونہ کافرہ ہے۔ اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے وہ دوزخ کی آگ میں رہنے والی ہے"۔ [2]

نوٹ: ملا علی قاری کی مذکورہ ہرزہ سرائی کے بارے میں کیا سزا ملنی چاہیئے۔ ہم اس کا عنقریب ذکر کریں گے۔ اور ان علماء کرام کے اقوال بھی منقول ہوں گے جنہوں نے ملا علی قاری کے اس نظریہ کی تردید کی ہے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین کریمین کے بارے میں ان علماء کے معتقدات بھی پیش کیئے جائیں گے۔

ابن حجر مکی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے جو احتمالات بیان کیے، ان پر ملا علی قاری کا تعجب کرنا بھی قابل تعجب ہے۔ ابن حجر مکی نے یہی کہا کہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کو استغفار کی اجازت اس لیے نہ دی گئی تاکہ اس کے اثر سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ آپ کے والدین کے ساتھ بھلائی کا ارادہ رکھتا تھا۔ اور وہ طریقہ جو استغفار کے بدلہ میں آپ کو دیا جانا تھا۔ اُس میں والدین کریمین کی بہت بھلائی

---

[1] (تفسیر روح المعانی، ج ۱۱، ص ۳۴، ۳۳: مطبوعہ بیروت طبع جدید)

[2] (مرام الکلام فی عقائد الاسلام، ص ۶۲)

تھی۔ اور خود سرکار دوعالم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کی انتہائی خوشی بھی تھی۔ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے ایک روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کو ایک مرتبہ نہایت مغموم دیکھا۔ کچھ دیر گزری تو دیکھا کہ آپ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم بہت زیادہ خوش نظر آرہے ہیں۔ عرض کی: یارسول اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم! اس قدر خوشی کی کیا وجہ ہے؟ فرمایا: میں حجون گیا وہاں اللہ تعالیٰ نے میرے لیے میری والدہ کو دوبارہ زندہ کیا اور زندہ ہو کر انہوں نے مجھ پر ایمان لایا۔ اس پر آج میں بہت زیادہ خوش ہوں۔ (یہ روایت علامہ السیوطی نے "نشر العلمین المنیفین فی احیاء الابوین الشریفین" کے صفحہ نمبر ۵ پر ذکر کی ہے) استغفار کی اجازت نہ ملنے کے بدلے میں اللہ تعالیٰ نے آپ کی والدہ کو زندہ کیا اور وہ مشرف باسلام ہوئیں۔ اس طرح اُن کو اعلیٰ مرتبہ سے نوازا تو استغفار نہ ملنا ایک اعلیٰ مرتبہ دیے جانے کی وجہ سے تھا۔ لیکن ملا علی قاری اس اعلیٰ مرتبہ دیے جانے کے متعلق اپنے استاد ابن حجر مکی پر اظہار تعجب کر رہے ہیں۔ جبکہ اس کی تائید ایک حدیث سے بھی ہو رہی ہے۔ چونکہ ملا علی قاری کے ذہن میں آپ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کے والدین کریمین کے بارے میں کفر کا تصور بھی بھرا ہوا ہے۔ اس لیے ان کا رجحان بھی انہی دلائل اور اقوال کی طرف ہو گا۔ جو اس کے مؤید ہوں، ورنہ وہ احتمالات جو ان کے اسلام پر دال ہیں۔ ان کو اولیت دی جائے، استغفار سے روکنا اس وجہ سے بھی ہو سکتا ہے۔ کہ وہ استغفار کے محل ہی نہ تھے۔ وہ اس طرح کہ پہلے انہیں دعوت اسلام پہنچے اسے وہ قبول کریں۔ اور پھر کچھ گناہ سرزد ہو جائیں۔ جب آپ کے والدین کے گناہ کا صدور نظر نہیں آتا تو پھر ان کے لیے استغفار کرنے کا کیا فائدہ؟ یہی بات درج ذیل حوالہ سے ملاحظہ ہو۔

الفتح الربانی لترتیب مسند امام احمد حنبل شیبانی

قيل ولعله لم يؤذن للنبي صلى الله عليه وسلم في الاستغفار لأمه لأنه فرع المؤاخذة على الذنب، ومن لم تبلغه الدعوة لا يؤاخذ على ذنبه فلا حاجة إلى الاستغفار لها، ولأن عدم الإذن بالاستغفار لها لا يستلزم أن تكون كافرة۔

کہا گیا ہے کہ حضور صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کو اپنی والدہ کے لیے استغفار کی اجازت نہ ملنے کی یہ وجہ ہو کہ استغفار دراصل کسی کے گناہوں کے مواخذہ کی فرع ہے۔ (یعنی گناہگار کو مواخذہ کا خطرہ ہو۔ اور اس سے چھٹکارا کے لیے اس کی مغفرت کی دعا کی جائے) اور وہ شخص جسے دعوت اسلام نہیں پہنچی، اس کے گناہوں کی وجہ سے اس کا مؤاخذہ نہ ہو گا۔ لہٰذا آپ کی والدہ کے لیے استغفار کی ضرورت نہ تھی اور استغفار کی اجازت نہ ملنے سے یہ کب لازم آتا ہے کہ وہ (آپ کی والدہ ماجدہ) کافرہ تھیں۔[1]

[1] (الفتح الربانی لترتیب مسند امام احمد حنبل شیبانی، ج۸، ص ۱۵۹)

ایک مثال سے وضاحت

استغفار کی اجازت نہ ملنا کسی کے کافر ہونے کی دلیل نہیں۔ ہم اس کو ایک شرعی مثال سے واضح کرتے ہیں۔ نماز جنازہ میت کے لیے استغفار کا ایک طریقہ ہے۔ (میت بالغہ مرد و عورت) کے لیے تمام موجود نمازی اللہ تعالیٰ سے ان الفاظ کے ذریعہ طلب مغفرت کرتے ہیں: اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِحَیِّنَا وَ مَیِّتِنَا، الخ اے اللہ! ہمارے زندوں اور ہمارے مردوں کو بخش دے، لیکن میت اگر نابالغ ہو تو اس کے لیے طلب مغفرت کی اجازت نہیں۔ یعنی حضور ﷺ نے نابالغ کی نماز جنازہ میں اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِحَیِّنَا، الخ پڑھنے کی بجائے دوسری دعا پڑھنے کو کہا۔ اب ملا علی قاری والی دلیل یہاں چلائی جائے تو لازم آئے گا کہ ہر مسلمان بچہ اور بچی مشرک اور کافر ہو جائے۔ کیونکہ اس کے مرنے کے بعد اس کے لیے استغفا کی اجازت نہیں۔ اور جس کے لیے استغفار کی اجازت نہ ہو وہ اس کے کافر ہونے کی دلیل ہے۔ اس کی بجائے اگر یوں کہا جائے کہ رسول اللہ ﷺ نے نابالغ کے لیے دعائے مغفرت کی بجائے: اَللّٰھُمَّ اجْعَلْہُ لَنَا فَرَطًا وَ اجْعَلْہ لَنَا اَجْرًا و ذُخْرًا، الخ پڑھنے کو اس لیے فرمایا کہ اسے مغفرت کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ اس نے دور تکلیف ہی نہ پایا۔ گناہ و نافرمانی کی عمر پانے سے پہلے ہی وہ اللہ تعالیٰ سے جا ملا۔ اگرچہ اسے علماء کی تقریریں سننے کا بارہا موقع ملا۔ اسلام کی دعوت اس تک پہنچی لیکن وہ گناہگار نہیں اس لیے گناہوں کے بخشنے کی دعا نہیں بلکہ اسے اپنے لیے شفاعت کرنے والا اور مقبول الشفاعۃ ہونے کی دعاء کی جارہی ہے۔ اس طرح سرکار دوعالم ﷺ کے والدین کریمین کو تو دعوت اسلام کے ملنے کا نام و نشان تک نہ تھا۔ کیونکہ دعوت حضور ﷺ نے آکر دینا تھی اور آپ ﷺ کے والد تو آپ ﷺ کے پیدا ہونے سے قبل اور آپ ﷺ کی والدہ آپ ﷺ کی چھ برس کی عمر میں انتقال کر گئی تھیں۔ اس لیے ان کے لیے استغفار کی اجازت نہ ملنا اس بنا پر تھا کہ وہ اس کا محل نہ تھے۔

ملا علی قاری کا بے ربط استدلال

ملا علی قاری نے قرآن کریم کی ایک آیت اپنی تائید میں پیش کی۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر کوئی شخص مرتے وقت حالت ناامیدی میں ایمان قبول کرتا ہے، اس کا ایمان مقبول نہیں۔ بلکہ وہ پہلے کی طرح کفر پر ہی مر گیا۔ آیت قرآنیہ یہ ہے: وَلَیْسَتِ التَّوْبَۃُ، الخ (النساء ۱۸) یہی آیت ملا علی قاری کے ہم نوا بڑے زور و شور سے پیش کرتے ہیں۔ اور حضور ﷺ کے والدین کریمین کا اس سے غیر مؤمن ہونا ثابت کرتے ہیں۔ جہاں تک اس آیت کا شان نزول ہے اس بارے میں ہم ان تمام ہم خیالوں کو چیلنج کرتے ہیں کہ کسی ایک تفسیر میں یہ دکھا دو کہ آیت مذکورہ رسول اللہ ﷺ کے والدین کے بارے میں نازل ہوئی، تو منہ

مانگا انعام دیا جائے گا۔ یا خاص کر والدین نہیں بلکہ عام طور پر ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جو اہل فترت کہلاتے ہیں؟ اگر ایسا نہیں تو پھر اس کا مصداق سرکار دوعالم ﷺ کے والدین کریمین کو بنانا کہاں کی دانشمندی ہے۔

اب ہم اس کے دوسرے پہلو کی طرف آتے ہیں۔ وہ یہ کہ جب اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ایمان یاس کو نامقبول کہا۔ یعنی اگر کوئی کافر مرتے وقت ناامیدی کی حالت میں ایمان کا دامن پکڑنا چاہتا ہے تو یہ ایمان قابل اعتبار نہیں، کیونکہ یہ ایمان شہودی ہے۔ اور معتبر ایمان وہ ہے جو غیبی ہو، لہٰذا مرنے کے بعد ایمان لانا کیونکر معتبر ہوگا؟ اور رسول اللہ ﷺ کے والدین مرنے کے بعد زندہ ہونے اور پھر ایمان لانے کا اسی قاعدہ کی بناء پر کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ وہ اسی طرح اور اسی کیفیت پر ہی رہیں گے جو بوقت انتقال تھی، ہم اس مغالطہ کے بارے میں کہتے ہیں کہ اگر والدین کریمین کو زندہ کرنے اور ان پر ایمان پیش کرنے کا واقعی کوئی فائدہ نہ تھا تو سرکار دوعالم ﷺ نے ایسا کیوں کیا؟ بلکہ اللہ تعالیٰ نے بطور معجزہ آپ ﷺ کے والدین کریمین کو اس مقصد کی خاطر کیوں زندہ ہونے دیا؟ یہ اعتراض تو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ پر ہوگا۔ عجیب بات یہ ہے کہ جس حدیث پاک میں حضور ﷺ کا اپنے والدین کریمین کو زندہ کرنے اور اسلام پیش کرنے کا واقعہ مذکور ہے۔ اس کی صحت کا خود ملا علی قاری بھی اقرار کرتے ہیں اور اس کے مصححین میں کچھ اکابر کے نام بھی دیتے ہیں، حالانکہ ایک محدث ہونے کے ناطے سے وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ فضائل میں ضعیف حدیث بھی مسلم ہے، یہ حدیث ضعیف نہیں بلکہ صحیح ہے۔ اور پھر اس سے پہلو تہی کی جا رہی ہے۔ علاوہ ازیں اگر زندہ کرنے اور اسلام قبول کرنے کے واقعہ کو رسول اللہ ﷺ کے خصائص میں سے شمار کر لیا جائے تو بھی اس میں سکون قلب کا سامان موجود ہے۔ اور یوں اس واقعہ میں عقل کو دولتیاں مارنے کی ضرورت بھی باقی نہیں رہے گی۔

ایک مغالطہ اور اس کا جواب

اگر تسلیم کر لیا جائے کہ آپ ﷺ نے اپنے والدین کریمین کو زندہ کیا اور پھر انہیں ایمان لانے کی دعوت دی۔ جو انہوں نے قبول کر لی تو اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ واقعی حالت کفر پر مرے تھے۔ تبھی انہیں ایمان واسلام کی دعوت دی گئی۔ ورنہ مسلمان کو پھر سے اسلام لانے اور کلمہ پڑھنے کے لیے زحمت دینا کوئی معقول بات نظر نہیں آتی۔

اس مغالطہ کا جواب یہ ہے کہ آپ ﷺ کے والدین کریمین مسلمان تھے اور ایمان پر ہی ان کا خاتمہ ہوا تھا۔ لیکن جس دور میں پیدا ہوئے اور انتقال کر گئے وہ دور پیغمبر اور رسول کی موجودگی سے خالی تھا۔ یعنی زمانۂ فترت تھا، اور اس دور میں صرف موحد ہونا ہی نجات کے لیے کافی ہوتا ہے لیکن ایمان کی تفصیل اور مضبوطی امر زائد ہے۔ اس لیے سرکار دوعالم ﷺ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ آپ ﷺ کے والدین ایمان بالتوحید کے ساتھ ساتھ ایمان بالرسالت کا مرتبہ بھی پائیں۔ اور نبی آخر

الزماں ﷺ کی امت اجابت کا شرف پائیں۔ لہٰذا والدین کریمین رسول اللہ ﷺ کا احیاء اور ان کا ایمان لانا اس وجہ سے متحقق ہوا کہ ایمان کے اعلیٰ مراتب و مدارج انہیں عطاء کیے جائیں۔

ذالک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء

دونوں احادیث میں تطبیق ہو سکتی ہے

حضور ﷺ کے معجزہ کی برکت سے آپ ﷺ کی والدہ ماجدہ سیدہ آمنہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا زندہ ہونا اور حضور ﷺ کو زیارت قبر والدہ کی اجازت ملنا لیکن استغفار کی اجازت نہ ملنے ان دونوں احادیث کا ملا علی قاری نے یوں موازنہ کیا کہ اول الذکر حدیث اگرچہ صحیح ہے۔ لیکن موخر الذکر بوجہ اصح ہونے کے معتبر ہے۔

اور اول الذکر غیر معتبر کہہ کر دوسری کو بالکل چھوڑ دیا جائے۔ بلکہ اس سے پہلے دونوں میں تطبیق کی کوشش کی جائے۔ اور اگر ان میں تطبیق ہو سکتی ہو تو پھر یہ طریقہ سب سے بہتر ہے جب غور کیا جائے، تو ان دونوں میں تطبیق ہو سکتی ہے۔ وہ اس طرح کہ حدیث مسلم (مؤخر الذکر) میں دو باتیں ذکر ہوئیں:

(۱) استغفار کی اجازت نہ ملنا (۲) قبر کی اجازت مل جانا

ان دونوں باتوں میں سے پہلی بات کو ملا علی قاری وغیرہ نے آپ ﷺ کی والدہ کے کافرہ ہونے کی دلیل بنائی۔ لیکن زیارت قبر کی اجازت دینا بھی تو اس کے حق میں نہیں جاتا۔

کیونکہ قرآن کریم نے ارشاد فرمایا:

وَلَا تُصَلِّ عَلَىٰ أَحَدٍ مِّنْهُم مَّاتَ أَبَدًا وَلَا تَقُمْ عَلَىٰ قَبْرِهِ (التوبۃ ۸۴)

اور ان میں سے کسی کی میّت پر کبھی نماز نہ پڑھنا اور نہ اس کی قبر پر کھڑے ہونا۔

آیت مذکورہ میں کفار و مشرکین کے مرنے کے بعد اُن کی نماز جنازہ سے منع کیا گیا۔ جسے ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ان کے لیے استغفار کی اجازت نہ دی گئی اور دوسری بات جس سے منع کیا گیا وہ قیام قبر یعنی اس کی قبر کی زیارت کرنا ہے، اب ان دونوں باتوں سے روکنا جب مرنے والے کے کفر و شرک کی وجہ سے ہوا تو صاف ظاہر کہ کسی کافر کی قبر کی زیارت کرنے کی بھی اجازت نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو دونوں میں ایک کام کی اجازت دی۔ اور ادھر خود ہی دونوں سے تمام مسلمانون کو بالتبع منع کیا جا رہا ہے۔ یا یوں کہہ لیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے کسی کافر کے مرنے کے بعد ان دو باتوں سے منع کر دیا تھا۔ تو پھر منع کے باوجود ان دونوں باتوں کے کرنے کی حضور ﷺ کا اجازت طلب کرنا احکام خداوندی میں دخل دینا ہے۔ اگر آپ ﷺ نے بھول کر یا فرط جذبات میں اجازت طلب ہی کر لی تھی تو اللہ تعالیٰ فورًا آپ کی توجہ **وَلَا تُصَلِّ عَلَىٰ أَحَدٍ مِّنْهُم مَّاتَ أَبَدًا**

(التوبۃ ۸۴) کی طرف فرما دیتا۔ اور یوں نہ استغفار کی اجازت سے انکار ہوتا بلکہ زیارت قبر سے بھی روک دیا جاتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان خرابیوں اور اعتراضات کی بجائے اگر یہ کہا جائے کہ آپ ﷺ کی والدہ مسلمان تھیں، موحدہ تھیں، توحید پر انتقال ہوا۔ اس لیے حضور اکرم ﷺ کا ان کے لیے استغفار کی اجازت طلب کرنا ان کے مراتب میں مزید اضافہ کے لیے تھا، جس کو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے ہاتھوں انہیں زندہ کر کے طلب سے بھی زیادہ اعزاز عطاء فرما دیا۔ اور ان کا توحید پر رخصت ہونا متحقق تھا۔ اس لیے اُن کی قبر کی زیارت کی اجازت بھی مل گئی۔ یوں دونوں احادیث باہم متعارض نہ تھیں۔ لیکن بادی النظر میں انہیں متعارض کر دیا گیا تھا۔

کیا والدینِ رسول اللہ ﷺ کے کفر پر جمہور کا اتفاق ہے؟

علامہ ابن حجر مکی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی تحقیق پر تعجب کا اظہار کرتے ہوئے ملا علی قاری نے یہ جملہ بھی لکھا ہے: ثُمَّ الْجَمْهُوْرُ عَلٰی اَنَّ وَالِدَیْهِ ﷺ مَاتَا کَافِرَیْنِ۔ یعنی جمہور کا اس بات پر اتفاق ہے کہ حضور ﷺ کے والدین کا انتقال حالت کفر پر ہوا۔ ذرا اس کی حقیقت بھی دیکھیں، کیا واقعی جمہور اسی نظریہ کے قائل ہیں؟

علامہ جلال الدین السیوطی اسی موضوع پر رقمطراز ہیں:

ذَهَبَ جَمْعٌ كَثِیْرٌ مِنَ الْاَئِمَّةِ الْاَعْلَامِ اِلٰی اَنَّهُمَا نَاجِیَانِ وَ مَحْكُوْمٌ لَهُمَا بِالنَّجَاةِ فِی الْاٰخِرَةِ وَهُمْ اَعْلَمُ النَّاسِ بِاَقْوَالِ مَنْ خَالَفَهُمْ وَ قَالَ بِغَیْرِ ذٰلِكَ وَ لَا یَقْصُرُوْنَ عَنْهُمْ فِی الدَّرَجَةِ وَ مِنْ اَحْفَظِ النَّاسِ لِاَحَادِیْثَ وَ الْاٰثَارِ وَ مِنْ اَحْفَظِ النَّاسِ لِلْاَدِلَّةِ الَّتِیْ اِسْتَدَلَّ بِهَا اُولٰئِكَ فَاِنَّهُمْ جَامِعُوْنَ لِاَنْوَاعِ الْمَعْلُوْمِ مُتَضَلِّعُوْنَ مِنَ الْفُنُوْنِ خُصُوْصًا الْاَرْبَعَةِ الَّتِیْ یُسْتَمَدُّ مِنْهَا هٰذِهِ الْمَسْئَلَةُ فَاِنَّهَا مَبْنِیَّةٌ عَلٰی ثَلَاثِ قَوَاعِدَ كَلَامِیَّةٍ وَ اُصُوْلِیَّةٍ وَ فِقْهِیَّةٍ وَ قَاعِدَةٍ رَابِعَةٍ مُشْتَرِكَةٍ بَیْنَ الْحَدِیْثِ وَ اُصُوْلِ الْفِقْهِ مَعَ مَا یُحْتَاجُ اِلَیْهِ مِنْ سِعَةِ الْحِفْظِ فِی الْحَدِیْثِ وَ صِحَّةِ النَّقْدِ لَهٗ وَ طُوْلِ الباع فی الاطّلاع علی اقوال الائمة و جمع متفرقات کلامهم فلا یظن بهم انهم لم یقفوا علی الاحادیث الّتی استدل بها اولئک معاذ اللہ بل وقفوا علیها وَ خَاضُوْا غَمْرَتَهَا وَ جَابُوْا عَنْهَا الْاَجْوِبَةِ الْمَرْضِیَّةِ الَّتِیْ لَا یَرُدُّهَا مُنْصِفٌ وَ اَقَامُوْا لِمَا ذَهَبُوْا اِلَیْهِ اَدِلَّةً كَالْجِبَالِ الرَّوَاسِیِ۔

مشاہیر علماء کی ایک بہت بڑی جماعت کا یہ مذہب ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے والدین کریمین نجات یافتہ ہیں۔ اور اُن کو آخرت میں نجات پانے والے کہنا ضروری ہے۔ یہ گروہ علماء دوسرے لوگوں کی بہ نسبت اپنے مذہب کے مخالفین کے اقوال کو بہت بہتر جاننے والے ہیں۔ اور ان سے درجات میں بھی کم نہیں ہے۔ اور یہ حضرات احادیث و آثار کے حافظ ہیں۔ اور اپنے مخالفین کے مسلک کے دلائل کی تنقید کرنا بخوبی جانتے ہیں۔ کیونکہ یہ بیک وقت مختلف انواع علوم کے جامع اور فنون کی اقسام کے بہرہ ور ہیں۔ خاص کر ان چار علوم کے جو اس مسئلہ کی بنیاد بنتے ہیں۔ کیونکہ اس مسئلہ کے تین قواعد یعنی کلامیہ، اصولیہ اور فقہیہ بنیاد ہیں۔ اور چوتھا قاعدہ حدیث اور اصول فقہ کے درمیان مشترکہ ہے، اس کے ساتھ ساتھ حدیث پاک کے حفظ میں

وسعت اور صحیح تنقید اور حضرات ائمہ کے اقوال واقفیت اور ان کے متفرق کلام کے جمع کرنے کی صلاحیت یہ سب باتیں اُن علماء میں موجود ہیں۔ لہٰذا یہ گمان نہیں کیا جاسکتا کہ یہ حضرات اُن احادیث پر مطلع نہیں تھے جو ان کے مخالفین نے بطور دلیل ذکر کیں (معاذ اللہ) بلکہ وہ پوری طرح اُن سے آگاہ تھے اور ان میں خوب گہرائی تک پہنچے ہوئے تھے۔ اور ان کے پسندیدہ جوابات دیئے، جنہیں کوئی انصاف پسند رد نہیں کر سکتا۔ اور پھر اپنے مذہب کی تائید میں ایسے دلائل قائم کیے جو مضبوطی میں بڑے بڑے پہاڑوں کی طرح ہیں۔[1]

علامہ السیوطی کی اس تحریر سے ملا علی قاری کے اس دعوے کی قلعی کھل جاتی ہے۔ جو انہوں نے ابن حجر مکی کے قول پر تنقید کرتے ہوئے کیا تھا۔ بلکہ معاملہ اُلٹ نظر آتا ہے۔

امر پنجم کا جواب:

ملا علی قاری نے سرکار دوعالم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کے والدین ماجدین کے کفر و شرک کے ثبوت پر قرآن کریم کی یہ آیت کریمہ پیش کی: وَلَوْ رُدُّوا لَعَادُوا لِمَا نُهُوا عَنْهُ (الانعام ۲۸) اور اگر واپس بھیجے جائیں تو پھر وہی کریں جس سے منع کیے گئے تھے۔ کہا گیا کہ اللہ تعالیٰ مشرکین و کفار کے بارے میں صاف صاف اعلان فرمارہے ہیں کہ وہ دوبارہ زندہ بھی ہو جائیں اور دنیا میں پھر انہیں لوٹا دیا جائے تو بھی ان کے کرتوت ویسے ہی ہوں گے جیسا کہ پہلے کر کے مر گئے۔ لہٰذا نبی کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کے والدین کا اول تو زندہ ہونا ہی قابل ثبوت ہے۔ اور اگر تسلیم کر لیا جائے تو پھر جبکہ وہ کفر و شرک پر مرے تھے اب دوبارہ دنیا میں آکر ان کا کفر و شرک کو چھوڑنا اور ایمان قبول کر لینا آیت مذکورہ کے خلاف جاتا ہے۔ لہٰذا اگر دوبارہ زندہ ہونا ہوا بھی تو ان کا ایمان لانا قطعاً درست نہیں۔

آیت مذکورہ سے یہ استدلال بڑا عجیب و غریب ہے کیونکہ اس آیت سے پچھلے الفاظ میں اللہ تعالیٰ ایسے مشرکین کا ذکر کر رہا ہے۔ جنہیں کل قیامت کو جب جہنم میں ڈالے جانے کے لیے جہنم کے کنارے کھڑا کیا جائے گا تو وہ یہ تمنا کریں گے، کاش! اللہ تعالیٰ ہمیں دوبارہ دنیا میں بھیج دے۔ اور اگر ہماری یہ خواہش پوری ہو جائے تو پھر ہم وہ کام ہرگز نہیں کریں گے، جو ہم پہلے کرتے رہے۔ یعنی ہم بت پرستی چھوڑ دیں گے۔ اللہ تعالیٰ کو وحدہ لاشریک مانیں گے۔ اس کی آیات پر ایمان لائیں گے۔ اس کے رسولوں پر ایمان لائیں گے، گویا کفر و شرک کا ہر کام چھوڑ کر ایمان و اسلام پر عمل پیرا ہوں گے۔ ان لوگوں کے بارے میں بتایا گیا کہ جو کچھ کہہ رہے ہیں، یہ بھی غلط ہے۔ بلکہ اگر انہیں واپس بھیج دیا جائے تو وہی کچھ کریں گے جو کر کے آئے ہیں۔ اب اس

[1] (الدرجۃ المنیفہ فی آباء الشریفہ، ص ۳، ۲: مطبوعہ حیدر آباد دکن)

آیت کا مصداق رسول اللہ ﷺ کے والدین کو اگر بنایا جائے تو پھر یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ انہوں نے ان کفار و مشرکین نے اللہ تعالیٰ کو نہ مانا ہو۔ اپنے دور کے رسول کا انکار کیا ہو۔ قرآن کریم کی تکذیب کی ہو۔ حالانکہ آپ ﷺ کے والدین کا نہ کفر ثابت نہ شرک کا ان سے وجود، نہ ان کے زمانہ میں کوئی پیغمبر تھا کہ اس کی تکذیب کا فتویٰ دیا جاتا اور نہ ہی ابھی قرآن اترا تھا۔ کہ اسے اگلوں کے قصے کہانیاں کہنا ان سے منقول ہوتا اور پھر کن لوگوں کو انہوں نے قرآن کریم سے دور کرنے کی کوشش کی؟ یہی وہ جرم تھے جن کی بناء پر آیت مذکورہ کے مصداق کفار و مشرکین کو جہنم میں ڈالا جانے لگا۔

اور انہوں نے واپس دنیا میں آکر پھر ایسے کام نہ کرنے کی خواہش کی۔ تو جب والدین رسول کریم ﷺ سے حالت قیام دنیا میں ایسے جرائم ہوئے ہی نہیں پھر انہیں دوزخ پر پیش کرنے اور وہاں ان کی دنیا میں واپسی اور اچھے عمل کی خواہش کے اظہار کا کیا مطلب؟ لہٰذا یہ قیاس "قیاس مع الفارق" ہے۔ کسی مفسر سے آیت مذکورہ کی یہ تفسیر منقول نہیں۔ اور نہ ہی کسی نے آیت مذکورہ کو سرکار دو عالم ﷺ کے والدین کریمین پر چسپاں کیا ہے۔

امر ششم کا جواب:

ملا علی قاری نے مسلم شریف کی حدیث سے ایک اور استشہاد کیا وہ یہ کہ علماء کا نظریہ یہ ہے کہ جو لوگ زمانۂ فترت میں مرے انہیں عذاب نہ ہو گا۔ ملا علی قاری حدیث مذکورہ سے اس نظریہ کی تردید کرتے ہیں۔ وہ اس طرح کہ رسول اللہ ﷺ کے والدین بھی زمانۂ فترت سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور ان کو مرنے کے بعد عذاب ہو رہا ہے۔ لہٰذا یہ کہنا کہ اہل فترت کو عذاب نہ ہو گا درست نہیں، یہ استدلال بھی ملا علی قاری کے اپنے نظریہ کی تائید پر ہے۔ کیونکہ جب انہوں نے یہ باور کر لیا کہ رسول اللہ ﷺ کے والدین کریمین نجات یافتہ نہیں۔ بلکہ عذاب میں گرفتار ہیں۔ تو ان کے اہل فترت ہوتے ہوئے معذب ہونا مذکور قانون کی نفی کرتا ہے، اسے کہتے ہیں: "بناء الفاسد علی الفاسد" جب سرکار دو عالم حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے والدین کریمین کا معذب ہونا ہی مردود ہے تو اس پر کسی اور کا قیاس بھی نامقبول ہو گا۔ چونکہ اہل فترت کا ذکر آگیا۔ اور ان کے بارے میں دو متضاد نظریئے سامنے آگئے۔ ایک یہ کہ وہ معذب نہیں اور دوسرا یہ کہ یہ نظریہ غلط ہے۔ بلکہ وہ عذاب میں گرفتار ہوتے ہیں۔ اس لیے ہم نے اہل فترت کے بارے میں کچھ وضاحت کر دینا ضروری سمجھا۔ لہٰذا اس سلسلے میں ایک حوالہ ملاحظہ ہو۔

اہل فترت کی تین اقسام ہیں

الفتح الربانی لترتیب مسند امام احمد بن حنبل شیبانی

القسم الاول:

من ادرک التوحید ببصیرته من ھٰؤلاء من لم یدخل فی شریعته کقیس بن ساعده و زید بن عمرو بن نفیل و منهم من دخل فی شریعته حتیٰ قائمة الرسم کتبع و قومه۔

القسم الثانی:

من بدل و غیر و اشرک و لم یوحد و شرع لنفسه محلل و حرم۔۔۔۔۔۔

القسم الثالث:

من لم یشرک و لم یوحد و لا دخل في شریعة نبي و لا ابتکر لنفسه شریعة و لا اخترع دینا بل بقي عمره علی حال غفلة من هذا کله، و في الجاهلیة من کان کذلک۔

فإذا انقسم أهل الفترة إلی الثلاثة الأقسام فیحمل من صح تعذیبه علی أهل القسم الثاني لکفرهم بما لا یعذرون به (و أما القسم الثالث) فهم أهل الفترة حقیقة و هم غیر معذبین للقطع کما تقدم (و أما القسم الأول) فقد قال صلی الله علیه و سلم في کل من قس و زید إنه یبعث أمة وحده (و أما تبع و نحوه) فحکمهم حکم أهل الدین الذین دخلوا فیه ما لم یلحق أحد منهم الإسلام الناسخ لکل دین۔

وہ لوگ جنہوں نے اپنی بصیرت سے توحید پر ایمان لایا ان میں سے کچھ وہ ہیں۔ جو کسی شریعت میں داخل نہیں۔ جیسا کہ قیس بن ساعدہ اور زید بن عمرو بن نفیل۔ اور کچھ وہ ہیں جو کسی شریعت میں داخل ہو گئے حتیٰ کہ انہیں اس شریعت کے نشانات مل گئے۔ جیسا کہ تبع اور اس کی قوم۔

قسم ثانی:

وہ لوگ جنہوں نے دین تبدیل کر دیا، اور شرک کیا۔ اور توحید پر یقین نہ کیا۔ اور اپنے لیے خود اپنی سے طرف سے حلال اور حرام گھڑ لیئے۔

قسم ثالث:

وہ جس نے نہ شرک کیا اور نہ ہی توحید کو جانا اور نہ ہی کسی نبی کی شریعت میں داخل ہوا۔ نہ خود اپنی طرف سے اپنے لیے کوئی شریعت گھڑی اور نہ ہی کوئی دین بنایا بلکہ باقی ماندہ عمر اس نے پہلے کی سی غفلت کے مطابق بسر کرڈالی۔ اور جاہلیت میں بھی وہ ایسا ہی تھا۔

جب اہل فترت کی تین اقسام ہوئیں، تو اس کی روشنی میں قسم ثانی وہ ہے۔ جسے عذاب دیا جائے گا۔ لہٰذا جن لوگوں نے اہل فترت کو عذاب دیئے جانے کی بات کی ہے۔ ان کے نزدیک اہل فترت سے مراد یہ قسم ثانی ہے۔ کیونکہ وہ اپنے کفر کا کوئی عذر اور بہانہ نہیں کر سکیں گے۔ اور تیسری قسم کے لوگ جو حقیقت میں اہل فترت ہیں۔ انہیں قطعاً عذاب نہ ہو گا۔ جیسا کہ گزر چکا ہے۔ اور قسم اول تو اس کے بارے میں سرکار دوعالم ﷺ نے فرمایا: قیس بن ساعدہ اور زید بن عمرو بن نفیل ایک امت کی حیثیت سے اٹھیں گے۔ باقی تبع اور اسی قسم کے دوسرے لوگ ان کا حکم اہل دین کا حکم ہے۔ یعنی جس دین میں وہ داخل ہوئے وہ اسی میں شمار ہوں گے۔ ہاں اگر کوئی دین اسلام کو پائے جو تمام ادیان کا ناسخ ہے، اور پھر اسے قبول نہ کرے، تو اس کا معاملہ دیگر ہو گا۔[1]

لمحۂ فکریہ

اہل فترت کی اقسام اور ان کے متعلق علماء کے نظریات حوالہ بالا میں آپ نے ملاحظہ کیے۔ اہل فترت کے علی الاطلاق معذب ہونے کا قول کس قدر غیر محتاط ہے اور خود ساختہ مسلک و مذہب کی خاطر حق سے آنکھیں موندنا ہے۔ قسم ثالث کے لیے نصاً غیر معذب ہونے کا قول موجود ہے۔ اور قسم اول بھی ناجی ہے۔ صرف قسم ثانی کو عذاب سے چھٹکارے کے لیے کوئی بہانہ کام نہ دے گا۔ اب سرکار دوعالم حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے والدین شریفین کو ان اقسام کے اعتبار سے دیکھا جائے تو پھر ان کے انجام کا بھی پتہ چل جائے گا۔ ملا علی قاری نے خواہ مخواہ انہیں قسم ثانی میں داخل کیا۔ اور پھر اس قسم کے انجام کا ان پر بھی قول دیا۔ حالانکہ ان کے موحد ہونے اور دین ابراہیمی پر ہونے کے بہت سے دلائل ہیں جن کا عنقریب ایک مستقل فصل میں ذکر آرہاہے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ مسلم شریف کی حدیث سے جو استنباط کیا گیا وہ ابتداءً ہی غلط اور باطل ہے۔

---

[1] (الفتح الرباني لترتيب مسند الإمام أحمد بن حنبل الشيباني ومعه بلوغ الأماني من أسرار الفتح الرباني، ج٨، ص ١٦٨)

امر ہفتم کا جواب:

امر ہفتم میں کوئی اعتراض نہیں کہ جس کا جواب دیا جائے۔ بلکہ علامہ السیوطی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے اسی موضوع پر تحریر کیے گئے تین رسائل کی طرف رجوع کرنے کا مشورہ دیا گیا۔ ملا علی قاری نے یہ مشورہ اس لیے دیا۔ تاکہ اس موضوع پر اپنے دلائل کا وزن بڑھا سکیں۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ وہ یہ باور کروانا چاہتے ہیں کہ علامہ السیوطی نے جو دلائل رسول اللہ ﷺ کے والدین کریمین کے ناجی اور مسلمان ہونے پر قائم کیے ہیں۔ وہ اتنے مضبوط نہیں، جس قدر میرے دلائل مضبوط ہیں۔ اور اس کا انہوں نے شرح فقہ اکبر کے اندر بھی اعلان کیا ہے۔

شرح فقہ اکبر:

و قد افردن لهذه المسئلة رسالة مستقلة و دفعت ما ذكره السيوطی فی رسائله الثلاثة فی تقرية هذه المقالة بالادلة الجامعة المجتمعة من الكتاب و السنة و القياس و اجماع الامة۔

میں نے اسی مخصوص مسئلہ پر ایک مستقل رسالہ تحریر کیا ہے۔ جس میں میں نے علامہ السیوطی کے ان تین عدد تصنیف شدہ رسائل کا بخوبی دفاع کیا ہے جو انہوں نے حضور ﷺ کے والدین کریمین کے مسلمان ہونے کی تقویت پر لکھے ہیں۔ اور انہوں نے کتاب اللہ، سنت رسول ﷺ قیاس اور اجماع امت سے اس کی تائید میں بہت سے جامع دلائل پیش کیے۔[1]

کسی کے دلائل کا رد کر دینا یا اس کا دفاع کرنا اور ہے۔ اور پھر رد میں پیش کیے دلائل کا قوی ہونا الگ امر ہے۔ ہمیں یہ تسلیم کہ ملا علی قاری نے اپنے استاد ابن حجر مکی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی تحریر پر تعجب کا اظہار کیا۔ لیکن اس تعجب پر تعجب آپ ملاحظہ کر چکے۔ اسی طرح علامہ السیوطی کے رسائل میں پیش کیے گئے۔ دلائل اور ملا علی قاری کے اپنے مذہب پر دلائل ان میں قوی اور غیر قوی ہونے کا فریقین پر فیصلہ تو نہیں چھوڑا جا سکتا۔ ملا علی قاری خود اپنے دلائل کی تعریف کر رہے ہیں۔ دوسری چیز یہاں یہ بھی پیش نظر رہے کہ دلائل کسی دعویٰ کے ہوتے ہیں، دعویٰ غلط ہو تو دلائل بے شک وزنی ہوں اس سے دعویٰ کی صداقت ظاہر نہیں ہو سکتی۔ اور اگر دعویٰ بھی صحیح ہو اور دلائل بھی مضبوط تو احقاق حق کے لیے یہ ایک نعمت الٰہیہ ہے۔ علامہ السیوطی نے اپنے دلائل کی خود تعریف نہیں بلکہ اپنے دعویٰ کی سچائی پر امت کے جم غفیر کا قول پیش کیا۔ یہ قول پہلے ہم ذکر کر چکے ہیں۔ یہاں صرف اس کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔

---

[1] (شرح فقه اکبر، ص ۱۳۱، مطبع آفتاب هند)

"یہ گمان بھی نہ کیا جائے کہ اکابر امت جنہوں نے سرکار دو عالم ﷺ کے والدین کریمین کے جنتی ہونے کا نظریہ اپنایا۔ وہ قرآن وحدیث و آثار سے واقف نہ تھے۔ اور انہوں نے وہ روایات نہ پڑھی تھیں جن میں ان کا کفر ثابت ہوتا ہے۔ بلکہ یہ سب کچھ اُن کے سامنے تھا۔ اور وہ ان روایات کی تہہ تک پہنچنے والے ہیں۔ ان حضرات نے پھر ان روایات واقوال کے ایسے پسندیدہ جوابات تحریر کیے کہ اگر کوئی انصاف پسند دیکھے تو انہیں رد نہیں کرے گا۔ اور وہ دلائل وشواہد اتنے وزنی ہیں کہ گویا بڑے بڑے پہاڑ ہیں"۔

الحاصل

مسلم شریف کی حدیث سے ملا علی قاری کا حضور ﷺ کے والدین کریمین کا کافر ثابت کرنا، اور آپ کا انہیں دوبارہ زندہ کر کے مشرف باسلام کرنا اور اہل فترت کا معذب ہونا اور زندہ ہونے کے بعد ایمان نامقبول ہونا ان باتوں کا اس حدیث سے کوئی تعلق نہیں۔ بلکہ یہ ملا علی قاری کی اپنی کوشش تھی اور اپنی رائے تھی جس کا ہم نے تفصیل سے رد کیا ہے۔ سرکار دو عالم ﷺ کا اپنے والدین کریمین کو زندہ کرنا اور پھر انہیں دولت ایمان عطاء کرنا حضرات علماء کرام نے اسے آپ ﷺ کے خصائص میں سے شمار کیا ہے۔ اس لیے قرآنی آیات جو اس کے خلاف مضمون پر مشتمل ہیں وہ اپنے عمومی مورد پر محمول ہوتی ہیں۔ خصائص مصطفیٰ ﷺ کا ثبوت ان آیات قرآنیہ سے تعارض پیدا نہیں کرتا۔ لہٰذا جب احیاء ابوین کریمین آپ ﷺ کی خصوصیت ٹھہری تو پھر اس پر اعتراضات کی گنجائش کہاں سے آگئی۔

"احیاء ابوین کریمین" کے بعد ایمان حضور ﷺ کے خصائص میں سے ایک ہے

ردالمحتار (شامی):

ألا ترى أن نبينا - صلى الله عليه وسلم - قد أكرمه الله تعالى بحياة أبويه له حتى آمنا به كما في حديث صححه القرطبي وابن ناصر الدين حافظ الشام وغيرهما، فانتفعا بالإيمان بعد الموت على خلاف القاعدة إكراما لنبيه - صلى الله عليه وسلم۔

کیا تم نہیں جانتے کہ ہمارے پیغمبر ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے آپ کے والدین کریمین کو زندہ فرما کر پھر انہیں ایمان عطاء فرما کر کمال اعزاز عطاء فرمایا۔ جیسا کہ حدیث پاک میں یہ واقعہ پایا جاتا ہے۔ اور اس حدیث کی علامہ قرطبی اور ابن ناصر الدین حافظ شام وغیرہ نے تصحیح فرمائی ہے۔

لہٰذا آپ ﷺ کے والدین کریمین کو اللہ تعالیٰ نے موت کے بعد ایمان عطاء فرما کر فائدہ عطا کیا جو عادت و قاعدہ کے خلاف ہے۔ لیکن یہ خلاف قاعدہ بات صرف حضور ﷺ کے اکرام کے پیش نظر کی گئی۔[1]

زرقانی شرح مواھب اللدنیہ:

عن عائشة: أن رسول الله صلى الله عليه وسلم سأل ربه أن يحيي أبويه فأحياهما له فآمنا به، ثم أماتهما. قال السهيلي: والله قادر على كل شيء وليس يعجز رحمته وقدرت عن شيء، ونبيه صلى الله عليه وسلم أهل أن يختصه بما شاء من فضله، وينعم عليه بما شاء من كرامته۔

سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے رب سے سوال کیا کہ میرے والدین کو زندہ کیا جائے تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی خاطر انہیں دوبارہ زندہ کیا پھر وہ آپ پر ایمان لائے اور انتقال فرما گئے۔ سہیلی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ ہر کام کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ اور اس کی رحمت و قدرت کسی چیز سے شکست نہیں کھا سکتی۔ اور اس کے محبوب پیغمبر ﷺ بھی اس امر کے مستحق ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ان پر مخصوص نوازشات فرمائے، اور آپ کی بزرگی و کرامت کی خاطر جو انعام آپ کو عطا فرمانا چاہے وہ عطا فرمادے۔[2]

قارئین کرام ملا علی قاری وغیرہ لوگوں نے مسئلہ زیر بحث میں جن احادیث سے استدلال کیا کہ رسول اللہ ﷺ کے والدین کریمین حالت کفر میں انتقال کر گئے تھے وہ احادیث اس لیے منسوخ ہیں کہ آپ ﷺ کے والدین کریمین کا زندہ ہو کر باایمان ہونا خلاف قاعدہ ہے، اور آپ ﷺ کی خصوصیات میں سے ایک ہے، اس لیے خصائص مصطفیٰ ﷺ کو قیاس نہیں کیا جا سکتا۔

ملا علی قاری کے اس نظریہ پر علماء کی برہمی

النبراس:

وَ عَارَضَهُ عليّ ابن السلطان القاری بِرَسالتهٖ فِیْ اثبات کُفْرِھِمَا فَرَأیٰ اُسْتَاذہ ابن حجر مکی فی مَنَامِهٖ اَنَّ الْقَاری سَقَطَ مِنْ سَقَفٍ فَانْکَسَرَتْ رِجْلُهٗ فَقِیْلَ ھٰذَا جَزَاءُ اِھَانَةِ وَالِدَیْ رَسُوْلِ اللہِ فَوَقَعَ کَمَا رَأیٰ۔[3]

---

[1] (ردالمحتار علی الدر المختار، ج۴، ص ۲۳۱)

[2] (شرح الزرقاني على المواهب اللدنية بالمنح المحمدية، ج ۱، ص ۳۱۶، فتح الربانی لترتیب مسند امام احمد بن حنبل شیبانی، ج۸، ص ۱۶۸، مسالک الحنفاء، ص ۱۵)

[3] (النبراس، ص ۵۲۶، مطبوعہ ملک دین محمد، لاہور)

علامہ جلال الدین السیوطی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے رسائل کا ملا علی قاری نے اپنے رسالہ سے معارضہ کیا۔ اور یہ ثابت کیا کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے والدین کافر تھے۔ ملا علی قاری کے استاد ابن حجر مکی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے خواب دیکھا کہ ملا علی قاری چھت سے گرا اور اس کا پاؤں ٹوٹ گیا اور آواز آئی کہ حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے والدین کریمین کی اہانت کی یہ سزا ہے، سو جو دیکھا، ویسا ہی ہوا۔[1]

مرام الکلام فی عقائد الاسلام:

والعجب من علی القاری الھروی الف رسالۃ فی تکفیرھما و قال فیھا ان امنۃ للعینۃ کافرۃ خالدۃ مخلدۃ فی النار فوصلت الرسالۃ الیٰ استاذہ ابن حجر المکی فالف رسالۃ کبیرۃ فی ردھا و قال فیھا رأیت فی المنام ان القاری جالس فوق سطح فتعجبت ثم رأیت انہ سقط فانکسر رجلہ فمات فسألت عن سبب سقوطہ فقال انہ اھان والدی رسول اللہ عمدا انتھی و یعد ھذا من خوارق ابن حجر فانہ وقع کما اخبر بہ۔

تعجب ہے کہ ملا علی قاری ہروی نے رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے والدین کریمین کی تکفیر پر ایک رسالہ لکھا۔ اور اس میں یہ لفظ بھی لکھے، "بے شک آمنہ لعینہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دوزخی ہے" جب یہ رسالہ اس کے استاد ابن حجر مکی کے پاس پہنچا، تو انہوں نے اس کے رد میں ایک بہت بڑا رسالہ تحریر کیا۔ اور اس میں لکھا ہے کہ میں نے جب خواب میں ملا علی قاری کو ایک چھت پر بیٹھے دیکھا تو بڑا عجیب سا تھا، پھر میں کیا دیکھتا ہوں کہ وہ چھت سے نیچے گرا اور اس کا پاؤں ٹوٹ گیا اور وہ مر گیا میں نے اس کے گرنے کا سبب پوچھا۔ تو جواب آیا کہ اس نے رسول کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے والدین شریفین کی جان بوجھ کر توہین کی ہے۔۔۔۔ (اور ملا علی قاری کے ساتھ پھر ایسا ہی ہوا) اس واقعہ کو ابن حجر مکی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے خوارق (کرامات) میں سے شمار کیا جاتا ہے، کیونکہ جو کچھ واقعۃً ہونے والا تھا۔ اس کو انہوں نے پہلے دیکھ لیا۔ اور جس طرح بتایا ویسے ہی ہوا۔[2]

روح المعانی:

اَقُوْلُ اِنَّھُمَا اَفْضَلُ مِنْ عَلِیِّ الْقَارِیْ وَ اَضْرَابِہٖ۔

میں (علامہ آلوسی صاحب تفسیر روح المعانی) کہتا ہوں کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے والدین کریمین، ملا علی قاری اور اس کے ہم مشرب علماء سے کہیں بہتر ہیں۔[3]

---

[1] (النبراس، ص ۵۲۶، مطبوعہ ملک دین محمد، لاہور)

[2] (مرام الکلام فی عقائد الاسلام، ص ۲۲، عبدالعزیز فرھاروی)

[3] (روح المعانی، ج ۱، ص ۳۷۱: مطبوعہ بیروت جدید)

و استدل بالآية على إيمان أبويه صلّى الله تعالى عليه وسلّم كما ذهب إليه كثير من أجلة أهل السنة، وأنا أخشى الكفر على من يقول فيهما رضي الله تعالى عنهما على رغم أنف على القارئ وأضرابه بضد ذلك۔

(وتقلبك في الساجدين) آیت ہذا سے رسول اللہ ﷺ کے والدین ماجدین کے ایمان دار ہونے پر استدلال کیا گیا ہے جیسا کہ اہل سنت کے جلیل القدر علماء کا یہ مذہب ہے اور میں (علامہ آلوسی صاحب تفسیر روح المعانی) تو اس شخص کے بارے میں کفر کا خوف رکھتا ہوں جو حضور ﷺ کے ماں باپ رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے بارے میں اس عقیدہ کے خلاف عقیدہ رکھتا ہو۔ جیسا کہ ملا علی قاری اور اس کے ہم مشرب علماء کا ہے۔[1]

ارشاد البغی الی الاسلام النبی ﷺ:

ملا علی قاری نے ایک رسالہ مشتملہ براسات ادب والدین آنحضرت ﷺ لکھا۔ اگر یہ رسالہ نہ لکھا جاتا تو ان کی تالیفات وتصنیفات سے دنیا بھر جاتی۔ فقیہ محمد مرعتشی، ملا علی قاری کے اس قول سے بے حد ناراض ہوئے اور فرمایا:

العجب عن القاری انه صنف فی هذا الباب رسالة و تكلف فیها و اتیٰ باسجاع جملة فلعله البردة اثرت فی رأسه فاختل عقلا۔

ملا علی قاری پر تعجب ہے کہ اس نے رسول اللہ ﷺ کے والدین کریمین کے ثبوت کفر پر ایک رسالہ لکھ مارا۔ اس میں بڑے تکلف سے کام لیا گیا۔ اور عجیب مقفہ و مسجع جملہ لکھے۔ ہو سکتا ہے کہ ملا علی قاری کو سرسام ہو گیا ہو اور اس کی وجہ سے عقل میں خلل پڑ گیا اور رسالہ لکھ مارا۔[2]

زرقانی:

قال السهيلي، بعد إيراد حديث مسلم: وليس لنا نحن أن نقول ذلك في أبويه صلى الله عليه وسلم، لقوله: "لا تؤذوا الأحياء بسب الأموات"، والله تعالى يقول: إِنَّ الَّذِينَ يُؤْذُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ (الأحزاب ٥٧) الآية، وسئل القاضي أبو بكر أحد أئمة المالكية عن رجل قال: إن أبا النبي صلى الله عليه وسلم في النار، فأجاب بأنه ملعون، لقوله تعالى: إِنَّ الَّذِينَ يُؤْذُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ لَعَنَهُمُ اللَّهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَأَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُهِينًا (الأحزاب: ٥٧)، ولا أذى أعظم من أن يقال: أبوه في النار۔

مسلم شریف کی حدیث وارد کرنے کے بعد سہیلی نے کہا ہمیں ہرگز یہ زیب نہیں دیتا کہ ہم رسول کریم ﷺ کے والدین کریمین کے بارے میں کفر کا قول کریں کیونکہ سرکار دو عالم ﷺ نے فرمایا زندہ لوگوں کو ان کے مردوں کی وجہ سے

---

[1] (روح المعاني في تفسير القرآن العظيم والسبع المثاني، ج ١٠، ص ١٣٥)

[2] (ارشاد البغی الی اسلام النبی مصنفہ مولوی برخوردار ملتانی مطبوعہ ھاشمی میرٹھ)

تکلیف نہ دو۔(یعنی مردوں کے بارے میں ایسی باتیں نہ کرو کہ جس سے ان کے زندہ رشتہ دار اذیت میں مبتلا ہوتے ہوں)اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے بے شک وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسول کو تکلیف پہنچاتے ہیں ان پر دنیا اور آخرت میں لعنت ہے،الخ۔

امام مالک کے پیروؤں میں سے ایک عظیم امام جناب قاضی ابو بکر سے پوچھا گیا کہ جو شخص رسول اللہ ﷺ کے والدین کریمین کے بارے میں دوزخی ہونے کا قول کرتا ہو اس کے متعلق کیا حکم ہے؟ فرمایا وہ ملعون ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:"بے شک وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو تکلیف پہنچاتے ہیں ان پر اللہ تعالیٰ کی پھٹکار دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ اور اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے رسواء کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔ اور رسول کریم ﷺ کے والدین کو دوزخی کہنے سے بڑھ کر اور کون سی اذیت ہو سکتی ہے، جو رسول اللہ ﷺ کو ہوتی ہو گی۔[1]

مقام غور

گزشتہ حوالہ جات سے معلوم ہوا کہ جو شخص رسول اللہ ﷺ کے والدین کریمین کے کفر کا قائل ہے، وہ:

۱۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے غیبی سزا کا مستحق ہو جاتا ہے۔

۲۔ اس کا دماغی توازن بگڑ جاتا ہے۔

۳۔ اپنے آپ کو رسول اللہ ﷺ کے والدین سے افضل سمجھتا ہے۔

۴۔ اپنے ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھنے کا احتمال رکھتا ہے۔

۵۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کو ایذاء پہنچانے والا ہونے کے اعتبار سے ملعون ہے۔

ایذائے رسول اللہ ﷺ کی دو مثالیں اور اس کا انجام

الدرجة المنيفه فی آباء الشريفه مثال نمبر ا:

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ جَاءَتْ سَبِيَّه بِنْتُ اَبِیْ لَهَبٍ اِلَی النَّبِیِّ فَقَالَتْ يَا رَسُوْلَ اللهِ اِنَّ النَّاسَ يَقُوْلُوْنَ اَنْتِ بِنْتُ حَطَبِ النَّارِ فَقَامَ رَسُوْلُ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وَهُوَ مُغْضَبٌ فَقَالَ مَا بَالُ اَقْوَامٍ يُؤْذُوْنَنِیْ فِیْ قَرَابَتِیْ مَنْ اٰذٰی قَرَابَتِیْ فَقَدْ اٰذَانِیْ وَ مَنْ اٰذَانِیْ فَقَدْ اٰذَی اللهَ۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ سبیہ بنت ابی لہب ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہوئیں اور شکایت کی: یارسول اللہ ﷺ! لوگ مجھے دوزخ کے ایندھن والے کی بیٹی کہہ کر پکارتے ہیں۔ یہ سن کر رسول کریم ﷺ منبر پر تشریف فرما ہوئے، اور آپ ﷺ غصہ کی حالت میں تھے، فرمانے لگے اس قوم کا کیا بنے گا جو مجھے میری قرابت کے

---

[1] (شرح الزرقاني على المواهب اللدنية بالمنح المحمدية، ج ۱، ص ۳۴۹، الحاوی للفتاوی، ج ۲، ص ۲۳۱، مسالک الحنفاء، ص ۵۳، فتح الربانی، ج ۸، ص ۱۷۰)

حوالہ سے اذیت دیتی ہے۔ سنو! جس نے میری قرابت والوں کو اذیت دی اس نے مجھے اذیت دی۔ اور جو مجھے اذیت دے گا، وہ اللہ تعالیٰ کو تکلیف پہنچائے گا۔[1]

فتح الربانی مثال نمبر ۲:

(قال الحلواني في المواكب) القول بكفر أبويه صلى الله عليه وسلم زلة عاقل نعوذ بالله من ذلك، فمن تفوه به فقد تعرض للكفر بإيذائه صلى الله عليه وسلم فقد جاء أن عكرمة بن أبي جهل اشتكى إلى النبي صلى الله عليه وسلم أن الناس يسبون أباه، فقال صلى الله عليه وسلم "لا تؤذوا الأحياء بسبب الأموات" رواه الطبراني؛ ولا شك أنه صلى الله عليه وسلم حي في قبره تعرض عليه أعمالنا، وإذا روعي عكرمة رضى الله عنه في أبيه بالنهي عما يتأذى به من سبه فسيد الخلق أولى وأوجب۔

مواکب میں حلوانی نے کہا کہ حضور ﷺ کے والدین کریمین کے بارے میں کافر ہونے کا قول کرنا عقلمند کے لیے انتہائی ذلیل حرکت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ایسا قول کہنے سے پناہ میں رکھے۔ جس شخص نے اپنے منہ سے ایسا حکم نکالا۔ اس نے کفر کو اپنی طرف دعوت دی۔ کیونکہ ایسا کہنے سے اس نے رسول اللہ ﷺ کو تکلیف پہنچائی۔ حدیث پاک میں آتا ہے کہ عکرمہ بن ابی جہل نے رسول کریم ﷺ سے شکایت کی کہ لوگ میرے باپ کو برا بھلا کہتے ہیں، آپ ﷺ نے لوگوں سے فرمایا: زندوں کو ان کے مردوں کے سبب تکلیف نہ پہنچاؤ۔ یہ روایت طبرانی سے ذکر کی، اور یہ بات شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ آپ ﷺ اپنی قبر انور میں زندہ ہیں۔ اور ہمارے اعمال آپ ﷺ پر پیش کیے جاتے ہیں۔ لہٰذا جب حضرت عکرمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں ان کے باپ کے متعلق برا بھلا کہنے سے روک کر یہ رعایت رکھی گئی۔ کیونکہ ایسا کرنے سے انہیں اذیت ہوتی تھی۔ تو تمام مخلوق کے سردار جناب رسالت مآب ﷺ اس روایت کے عکرمہ سے زیادہ حق دار ہیں اور آپ ﷺ کی رعایت واجب ہے۔[2]

اختتامی کلمات

ابو لہب اور ابو جہل کا جہنمی ہونا نص قرآنی سے ثابت ہے۔ ان کو برا بھلا کہنے سے جب ان کے ورثاء کو ذہنی کوفت ہوئی۔ تو سرکار دوعالم ﷺ سے شکایت کی، آپ ﷺ نے لوگوں کو منع فرمادیا کہ ان کے مرے ہوئے رشتہ داروں کو برا بھلا نہ کہا جائے، تاکہ تمہارے ان ساتھیوں کو اذیت نہ پہنچے۔ حالانکہ ان دونوں کے لیے کوئی ضعیف سے ضعیف حدیث وروایت ہرگز نہ

---

[1] (الدرجة المنيفه فی آباء الشريفه، ص ۱۷)

[2] (الفتح الربانی، ج۸، ص ۱۷۱، مطبوعه: قاهره، طبع جديد)

ملے گی کہ یہ قابل مغفرت ہیں۔ اور ابدی دوزخی نہیں ہیں، اور نہ ہی ان کے ورثاء کی اذیت پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کہیں لعنت آئی۔ اور ادھر سرکار دوعالم ﷺ کی شان میں گستاخی کے مرتکب پر نص قرآنی سے لعنت موجود ہے۔ لہٰذا جو شخص رسول اللہ ﷺ کے والدین کریمین کو دوزخی یا کافر و مشرک کہتا ہے، وہ دراصل رسول اللہ ﷺ کو اذیت دے رہا ہے اور رسول اللہ ﷺ کو اذیت دینے والے پر اللہ تعالیٰ کی پھٹکار وارد ہے۔ اس لیے وہ شخص اپنی آخرت برباد کرنے کے درپے ہے۔ آپ ذرا خیال فرمائیں، کہ جب امتیوں کے اعمال روزانہ سرکار دوعالم ﷺ کے حضور پیش ہوتے ہیں تو ان میں اگر کسی امتی کا یہ قول بھی آپ ﷺ کے سامنے آئے کہ اس نے آپ ﷺ کے والدین کو کافر اور جہنمی لکھا یا کہا ہے تو اسے پڑھ کر یا سن کر حضور ختمی مرتبت ﷺ کو کتنا رنج ہوتا ہو گا۔ اور آپ ﷺ ایسے شخص سے کس قدر ناراضگی کا اظہار فرماتے ہوں گے۔

حضور ﷺ کے والدین کریمین کے بارے میں ملا علی قاری نے اپنے نظریہ سے رجوع کیا اور توبہ کی

حاشیہ نبراس علی شرح العقائد:

علی بن السلطان القاری فقد اخطاء و زلّ لا یلیق ذالک له و نقل توبته عن ذالک فی قول المستحسن۔

علی بن سلطان المعروف ملا علی قاری نے اس مسئلہ میں خطاء کھائی اور راہ راست سے پھسل گیا۔ اسے ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا، اور قول مستحسن میں اس نظریئے کی ان کی توبہ کرنا منقول ہے۔[1]

ملا علی قاری علمائے احناف میں سے ایک بہت بڑے عالم، مصنف اور شارح ہوئے ہیں۔ ان کی تصنیفات و شروحات میں سرکار دوعالم ﷺ سے بے پناہ عقیدت و محبت ٹپکتی ہے۔ لیکن چند احادیث و اقوال کے ظاہر کو دیکھتے ہوئے انہوں نے سرکار دوعالم ﷺ والدین کریمین کے بارے میں نازیبا کلمات کہے، بلکہ گستاخانہ رویہ اپنایا۔ جس کی سزا انہیں دنیا میں مل بھی گئی۔ اور اس گستاخی پر خود ان کے استاد محترم ابن حجر مکی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ بھی ناراض تھے۔ خود رسول اللہ ﷺ بھی ناراض تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں مزید محرومیوں سے بچانا تھا، اور آخرت کی بربادی بھی منظور نہ تھی۔ بالآخر انہیں اس عقیدہ سے توبہ کی توفیق ملی۔ کاش کہ ان کی توبہ بھی اسی طرح سرعام ہوتی جس طرح ان کے والدین کریمین کے بارے میں نظریہ ان کی تصنیفات میں عام ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی اس غلطی کو معاف فرمائے اور ہمیں اسی نظریئے پر قائم و دائم رکھے کہ سرکار دوعالم ﷺ نے اپنے والدین کریمین کو معجزانہ طور پر زندہ کیا۔ اور انہیں مشرف بہ اسلام کیا۔ پھر وہ اس دنیا سے کامل الایمان

[1] (حاشیہ نبراس علی شرح العقائد، ص ۵۲۶)

رخصت ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے جہاں اپنے محبوب کو اور بہت سی خصوصیات سے نوازا ہے، ایک یہ خصوصیت بھی آپ ﷺ کو عطا ہوئی۔

وَ اللہُ یَخْتَصُّ بِرَحْمَتِہٖ مَنْ یَشَاءُ وَ اللہُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ فَاعْتَبِرُوْا یَا اُولِی الْاَبْصَارِ

امام الانبیاء محمد رسول اللہ ﷺ کے والدین کریمین آدم علیہ السلام تک سب کے سب موحد تھے

تفسیر مظہری میں قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے لکھا ہے:

المراد منه تقلبک من أصلاب الطاهرين الساجدين لله إلى أرحام الطاهرات الساجدات ومن أرحام السجدات إلى أصلاب الطاهرين أى الموحدين والموحدات حتى يدل على ان اباء النبي صلى الله عليه وسلم كلهم كانوا مؤمنين۔

اس سے مراد یہ ہے کہ آپ ﷺ پاکیزہ اور اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرنے والے مردوں کی پشت سے ان عورتوں کی رحم کی طرف منتقل ہوئے، جو طاہرہ اور سجدہ کرنے والی تھیں۔ اور پھر ان طاہرات وساجدات کے رحم سے ایسے پاکیزہ افراد کی طرف منتقل ہوئے جو سبھی اللہ تعالیٰ کی توحید پر قائم تھے۔ یہ آیت کریمہ اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ آپ ﷺ کے تمام آباء و اجداد صاحبان ایمان وتوحید تھے۔[1]

صاحب تفسیر درمنثور اس آیت کے تحت لکھتے ہیں:

ابن جرير عن قتادة وتقلبک فى الساجدين قال فى المصلين واخرج ابن عباس في قوله وتقلبک في الساجدين قال: سألت رسول الله صلى الله عليه وسلم فقلت: بأبى أنت وأمي أين كنت وآدم في الجنة؟ فتبسم حتى بدت نواجده ثم قال " اني كنت في صلبه وهبط إلى الأرض وأنا في صلبه وركبت السفينة في صلب أبي نوح وقذفت في النار في صلب أبي إبراهيم ولم يلتق أبواي قط على سفاح لم يزل الله ينقلني من الإصلاب الطيبة إلى الأرحام الطاهرة مصفى مهذبا لا تتشعب شعبتان إلا كنت في خيرهما۔

ابن جریر جناب قتادہ سے بیان کرتے ہیں کہ **وَتَقَلُّبَکَ فِي السَّاجِدِينَ (الشعراء ۲۱۹)** سے مراد نمازی ہیں۔ ابن عباس کہتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ سے پوچھا، آپ ﷺ پر میرے ماں باپ قربان ارشاد فرمائیے کہ جب آدم جنت میں تھے تو آپ ﷺ اس وقت کہاں تھے۔ میری بات سن کر آپ ﷺ خوب ہنسے یہاں تک کہ آپ ﷺ کی داڑھیں نظر آنے لگیں۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا: اس وقت میں ان کی پشت میں تھا، پھر جب وہ زمین پر تشریف لائے، تب بھی میں ان کی پشت میں تھا اور میں اپنے باپ نوح علیہ السلام کی پشت میں ہوتے ہوئے کشتی میں سوار ہوا، اپنے باپ ابراہیم علیہ السلام کی پشت میں ہوتے ہوئے آگ میں پھینکا گیا، میرے والدین کریمین کبھی بھی حرام کاری میں نہ پڑے۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے طیب پشتوں

---

[1] (تفسیر مظھری، ج۷، ص ۸۹)

سے طاہر رحموں کی طرف منتقل فرمایا، اور وہ تمام مرد و زن صاحبان صفا اور تہذیب تھے۔ جب کسی سے دو شاخیں بنتیں تو مجھے ان میں سے بہترین شاخ اور قبیلہ ملتا۔[1]

البدایہ والنہایہ میں لکھا ہے:

عن أبي هريرة أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: بعثت من خير قرون بني آدم قرناً فقرناً حتى كنت من القرن الذي كنت فيه۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا میں بنی آدم کے بہترین لوگوں میں سے ہوتا آیا ہوں۔ یہاں تک کہ میں اس خاندان میں سے کہ جس میں میں بھیجا گیا، آیا ہوں۔[2]

لہٰذا ثابت ہوا کہ سرکار دوعالم ﷺ کی نسل پاک ہر دور میں اپنے لوگوں سے بہترین تھی۔ اور یہ بات واضح ہے کہ بہتری سے مراد وہی بہتری ہے جو اللہ تعالیٰ کے ہاں مطلوب و منظور ہے۔ جس کی طرف یہ آیت توجہ دلاتی ہے: **وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ (البقرة ۲۲۱)** اور بے شک مسلمان غلام مشرک سے اچھا۔ تو واضح ہوا کہ خیریت ایمان کے اعتبار سے مراد ہے، اس لیے حضور ﷺ کے ارشاد گرامی کے مطابق آپ ﷺ کے آباء و اجداد ابراہیم علیہ السلام تک ہی نہیں بلکہ آدم علیہ السلام تک صاحبان ایمان و توحید ہوئے۔

حضور ﷺ کے تمام آباء و اجداد کے موحد اور مومن ہونے پر تفصیلی دلائل فقیر کی کتاب **قرأۃ العینین فی ایمان آبائ سید الکونین** ﷺ کا مطالعہ کریں، انشاء اللہ تعالیٰ تمام شکوک و شبہات دور ہو جائیں گے، بد مذہب اور بد عقیدہ لوگوں کے تمام اعتراضات اور ان کے تفصیلی جوابات مذکورہ کتاب میں موجود ہیں۔

مزید یہ کہ نبی کریم ﷺ کے والدین کریمین کے اسماء مبارکہ پر فقیر نے جامعہ عبد اللہ بن عبد المطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہما اور جامع مسجد سیدہ آمنہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بھی قائم کی ہے۔ **واللہ تعالیٰ و رسولہ اعلم!**

---

[1] (تفسیر درمنثور، ج۵، ص۹۸)

[2] (البدایة والنهایة، ج۲، ص۲۵۶)

(۱۰) باب نمبر دس: صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم پر تنقیص اور جرح کرنے کی مذمت کے بیان میں

بعض علماء صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم پر تنقیص اور جرح کرتے ہیں حالانکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر جرح کرنے والے زندیق ہیں۔

امام ابوزرعہ عبید اللہ بن عبد الکریم الرازی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۲۶۴ھ) کا یہ ارشاد بہت سے اکابر نے نقل کیا ہے:

إذا رأيت الرجل ينتقص أحدا من أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم فاعلم أنه زنديق، لأن الرسول صلى الله عليه وسلم عندنا حق، والقرآن حق، وإنما أدى إلينا هذا القرآن والسنن أصحاب رسول الله، وإنما يريدون أن يجرحوا شهودنا ليبطلوا الكتاب والسنة، والجرح بهم أولى، وهم زنادقة۔

جب تم کسی شخص کو دیکھو کہ وہ حضور ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے کسی کی تنقیص کرتا ہے تو سمجھ لو کہ وہ زندیق ہے اس لئے کہ آنحضرت ﷺ ہمارے نزدیک برحق ہیں اور قرآن کریم برحق ہے۔ جو تعلیمات آپ ﷺ لے کر آئے وہ برحق ہیں اور یہ سب چیزیں ہم تک پہنچانے والے صحابہ رضی اللہ عنہم کے سوا کوئی نہیں، اور یہ لوگ ارادہ رکھتے ہیں کہ ہماری شہادتوں کو مجروح کردیں تاکہ کتاب وسنت باطل ہو جائیں، ان کے اوپر جرح اولیٰ ہے، اور یہی زنادقہ ہیں۔ [1]

اسی حوالے سے چند عبارات ہدیۂ قارئین ہیں:

عن ابن عمر رضي الله عنهما قال: قال رسول الله صلى الله تعالىٰ عليه وآله واصحابه وسلم: إذا رأيتم الذين يسبون أصحابي، فقولوا لعنة الله على شركم۔ [2]

قال رسول الله صلى الله عليه وآله واصحابه وسلم: من سب أصحابي فعليه لعنة الله والملائكة والناس أجمعين۔ [3]

وفي رواية: لعن الله من سب أصحابي۔ [4]

ليس في الصحابة من يكذب وغير ثقة۔ [5]

وأما من سب أحداً من الصحابة فهو فاسق ومبتدعٌ بالإجماع۔ [6]

واعتقاد أهل السنة والجماعة تزكية جميع الصحابة وجوباً بإثبات العدالة لكل منهم والكف عن الطعن فيهم والثناء عليهم كما أثنى الله سبحانه وتعالىٰ۔ [7]

---

1 (العواصم من القواصم في تحقيق مواقف الصحابة بعد وفاة النبي صلى الله عليه وسلم، ج ۱، ص ۳۴)

2 (سنن الترمذي ۲/۲۲۷، مشكوٰة المصابيح ۵۵۴)

3 (رواه الطبراني ۱۲ رقم: ۱۲۷۰۹)

4 (رواه الطبراني ۱۲ رقم: ۱۳۵۸۸)

5 (عمدة القاري ۲/۱۰۵)

6 (تنبيه الولاة والحكام ۱/۳۶۷ لابن عابدين الشامي)

7 (مسامره ۱۳۲ بحواله: فتاوىٰ رحيميه ۱۸/۴)

الصحابة كلهم عدول مطلقاً لظواهر الكتاب والسنة وإجماع من يعتد به۔[1]

قال القاضي عياض: من شتم أحداً من أصحاب النبي صلى الله عليه وآله واصحابه وسلم أبا بكر أو عمر أو عثمان أو معاوية... كانوا في ضلال قتل، وإن شتمهم بغير هٰذا من شاتمة الناس، نكل نكالاً شديداً۔[2]

قال أبو زرعة الرازي: إذا رأيت الرجل ينتقص أحداً من أصحاب رسول الله صلى الله تعالىٰ عليه وآله واصحابه وسلم فاعلم أنه زنديق۔[3]

وسب أحد من الصحابة وبغضه لا يكون كفراً لكن يُضلل۔[4]

عدالت صحابہ کے کتاب و سنت سے دلائل

اہل سنت کے نزدیک صحابہ کی عدالت عقیدہ کے قطعی مسائل میں سے یا دین کی قطعیت کے ساتھ معلوم امور میں سے ہے، اور وہ اس پر قرآن و سنت کی بہت سی دلیلوں سے حجت پکڑتے ہیں۔

اوّل: قرآن کریم سے دلائل

پہلی آیت: اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: لَقَدْ رَضِيَ اللَّهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ إِذْ يُبَايِعُونَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِي قُلُوبِهِمْ فَأَنْزَلَ السَّكِينَةَ عَلَيْهِمْ وَأَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيبًا (الفتح ۱۸)

یقیناً اللہ تعالیٰ مؤمنوں سے خوش ہو گیا جب کہ وہ درخت تلے تجھ سے بیعت کر رہے تھے، ان کے دلوں میں جو تھا، اسے اس نے معلوم کر لیا، اور ان پر اطمینان نازل فرمایا اور انہیں قریب کی فتح عنایت فرمائی۔ حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ اس (بیعت رضوان) کے موقع پر ہماری تعداد ۱۴۰۰ر تھی۔[5]

یہ آیت واضح طور پہ دلالت کرتی ہے کہ اللہ نے ان کے تزکیہ ءنفس کی شہادت خود دی، ایسا تزکیہ جو اللہ کے سوا کوئی اور نہیں دے سکتا، ان کے دلوں اور نہاں خانوں کی طہارت اور پاکیزگی کی اس سے بہتر گواہی اور کیا ہو سکتی ہے! رضی اللہ عنہم۔ (جس سے اللہ راضی ہو جائے اس کی موت کفر پر ہو ہی نہیں سکتی، اس لئے کہ اللہ کی رضا اُسی کے لئے ہوتی ہے جس کے بارے میں اُسے پتہ ہے کہ اس بندہ کی موت اسلام پر ہو گی۔[6]

اس کی مزید توثیق صحیح مسلم میں وارد اس حدیث سے ہو جاتی ہے جس میں اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا:

---

[1] (مرقاۃ المفاتیح ۵/۷/۵۱)
[2] (تنبیه الولاة والحکام ۱/۵/۳۷۵ لابن عابدين الشامي)
[3] (الإصابة في تمييز الصحابة لابن حجر العسقلاني ۱/۲۲ بيروت)
[4] (شامی کراچی ۴/۷/۲۳، شامی زکریا ۶/۷/۳۷۷)
[5] (بخاری۔ حدیث نمبر: ۴۱۵۴، فتح الباری: ۷/۷/۵۰۷)
[6] (الصواعق المحرقة: ۶/۳۱۶)

لا يدخل النار ان شاء الله من أصحاب الشجرة أحد، الذين بايعو اتحتها۔

ان شاء اللہ درخت کے نیچے بیعت کرنے والوں میں سے کوئی بھی جہنم میں داخل نہیں ہو گا۔[1]

ابن تیمیہ لکھتاہیں: اللہ کی رضا صفت قدیم ہے، اور اللہ اُسی بندے سے راضی ہوتا ہے جس کے بارے میں علم ہوتا ہے، کہ یہ بندہ رضا کی ساری شرطیں پوری کردے گا، اور اللہ جس سے راضی ہو جائے اُس سے کبھی ناراض نہیں ہو گا، سو اللہ جس کے بارے میں خبر دے دے کہ اُس سے راضی ہے، تو وہ جنتی ہے، اگرچہ اللہ کی رضا بندہ کے ایمان اور عمل صالح کے بعد حصے میں آئی ہو۔ تو ایسے لوگوں کا ذکر بطور مدح وثناء ہوتا ہے۔ اور اگر اللہ یہ جانتا ہے کہ بندہ عمل صالح کے بعد ایسے اعمال کرے گا جس سے وہ ناراض ہو گا تو وہ اس زمرہ میں شامل نہیں ہو سکتا۔[2]

علامہ ابن حزم رحمہ اللہ کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے ہمیں بتلادیا ہے کہ وہ صحابہ کے دلوں کو اچھی طرح جانتا ہے، وہ اُن سے راضی ہوا، اور اُن پر سکینت نازل کی، اس لئے اب کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ صحابیت کے معاملے میں بحث ومباحثہ کرے، یہاں ادنیٰ سا شک بھی حرام ہے۔[3]

دوسری آیت: **مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ تَرَاهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِنَ اللهِ وَرِضْوَانًا سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِمْ مِنْ أَثَرِ السُّجُودِ ذَلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَمَثَلُهُمْ فِي الْإِنْجِيلِ كَزَرْعٍ أَخْرَجَ شَطْأَهُ فَآزَرَهُ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوَى عَلَى سُوقِهِ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ وَعَدَ اللهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ مِنْهُمْ مَغْفِرَةً وَأَجْرًا عَظِيمًا (الفتح ۲۹)**

محمد صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم اللہ کے رسول ہیں، اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں کافروں پر سخت ہیں، آپس میں رحم دل ہیں، تو انہیں دیکھئے گا کہ رکوع اور سجدے کر رہے ہیں، اللہ تعالیٰ کے فضل اور رضامندی کی تلاش میں ہیں، اُن کے چہروں پر ان کا نشان سجدوں کے اثر سے ہے، ان کی یہی مثال تورات میں ہے اور ان کی مثال انجیل میں ہے، اُس کھیتی کے مثل جس نے اپنا انکھوا نکالا، پھر اُسے مضبوط کیا، اور وہ موٹا ہو گیا، اور کسانوں کو خوش کرنے لگا، تاکہ ان کی وجہ سے کافروں کو چڑائے، اللہ تعالیٰ نے اُن ایمان والوں اور نیک اعمال والوں سے بخشش اور بہت بڑے ثواب کا وعدہ کیا ہے۔

---

[1] (صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۲۴۹۶)

[2] (الصارم المسلول: ص: ۵۷۳)

[3] (الفصل فی الملل والنحل: ۱۴۸/۴)

امام مالک رحمہ اللہ کہتے ہیں: ”مجھے یہ خبر پہنچی کہ جب صحابہ کرام نے ملک شام فتح کیا، تو عیسائی انہیں دیکھ کر کہنے لگے: ”اللہ کی قسم! عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں سے متعلق جو صفات ہمیں پہنچی ہیں، اُن سے یہ لوگ بہتر ہیں“۔ یہ ہے سچی گواہی! اس امت کی عظمت شان کا ذکر سابقہ آسمانی کتابوں میں ہوا ہے اور امت کے افضل ترین اشخاص اصحاب رسول صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ہیں۔

اللہ کا فرمان دیکھئے:

ذَلِکَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَمَثَلُهُمْ فِي الْإِنْجِيلِ كَزَرْعٍ أَخْرَجَ شَطْأَهُ فَآزَرَهُ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوَى عَلَى سُوقِهِ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ (الفتح ٢٩)

ان کی یہی مثال تورات میں ہے اور ان کی مثال انجیل میں ہے، اُس کھیتی کے مثل جس نے اپنا انکھوا نکالا، پھر اُسے مضبوط کیا، اور وہ موٹا ہو گیا، اور کسانوں کو خوش کرنے لگا۔

اسی طرح صحابہ کرام نے اپنے وجود سے نبی صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کو توانائی عطا کی، ہر موقع پر آپ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کی مدد کی، ہر موڑ پر اسلام کو تقویت بخشی، اور نبی صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کی مثال کسانوں کے ساتھ اس پودے کی تھی جو دانہ پھاڑ کر باہر نکل رہا تھا، صحابہ کرام کی بڑھتی ہوئی قوت و شوکت اور اثر و نفوذ کافروں کو غضبناک کر رہی تھی۔[1]

علامہ ابن جوزی کہتے ہیں: ”جمہور کے نزدیک یہ تمام صحابہ کا وصف ہے“۔[2]

تیسری آیت: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: **لِلْفُقَرَاءِ الْمُهَاجِرِينَ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَأَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا وَيَنْصُرُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ أُولَئِکَ هُمُ الصَّادِقُونَ (٨) وَالَّذِينَ تَبَوَّءُوا الدَّارَ وَالْإِيمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّونَ مَنْ هَاجَرَ إِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُونَ فِي صُدُورِهِمْ حَاجَةً مِمَّا أُوتُوا وَيُؤْثِرُونَ عَلَى أَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ وَمَنْ يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (٩) وَالَّذِينَ جَاءُوا مِنْ بَعْدِهِمْ يَقُولُونَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِي قُلُوبِنَا غِلًّا لِلَّذِينَ آمَنُوا رَبَّنَا إِنَّکَ رَءُوفٌ رَحِيمٌ (الحشر ١٠)**

ترجمہ: (مال فئی) اُن مہاجر مسکینوں کے لئے ہے جو اپنے گھروں سے اور اپنے مالوں سے نکال دئے گئے ہیں، وہ اللہ کے فضل اور رضا مندی کے طالب ہیں، اللہ اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں، یہی راست باز لوگ ہیں۔ اور (اُن کیلئے) جنہوں نے اس گھر میں (یعنی مدینہ) اور ایمان میں ان سے پہلے جگہ بنالی ہے، اور اپنی طرف ہجرت کر کے آنے والوں سے محبت کرتے ہیں اور مہاجرین کو جو کچھ دے دیا جائے اُس سے اپنے دلوں میں کوئی تنگی نہیں رکھتے بلکہ خود اپنے اوپر انہیں ترجیح دیتے ہیں، گو خود کو کتنی ہی سخت حاجت ہو، (بات یہ ہے) کہ جو بھی اپنے نفس کے بخل سے بچایا گیا وہی کامیاب ہے۔ اور (اُن کے لئے) جو اُن

---

[1] (الاستیعاب لابن عبدالبر ١/٦)

[2] (زادالمسیر ٤/٢٠٤)

کے بعد آئیں جو کہیں گے: اے ہمارے پروردگار! ہمیں بخش دے، اور ہمارے اُن بھائیوں کو بھی جو ہم سے پہلے ایمان لا چکے ہیں اور ایمان داروں کی طرف سے ہمارے دل میں کینہ اور دشمنی نہ ڈال، اے ہمارے رب! بیشک تو شفقت و مہربانی کرنے والا ہے۔

اللہ تعالیٰ بالا آیات میں مال فئی کے مستحقین کی صفات بیان کر رہا ہے، ان کی تین قسمیں ہیں:

(۱) للفقراء المهاجرينمهاجر فقراء۔

(۲) والذين تبوّءُو الدار و الايمان من قبلهم۔

اور (اُن کیلئے) جنہوں نے اس گھر میں (یعنی مدینہ) اور ایمان میں ان سے پہلے جگہ بنالی ہے (انصار مدینہ)۔

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ (الحشر ۱۰)

اور (اُن کے لئے) جو اُن کے بعد آئیں (یعنی صحابہ کے نقش قدم پر چلنے والے اہل ایمان)۔

اس آیت سے امام مالک رحمہ اللہ کا نرالا استدلال دیکھئے: جو صحابہ کو گالی دے، اس کے لئے مال فئے میں کوئی حصہ نہیں، اللہ نے جن کی تعریف بیان کی ہے وہ اُن پر صادق نہیں آتی، وہ اپنے سابقین کے لئے مغفرت طلب نہیں کرتے۔

جیسا کہ آیت میں وارد ہے:

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ (الحشر ۱۰)

سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول ہے:

"لوگ تین زمروں میں منقسم ہیں، دو زمرے پُر ہو چکے ہیں، تیسرا باقی ہے، اور بہتر ہو گا کہ تم اپنے کو تیسرے زمرے میں شامل کر لو، پھر یہ آیتیں پڑھیں: للفقراء المهاجرين یہ زمرہ پُر ہو چکا ہے، والذين تبوّءُو الدّارَ و الايمانَ من قبلهم اس سے انصار مراد ہیں، اور یہ دوسرا زمرہ بھی پُر ہو چکا ہے، والذين جآءُو من بعدهم یہ زمرہ باقی ہے، اور اس میں شامل ہونے کی شکل یہ ہے کہ تم اُن (صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم) کے لئے مغفرت کی دعا کرو"۔[1]

اُم المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کہتی ہیں: لوگوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اصحاب رسول ﷺ کے لئے مغفرت طلب کریں، تو لوگوں نے انہیں گالیاں دیں۔[2]

[1] (الصارم المسلول: ص: ۵۷۷ و رواہ الحاکم و صححہ ۲/۴۸۴)

[2] (رواہ مسلم۔ کتاب التفسیر۔ ۳/۲۲)

ابو نعیم کہتے ہیں: اُس سے بدتر کون ہو گا جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی مخالفت کرتا ہے، اُن کی نافرمانی اور سرکشی پر آمادہ رہتا ہے! کیا اُسے خبر نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو حکم دیا کہ اپنے صحابہ کے ساتھ عفو و در گزر سے کام لیں، ان کے لئے مغفرت طلب کریں اور نرمی سے پیش آئیں۔

اللہ کا فرمان ہے:

وَلَوْ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (آل عمران ۱۵۹)

اگر آپ ﷺ بدزبان اور سخت دل ہوتے تو آپ کے پاس سے چھٹ جاتے، اس لئے آپ ﷺ ان کے ساتھ عفو کا معاملہ کریں، ان کے لئے مغفرت کی دعا کریں، اور معاملات میں اُن سے مشورہ کرتے رہیں۔

دوسری جگہ فرمایا:

وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ (الشعراء ۲۱۵)

جو ایمان لائیں اور آپ کی تابعداری کریں اُن کے ساتھ نرمی سے پیش آئیں۔

توجو صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو گالی دے، اُن سے بغض و عناد رکھے، ان کے بعض اجتہادات اور باہمی جنگوں کی (محض بدنام کرنے کیلئے) غلط تعبیر کرے۔ ایسا شخص اللہ کے احکامات اور وصیتوں سے کھلواڑ کرتا ہے، وہ نبی ﷺ، صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور اسلام و مسلمانوں کے بارے میں بدزبانی کر کے اپنی بدباطنی کا اظہار کرتا ہے۔[1]

تابعی مجاہد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ، ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا: محمد ﷺ کے صحابہ کو گالی مت دو، اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے استغفار کا حکم دیا ہے، اور اللہ جانتا تھا کہ یہ باہم دست و گریباں ہوں گے۔[2]

چوتھی آیت:

اللہ تعالیٰ کا قول: **وَالسَّابِقُونَ الْأَوَّلُونَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنصَارِ وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُم بِإِحْسَانٍ رَّضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ وَأَعَدَّ لَهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي تَحْتَهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ (التوبة ۱۰۰)**

ترجمہ: اور جو مہاجرین اور انصار سابق اور مقدم ہیں، اور جتنے لوگ اخلاص کے ساتھ ان کے پیرو ہیں اللہ اُن سب سے راضی ہوا، اور وہ سب اس سے راضی ہوئے، اور اللہ نے ان کے لئے ایسے باغ مہیا کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، جن میں ہمیشہ رہیں گے یہ بڑی کامیابی ہے۔

---

[1] (الامامة لأبی نعیم، ص: ۳۷۵)

[2] (الصارم المسلول: ۵۷۴)

ابن تیمیہ نے لکھا ہے:

”اللہ تعالیٰ سابقین سے بغیر احسان کی شرط کے راضی ہو، اور ان کے پیروکاروں سے اُسی وقت راضی ہو گا جب وہ اخلاص کے ساتھ ان کی اتباع کریں گے“۔[1]

اگر آپ چاہتے ہیں کہ اللہ آپ سے راضی ہو تو خلوص نیت کے ساتھ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی اتباع کریں اور ان کے لئے استغفار کریں۔

پانچویں آیت:

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

لَا يَسْتَوِي مِنْكُمْ مَنْ أَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ أُولَئِكَ أَعْظَمُ دَرَجَةً مِنَ الَّذِينَ أَنْفَقُوا مِنْ بَعْدُ وَقَاتَلُوا وَكُلًّا وَعَدَ اللَّهُ الْحُسْنَى (الحدید ۱۰)

ترجمہ: تم میں سے جن لوگوں نے فتح (مکہ) سے پہلے فی سبیل اللہ خرچ کیا ہے اور قتال کیا ہے، وہ (دوسروں) کے برابر نہیں، بلکہ ان سے بہت بڑے درجے کے ہیں، جنہوں نے فتح کے بعد خیراتیں دیں اور جہاد کیا، ہاں! بھلائی کا وعدہ تو اللہ تعالیٰ کا ان سب سے ہے۔

تابعی مجاہد اور قتادہ کہتے ہیں: **الحسنیٰ** سے مراد جنت ہے۔[2]

علامہ ابن حزم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس آیت سے قطعی استدلال کیا ہے کہ تمام صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم جنتی ہیں، (**وکُلاوعداللہ الحسنیٰ**)۔

چھٹی آیت: **لَقَدْ تَابَ اللَّهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ الَّذِينَ اتَّبَعُوهُ فِي سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيغُ قُلُوبُ فَرِيقٍ مِنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ إِنَّهُ بِهِمْ رَءُوفٌ رَحِيمٌ (التوبۃ ۱۱۷)**

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے پیغمبر کے حال پر توجہ فرمائی اور مہاجرین و انصار کے حال پر بھی۔ جنہوں نے ایسی تنگی کے وقت پیغمبر کا ساتھ دیا، اس کے بعد کہ ان میں سے ایک گروہ کے دلوں میں کچھ تزلزل ہو چلا تھا، پھر اللہ نے ان کے حال پر توجہ فرمائی، بلاشبہ اللہ تعالیٰ ان سب پر بہت ہی شفیق و مہربان ہے۔

---

[1] (الصارم المسلول: ۵۷۲)

[2] (تفسیر ابن جریر: ۱۲۸/۲۷)

غزوۂ تبوک میں خواتین اور بوڑھے معذوروں کے علاوہ تمام صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم شریک ہوئے تھے، تین صحابی پیچھے رہ گئے تھے، بعد میں ان کی توبہ اللہ نے قبول کی اور آیت نازل فرمائی۔

دوم: سنت سے دلائل

پہلی حدیث: عن أبی سعید ,قال: کان بین خالد بن الولید و بین عبد الرحمٰن بن عوف شيء,فسبه خالد, فقال رسول اللہ ﷺ: "لاتسبوا أحدامن أصحابیفانّ أحدکم لو أنفق مثل أحد ذھباماأدرک مُدّأحدھم ولا نصیفه۔

ترجمہ: ابو سعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ خالد بن ولید اور عبد الرحمن بن عوف کے مابین کچھ بات ہو گئی تھی، جس پر خالد بن ولید نے انہیں بُرا بھلا کہہ دیا، اللہ کے نبی ﷺ یہ سُن کر انہیں ڈانٹا: "میرے کسی بھی ساتھی کو گالی مت دو، اگر تم میں سے کوئی اُحد (پہاڑ) کے برابر بھی سونا اللہ کی راہ میں خرچ کر دے تب بھی ان کے ایک یا آدھے مُد کے برابر نہیں پہنچ سکتا۔[1]

ابن تیمیہ الصارم المسلول میں لکھتے ہیں:

"اسی طرح امام أحمد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے بھی کہا ہے: جس کسی نے نبی ﷺ کی صحبت بحالت ایمان ایک سال، ایک مہینہ، ایک دن اختیار کی ہو، یا ایمان کی حالت میں محض دیکھا ہو، وہ صحابی ہے"۔

ایک اشکال پیدا ہو سکتا ہے کہ نبی ﷺ نے خالد بن ولید کو کیوں منع کیا کہ وہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو گالی نہ دیں، جب کہ خالد بھی صحابی ہیں۔ اور فرمایا: اگر تم میں سے کوئی اُحد (پہاڑ) کے برابر بھی سونا اللہ کی راہ میں خرچ کر دے تب بھی ان کے ایک یا آدھے مُد کے برابر نہیں پہنچ سکتا؟

اس کا جواب ہے: کہ عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ سابقین اولین میں سے ہیں، اور ایسے وقت میں یہ آپ ﷺ کے ساتھ تھے جب خالد بن ولید مسلمانوں کے دشمن تھے۔ عبد الرحمٰن بن عوف اور اُن کے ساتھیوں نے صلح حدیبیہ سے قبل خوب مال خرچ کیا اور لڑائیوں میں دل و جان سے شریک ہوئے، اور اللہ نے ان سب سے جنت کا وعدہ کیا، خالد بن ولید اور ان کے ساتھی صلح حدیبیہ کے بعد اسلام لانے کے سبب عبد الرحمن بن عوف کے درجے کو نہیں پہنچ سکتے، اسی لئے اللہ کے نبی ﷺ نے سابقین کو بُرا بھلا کہنے سے روک دیا تھا۔ خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نسبت سابقین کی طرف ایسے ہی ہے جیسے شرف صحبت سے محروم شخص کی نسبت صحابیت کا اعزاز حاصل کرنے والے شخص سے، بلکہ کچھ زیادہ ہی۔[2]

---

[1] (رواہ البخاری ۳۶۷۳، و مسلم ۲۵۴۱)

[2] (الصارم المسلول: ۵۷۶)

دوسری حدیث: اللہ کے رسول ﷺ نے عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا:

ومایدریک، لعل اللہ اطلع علیٰ أھل بدر، فقال: اعملوا ماشئتم فقد غفرت لکم۔ (رواہ البخاری ومسلم)

تمھیں کیا معلوم! اللہ تعالیٰ بدری صحابہ پر نوازشیں کرتا ہے، کہتا ہے: جاؤ، جو من میں آئے کرو، میں نے تمھیں بخش دیا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ (اعملوا) امر کا صیغہ تکریم کے لئے وارد ہوا ہے، اور اس سے مراد ہے، کہ بدری صحابہ جو بھی عمل کریں، ان کا مؤاخذہ نہیں ہوگا اس لئے کہ اللہ نے اُن سے سچا وعدہ کر لیا ہے۔ ایک معنیٰ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ اُن کے بُرے اعمال بخشے بخشائے ہیں، گویا ان سے سرزد ہی نہیں ہوئے۔[1]

امام نووی کا کہنا ہے: علماء کہتے ہیں کہ مغفرت سے مراد اُخروی مغفرت ہے، اگر دنیا میں ان پر حد واجب ہو جائے تو اُن پر نافذ کیا جائے گا، قاضی عیاض نے حد کی نفاذ پر اجماع قرار دیا ہے۔ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے قدامہ بن مظعون رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور دوسرے بدری صحابہ پر حد نافذ کی، نبی ﷺ نے مسطح رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر کوڑے برسائے جب کہ وہ بدری صحابی ہیں۔[2]

علامہ ابن قیم کہتے ہیں: واللہ أعلم! یہ خطاب ایک ایسی قوم کے لئے ہے جس کے بارے میں اللہ جانتا تھا کہ یہ اپنے دین سے ہرگز نہ پھریں گے، اور ان کا خاتمہ اسلام پر ہوگا، ان سے گناہ سرزد ہونگے، لیکن اس پر اصرار نہیں ہوگا، بلکہ انہیں توبۂ نصوح کی توفیق میسر ہوگی، ان کے استغفار اور نیکیاں گناہوں کو مٹا دیں گی، اور یہ خصوصیت صرف انہی کو حاصل ہے، جس کی بنا پر انہیں مغفرت کا پروانہ حاصل ہوا۔ مغفرت کئی اسباب کی بناء پر اُن کے حصہ میں آئی، اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ مغفرت پر بھروسہ کر کے فرائض چھوڑ بیٹھتے، یہ پروانہ فرائض وواجبات کی پیہم ادائیگی پر ملا، پروانۂ مغفرت ملنے کے بعد یہ کہنا محال ہوگا کہ انہیں صوم وصلاۃ، روزہ وحج اور زکاۃ وجہاد کی ضرورت نہیں رہی۔[3]

تیسری حدیث: **عن عِمْرَانَ بْنَ حُصَيْنٍ رَضِيَ اللّٰہ عَنۡهُمَا يَقُولُ قَالَ رَسُولُ اللّٰہِ صَلَّى اللّٰہ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَيْرُ أُمَّتِي قَرْنِي ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ قَالَ عِمْرَانُ فَلَا أَدْرِي أَذَكَرَ بَعْدَ قَرْنِهِ قَرْنَيْنِ أَوْ ثَلَاثًا۔ (متفق علیه)**

---

[1] (معرفۃ الخصال المکفرۃ لابن حجر: ۳۱)

[2] (مسلم مع شرح النووی ۱۶/۵۶)

[3] (الفوائد لابن القیم: ۱۹)

ترجمہ: عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا: میری امت کا بہترین زمانہ میرا ہے، پھر اُس کے بعد آنے والوں کا ہے، پھر اُس کے بعد آنے والوں کا ہے۔ راوی حدیث عمران رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں: مجھے نہیں معلوم کہ آپ ﷺ نے اپنے زمانے کے بعد دو یا تین زمانوں کا ذکر کیا۔[1]

چوتھی حدیث: **عن أبی موسیٰ الأشعري رضی اللہ تعالیٰ عنہ أنّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: النجوم أمنة للسماء فاذا ذھبت النجوم أتی أھل السماء ما یوعدون، وأنا أمنة لأصحابي، فاذا ذھبتُ أنا أتی أصحابیما یوعدون، وأصحابیأمنة لأمتي، فاذا ذھب أصحابي أتی أمتیما یوعدون۔**

ترجمہ: ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کہ ستارے آسمان کے امین و محافظ ہیں، جب یہ ستارے (بشمول شمس وقمر) لپیٹ دئے جائیں گے تو آسمان والوں کو وعدہ کے مطابق (قیامت کا) سامنا ہو گا، میں اپنے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنھم کے لئے امین ونگہبان ہوں، جب میں رخصت ہو جاؤں گا تو میرے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنھم پر وہ چیزیں (اختلافات، فتنے اور آزمائشیں) آئیں گی جن کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے، اور جب میرے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنھم نہیں ہونگے تو امت کو وعدہ کے مطابق اُمور درپیش ہونگے (یعنی: مصائب، مشکلات، شرور و فتن، بدعات و خرافات وغیرہ)۔[2]

پانچویں حدیث: **عن عمر بن الخطاب رضي اللہ عنہ أنّ رسول اللہ ﷺ قال: أکرموا أصحابي فانھم خیارکم (أحمد، نساءي) وفي روایةأخریٰ: احفظوني في أصحابي۔**

عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میرے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنھم کی عزت کرو اس لئے کہ وہ تم میں سب سے اچھے ہیں۔ دوسری روایت میں وارد ہے: میری (سنت کی) حفاظت کے لئے میرے صحابہ کو دیکھو (میرے اصحاب کے حوالے سے مجھے بچائے رکھنا)۔[3]

چھٹی حدیث: **عن واثلة رضی اللہ تعالیٰ عنہ یرفعه: لا تزالون بخیر ما دام فیکم من رأی من رآنیو صحبني، واللہ لا تزالون بخیر مادام فیکم من رأی من رآنیو صاحبني۔**

---

[1] (صحیح بخاری، باب فضائل اصحاب النبی ﷺ، ج ۱۱، ص ۴۸۱، المکتبة الفاروقية، الصحیح مسلم، باب فضل الصحابة رضی اللہ تعالیٰ عنھم ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم، ج ۱۲، ۳۵۸، المکتبة الفاروقية)

[2] (رواہ مسلم ۲۵۳۱)

[3] (ابن ماجہ ۲/ ۶۴)

واثلہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اللہ کے نبی ﷺ سے مرفوعاروایت کرتے ہیں: تم اُس وقت تک بھلائی میں رہو گے جب تک تمہارے درمیان وہ لوگ ہونگے جنہوں (تابعی) نے میرے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو دیکھا اور انہوں نے مجھے دیکھا اور میری صحبت اختیار کی، خدا کی قسم! تم لوگ اُس وقت تک برابر بھلائی میں رہو گے جب تک تمہارے درمیان صحابہ کو دیکھنے والے لوگ موجود ہونگے، اور صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے مجھے دیکھا اور میری مصاحبت اختیار کی۔ [1]

ساتویں حدیث: **عن أنس رضی اللہ تعالیٰ عنه عن رسول اللہ ﷺ: آیة الایمان حب الأنصار، و آیة النفاق بغض الأنصار۔**

وقال في الأنصار کذٰلک لا یحبهم الا مؤمن، ولا یبغضهم الا منافق۔

انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا: انصار سے محبت ایمان کی علامت ہے اور انصار سے بغض و عناد منافق کی نشانی ہے۔ [2]

اصحاب رسول کو برا کہنے والے ملعون کی نہ فرض عبادت قبول نہ نفل:

عَنْ عُوَيْمِ بْنِ سَاعِدَةَ، أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: "إِنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ اخْتَارَنِي وَاخْتَارَ لِي أَصْحَابًا، فَجَعَلَ لِي مِنْهُمْ وُزَرَاءَ وَأَنْصَارًا وَأَصْهَارًا، فَمَنْ سَبَّهُمْ فَعَلَيْهِ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ، لا يَقْبَلُ اللّٰهُ مِنْهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ لا صَرْفًا وَلا عَدْلا هذا حديث صحيح الأسناد ولم يخرجاه، وقال الذهبي "صحيح"۔ [3]

قَالَ إِبْرَاهِيمُ بْنُ الْمُنْذِرِ: الصَّرْفُ وَالْعَدْلُ: الْفَرِيضَةُ وَالنَّافِلَةُ۔ [4]

ترجمہ: حضرت عویم بن ساعدہ رسول اللہ سے مروی ہیں کہ بیشک اللہ تبارک و تعالیٰ نے مجھے چن لیا، اور میرے لئے اصحاب کو چن لیا، پس ان میں بعض کو میرے وزیر اور میرے مددگار اور میرے سسرالی بنادیا، پس جو شخص ان کو برا کہتا ہے، ان پر اللہ کی لعنت اور سارے انسانوں کی لعنت، قیامت کے دن نہ ان کا کوئی فرض قبول ہو گا، اور نہ ہی نفل۔ [5]

---

[1] (ابن أبي شيبة ۱۲/۱۷۸)

[2] (بخاري ۱۱۳/۷، مسلم ۸۵/۱، بخاري ۱۱۳/۷، مسلم ۸۵/۱ بروایت بَراء)

[3] (مستدرک الحاکم: ۶۳۲/۳)

[4] (الشريعة للآجري» رقم الحديث: 1973)

[5] تخریج الحدیث: 1) السفر الثاني من تاريخ ابن أبي خيثمة (سنة الوفاة: 287) » رقم الحديث: 2885) السفر الثاني من تاريخ ابن أبي خيثمة (سنة الوفاة: 279) » رقم الحديث: 31553) الآحاد و المثاني لابن أبي عاصم (سنة الوفاة: 287) » رقم الحديث: 1590 (1772) 4) الآحاد و المثاني لابن أبي عاصم (سنة الوفاة: 287) » رقم الحديث: 1730 (1946) 5) معجم الصحابة لابن قانع (سنة الوفاة: 351) » رقم الحديث: 1285 (1437) 6) الشريعة للآجري (سنة الوفاة: 360) » رقم الحديث: 1972 7) الشريعة للآجري (سنة الوفاة: 360) » رقم الحديث: 1973 8) المعجم الأوسط للطبراني (سنة الوفاة: 360) » رقم الحديث: 467 (456) 9) المعجم الكبير للطبراني (سنة الوفاة: 360) » رقم الحديث: 13809 (349) 10) جزء ابن الغطريف (سنة الوفاة: 377) » رقم الحديث: 1137) المستدرک على الصحيحين (سنة الوفاة: 405) » رقم الحديث: 6686 (3: 629) 12) الجزء التاسع من

اس کے علاوہ اور بہت سی احادیث ہیں جو اجمالا ان کی فضیلت میں وارد ہیں، تفصیلی احادیث بہت زیادہ ہیں، امام أحمد بن حنبل رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنی کتاب "فضائل الصحابہ" (دو جلدوں میں) میں دو ہزار سے زیادہ احادیث و آثار جمع کئے ہیں، اپنے موضوع پر نہایت جامع کتاب ہے، اس کی تحقیق جامعہ ام القریٰ مکہ مکرمہ کے پروفیسر ڈاکٹر وصی اللہ عباس نے کی ہے۔ اور وہیں سے ۱۴۰۳ھ میں شائع ہوئی ہے۔

خلاصۂ مبحث

گزشتہ صفحات میں صحابۂ کرام کے مناقب وفضائل کے متعلق جو آیات واحادیث ذکر کی گئی ہیں، ان کا خلاصہ پیش کیا جارہا ہے:

۱۔ اللہ تعالیٰ نے صحابۂ کرام کے ظاہر و باطن کا تزکیہ کر دیا ہے، ظاہر کی وضاحت میں ان کے بلند اخلاق حمیدہ کو بیان کیا ہے: جیسے: کفار پر شدید اور بھاری ہیں لیکن آپس میں رحم وکرم کا معاملہ کرتے ہیں (الفتح: ۲۹)، اللہ اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں اور یہی سچے لوگ ہیں (الحشر: ۸)، اپنے دلوں میں کوئی تنگی نہیں رکھتے بلکہ خود اپنے اوپر انہیں ترجیح دیتے ہیں، گو خود کو کتنی ہی سخت حاجت ہو (الحشر: ۹)۔ لیکن ان کے باطن کا معاملہ اللہ کے ساتھ خاص ہے، وہی تنہا دلوں کے بھید کو جانتا ہے، صحابہ کا باطن کتنا سچا تھا، ان کی نیت کتنی نیک تھی، مثال کے طور پہ اللہ تعالیٰ بیان کرتا ہے: "اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو پرکھ لیا، اور ان پر سکینت نازل کی" (الفتح: ۱۸)، اور اپنی طرف ہجرت کر کے آنے والوں سے محبت کرتے ہیں (الحشر: ۹)، وہ لوگ اللہ کا فضل اور اس کی خوشنودی تلاش کرتے ہیں (الحشر: ۹)، اللہ نے نبی ﷺ، مہاجرین اور انصار جنہوں نے تنگی کی گھڑی میں اپنے نبی ﷺ کا ساتھ دیا (التوبہ: ۱۱۷)، اللہ تعالیٰ نے ان کی سچی نیت اور توبہ کی بدولت ان کی مغفرت فرمادی، اور توبہ 'خالص قلبی عمل ہے۔

الفوائد المنتقاة (سنة الوفاة:412) »رقم الحديث: 1327) حديث ابن السماک و الخلدي (سنة الوفاة:419) »رقم الحديث: 1456) أمالي ابن بشران 20 (سنة الوفاة:430) »رقم الحديث: 1559) حلية الأولياء لأبي نعيم (سنة الوفاة:430) »رقم الحديث: 1399(1401) 16) معرفة الصحابة لأبي نعيم (سنة الوفاة:430) » رقم الحديث: 4040(4440) 17) معرفة الصحابة لأبي نعيم (سنة الوفاة:430) » رقم الحديث: 4863(5344) 18) المدخل إلى السنن الكبرى للبيهقي (سنة الوفاة:458) » رقم الحديث: 24(47) 19) تلخيص المتشابه في الرسم (سنة الوفاة:463) » رقم الحديث: 936(2:631) 20) أربع مجالس للخطيب البغدادي (سنة الوفاة:463) »رقم الحديث: 2121) مجلسان من أمالي نظام الملک (سنة الوفاة:485)» رقم الحديث: 20 22) الثاني و العشرون من المشيخة البغدادية لأبي طاهر السلفي (سنة الوفاة:576) » رقم الحديث: 55 23) السابع و العشرون من المشيخة البغدادية لأبي طاهر السلفي (سنة الوفاة:576) »رقم الحديث: 2414) التبصرة لابن الجوزي (سنة الوفاة:597) »رقم الحديث: 104 25) التدوين في أخبار قزوين للرافعي (سنة الوفاة:623) »رقم الحديث: 1438 26) مشيخة أبي بكر بن أحمد المقدسي (سنة الوفاة:718) »رقم الحديث: 69(70)

۲۔ ظاہری اور باطنی خیر کے حاملین صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اللہ کی توفیق اسکی خوشنودی اور مغفرت کے مستحق ہوئے، اور اللہ نے اُن سے جنت کا وعدہ کیا۔

۳۔ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی انہی فضیلتوں کے سبب اللہ نے ہمیں ان کے لئے مغفرت کا حکم دیا، اور رسول اکرم ﷺ نے ان کی تکریم، احترام، ان کے حقوق کی حفاظت اور ان سے محبت کا حکم دیا، اور ہمیں ان کی شان میں گستاخی، بے ادبی اور گالی گلوچ سے روکا ہے۔ بلکہ ان سے محبت کو ایمان کی علامت اور ان سے بغض کو نفاق کی نشانی قرار دیا ہے۔

۴۔ ان ساری صفات و دلائل کے مد نظر اُن کا دور بہترین دور تھا، وہ امت کے امین تھے، اور اس کے ساتھ امت پر ان کی اقتداء واجب ہے، بلکہ یہی واحد طریقہ ہے جنت کی طرف لے جانے کا: **عليكم بسنتي وسنة الخلفاء الراشدين المهديين من بعدي۔**[1] تم پر میری سنت اور میرے بعد ہدایت یاب خلفائے راشدین کی سنت کو پکڑے رہنا واجب ہے۔

صحابۂ کرام کی تعظیم اور ان کی قدر و منزلت کی معرفت کبار صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے نزدیک مسلم امر ہے، اگر صحابی نے محض چند لمحات ہی اللہ کے نبی ﷺ کے ساتھ گزارا ہو۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اپنی یادداشت کے مطابق کہتے ہیں: میں نے محمد بن قدامۃ المروزی کی کتاب "أخبار الخوارج" میں یہ قصہ پڑھا: سند ذکر کرنے کے بعد، نبیح العنزی بیان کرتے ہیں کہ ہم ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس بیٹھے تھے اور ابو سعید ٹیک لگائے ہوئے تھے، تو ہم نے علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ذکر چھیڑ دیا، ایک آدمی معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو غلط کہنے لگا، اتنے میں ابو سعید تن گئے اور تادیب کے لئے اپنا قصہ بیان کیا جس میں وہ اور ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نیز ایک دیہاتی (بدو) رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے، پھر ابو سعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: ایک مرتبہ میں نے دیکھا اُسی بدو کو عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فاروق نے بلوایا تھا اور اس کا قصور تھا، اس نے انصار کی ہجو بیان کی تھی، عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مجلس میں لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا: اس بدو کو اگر نبی ﷺ کی صحبت نہ ملی ہوتی، تو مجھے خود خبر نہیں کہ آج کیا ہو جاتا، اور تم سب پر تنہا کافی ہوتا۔[2]

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے کہا: اس قصہ کے تمام راوی ثقہ ہیں۔

عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اُس بدو کو سزا دینا تو دور، اُس کی سرزنش بھی نہیں کی، صرف اس وجہ سے کہ اس نے اللہ کے نبی ﷺ سے ملاقات کا شرف حاصل کیا ہے، یہ واضح دلیل ہے کہ صحابہ کا خود عقیدہ تھا کہ شان صحبت کا کوئی بدل نہیں۔

---

[1] (أحمد ۴/۱۲۶)

[2] (الصارم المسلول: ۵۹۰)

وکیع رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کہتے ہیں کہ میں نے سفیان ثوری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو فرماتے ہوئے سنا: اللہ تعالیٰ کا قول ہے: قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی (النمل ٥٩) تو کہہ دے کہ تمام تعریف اللہ ہی کے لئے ہے اور اُس کے برگزیدہ بندوں پر سلام ہے۔ انہوں نے کہا: کہ اس سے مراد محمد ﷺ کے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم ہیں۔ تو اس حسن انتخاب واختیار کا تصور وادراک مشکل امر ہے، یہ ایسا معاملہ ہے جہاں عقل کے گھوڑے بھی نہیں دوڑائے جاسکتے۔ اور خواہ کسی کے اعمال کتنے ہی بڑھے ہوئے ہوں، صحابہ کی فضیلت کو نہیں پاسکتے، (اس لئے صحابہ کے ساتھ دوسرے لوگوں کا موازنہ درست نہیں)۔

عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کہتے ہیں: ''محمد ﷺ کے ساتھیوں کو گالی مت دو، ان کے مقام کا حال یہ ہے کہ اُن کا تھوڑا سا نیک عمل تمہارے چالیس سال کی نیکیوں پر بھاری ہے'' وکیع رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی روایت میں ہے: ''اُن کا معمولی عمل تمہارے عمر بھر کی عبادت سے بہتر ہے''۔[1]

جمہور علماء کرام کا ماننا ہے کہ فضل صحابیت کے مقابل کسی کا کوئی عمل نہیں پہنچ سکتا، اس لئے کہ انہوں نے اللہ کے نبی ﷺ کو دیکھا ہے۔ علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جنہوں نے ابتداء میں نبی ﷺ کی مدافعت کی، آپ ﷺ کی طرف ہجرت اور نصرت میں سبقت لے گئے، یا جنہوں نے شریعت مطہرہ کو آپ ﷺ سے سیکھا اور سینے میں محفوظ کیا اور اُسے آپ ﷺ کے بعد آنے والے لوگوں تک پہنچایا، تو ایسے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا کوئی مد مقابل نہیں، کیونکہ اُن کے بتائے ہوئے طریقے پر لوگ چلتے رہے، اور لوگوں کے اس عمل کا ثواب انہیں بھی برابر ملتا رہا، جس سے ان کی فضیلت ظاہر ہوتی ہے۔[2]

امام أحمد بن حنبل رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے متعلق عقیدے میں لکھتے ہیں:

ادنیٰ صحابی افضل ہے اُس صدی کے لوگوں سے جنہوں نے اللہ کے رسول ﷺ کو نہیں دیکھا، اگرچہ اُن لوگوں نے تمام أعمال کے ساتھ اللہ سے ملاقات کی ہو۔[3]

امام نووی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کہتے ہیں: صحبت رسول ﷺ اگرچہ ایک لحظہ کے لئے ہی کیوں نہ ہو، اس کی فضیلت کے برابر کوئی عمل نہیں ہو سکتا، اور نہ ہی اس مرتبہ تک کسی چیز کے ذریعے پہنچا جاسکتا ہے، اور فضائل کو قیاسا اختیار نہیں کیا جاتا، یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہے عطا کرتا ہے۔[4]

---

[1] (أحمد، فضائل الصحابة ١/٥٧)

[2] (فتح الباری ٧/٧)

[3] (شرح أصول اعتقاد أهل السنة للالكائى ١/١٦٠)

[4] (مسلم بشرح النووی: ١٦/٩٣)

اسی طرح اللہ عزوجل جو دلوں کے بھید سے بخوبی واقف ہے، اس نے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے باطن کی طہارت اور تزکیہ بیان کر دیا ہے، جیسے اللہ کا قول: (**فعلم ما في قلوبهم**) اور ان کی توبہ کی قبولیت کا ذکر: (**لقد تاب الله على النبي والمهاجرين والأنصار**) اور اللہ کی رضا وحصول خوشنودی کا بیان: (**لقد رضي الله عن المؤمنين اذ يبايعونك تحت الشجرة فعلم ما في قلوبهم فأنزل السكينة عليهم وأثابهم فتحا قريبا**) الخ۔ یہ سب ان کی خصوصیت پہ دال ہیں، ان کے بعد آنے والوں کے لئے کہاں ایسی تزکیات ملیں گی؟

لیکن کہنے والا یہ کہہ سکتا ہے کہ "بعض روایات اوپر ذکر کی گئی روایتوں کے خلاف ہیں جیسے نبی ﷺ کا فرمان: (ابو ثعلبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ حدیث کے راوی ہیں):

"تأتي أيام للعامل فيهن أجر خمسين" قيل: منهم أو منا يا رسول الله؟ قال: "بل منهم"۔[1]

ایسا وقت آئے گا کہ ایک عمل کرنے والے کو ۵۰ لوگوں کے برابر اجر ملے گا، آپ ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ وہ ۵۰ لوگ ہمارے برابر ہونگے یا ہمارے علاوہ؟ آپ نے فرمایا: تم میں سے ۵۰ لوگوں کے برابر۔

اسی طرح ابو جمعہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ابو عبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اللہ کے نبی ﷺ سے پوچھا: اے اللہ کے رسول! ہم آپ ﷺ کے ہاتھ پر اسلام لائے، آپ ﷺ کے ساتھ جہاد کیا، (کیا اس کے باوجود) ہم سے بہتر بھی کوئی ہے؟

آپ ﷺ نے فرمایا:

قوم يكونون من بعدكم يؤمنون بي ولم يروني۔[2]

تمہارے بعد ایک ایسی قوم ہوگی جو مجھے دیکھے بغیر مجھ پر ایمان لائے گی۔

مذکورہ احادیث کے مابین تطبیق کی مختلف وجوہات:

پہلی وجہ: حدیث (للعامل فيهن أجر خمسين) افضلیت پر دلالت نہیں کرتی، محض بعض اعمال پر اجر وثواب کا اضافہ مطلق افضلیت کے لئے ناکافی ثبوت ہے۔

دوسری وجہ: مفضول کے اندر چند ایسی فضیلت اور خصوصیات پائی جاسکتی ہیں جو افضل کے پاس نہ ہو، لیکن مجموعی طور پہ مفضول افضل کے برابر نہیں ہو سکتا۔

---

[1] (ابو داؤد: ۴۳۴۱، وصححه الألباني)

[2] (أحمد: ۴/۱۰۶)

تیسری وجہ: یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ افضلیت دونوں کے مابین اکٹھی ہونے کا امکان ہے، اور وہ عام مسلمانوں کے بیچ مشترک عبادتوں میں ہوسکتا ہے، اور کسی کے عمل کو بعض صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم پر جزوی افضلیت دینے کا امکان موجود ہے۔ لیکن صحابۂ کرام جن خصوصیات کے حامل ہیں اور جو ان کی کامرانی کا سبب بنا، ان میں نمایاں وصف اس محترم و مشرف ہستی ﷺ کے روئے انور کا دیدار ہے، جو سب پر بھاری ہے، کوئی کتنا بھی عمل کرلے، چاہے ان کے برابر بھی عمل کرلے مگر ان کے مثل نہیں ہوسکتا۔[1]

چوتھی وجہ: ابو جمعۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث کے لفظ پر سارے راوی متفق نہیں، حتی کہ بعض نے 'الخیریة' کے لفظ کے ساتھ استعمال کیا ہے۔

اور بعض نے ان الفاظ کے ساتھ روایت کی ہے:

قلنا یا رسول اللہ هل من قوم أعظم منا أجرا؟ أخرجه الطبراني۔

ہم نے پوچھا اے اللہ کے رسول ﷺ! کیا کوئی قوم ایسی بھی ہے جو اجر میں ہم سے بڑھ کر ہو۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فتح الباری میں لکھتے ہیں:

اس روایت کی سندیں زیادہ قوی ہیں بہ نسبت ابو جمعہ کی روایت، جو ابو ثعلبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت کے موافق ہے اور اس کا جواب دیا جاچکا ہے۔

اس اخیر فقرہ میں یہ تنبیہ مناسب ہے کہ جمہور علماء کا جو صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے سلسلے میں اختلاف ہے، وہ سینئر اور بڑے صحابہ جیسے خلفاء اربعہ، عشرۂ مبشرہ، اہل بیعت عقبہ، اہل بدر، بیعت رضوان اور اہل تبوک وغیرہ۔۔۔۔۔ اس اختلاف میں شامل نہیں ہیں، اختلاف صرف ان صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے بارے میں ہے جنھوں نے محض آپ ﷺ کو صرف دیکھا ہے۔ اسی لئے امام ابن عبد البر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اہل بدر اور اہل حدیبیہ کو اس نزاع سے مستثنیٰ قرار دیا ہے۔[2]

---

[1] (الصواعق المحرقة للهيثمي: ص: ۳۲۱)

[2] (فتح الباری ۷/۷)

سبِّ (گالی) صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی قسمیں اور اُن کا حکم

اول: جس نے تمام صحابہ یا اکثر صحابہ کو کافر، مرتد اور فاسق کہہ کر گالی دی

ایسے شخص کے کافر ہونے میں کوئی شبہ نہیں، اس لئے کہ قرآن وسنت کے ناقلین کو کافر یا فاسق کہنے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اُسے قرآن اور حدیث میں شک ہے، ناقلین پر افتراء پردازی کا مطلب ہے کہ منقول (قرآن وسنت) بھی جھوٹا ہے، جب کہ قرآن نے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی شان میں قصیدے پڑھے ہیں اور اللہ اُن سے راضی ہو چکا ہے۔

قرآن اور احادیث کے نصوص سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی فضیلت پر قطعی دلالت کرتا ہے۔[1]

تو جس نے قطعیت کا انکار کیا وہ کافر ہو گیا۔

صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو گالی دینے کا مطلب نبی ﷺ کو ایذاء پہنچانا ہے، اس لئے کہ وہ آپ ﷺ کے خواص، محبوب اور ساتھی تھے، اور کسی کے محبوب وخواص کو گالی دینے پر اُسے تکلیف پہنچے گی ہی۔ اور نبی ﷺ کو تکلیف دینا کفر ہے۔

ابن تیمیہ نے اس قسم کا حکم بیان کیا ہے:

جو اپنے گمان میں اس قدر تجاوز کر جائے کہ اللہ کے نبی ﷺ کے انتقال کے بعد چند صحابۂ کرام کو چھوڑ کر سب مرتد ہو گئے تھے، یا انکی اکثریت فاسق ہو گئی تھی، تو ایسے شخص کے کافر ہونے میں کوئی شک نہیں، اس لئے کہ اس نے قرآن کے نصوص کو جھٹلایا، جو ان کی فضیلت میں کئی جگہ وارد ہیں، جیسے اللہ کا اُن سے راضی ہو جانا، اُن کی مدح وثناء بیان کرنا، تو ایسے لوگوں کے کافر ہونے میں جو شک کرے وہ خود کافر ہے۔ ابن تیمیہ نے آگے لکھا: کہ ایسے لوگوں کا یہ کفر دین اسلام کی تعلیمات کی روشنی میں لازماً جانا جائے۔[2]

امام ہیثمی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کہتے ہیں: کہ علماء کا اختلاف بعض صحابہ کو گالی دینے کے سلسلے میں ہے کہ وہ کافر ہے یا نہیں؟ لیکن تمام صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو گالی دینے والا یقیناً کافر ہے۔[3]

---

[1] (الردعلی الرافضة: ١٩)

[2] (الصارم المسلول: ٥٨٦)

[3] (الصواعق المحرقة: ٣٧٩)

مذکورہ دلائل کی توضیح کے ساتھ یہاں بعض علماء کے دوسرے تفصیلی دلائل بیان کئے جارہے ہیں:

(۱) سورۂ فتح کی آخری آیت کی تفسیر پیچھے گزری ہے: اللہ کا قول: **(محمد رسول الله و الذين معه۔۔الی۔۔ليغيظ بهم الكفار)** امام مالک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اس آیت سے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ جو صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے بغض رکھے وہ کافر ہے، ایسے لوگوں سے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم خود بغض رکھتے تھے، اور صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم جس سے نفرت کریں، وہ کافر ہے، امام شافعی اور دوسرے علماء کا بھی یہی موقف ہے۔[1]

(۲) بخاری و مسلم کے حوالے سے اَنس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت پیچھے گزری ہے جس میں اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا: انصار سے محبت ایمان کی نشانی ہے اور اُن سے بغض نفاق کی علامت ہے۔

مسلم شریف کی ایک روایت میں ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا:

لايبغض الأنصار رجل آمن بالله و اليوم الآخر۔

اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھنے والا شخص انصار سے بغض نہیں رکھ سکتا۔[2]

توجو لوگ انہیں گالی دیتے ہیں، اُن کا منافق ہونا واجب ہو گیا، جن کا ایمان نہ تو اللہ پر ہے اور نہ ہی آخرت کے دن پر۔[3]

(۳) امیر المؤمنین عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ثابت ہے کہ انہوں نے ایک مرتبے ایک شخص کو دُرّے لگائے جس نے اُن کو ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر فوقیت دی تھی، اور پھر عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا تھا: ''ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ ﷺ کے بعد لوگوں میں سب سے زیادہ افضل ہیں، فلاں فلاں چیزوں میں۔۔۔'' پھر کہا: جو اس کے خلاف کہے گا، اُس پر ہم حد نافذ کریں گے جیسا کہ اُس جھوٹے کو دُرّے لگائے گئے''۔[4]

اسی طرح امیر المومنین علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا:

''مجھ کو کوئی بھی ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ و عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر فضیلت نہ دے، ورنہ میں اُس پر افتراء پردازی کی حد نافذ کروں گا''۔[5]

---

[1] (الصواعق المحرقة، ص:۳۱۷)
[2] (مسلم: ۸۶/۱)
[3] (الصارم المسلول، ص: ۵۸۱)
[4] (فضائل الصحابة للامام أحمد: ۳۰۰/۱)
[5] (فضائل الصحابة للامام أحمد: ۸۳/۱)

جب دو خلیفۂ راشد عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ و علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اُن لوگوں پر افتراء پردازی کی حد نافذ کرنے کا عزم کرتے ہیں جو علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ و عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر ترجیح دیتے ہیں یا جو عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر فوقیت دیتے ہیں۔ حالانکہ محض افضلیت کو اوپر نیچے کرنے میں نہ کوئی عیب ہے اور نہ ہی گالی۔ تو اندازہ لگائیں کہ گالی کی سزا ان دونوں کے نزدیک کتنی بھاری رہی ہوگی۔ [1]

دوم: جس نے بعض صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو گالی دی جس سے دین میں طعن و تشنیع لازم آتی ہے:

جیسے اُن پر کفر اور فسق کی تہمت لگائے، اور وہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں ایسے لوگ ہوں جن کے فضل میں متواتر روایتیں وارد ہیں، جیسے خلفائے راشدین۔ تو ان کو طعن و تشنیع کرنے والا کافر ہے کیونکہ اس نے متواتر کو جھٹلایا ہے۔

ابو محمد بن ابو یزید روایت کرتے ہیں کہ سحنون رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا: "جس نے ابو بکر، عمر، عثمان اور علی رضی اللہ عنہم کے بارے یہ کہا: کہ وہ لوگ گمراہی اور کفر کی راہ پر تھے، وہ واجب القتل ہے، ان کے علاوہ اگر دوسرے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو بھی گالی دی گئی تو اُسے سخت سزا دی جائے گی"۔ [2]

ہشام بن عمار کہتے ہیں:

میں نے امام مالک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو یہ کہتے ہوئے سنا جو ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ و عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو گالی دے اُسے قتل کر دیا جائے گا، جو ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو گالی دے، وہ بھی واجب القتل ہے۔

اس لئے کہ اللہ تعالیٰ ان کے بارے میں فرماتا ہے:

يَعِظُكُمُ اللَّهُ أَنْ تَعُودُوا لِمِثْلِهِ أَبَدًا إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ (النور ۱۷)

اللہ تعالیٰ تم کو نصیحت کرتا ہے کہ پھر کبھی بھی ایسا کام نہ کرنا، اگر تم سچے مؤمن ہو۔

تو جس نے عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو متہم کیا، اُس نے قرآن کی خلاف ورزی کی، اور قرآن کی خلاف ورزی کرنے والا قتل کر دیا جائے گا۔ [3]

---

1 (الصارم المسلول، ص: ۵۸۶)

2 (الشفاء للقاضی عیاض ۲/۱۰۹ ۱)

3 (الصواعق المحرقة، ص: ۳۸۴)

امام مالک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا دوسرا قول:

"جس نے ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو گالی دی اُسے کوڑے لگائے جائیں گے، اور جس نے عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو گالی دی اُسے قتل کر دیا جائے گا، اُن سے پوچھا گیا: ایسا کیوں؟ تو انہوں نے کہا: جس نے ان پر تہمت تراشی کی، گویا اُس نے قرآن کا انکار کیا" ظاہر میں (واللہ أعلم)۔

امام مالک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا مقصد یہاں ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو گالی دینے سے آدمی کافر نہیں ہو گا، جب کہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو گالی دینے والا کافر ہے، یہاں مخصوص گالی (تہمت تراشی) دینے والے کو کافر کہا گیا ہے، دوسرے اقسام کی گالیاں اس حکم میں داخل نہیں ہیں، حالانکہ پہلی روایت میں امام مالک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے ثابت ہے کہ ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تکفیر کرنے والا واجب القتل ہے۔[1]

امام ہیثمی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو گالی دینے کا حکم بیان کرتے ہیں:

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ احناف کے نزدیک اَبو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو گالی دینے والا کافر ہے، شافعیوں کا مسلک بھی یہی ہے، البتہ مالکیوں کے نزدیک مشہور مسلک یہی ہے کہ وہ کافر نہیں ہے بل کہ اُسے کوڑے مارے جائیں گے۔

دوسری جگہ پر امام مالک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ خوارج کو کافر قرار دیتے ہیں، تو ان کے نزدیک مسئلہ کی دو شکلیں بنتی ہیں: اگر تکفیر کے خاطر خواہ اسباب نہیں پائے جاتے ہیں تو اس کی تکفیر نہیں کرتے، ورنہ اُسے کافر قرار دیتے ہیں۔[2]

امام ہیثمی دوسری جگہ لکھتے ہیں: جو لوگ ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کے ہمراہی کو کافر قرار دیتے ہیں، جن کے لئے نبی ﷺ نے جنت کی بشارت دی ہے، اس سلسلے میں امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے اصحاب خاموش ہیں، لیکن میرا نظریہ ہے کہ وہ صریح کفر ہے۔[3]

خرشی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کہتے ہیں: جس نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پر ایسی تہمت لگائی، جس سے اللہ نے ان کی برأت فرمائی ہے، یا جو لوگ ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی صحابیت، یا عشرۂ مبشرہ کے اسلام، یا تمام صحابہ کے اسلام کا انکار کرے یا خلفائے اربعہ میں سے کسی تکفیر کرے تو وہ کافر ہے۔[4]

---

[1] (الشفاء: ۲/۱۱۰۹)

[2] (الصواعق: ۳۸۶)

[3] (الصواعق: ۳۸۵)

[4] (الخرشی علیٰ مختصر خلیل: ۸/۷۴)

خطیب بغدادی کہتے ہیں: کہ علماء لکھتے ہیں: وہ شخص کافر ہے جو عشرۂ مبشرہ میں سے کسی کی تکفیر کرے، اسی طرح نبی ﷺ کی تمام ازواج مطہرات کا احترام اور ان سے محبت واجب ہے، جو شخص ان میں سے کسی کی بھی تکفیر کرے، اُسے کافر قرار دیا جائیگا۔[1]

اس مسئلہ میں اختلاف مشہور ہے، لیکن راجح یہی ہے کہ وہ کافر ہے جو انہیں گالی دے یا ان کی تکفیر کرے۔ جو لوگ کفر کے قائل نہیں ہیں، اُن کا اتفاق ہے کہ وہ فاسق، اور گناہ کبیرہ کا مرتکب ہے۔ صحابی کے مقام و مرتبہ اور گالی کی نوعیت دیکھ کر ایسے لوگوں کو سزا دینی چاہیئے۔

مزید ملاحظہ فرمائیں: ہیثمی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کہتے ہیں: اس بات پر اجماع ہے کہ جو صحابہ کو فاسق قرار دے وہ کافر نہیں ہے۔[2]

ابن تیمیہ کہتے ہیں: ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے کہا: کہ ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ وعمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو گالی دینا کبیرہ گناہوں میں شمار کیا جاتا ہے، اسی طرح ابو اسحاق سُبیعی سے منقول ہے: ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ وعمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو گالی دینا کبیرہ گناہوں میں اس لئے شمار ہے۔

کیونکہ اللہ نے اُن کے بارے میں فرمایا:

إِنْ تَجْتَنِبُوا كَبَائِرَ مَاتُنْهَوْنَ عَنْهُ (النساء ۳۱)

اگر تم بڑے گناہوں سے بچتے رہو گے جن سے تم کو منع کیا جاتا ہے۔

اگر صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو گالی دینے کی یہی شکل ہے تو گالی دینے والے کو تادیبا سزا دی جائے گی، کیونکہ سزا ہر اس معصیت پر دی جاسکتی ہے جس پر حد اور کفارہ ثابت نہیں ہے، اور اس مسئلہ میں اہل علم کے درمیان (صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم، تابعین، اہل سنت والجماعت) کوئی اختلاف نہیں۔

بلکہ سب کا اس بات پر اجماع ہے: کہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی مدح و ثناء، اُن کے لئے استغفار اور رحمت طلبی واجب ہے، اور اُن کے متعلق گالی گلوچ کرنے والے کو سزا دی جائے گی۔[3]

---

[1] (الفرق بین الفرق، ص: ۳۶۰)

[2] (الصواعق المحرقة: ۳۸۳)

[3] (اللآلکائی: ۱۲۶۲/۸)

قاضی عیاض رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کہتے ہیں: ”صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں کسی کو بھی گالی دینا گناہ کبیرہ ہے، گالی دینے والے کو قتل کے علاوہ دوسری سزائیں دی جائیں گی، یہی میرا اور جمہور علماء کا مسلک ہے“۔[1]

عبد الملک بن حبیب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کہتے ہیں:

کوئی غالی شیعہ عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بغض اور برأت کا اظہار کرے، اُسے سخت سزادی جائے گی، اور وہ اگر ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ و عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نفرت وعداوت کا اظہار کرے تو اُس پر سزا بڑھادی جائے گی، اُس کی پٹائی ڈبل کی جائے گی، اور اُسے تاحیات جیل میں رکھا جائے گا۔[2]

ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو گالی دینے والے کو محض کوڑے مارنے پر اکتفاء نہیں کیا جائے گا، کوڑا صرف رفاقت نبی ﷺ کے انکار یا سب وشتم پر لگایا جائے گا، اگر کوئی انکی دینی حمیت و نصرت، خلافت اور ان کی فتوحات کو مطعون کرنے کی کوشش کرتا ہے، تو اس کی ملعون جرأت پر علٰحدہ سزادی جائے گی۔[3]

اور حاکم وقت ان سزاؤں کو ہر حال میں نافذ کرے گا

امام أحمد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کہتے ہیں: کسی کے لئے جائز نہیں کہ وہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی معمولی بھی بُرائی کرے یا اُن کے عیب ونقص ڈھونڈے اور نشتر چلائے، اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو سلطان (حاکم) پر واجب ہے کہ اُسے سخت سزادے، اسے معاف نہیں کیا جاسکتا، سماعت کے دوران اگر توبہ کرلے تو اُسے چھوڑ دیا جائے گا، پھر وہی غلطی کرے تو اُسے حبس دوام کی سزا دی جائے گی، یہاں تک اُس کی موت ہوجائے یا پھر اپنی غلطی سے تائب ہوکر رجوع کرلے۔[4]

میرے مسلمان بھائی! آپ امام احمد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے اس قول پر غور کریں کہ کسی ایک صحابی پر طعن یا عیب لگانا کس قدر سزا کا موجب ہے، اور صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو گالی دینا گناہ کبیرہ ہے اور گالی دینے والے کا حکم یہ ہے کہ وہ کفر کی جہت سے گناہ کبیرہ کا مرتکب ہے۔

محمد بن عبد الوہاب نجدی سبّ ِصحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا حکم بیان کرتے ہیں:

جس نے خصوصیت کے ساتھ بعض صحابہ کو گالی دی جن کے فضل و کمال کے متعلق متواتر روایتیں موجود ہیں جیسے خلفاء راشدین۔ تو جو اُنہیں گالی دینے کو جائز سمجھے، اُس نے کفر کیا، اللہ کے نبی ﷺ کے ارشادات کو جھٹلانے کے نتیجے میں۔ اور سنت

---

[1] (مسلم بشرح النووی ۱۶/۹۳)

[2] (الشفاء: ۲/۱۱۰۸)

[3] (الصواعق المحرقۃ: ص ۳۸۷)

[4] (طبقات الحنابلہ ۱/۲۴)

کی تکذیب کرنے والا کافر ہے۔ اور جس نے یونہی گالی دی تو اُس نے فسق کا ارتکاب کیا، اس لئے کہ مسلمان کو گالی دینا فسق ہے، اور بعض علماء نے لکھا ہے کہ شیخین (ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ و عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کو مطلقا گالی دینے والا بھی کافر ہے۔ و اللہ أعلم[1]

امام أحمد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے قول پر قاضی أبو یعلیٰ تعلیقاً لکھتے ہیں:

جب اُن سے صحابہ کو گالی دینے کا حکم پوچھا گیا، تو انہوں نے کہا "ما أراه علی الاسلام" کہ میں ایسے شخص کو مسلمان نہیں سمجھتا۔ میرے خیال میں احتمال اس بات کا ہے کہ جب وہ گالی دینے کو حلال جانے، ایسی صورت میں وہ بلا اختلاف کافر ہے، اور ایسے شخص کو قتل نہیں کیا جائے گا جو اس بات کا عقیدہ رکھے کہ اُنہیں گالی دینا حرام ہے، لیکن منہ سے اُن کے لئے گالی نکل گئی۔ یہ اُسی طرح ہے جیسے آدمی کوئی گناہ کا کام کرتا ہے۔[2]

خلاصۂ کلام یہ کہ ایسی گالی اور طعن جو صحابہ کے دین اور عدالت کو مجروح کرے، جن کی فضیلت میں متواتر نصوص وارد ہیں، ان کو گالی دینے والا' راجح قول کے مطابق کافر ہے، اس لئے کہ اس نے امر متواتر کو جھٹلایا ہے، اور جن علماء نے کفر کا حکم نہیں لگایا ہے، اُن کا اجماع ہے کہ وہ مرتکب کبیرہ ہے، تادیب و سزا کا حقدار ہے، امام وقت کو حق نہیں کہ اُسے معاف کر دے، بلکہ اُس کی سزا میں صحابی کے رتبے کو دیکھتے ہوئے اضافہ بھی کیا جائے گا۔ اور وہ کافر اُس وقت ہو گا جب انہیں گالی دینے کو حلال جانے۔ اور جو سبِّ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو عین ایمان سمجھے، اللہ کی عبادت تصور کرے، اس کو کافر قرار دینے میں علماء متفق ہیں، اور اس سلسلے میں علماء کے واضح اقوال و دلائل پیچھے گزر چکے ہیں۔ اس نوع کی تفصیل بیان کرنے کے بعد ان شاء اللہ آگے کے موضوعات بہت آسانی سے واضح ہو جائیں گے۔

---

[1] (الرد علی الرافضۃ: ص: ۱۹)

[2] (الصارم المسلول، ص: ۵۷۱)

(۱۱) باب نمبر گیارہ: اہل بیت اطہار رضوان اللہ علیہم اجمعین کی گستاخی کا بیان

بعض علماء و عوام اہل بیت اطہار رضوان اللہ علیہم اجمعین کی توہین کرتے ہیں اور بعض نام نہاد سُنی جناب امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شان میں گستاخی کرتے ہیں، جب کہ ان کی شان میں گستاخی کرنے والا حلالی نہیں ہے، تو سُنی کیسے ہو سکتا ہے۔

حضور ختم الرسل ﷺ کی ذاتِ بابرکات کو خالق کائنات جلّ وعلا نے اپنے قرب کے انتہائی مقام پر فائز فرمایا جہاں کوئی نہ پہنچ سکا اور کمالات عالیہ عنایت فرما کر پوری کائنات میں ممتاز اور فائق فرمایا، اور قاسمِ فیضانِ الٰہی بنا کر شرفِ خلافتِ مطلقہ عطا فرمایا۔ اس لئے جو کچھ کسی کو ملتا ہے وہ آپ ﷺ کے توسل سے ہی ملتا ہے۔ اس پر حدیث "**انما انا قاسم و اللہ یعطی**" ناطق ہے۔ آپ ﷺ سے نسبت رکھنے والی اشیاء بھی متبرک اور قابلِ احترام ہوتی ہیں۔ وہ حضرات جنہیں آپ ﷺ سے ایمان کے ساتھ کسی طرح کی بھی نسبت ہو، وہ قابل صد احترام ہیں۔ آپ ﷺ سے نسبت رکھنے والے دو طبقے ہیں، ایک طبقہ کے لوگ وہ ہیں جو آپ ﷺ کے خاندان کے افراد ہیں اور آپ ﷺ پر ایمان لائے ہیں جنہیں اہل بیت کہتے ہیں۔ اور ایک طبقہ کے لوگ وہ جو آپ ﷺ سے خاندانی نسبت نہیں رکھتے مگر آپ ﷺ پر ایمان لائے انہیں صحابی کہتے ہیں۔ دونوں طبقات کی نسبت آپ ﷺ سے ہے اسی وجہ سے دونوں طبقات کی محبت و عزت و احترام لازم ہے۔ دونوں میں سے کسی ایک سے بغض و نفرت دوسرے کی نفرت و بغض کو مستلزم ہے کیونکہ دونوں کی علت ذاتِ پاک مصطفی ﷺ ہے۔ لہٰذا اہل بیت سے محبت کے ساتھ ساتھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی محبت بھی لازمی ہے اور صحابہ کرام کی محبت کے ساتھ ساتھ اہل بیت کی محبت بھی لازمی امر ہے۔

اہل بیت کی محبت کی آڑ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی شان میں گستاخی و بے ادبی سخت ترین جرم و گناہ و زندیقیت ہے۔

امام ابو زرعہ عبید اللہ بن عبد الکریم الرازی رحمۃ اللہ علیہ المتوفی ۲۶۴ھ کا یہ ارشاد بہت سے اکابر نے نقل کیا ہے:

اذا رأیت الرجل ینتقص احدًا من اصحاب رسول اللہ ﷺ فانہ زندیق و ذٰلک ان الرسول عندنا حق و القراٰن حق و انما ادیٰ الینا ھٰذا القراٰن و السّنن اصحاب رسول اللہ ﷺ و انما یریدون ان یجرحوا شھودنا لیبطلوا الکتاب و السّنۃ و الجرح بھم اولیٰ و ھم زنادقۃ۔

"جب کسی کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی کی تنقیص کرتا دیکھو تو یہ سمجھ لو کہ وہ زندیق ہے اور یہ اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ ہمارے نزدیک برحق ہیں، قران حق ہے اور یہ قرآن و سنت ہمیں اصحابِ رسول ﷺ نے ہی پہنچایا ہے (جو

لوگ صحابہ رضی اللہ عنہم پر معترض ہوتے ہیں) وہ یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے دین کے گواہوں کو مجروح کریں تاکہ اس طرح سے وہ کتاب وسنّت کو مجروح کر سکیں ایسے لوگ خود قابلِ جرح ہیں اور زندیق ہیں"۔[1]

ہمارے اس دور میں اپنے آپ کو سادات گردانے والے کچھ لوگ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی شان میں بہت بے ادبی اور گستاخی کرتے ہیں۔ ایسا کہنے والا قطعی طور پر سادات کے نقش قدم پر نہیں ہو سکتا۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی بہت بڑی شان اور رتبہ ہے۔ بارگاہِ رسالت ﷺ میں آپ رضی اللہ عنہ کو ایک خاص مقام حاصل تھا، حضور خاتم النبیین ﷺ نے آپ کے بارے میں ہادی اور مہدی کے الفاظ استعمال کئے، مختلف مواقع پر آپ ﷺ نے ان کے بارے میں مختلف دعائیں فرمائیں۔ چنانچہ سیدنا عبد الرحمن بن ابی عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سید دو عالم ﷺ نے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارہ میں ان الفاظ میں دعا فرمائی: **اللھم اجعلہ ھادیًا مھدیًّا واھدہ واھد بہ۔** اے اللہ! معاویہ رضی اللہ عنہ کو لوگوں کے لئے ہدایت دینے والا اور ہدایت یافتہ فرما اور ان کو ہدایت دے اور ان کو دوسروں کے لئے ذریعہ ہدایت بنا۔[2]

ایک اور روایت میں جو سیدنا عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، سید دو عالم ﷺ نے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ دعائیہ کلمات ارشاد فرمائے:

اللھمّ علّم معاویۃ الکتاب والحساب وقہ العذاب۔

"اے اللہ! معاویہ رضی اللہ عنہ کو کتاب اور حساب کا علم عطا فرما اور اسے عذابِ جہنم سے محفوظ فرما"۔[3]

ملا علی قاری حنفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

ولا ارتیاب ان دعاء النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مستجاب فمن کان ھذا حالہ فکیف یرتاب فی حقہ۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی دعا یقیناً قبول ہوتی ہے لہٰذا جس شخص کے حق میں یہ دعائیں ہوئی ہیں اس کے بارہ میں ان کی قبولیت میں کس طرح شک کیا جا سکتا ہے"۔[4]

---

[1] (الاصابۃ فی تمیز الصحابۃ، ج ۱، ص ۲۲، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، لبنان، فتح المغیث بشرح ألفیت الحدیث للعراقي، ج ۴، ص ۹۵، الکفایۃ في علم الروایۃ، ج ۱، ص ۱۷، دار الکتاب العربی)

[2] (التاریخ الکبیر ۳۲۷:۴، طبرانی المعجم الاوسط ۳۸۰:۱، ترمذی ۲۱۱:۲، اسد الغابہ ۳۸۶:۴، البدایہ والنہایہ ۱۲۱:۸، تاریخ الاسلام للذہبی ۳۱۹:۲، حلیۃ الاولیاء ۳۵۸:۸، طبقات ابنِ سعد ۱۳۶:۷، تاریخ بغداد ۲۰۸:۱، الاصابہ ۴۰۶:۲، وقال الترمذی حسن غریب، الفتح الربانی ۳۵۶:۲، تہذیب الاسماء واللغات للنووی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ۱۰۳:۲)

[3] (مسند امام احمد ۱۲۷:۴، تاریخ الاسلام للذہبی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ۳۱۸:۲، البدایہ والنہایہ ص ۱۲۱، کنز العمال ۸۷:۷، الاستیعاب ۳۸۱:۳، انساب الاشراف بلاذری ۱۰۷:۴، مجمع الزوائد ھیثمی ۳۵۶:۹، صحیح ابن حبان ۱۲۹:۱۰، الاصابہ ۳۸۵:۱)

[4] (مرقاۃ ۱۳۸:۱۱)

اس حدیث میں سرکارِ دوعالم ﷺ نے ایک تو آپ رضی اللہ عنہ کے لئے **علم الکتاب** کی دعا فرمائی اور دوسرے **علم الحساب** کی، جس میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت کی طرف اشارہ ہے، اور تیسرے **وقه العذاب** کی تاکہ دنیا میں امورِ خلافت کی انجام دہی میں اگر کوئی کوتاہی ہو جائے تو آخرت میں اس پر مواخذہ نہ ہو، یہ تینوں دعائیں کسی معمولی آدمی کے لئے نہیں ہوسکتیں بلکہ یہ صرف اس کے لئے ہوسکتی ہیں جس سے خاص محبت اور الفت کا رشتہ ہو۔

الفاظ کی معمولی کمی بیشی کے ساتھ مختلف اوقات میں سرکارِ دوعالم ﷺ نے آپ کو تعلیمِ کتاب اور آخرت کے عذاب سے محفوظ و مصئون رہنے کی دعا فرمائی۔ اور ایک امتی کے لئے سب سے بڑا سرمایہ حیات یہی ہے کہ اس کا نبی اس دنیا میں اس کے لئے تعلیم کتاب فہم دین اور آخرت میں عذاب سے محفوظ رہنے کی دعا کرے۔

جناب رسول اللہ ﷺ کی انہی دعاؤں کے اثرات تھے کہ آپ کو حق تعالیٰ شانہ نے صفتِ عدل سے نوازا، اور ان کے عدل وانصاف اور وسیع القلبی اور لوگوں کے ساتھ مروت وعدالت سے پیش آنے کی بناء پر کوئی ان کو "**المھدی**" کہنے پر مجبور ہوتا۔[1]

اور کوئی ان کو "**المصحف**" کہتا۔[2]

اور کوئی انہیں عدل وانصاف کا پیکر کہتا۔

چنانچہ امام اعمش رحمہ اللہ کی مجلس میں ایک روز سیدنا عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کا تذکرہ چل پڑا۔ امام اعمش رحمہ اللہ نے فرمایا اگر تم سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانہ کو پالیتے تو تمہیں پتہ چل جاتا۔" لوگوں نے پوچھا: "حضرت! کس چیز کا پتہ چل جاتا؟ ان کے حلم وبردباری کا؟ فرمایا: نہیں! بلکہ ان کے عدل وانصاف کا۔[3]

سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ پر سرکارِ دوعالم ﷺ کی نظر شفقت کا اس حدیث سے بھی پتہ چلتا ہے جس کو علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے طبرانی کے حوالے سے اپنی تاریخ میں نقل فرمایا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن بسر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک مرتبہ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے کسی بات کے بارے میں مشورہ چاہا، یہ دونوں حضرات اس بارے میں کچھ نہ کہہ سکے اور دربارِ رسالت پناہ میں عرض کردیا کہ اللہ جل شانہ اور اس کا رسول ﷺ ہی بہتر جانتا ہے۔

آپ ﷺ نے ان کا یہ جواب سن کر فرمایا: **ادعوا معاویة رضی اللہ عنه**۔ "معاویہ رضی اللہ عنہ کو بلاؤ۔"

---

[1] (العواصم من القواصم ص ۲۰۵ تعلیقہ، البدایہ والنہایہ ۱۳۵: ۸)
[2] (البدایہ والنہایہ ۱۲۱: ۸)
[3] (العواصم من القواصم ۲۰۵ تعلیقہ)

سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو اس سے بڑا تعجب ہوا اور کہا کہ سرکارِ دو عالم ﷺ کو قریش کے دو آدمیوں پر اس قدر یقین نہیں کہ قریش کے نوجوانوں میں سے ایک نوجوان کو طلب فرما رہے ہیں، لیکن آپ ﷺ نے فرمایا: معاویہ رضی اللہ عنہ کو بلاؤ۔ جب سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے تو آپ ﷺ نے فرمایا تم لوگ اپنی بات ان کے سامنے رکھو کیونکہ: فانّہ قویٌّ امینٌ (کیونکہ یہ قوی اور امین ہیں)۔[1]

تاریخ و حدیث کی کتابوں میں کچھ روایات ایسی بھی ملتی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ آپ ﷺ نے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت و امارت کے بارے میں کچھ بشارات بھی دی تھیں جن کو آپ کی خلافت کے بارہ میں پیش گوئی بھی کہا جا سکتا ہے۔
چنانچہ ایک مرتبہ سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ خود فرماتے ہیں کہ وضو فرماتے ہوئے سرورِ کائنات ﷺ نے ایک یا دو مرتبہ میری طرف نگاہ اٹھائی اور فرمایا: یا معاویة! ان ولیت امرًا فاتق اللہ و اعدل۔ "اے معاویہ رضی اللہ عنہ! اگر تجھے امور مملکت و خلافت سونپے جائیں تو اللہ سے ڈرنا اور عدل و انصاف سے کام لینا۔"[2]

اس حدیث کے تمام راوی صحیح ہیں۔

علامہ ابن اثیر رحمہ اللہ اور ابو بکر ابن ابی شیبہ رحمہ اللہ وغیرہ نے یہ الفاظ نقل کئے ہیں: "یا معاویة! ان ولیت فاحسن۔ "اے معاویہ رضی اللہ عنہ! اگر امورِ مملکت تجھے سونپے جائیں تو لوگوں سے حسنِ سلوک سے پیش آنا اور امورِ مملکت و خلافت کو احسن طریق سے سرانجام دینا"۔[3]

سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جس روز سے سرکارِ دو عالم ﷺ نے مجھے یہ کلمات فرمائے تھے، اسی روز سے مجھے یقین تھا کہ میں حکومت کے معاملات میں ضرور مبتلا ہوں گا، یہاں تک کہ مجھے حکومت مل گئی۔"

اسی وجہ سے علماء نے لکھا ہے کہ آپ کو حکومت حضور ﷺ کی دعا کی وجہ سے ملی تھی۔ چنانچہ علامہ خفاجی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ مختلف شہروں اور مملکتِ اسلامیہ کے جو خلیفہ بنے وہ سرکارِ دو عالم ﷺ کی دعا کا نتیجہ تھا"۔[4]

---

[1] (البدایہ والنہایہ ۱۲۲ :۸، تاریخ الاسلام للذہبی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ۳۱۹ :۲، مجمع الزوائد ۳۵۵ :۹)
[2] (البدایہ والنہایہ ۱۲۳ :۸، مجمع الزوائد ۱۸۶ :۵، ۳۵۵ :۹، مسند احمد ۱۰۱ :۴، تطہیر الجنان ۱۸، دلائل النبوۃ ۴۴۶ :۶)
[3] (المصنف، ابن ابی شیبہ ۱۱ :۱۱۷، اسد الغابہ ۳۸۷ :۴، البدایہ والنہایہ ۱۲۳ :۸، المطالب العالیہ لابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ۱۰۸ :۴)
[4] (نسیم الریاض ۱۲۶ :۳)

آپ رضی اللہ عنہ کی خلافت کی پیش گوئی کے ساتھ ساتھ آپ کی طاقت اور عزم وہمت کے بارے میں بھی حضور ﷺ نے ان الفاظ میں ارشاد فرمایا: ان معاویة لا یصارع احدًا الّا صرعه معاویة۔ ”معاویہ رضی اللہ عنہ سے جو بھی نبرد آزما ہو گا معاویہ رضی اللہ عنہ اسے پچھاڑ دے گا“۔[1]

یہ تو دنیا کی کامیاب وکامرانی کی بشارت تھی، آخرت میں آپ پر انعام ذکر فرماتے ہوئے سرکارِ دوعالم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

یبعث اللہ تعالیٰ معاویہ یوم القیمة وعلیه رداء من الایمان۔

”اللہ تعالیٰ قیامت کے دن معاویہ رضی اللہ عنہ کو اس حالت میں اٹھائے گا کہ ان پر ایمان کے نور کی ایک چادر ہو گی (جس میں وہ لپٹے ہوئے ہوں گے)“۔[2]

علامہ ذہبی رحمہ اللہ نے اپنی تاریخ میں ایک روایت نقل کی ہے کہ ایک مرتبہ جناب رسول اللہ ﷺ نے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو سواری پر اپنے پیچھے بٹھایا، سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے آپ کو جناب رسول اللہ ﷺ کے جسم مبارک کے ساتھ چمٹالیا، جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”معاویہ رضی اللہ عنہ! تمارے جسم کا کون سا حصہ میرے جسم سے ملا ہوا ہے؟“ امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کی: ”یا رسول اللہ ﷺ! میرا پیٹ اور سینہ آپ ﷺ کے جسم کے ساتھ ملا ہوا ہے۔“

یہ سن کر حضور اکرم ﷺ نے دعا کے طور پر فرمایا: اللھمّ املأہ علمًا۔ اے اللہ! اس کو علم سے بھر دے!

حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے فرمایا: زاد ابو مسھر وحلماً۔ ابو مسہر نے اپنی روایت میں اتنا اور اضافہ کیا ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے علم کے ساتھ حلم کی بھی دعا فرمائی۔ یعنی ”اے اللہ اس کے سینے اور پیٹ کو علم اور حلم سے بھر دے“۔[3]

جناب خاتم النبیین علیہ الصلوۃ والسلام کی انہی دعاؤں اور پیش گوئیوں کا نتیجہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو وسعتِ قلبی اور حلم سے نوازا تھا اور حضور ﷺ کے ارشاد گرامی ان ولیت فاحسن پر آپ نے اس طرح عمل فرمایا کہ تاریخ میں اس کی مثال شاید ہی ڈھونڈے سے ملے۔ جتنا کوئی آپ کی مخالفت کرتا اور آپ کو ایذا اور تکلیف دیتا اُتنا ہی اس کے ساتھ نیک سلوک فرماتے اور ہر ممکن طریق سے اس کی تالیفِ قلب فرماتے، اسی وجہ سے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ آپ کو ”سید کریم“ فرمایا کرتے تھے۔

---

[1] (کنز العمال ۷:۸۷)
[2] (کنز العمال ۶:۱۹۰)
[3] (تاریخ الاسلام ۲:۳۱۹، التاریخ الکبیر ۴:۱۸)

ابن تیمیہ نے آپ رضی اللہ عنہ کی سیرت پر تبصرہ کرتے ہوئے اس بات کو یوں لکھا ہے:

من المعلوم من سیرة معاویة انه کان من احلم الناس و اصبرھم علی من یؤذیه و اعظم النّاس تالیفًا لمن یعادیه۔

"آپ کی سیرت سے یہ پتہ چلتا ہے کہ آپ حد درجہ حلیم و بردبار تھے اور ایذاء دینے والے کی ایذاء کو سب سے زیادہ صبر و تحمل اور بردباری سے برداشت کرتے اور جو کوئی ان کی مخالفت کرتا آپ اس کی تالیفِ قلب میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ رکھتے۔"[1]

آپ کی اسی وسعتِ قلبی اور بُردباری سے متاثر ہو کر سیدنا علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حقیقی اور بڑے بھائی سیدنا عقیل بن ابی طالب اپنے بھائی کو چھوڑ کر سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ سے جا ملے اور جنگ صفین میں سید معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہو کر اپنے بھائی علی رضی اللہ عنہ سے جنگ لڑی۔

چنانچہ ایک شیعہ مؤرخ لکھتا ہے:

و فارق (عقیل) اخاه علیاً امیر المؤمنین فی ایّام خلافتهٖ و ھرب الیٰ معاویة و شھد صفین معه۔

"عقیل اپنے بھائی علی امیر المؤمنین سے ان کے ایامِ خلافت میں علیحدہ ہو گئے اور معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس چلے گئے اور معاویہ رضی اللہ عنہ ہی کے ساتھ مل کر آپ نے (علی رضی اللہ عنہ سے) صفین کی جنگ لڑی۔"[2]

آپ رضی اللہ عنہ کی وسعتِ قلبی، بردباری اور عدل و انصاف کی ایک نہیں سینکڑوں مثالیں تاریخ کے اوراق میں بکھری پڑی ہیں جن کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔[3]

لیکن یہ بات مسلمہ ہے کہ جناب رسالت مآب ﷺ کے اس فرمان کی وجہ سے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے حلم اور بردباری کو اپنی کتابِ زندگی کا ایک امتیازی باب بنالیا تھا۔[4]

آپ رضی اللہ عنہ اکثر فرماتے تھے:

اِنی لا رفع نفسی من ان یکون ذنب اعظم من عفوی او جھل اکثر من حلمی او عورة لا اواریھا بستری او اسائة اکثر من احسانی۔

---

1 (منہاج السنّة ۲:۲۱۹)

2 (عمدة الطالب فی الانساب آل ابی طالب ص ۱۵)

3 (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: الفخری ص ۱۴۵، العقد الفرید ۲:۳۰۴، ۱۶۵، مروج الذهب ۵:۴۱۰)

4 (ہسٹری آف دی عربز، پروفیسر ہٹی انگریزی)

"میں اپنے نفس کو اس امر سے بچاتا ہوں کہ کوئی گناہ ایسا بھی ہو جو میرے عفو سے بڑھ کر ہو یا کوئی سبک سری ایسی ہو جو میری بردباری پر چھا جائے یا کوئی خطا ایسی ہو جسے دامن میں نہ چھپا سکوں یا کوئی ایسی برائی ہو جس کے مقابلہ میں میں احسان نہ کر سکوں"۔[1]

آپ رضی اللہ عنہ کا یہ قول بھی تاریخ کی کتابوں میں جلی حروف میں ملتا ہے:

انی لا احول بین الناس و بین السنتھم ما لم یحولوا بیننا و بین سلطاننا (ملکنا)۔

"میں لوگوں کے اور ان کی زبانوں کے درمیان اس وقت تک حائل نہیں ہوتا جب تک کہ وہ میرے اور میری سلطنت کے درمیان حائل نہ ہوں"۔[2]

آپ کی وسعتِ قلبی اور حلم و بردباری کا تذکرہ لسانِ نبوت نے ان الفاظ میں فرمایا: **احلم امّتی معاویۃ۔** "میری امت میں سب سے بڑا حلیم اور بردبار معاویہ رضی اللہ عنہ ہے"۔[3]

غرضیکہ حضور ﷺ نے مختلف مواقع پر آپؓ کی انتہائی تعریف فرمائی اور آپ رضی اللہ عنہ کے متعلق بعض وہ باتیں ارشاد فرمائیں جن کی وجہ سے آپ رضی اللہ عنہ کو بہت سے صحابہ رضی اللہ عنہم پر امتیاز حاصل ہے۔ اسی وجہ سے ۴۱ھ میں تمام امت نے متفقہ طور پر آپ رضی اللہ عنہ کو ساری دنیائے اسلام کا خلیفہ منتخب کر لیا اور سیدنا حسن رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم نے آپ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعتِ خلافت کی۔[4]

فتح مکہ تک تو آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنا اسلام گھر والوں سے چھپائے رکھا۔[5]

لیکن فتح مکہ کے بعد آپ نے حضور رسالت مآب ﷺ کی ہمرکابی میں جہاد فی سبیل اللہ میں حصہ لیا اور اپنی شجاعت و بہادری کے جوہر دکھائے۔ چنانچہ آپ رضی اللہ عنہ نے غزوہ حنین اور غزوہ طائف میں شرکت فرمائی اور حضور ختمی مرتبت ﷺ نے آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو سو اونٹ اور چالیس اوقیہ سونا یا چاندی مرحمت فرمایا۔[6]

صرف علمی اور عملی لحاظ ہی سے آپ کو دربار رسالت میں قرب حاصل نہیں تھا بلکہ نسبی اور رشتہ داری کے لحاظ سے بھی آپ کو حضور ختمی مرتبت ﷺ سے تعلق اور قرب حاصل تھا، ایک تو چوتھی پشت میں آپ ﷺ سے ملتے تھے اور دوسرے

---

[1] (طبری ۱۸۷: ۶، البدایہ والنہایہ ۱۳۵: ۸، ابن الاثیر جلد ۳)

[2] (طبری ۳۳۶: ۵، الکامل لابن الاثیر ۲۶۳: ۳، تاریخ الاسلام والحضارۃ الاسلامیہ ۱۴۷: ۲)

[3] (تطہیر الجنان بر حاشیہ صواعق محرقہ از ابن حجر مکی ص ۵۵)

[4] (ملاحظہ ہو البدایہ والنہایہ ۴۱: ۸، فتح الباری ۵۳: ۱۳، مہیج الاحزن ۴۸، ناسخ التواریخ ج ۶ کتاب دوم ص ۷۹، بخار الانوار از ملا باقر مجلسی جلد ۱۰ ص ۱۲۴ وغیرہم)

[5] (البدایہ والنہایہ ۱۱۷: ۸، تطہیر الجنان لمعاویۃ بن ابی سفیان ص ۱۰، حیوۃ الحیوان ۱۰۴: ۱، الاصابہ تذکرۃ معاویہ اسد الغابہ ۳۸۵: ۴)

[6] (الاستیعاب ۳۷۷: ۳)

آپ آنحضرت ﷺ کی زوجہ محترمہ ام المؤمنین سیدہ ام حبیبہ صلوٰۃ اللہ علیہا کے حقیقی بھائی تھے، اس لحاظ سے آپ رضی اللہ عنہ آنحضرت ﷺ کے برادرِ نسبتی اور مسلمانوں کے ماموں تھے۔

کتابتِ وحی اور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ

آپ کی ذہنی، فکری اور عملی خوبیوں کی بناء پر سرکارِ دوعالم ﷺ کو آپ رضی اللہ عنہ پر خاص اعتماد تھا، اسی اعتماد کی وجہ سے بارگاہِ رسالت سے آپ کو کتابتِ وحی کا منصبِ جلیلہ عطا ہوا۔[1]

خود شیعہ مؤرخ ابن ابی الحدید نے لکھا ہے:

کان (معاویۃ رضی اللہ عنہ) احد کتّاب رسول اللہ ﷺ۔

"معاویہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے کاتبوں میں سے تھے"۔[2]

آپ کا کاتبِ نبوی ﷺ ہونا تاریخ کی سب کتابوں میں مرقوم ہے۔ علامہ ذہبی رحمہ اللہ نے مفضل الخلابی کے حوالے سے ایک روایت نقل کی ہے:

ان زید بن ثابت کان کاتب وحی رسول اللہ ﷺ و کان معاویۃ کاتبہ فیما بینہ و بین العرب۔

"حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ جناب رسول اللہ ﷺ کی وحی کے کاتب تھے اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ جناب رسول اللہ ﷺ اور عرب کے دوسرے قبائل یا ملوک کے درمیان خط و کتابت کا فریضہ سرانجام دیتے تھے"۔[3]

اگرچہ علامہ ذہبی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اس روایت کو نقل تو کر دیا ہے لیکن دوسری روایت اس کی تردید کرتی ہے، لہٰذا مختلف روایات کے درمیان تطبیق سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ صرف وحیِ الٰہی کے کاتب تھے لیکن سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ وحیِ الٰہی اور رسول اللہ ﷺ کے دوسرے امور کی کتابت بھی سرانجام دیتے تھے۔

چنانچہ علامہ ذہبی رحمہ اللہ نے اسی صفحہ پر سند صحیح کے ساتھ سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت نقل کی ہے:

کنت العب فدعانی رسول اللہ ﷺ فقال ادع لی معاویۃ و کان یکتب الوحی۔

"میں کھیل رہا تھا کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے مجھے بلایا اور فرمایا کہ معاویہ رضی اللہ عنہ کو بلاؤ اور معاویہ رضی اللہ عنہ وحی لکھا کرتے تھے۔[4]

---

[1](تقریب التہذیب ص ۳۵۷، کنز العمال ۲:۲۴۹، البدایہ والنہایہ ۸:۱۱۸، آداب السلطانیہ للفخری ص ۱۴۵، النجوم الزاہرہ ۱:۱۵۴، الاستیعاب ۳:۳۲۵)

[2](ابن ابی الحدید ۱:۲۳۸)

[3](تاریخ اسلام للذہبی ۲:۳۱۸)

[4](تاریخ اسلام للذہبی ۲:۳۱۸)

اس سلسلہ میں ایک روایت مسند احمد میں بھی سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما ہی سے مروی ہے، فرماتے ہیں "ایک مرتبہ سرکارِ دوعالم ﷺ نے مجھے بلایا اور فرمایا کہ معاویہ رضی اللہ عنہ کو بلا کر لاؤ۔ اور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ ان دنوں حضور ﷺ کے کاتبِ وحی تھے، چنانچہ میں دوڑتا ہوا گیا اور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو سرکارِ دو عالم ﷺ کا یہ پیغام دیا کہ سرکار ﷺ آپ رضی اللہ عنہ کو بلا رہے ہیں کیونکہ آپ ﷺ کو تم سے کوئی کام ہے۔"[1]

بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ آپ صرف سرکارِ دوعالم ﷺ کے مراسلات اور فرامین کی کتابت فرماتے تھے، بعض نے لکھا ہے کہ صرف وحی کی کتابت فرماتے تھے لیکن اصل بات یہ ہے کہ آپ وحی اور فرامین ومراسلات دونوں کی کتابت فرماتے تھے۔ چنانچہ علامہ ابن کثیر نے فرمایا کہ آپ وحی کی کتابت فرماتے تھے"۔[2]

اور طبرانی نے بسند حسن روایت کیا ہے کہ سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کی کتابت کیا کرتے تھے، یعنی وحی کی بھی اور مراسلات وفرامین کی بھی۔[3]

چنانچہ علامہ ابن حجر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے کہا کہ: "ایک مرتبہ سرکارِ دوعالم ﷺ نے مسعود بن وائل رضی اللہ عنہ کی درخواست پر ان کی قوم کی طرف مراسلہ بھیجا جو آپ ﷺ نے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ سے لکھوایا۔ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے پوچھا یارسول اللہ ﷺ، کیسے لکھوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: پہلے **بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم** لکھو اس کے بعد دوسرا مضمون جو میں لکھواؤں وہ لکھو، چنانچہ آپ رضی اللہ عنہ نے ایسے ہی لکھا"۔[4]

تاریخ میں مختلف فَرامین کا ذکر ملتا ہے جو رسول اللہ ﷺ نے بنو امیہ کے اس نوجوان سے لکھوائے جس سے پتہ چلتا ہے کہ سرکارِ دوعالم ﷺ کو ان پر کتنا بھروسہ اور اعتماد تھا۔ چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے ایک شخص سیدنا وائل بن حجر الکندی رضی اللہ عنہ ہوئے ہیں، یہ اپنی قوم کے رئیس اور اپنے علاقے کے سردار تھے، سرکارِ دوعالم ﷺ نے ان کے لئے بڑی دعائیں فرمائیں، وہ حضرموت سے آکر مسلمان ہوئے، نبی اکرم ﷺ نے انہیں ایک قطعہ اراضی دینے کا ارادہ فرمایا، نبی اکرم ﷺ نے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کو فرمایا کہ وائل رضی اللہ عنہ کے ساتھ جاؤ اور ان کے لئے ایک قطعہ اراضی متعین کرکے ان کی تحویل میں دے دیں، حضور ﷺ نے ساتھ ہی ان کے لئے ایک مکتوب تحریر کرایا جس میں سیدنا وائل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے میری فضیلت ظاہر فرمائی اور میرے اور میرے اہل خانہ کے لئے

---

[1] (مسند امام احمد ص ۳۳۵)

[2] (البدایہ والنہایہ ۲۱: ۸)

[3] (مجمع الزوائد ۳۵۷: ۹)

[4] (الاصابہ ۳۹۳: ۳)

مزید مال و متاع کے لئے ایک وثیقہ بطور مکتوب عنایت فرمایا۔ اس کی تفصیل امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تاریخ میں نقل فرمائی ہے۔[1]

اسی طرح کا ایک اور واقعہ محدّثین اور اصحابِ تاریخ نے اپنی کتابوں میں ذکر کیا ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے سیدنا بلال بن الحارث المزنی رضی اللہ عنہ کو ساحل البحر کے علاقہ معاون القبلیۃ میں چند قطعاتِ اراضی عنایت فرمائے اور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ سے اس بارے میں ایک وثیقہ تحریر کروا کر انہیں عطاء فرمایا۔[2]

محدّثین نے اس سلسلہ میں ایک اور واقعہ بھی اپنی کتابوں میں درج فرمایا ہے جس سے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے کاتبِ رسول ﷺ ہونے اور سرکارِ دو عالم ﷺ کے نزدیک ان کے با اعتماد ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے مشہور صحابی سیدنا دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کی معرفت قیصرِ روم کو دعوتِ اسلام کا ایک والانامہ ارسال فرمایا، اس مراسلہ کے جواب میں قیصر روم کا خط لے کر اس کا قاصد التنوخی حضور سرکارِ دو عالم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ہر قل روم کا قاصد التنوخی بیان کرتا ہے کہ: ”سرورِ کائنات ﷺ مقامِ تبوک میں اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان تشریف فرما تھے۔ میں ہر قل کا خط لے کر وہاں گیا۔ میں آپ ﷺ کو نہیں پہچانتا تھا، میں نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے پوچھا کہ محمد (ﷺ) کون ہیں؟ حضور ﷺ نے اپنے دست مبارک سے اپنی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ میں ہوں۔ میں نے وہ مکتوب آپ ﷺ کی خدمتِ اقدس میں پیش کیا، آپ ﷺ نے وہ خط اپنے پہلو میں بیٹھے ہوئے ایک شخص کو پڑھنے کے لئے دیا، جب میں نے پوچھا کہ یہ کون ہے؟ تو لوگوں نے مجھے بتایا کہ یہ معاویہ رضی اللہ عنہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ ہیں، سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے وہ مکتوب آپ ﷺ کو پڑھ کر سنایا۔ اس مکتوب میں لکھا تھا کہ آپ ﷺ مجھے جنت کی طرف بلاتے ہیں جس کی وسعت زمین وآسمان کے برابر ہے تو فرمایئے کہ پھر جہنم کہاں ہے؟ (گویا کہ یہ ایک سوال تھا جو قیصر روم نے آپ ﷺ سے پوچھا تھا)۔ آپ ﷺ نے یہ سن کر فرمایا: **سبحان اللہ! اذا جاء اللیل فاین النہار؟ سبحان اللہ!** جب رات آتی ہے تو دن کہاں جاتا ہے؟ جب یہ مراسلہ پڑھ لیا گیا تو آپ ﷺ نے قیصر روم کے قاصد سے فرمایا کہ ”آپ مکتوب لانے والے ہیں اور پیغام رساں کا احترام اور حق ہوتا ہے، ہم چونکہ اس وقت مسافرت میں ہیں، اگر اس وقت ہمارے پاس کوئی ہدیہ یا عطیہ ہوتا تو ہم آپ کو ضرور دیتے۔“ آپ ﷺ کی یہ بات سن کر آپ ﷺ کے اصحاب میں سے ایک شخص اٹھا اور عرض کی کہ میں اس قاصد کو ہدیہ اور تحفہ پیش کرتا ہوں، چنانچہ وہ شخص اپنے سامان میں سے ایک نہایت عمدہ پوشاک نکال کر لایا اور اسے میری گود میں رکھ دیا، میں نے

---

[1] (تاریخ الکبیر ۱۷۵:۴، اسد الغابہ ۸۱:۵، الاصابہ ۵۹۲:۳، صحیح ابن حبان ۹/۱۰:۱۶۶، تحت وائل بن حجر الکندی)

[2] (المستدرک حاکم ۵۱۷:۳، معجم البلدان ۳۰۷:۱۵)

حاضرین سے پوچھا کہ یہ کون ہیں، انہوں نے کہا یہ عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ ہیں۔ بعد ازاں سرکارِ دو عالم ﷺ نے فرمایا کہ اس قاصد کو کون اپنے ہاں ٹھہرائے گا؟ اس پر انصار کا ایک شخص مجھے اپنے ساتھ لے گیا اور مجھے اپنے پاس ٹھہرایا۔[1]

اس واقعہ سے بھی پتہ چلتاہے کہ امورِ مملکت کے نہایت اہم خطوط نبی اکرم ﷺ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ سے پڑھواتے تھے اور انہی سے ان کے جواب بھی لکھواتے تھے۔ بعض روایات سے پتہ چلتاہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے بعض تحریرات اور وثیقہ جات پر سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ ان کو بھی بطورِ گواہ پیش کیا۔[2]

سیدنا صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ، سیدنا فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ، سیدنا عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ، اور سیدنا علی المرتضی رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابہ جو اسلام کے چار ستون تھے، جہاں انہوں نے اپنی گواہی ثابت کی وہیں حضورِ انور ﷺ کا سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو بھی گواہ کے طور پر دستخط ثبت کرنے کے لئے فرمانا، ان کی کتابِ زندگی کا ایک نہایت پُر اعتماد باب ہے، بلکہ سرکار دو عالم ﷺ کی یہ ایک پیش گوئی تھی کہ میرے پہلے یہی پانچ خلفاء ہیں جو تمیم الداری رضی اللہ عنہ کی اس تحریر پر بطور گواہ اپنے دستخط ثبت فرمارہے ہیں۔[3]

سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے کاتبِ وحی ہونے کو شیعہ مؤرخین نے بھی تسلیم کیاہے، چنانچہ ابن ابی الحدید رحمہ اللہ کا حوالہ تو ہم پہلے نقل کرچکے ہیں لیکن یعقوبی جو شیعہ فرقہ کا ستون سمجھا جاتاہے، اس نے بھی صاف الفاظ میں اقرار کیاہے کہ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ سرکارِ دو عالم ﷺ کے کاتبانِ وحی میں سے تھے اور نہ صرف وحی بلکہ آپ ﷺ کے فرامین اور مراسلات بھی اکثر آپ رضی اللہ عنہ ہی تحریر فرماتے تھے۔

چنانچہ لکھاہے:

وکان کتابه الّذین یکتبون الوحی والکتب والعهود علی بن ابی طالب وعثمان بن عفان وعمرو بن العاص بن امیّه ومعاویة بن ابی سفیان وشرحبیل بن حسنة۔

اور رسول اللہ ﷺ کے کاتبین جو آپ ﷺ کے لئے وحی، مراسلات ومعاہدات اور مواثیق وغیرہ لکھا کرتے تھے، وہ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ، عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ، عمرو بن العاص بن امیہ رضی اللہ عنہ، معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ، اور شرحبیل بن حسنہ رضی اللہ عنہ وغیرہم تھے۔"[4]

---

[1] (مسندامام احمد ۱۴۴:۳، ۴۷:۴، البدایہ والنہایہ ۱۶:۵، مجمع الزوائد ۲۳۵:۸)

[2] (ملاحظہ ہو سیرت الحلبیہ ۲۴۱:۳)

[3] (سیرت حلبیہ ۲۴۰:۳)

[4] (تاریخ یعقوبی ۸۰:۲)

ہماری اس بات کی تائید ابن حزم اور علی بن برہان الدین الحلبی کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے:

وکان زید بن ثابت من الزم النّاس لذٰلک ثمّ تلاہ معاویۃ بعد الفتح فکانا ملازمین لکتابتہ بین یدیہ ﷺ فی الوحی وغیر ذٰلک لا عمل لھما غیر ذٰلک۔

"سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ اور فتح مکہ کے بعد سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں کتابت کے لئے ہمیشہ حاضر رہنے والے لوگوں میں سے تھے، چاہے وہ کتابت وحی کی ہو یا غیر وحی کی"۔[1]

آپ کے کاتبِ وحی ہونے کے لئے مندرجہ ذیل کتابیں بھی ملاحظہ فرمائی جاسکتی ہیں۔[2]

روایتوں میں یہاں تک آتا ہے کہ یہ ذمہ دارانہ منصب حضور ﷺ نے اللہ رب العزت کے حکم سے عطا فرمایا چنانچہ حافظ ابن کثیر نے نقل فرمایا ہے کہ ایک مرتبہ جبریل امین بارگاہِ رسالت مآب ﷺ میں تشریف لائے اور عرض کیا کہ: یا محمد اقراء معاویۃ السلام واستوص بہ خیراً فانہ امین اللہ علیٰ کتابہٖ ووحیہ ونعم الامین۔ "اے محمد (ﷺ)! معاویہ رضی اللہ عنہ کو سلام کہیے اور اس کو نیکی کی تلقین کیجئے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اس کی وحی کے امین ہیں اور بہترین امین ہیں"۔[3]

ایک اور حدیث میں ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو کاتبِ وحی بنانے کے لئے حضور ختمی مرتبت ﷺ نے جبریل امین سے مشورہ فرمایا، جبرئیل امین علیہ السلام نے جواب دیا: استکتبہ فانہ امین۔ "آپ ان کو کاتب وحی بنالیں کیونکہ وہ امین ہیں"۔[4]

اگر آپ کی امانت کے متعلق جبرئیل امین کی یہ گواہی نہ بھی ہوتی تب بھی آپ کا صرف کتابتِ وحی کے منصب پر فائز رہنا ہی آپ کے امین ہونیکے لئے کافی تھا کیونکہ جس طرح وحی لانے والے کے لئے امین ہونا شرط ہے تاکہ وہ وحی الٰہی کے لانے میں کوئی خیانت نہ کرسکے، اسی طرح کاتبِ وحی کے لئے بھی امین ہونا ضروری ہے تاکہ وہ کتابتِ وحی میں کوئی خیانت نہ کرسکے۔ لہٰذا جس طرح آپ کا کاتبِ وحی ہونا مسلّم ہے اسی طرح آپ کا امین ہونا بھی مسلّم ہے۔ **کما لا یخفیٰ علی من لہ ادنیٰ من الفھم۔**

کتابتِ وحی کا منصب جلیلہ آپ کو عطا فرمایا جانا جہاں آپ کی دینی اور علمی علوّ مرتبت کی دلیل ہے وہاں آپ کی علمی اور فکری بلندی کی بھی دلیل ہے کیونکہ ظہور اسلام کے وقت قریش میں صرف سترہ (۱۷) آدمی لکھنا پڑھنا جانتے تھے جن میں ایک سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ بھی تھے۔[5]

---

[1] (جوامع السیرۃ ص ۲۷)

[2] (الاستیعاب ۳:۳۷۵، الاصابہ ۳:۴۱۲، مجمع الزوائد ۹:۳۵۷، زادالمعاد ۱:۳۰)

[3] (البدایہ والنہایہ ۸:۱۲۰)

[4] (البدایہ والنہایۃ ۸:۱۲۰)

[5] (الحضارۃ الاسلامیہ ص ۶۲)

پورے مکہ میں جبکہ صرف سترہ یا بیس لکھنا پڑھنا جانتے تھے، آپ کا کتابت کے فن سے واقف ہونا آپ رضی اللہ عنہ کی بہترین تربیت اور علمی بلندی کی دلیل ہے۔

حضرت سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ عادل ثقہ اور صالح صحابی ہیں۔ سرورِ کائنات ﷺ کے گھر آپ رضی اللہ عنہ کی حقیقی ہمشیرہ امِ حبیبہ رضی اللہ عنہا تھیں۔ آپ رضی اللہ عنہ بڑے عالم اور مجتہد صحابی ہیں۔ آپ کے لئے سرورِ کائنات ﷺ نے دعا فرمائی۔ آپ کی شان میں گستاخی کرنا اور آپ کو برا کہنا رفض ہے۔ ایسا شخص ہر گز ہر گز سُنی نہیں ہے۔ اس کے پیچھے ہر گز ہر گز نماز نہ پڑھی جائے کیونکہ ایسا شخص امامت کے لائق نہیں ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کی شان میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "اللہ اللہ فی اصحابی۔۔الخ" میرے صحابہ کے معاملے اللہ سے ڈرو۔" یعنی ان کی عزت و عظمت و حرمت کا خیال رکھو۔ کیونکہ صحابی کا نصف سیر جو گندم خیرات کرنا دوسروں کے لاکھوں من سونا خیرات کرنے سے افضل و بہتر ہے۔ دین ہمیں صحابہ کرام اور اہل بیت رضی اللہ عنہم کے توسل سے ہی ملا ہے دونوں میں کسی کی تنقیص وتوہین سے دین کے معتدبہ حصہ سے انکار لازم آتا ہے۔

جو لوگ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی گستاخی کرتے ہیں وہ سخت ترین گمراہ ہیں اگرچہ وہ سید ہی کیوں نہ ہوں کیونکہ اصل چیز ایمان اور عقیدہ ہے اگر عقیدہ خراب ہے یعنی کوئی شخص سید بد عقیدہ (مثلاً خارجی، رافضی، وہابی نجدی، قادیانی وغیرہ) ہو جائے تو وہ سادات سے نکل جاتا ہے۔ اور اسے سید کہنا بھی درست نہیں۔ قرآن کریم میں سیدنا نوح علیہ السلام کے بیٹے کے بارے میں جب اس نے عقیدتاً و عملاً اپنے والد محترم جو اللہ کے نبی علیہ السلام تھے کا انکار کیا اور ساتھ نہ دیا تو اللہ نے فرمایا: "انہ لیس من اھلک۔۔الخ" یعنی وہ تمہارے اہل بیت میں سے نہیں ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور اہل بیت کرام رضی اللہ عنہم آپس میں مثالی محبت رکھتے تھے اور ایک دوسرے کا احترام فرماتے تھے کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ ہماری آپس کی محبت حضور نبی کریم ﷺ کی وجہ سے ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ میں نے اپنے والد محترم سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ آپ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے چہرہ مبارک کو غور اور محبت سے کیوں دیکھتے ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے سنا کہ علی کے چہرے کو دیکھنا بھی عبادت ہے۔" حضرت محمد بن حنفیہ رضی اللہ عنہ نے اپنے والد محترم سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ حضور ﷺ کے بعد سب سے افضل کون ہے تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ۔۔۔ الخ ایک مرتبہ ایک صحابی کی نماز جنازہ پڑھانے تشریف لائے واپسی پر جب وہ سواری پر سوار ہونے لگے تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے ان کی سواری کی رکاب کو پکڑ کر احتراماً اوپر کر دیا تا کہ وہ صحابی آرام سے سوار ہو جائیں تو ان صحابی نے کہا آپ نے ایسے کیوں کیا تو ابن عباس رضی اللہ عنہ نے کہا ہمیں اسی طرح حکم دیا گیا ہے کہ اہل علم

کی اسی طرح تعظیم کریں۔ تو ان صحابی رضی اللہ عنہم نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کے ہاتھ کو پکڑ کر بوسہ دیا اور فرمایا کہ ہمیں بھی اسی طرح حکم دیا گیا ہے کہ اہل بیت رضی اللہ عنہم کی اس طرح تعظیم کریں۔ (سبحان اللہ)

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور اہل بیت کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان بشری تقاضوں کے پیش نظر کوئی رنجش ہو بھی گئی ہو تو وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر چھوڑ دی جائے گی اور دونوں گروہوں کے متعلق خیر کی بات ہی کہنی لازم ہے کیونکہ دونوں نے صحبتِ نبوی ﷺ سے فیض پایا ہے اور دونوں گروہ آپ ﷺ کے محبوب ہیں اور دونوں کی عزت و حرمت کی تلقین آپ ﷺ نے فرمائی ہے اور قرآن کریم نے ان تمام حضرات کو رَضِیَ اللّٰہُ عَنۡھُمۡ وَرَضُوا عَنۡہُ کی بشارت عطا فرمائی ہے۔ لہٰذا سادات حضرات بھی اس بات کو نگاہ میں رکھیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں توہین و بے ادبی کتنا سنگین جرم ہے کہ اس بے ادبی و گستاخی کی وجہ سے سید دو عالم ﷺ کی ناراضگی لازم آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی اپنے محبوب کریم ﷺ ان کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور ان کے اہل بیت کرام رضی اللہ عنہم کی محبت عطا فرمائے اور ان کی عزت و حرمت کا خیال رکھنے کی توفیق عطا فرمائے بلکہ ہر مؤمن مسلمان کی محبت اور عزت ہمیں عطا فرمائے اور ہمیں صالحین کے ساتھ قیامت میں اٹھائے۔ آمین بجاہ النبی الکریم ﷺ۔

حضور نبی اکرم ﷺ کی اپنے اہلِ بیت کے بارے میں وصیت کا بیان

عن أبی سعید عن النّبی ﷺ قال: ألا انّ عیبتی الّتی آوی الیھا أھل بیتی، وانّ کرشی الأنصار۔ فاعفوا عن مسیئھم واقبلوا من محسنھم۔ رواہ التّرمذی وابن أبی شیبۃ۔ وقال أبو عیسی: ھذا حدیث حسنٌ۔

”حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: آگاہ ہو جاؤ! میرا جامہ دان جس سے میں آرام پاتا ہوں میرے اہل بیت ہیں اور میری جماعت انصار ہیں۔ ان کے بُروں کو معاف کر دو اور ان کے نیکوکاروں سے (اچھائی کو) قبول کرو۔“ اس حدیث کو امام ترمذی اور ابن ابی شیبہ نے روایت کیا ہے نیز امام ترمذی نے فرمایا کہ یہ حدیث حسن ہے۔[1]

عن زید بن ثابت رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللہ ﷺ: انّی تارکٌ فیکم خلیفتین: کتاب اللہ حبلٌ ممدود ما بین السّماء والأرض۔ أو ما بین السّماء الی الأرض، وعترتی أھل بیتی، وانّھما لن یّتفرّقا حتی یردا علیّ الحوض۔ رواہ أحمد۔

[1](أخرجہ الترمذی فی السنن، کتاب: المناقب، باب: فی فضل الأنصار وقریش، ۵/۷۱۳، الرقم: ۳۹۰۴ وابن أبی شیبۃ فی المصنف، ۶/۳۹۹، الرقم: ۳۲۳۵۷، والشیبانی فی الآحاد والمثانی، ۳/۳۳۲، الرقم: ۱۷۱۶، وابن سعد فی الطبقات الکبری، ۲/۲۵۲)

”حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: بے شک میں تم میں دو نائب چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ ایک اللہ تعالیٰ کی کتاب جو کہ آسمان و زمین کے درمیان پھیلی ہوئی رسی (کی طرح) ہے اور میری عترت یعنی میرے اہل بیت اور یہ کہ یہ دونوں اس وقت تک ہرگز جدا نہیں ہوں گے جب تک یہ میرے پاس حوضِ کوثر پر نہیں پہنچ جاتے۔“ اس حدیث کو امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے روایت کیا ہے۔[1]

عن عبد الرّحمٰن بن عوف قال: افتتح رسول اللہ ﷺ مکّة ثم انصرف الی الطّائف فحاصرهم ثمانية أو سبعة، ثمّ أدخل غدوة أو روحة ثم نزل ثمّ هجر۔ ثم قال، أيها النّاس، انّی لكم فرطٌ و انّی أوصيكم بعترتی خيرًا، و انّ موعدكم الحوض۔۔۔۔ الحديث۔ رواه الحاكم، و قال: هذا حديث صحيحٌ۔

”حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے مکہ فتح کیا پھر طائف کا رخ کیا اور اس کا آٹھ یا سات دن محاصرہ کئے رکھا پھر صبح یا شام کے وقت اس میں داخل ہو گئے پھر پڑاؤ کیا پھر ہجرت فرمائی اور فرمایا: اے لوگو! بے شک میں تمہارے لئے تم سے پہلے حوض پر موجود ہوں گا اور بے شک میں تمہیں اپنی عترت کے ساتھ نیکی کی وصیت کرتا ہوں اور بے شک تمہارا ٹھکانا حوض ہو گا۔۔۔ الحدیث۔“ اس حدیث کو امام حاکم نے روایت کیا ہے اور فرمایا کہ یہ حدیث صحیح ہے۔[2]

عن زيد بن أرقم رضی اللہ عنه قال: قال رسول اللہ ﷺ: أيّها النّاس، انّی تاركٌ فيكم أمرين لن تضلّوا ان اتبعتموهما، وهما: كتاب اللہ، و أهل بيتی عترتی۔ ثمّ قال: أتعلمون أنّی أولى بالمؤمنين من أنفسهم ثلاث مرّاتٍ قالوا: نعم، فقال رسول اللہ ﷺ: من كنت مولاه فعلیّ مولاه۔ رواه الحاكم و قال الحاكم: صحيح۔

”حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: اے لوگو! میں تم میں دو چیزیں چھوڑ کر جانے والا ہوں اور اگر تم ان کی اتباع کرو گے تو کبھی گمراہ نہیں ہو گے اور وہ دو چیزیں کتاب اللہ اور میرے اہل بیت ہیں پھر آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تم جانتے ہو میں مؤمنین کی جانوں سے بڑھ کر ان کو عزیز ہوں آپ ﷺ نے ایسا تین مرتبہ فرمایا۔ صحابہ کرام ﷺ نے عرض کی: ہاں یا رسول اللہ ﷺ! تو حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: جس کا میں دوست ہوں علی بھی اس کا مولیٰ ہے۔“ اس حدیث کو امام حاکم نے روایت کیا ہے اور کہا کہ یہ حدیث صحیح ہے۔[3]

عن ابن عباس رضی اللہ عنه قال: لمّا نزلت هذه الآية: {قُل لَّآ اَسۡـَٔلُكُمۡ عَلَيۡهِ اَجۡرًا اِلَّا الۡمَوَدَّةَ فِى الۡقُرۡبٰى} قالوا: يا رسول اللہ، من قرابتك هؤلاء الّذين وجبت علينا مودّتهم؟ قال: علیّ و فاطمة و ابناهما۔ رواه الطّبرانی۔

---

[1] (أخرجه أحمد بن حنبل فی المسند، ۵/۱۸۱، الرقم: ۲۱۶۱۸، والهيتمی فی مجمع الزوائد، ۹/۱۶۲)

[2] (أخرجه الحاكم فی المستدرك، ۲/۱۳۱، الرقم: ۲۵۵۹)

[3] (أخرجه الحاكم فی المستدرك، ۳/۱۱۸، الرقم: ۴۵۷۷)

”حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جب یہ آیت: {قُل لَّآ اَسئَلُکُمْ عَلَيهِ اَجرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰی} نازل ہوئی تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! آپ ﷺ کی قرابت کون ہیں جن کی محبت ہم پر واجب ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: علی، فاطمہ، اور ان کے دو بیٹے (حسن و حسین)۔“

اس حدیث کو امام طبرانی نے روایت کیا ہے۔[1]

عن زيد بن أرقم رضی اللہ عنه في رواية طويلة: قال: قال النّبی ﷺ: انظروا كيف تخلفوني في الثقلين۔ فنادى مناد وما الثقلان يا رسول اللہ ﷺ، قال: كتاب اللہ طرف بيداللہ وطرف بأيديكم فاستمسكوا به لا تضلّوا، والآخر عترتي وانّ اللّطيف الخبير نبّأني أنّهما لن يّتفرّقا حتى يردا عليّ الحوض، سألت ربّي ذلک لهما، فلا تقدّموهما فتهلكوا، ولا تقصروا عنهما فتهلكوا، ولا تعلموهم فانهم أعلم منكم ثمّ أخذ بيد عليّ فقال: من كنت أولى به من نفسي فعليّ وليّه اللّهم وال من والاه وعاد من عاداه۔ رواه طبراني۔

”حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ ایک طویل روایت میں بیان کرتے ہیں کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: پس یہ دیکھو کہ تم دو بھاری چیزوں سے مجھے کیسے باقی رکھتے ہو۔ پس ایک نداء دینے والے نے ندا دی یارسول اللہ ﷺ! وہ دو بھاری چیزیں کیا ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کی کتاب جس کا ایک کنارا اللہ کے ہاتھ میں اور دوسرا کنارا تمہارے ہاتھوں میں ہے پس اگر تم اسے مضبوطی سے تھامے رہو تو کبھی بھی گمراہ نہیں ہوگے اور دوسری چیز میری عترت ہے اور بے شک اس لطیف خبیر رب نے مجھے خبر دی ہے کہ یہ دونوں چیزیں کبھی بھی جدا نہیں ہوں گی یہاں تک کہ یہ میرے پاس حوض پر حاضر ہوں گی اور ایسا ان کے لئے میں نے اپنے رب سے مانگا ہے۔ پس تم لوگ ان پر پیش قدمی نہ کرو کہ ہلاک ہو جاؤ اور نہ ہی ان سے پیچھے رہو کہ ہلاک ہو جاؤ اور نہ ان کو سکھاؤ کیونکہ یہ تم سے زیادہ جانتے ہیں پھر آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑا اور فرمایا: پس میں جس کی جان سے بڑھ کر اسے عزیز ہوں تو یہ علی رضی اللہ عنہ اس کا دوست ہے اے اللہ! جو علی کو اپنا دوست رکھتا ہے تو اسے اپنا دوست رکھ اور جو علی سے عداوت رکھتا ہے تو تو اس سے عداوت رکھ۔“

اس حدیث کو امام طبرانی نے روایت کیا ہے۔[2]

عن مصعب بن عبد الرّحمٰن بن عوف عن أبيه قال: لمّا فتح رسول اللہ ﷺ مكّة انصرف الى الطّائف فحاصرها سبع عشرة، أو تسع عشرة، ثمّ قام خطيبًا فحمد اللہ وأثنى عليه۔ ثمّ قال: أوصيكم بعترتي خيراً، وأنّ موعدكم الحوض۔ والّذي نفسي بيده لتقيمنّ الصلاة ولتؤتنّ الزّكاة، أو لأبعثنّ اليكم رجلاً منّي۔ أو كنفسي يضرب أعناقكم۔ ثمّ اخذ بيد عليّ رضي اللہ عنه فقال: بهذا۔ رواه البزّار۔

---

[1] (أخرجه الطبراني في المعجم الكبير، ۳/۴۷، الرقم: ۲۶۴۱، والهيثمي في مجمع الزوائد ۹/۱۶۸)

[2] (أخرجه الطبراني في المعجم الكبير، ۵/۱۶۶، الرقم: ۴۹۷۱)

”حضرت مصعب بن عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ جب حضور ﷺ نے مکہ فتح کیا اس کے بعد آپ ﷺ طائف کی طرف روانہ ہوئے اور آپ ﷺ نے سترہ دن طائف کا محاصرہ کئے رکھا پھر آپ ﷺ خطاب کے لئے کھڑے ہوئے آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء بیان کی پھر فرمایا: میں اپنی عترت کے بارے میں تمہیں بھلائی کی وصیت کرتا ہوں اور بے شک تمہارا ٹھکانہ حوض کوثر ہو گا اور نماز قائم کرو گے اور زکوۃ ادا کرو گے یا میں تمہاری طرف ایک ایسے آدمی کو بھیجوں گا جو مجھ سے ہے یا میری طرح کا ہے اور جو تمہاری گردنیں مارے گا پھر آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ہاتھ پکڑا اور فرمایا: اس آدمی سے میری مراد یہ ہے۔“

اس حدیث کو امام بزار نے روایت کیا ہے۔[1]

حضور نبی اکرم ﷺ کا لوگوں کو اہلِ بیت کی محبت پر اُبھارنے کا بیان

اہل بیت النبی (ﷺ) کی محبت ایمان کا لازمی حصہ ہے۔ در حقیقت اس محبت کی محرک اہل بیت کی نسبت ہے۔ جو ذاتِ رسول (ﷺ) سے مربوط و منسلک ہے اور دوسری وجہ آنجناب (ﷺ) کی اپنی ذاتی محبت اپنی نسل پاک سے ہے اور یہ عاشقانہ دستور و اصول ہے کہ محبوب کا محبوب بھی محبوب ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں آنحضرت (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم) نے ایک بالترتیب محبت و مودت کا موجب ذکر فرمایا ہے:

قال صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم احبو اللہ تعالیٰ لما یغفر کم بہ من نعمۃ و احبونی لحب اللہ تعالیٰ و احبوا اھل بیتی لحبی۔

”فرمایا اللہ تعالیٰ سے محبت کرو کیونکہ وہ تمہیں غذا اور نعمتیں عطا فرماتا ہے اور مجھ سے محبت کرو کیونکہ میں اللہ تعالیٰ کا محبوب ہوں اور میری اہل بیت سے محبت کرو کہ میں ان سے محبت کرتا ہوں۔“

محبت کے اس ایمان افروز دستور کو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اس محبوب پیرایہ میں ذکر فرمایا ہے:

قُلْ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبَىٰ (الشوریٰ ۲۳)

”تم فرماؤ میں اس پر تم سے کچھ اجرت نہیں مانگتا مگر قرابت کی محبت“۔

مفسر روح البیان اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

و یجوز ان یراد بالقربیٰ اھل قرابتہ قیل یا رسول من قرابتک ھٰؤلاء الذین وجبت علینا مودتھم قال علی و فاطمہ و ابنای ای الحسن و الحسین رضی اللہ عنھما۔

[1](أخرجه البزار في المسند، ۲۵۸/۳، ۲۵۹، الرقم: ۱۰۵، والهيثمي في مجمع الزوائد، ۱۶۳/۹)

”یہ حقیقت ہے کہ قرابت سے مراد آنجناب رسالت مآب (ﷺ) کی قرابت اور نسل پاک ہو۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ وہ کون قریبی ہیں جن کی محبت ہم پر واجب ہے۔ فرمایا وہ علی فاطمہ اور میرے دو بیٹے حسن اور حسین ہیں رضی اللہ عنہم“۔

علماء کرام اور مفسرینِ عظام نے ”آل“ کی وضاحت یوں فرمائی ہے:

عترۃ الرجل: أھل بیته, و رھطه الأدنون, و لاستعمالھم "العترۃ" علی أنحاء کثیرۃ۔

یعنی کسی شخص کی آل اسکے گھر والے ہوتے ہیں اور وہ افراد جو اس کے بہت قریب ہوتے ہیں۔ اس لئے آل کا استعمال کئی اقسام میں منقسم ہے۔[1]

ایک اہل گھر کے افراد ہیں مثلاً ازواج مطہرات (رضی اللہ تعالیٰ عنھما)۔ دوسرے وہ حضرات جن کا تعلق نسب و نسل سے ہے۔ ان میں سے بعض بہت زیادہ قریب ہیں جیسے حضرت فاطمۃ الزہرا، حضرت زینب، حضرت رقیہ، حضرت امّ کلثوم (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) اور حضرت علی، حضرت حسن اور حضرت حسین، حضرت محسن اور انکی بہنیں (اخوات) رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔ تیسرے وہ حضرات جو ان کی نسبت کچھ دور ہیں جیسے حضرت عباس، حضرت حمزہ اور ان کی اولاد رضی اللہ عنہم۔ چوتھے درجہ میں حضرت عبد المطلب اور حضرت ہاشم کی اولاد جس پر زکوۃ ممنوع ہے۔ (رضی اللہ تعالیٰ عنہم)۔ پانچویں درجہ میں ہر متقی اور صالح و مخلص مؤمن بھی آل میں داخل ہے۔ چنانچہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے حق میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا: **(السلمان منا اھل البیت)** اور فرمایا **(اٰلِ محمد کل تقی)** اس اعتبار سے سب صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم آل میں داخل ہیں۔

یہاں جس آلِ اطہار کا بیان کرنا چاہتا ہوں وہ حضرت فاطمۃ الزہرا اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی اولاد ہے۔ اگرچہ اس کے ضمن میں آل کے تمام افراد داخل ہونگے لیکن خصوصیّت اپنا ایک مقام رکھتی ہے۔

جیسا کہ مفسرین کرام نے اس ضمن میں وضاحت کی ہے:

والحق وجوب محبۃ قرابته ﷺ من حیث انّھم قرابته ﷺ کیف کانوا وکلما کانت جھۃ القرابۃ اقوی کان طلب المودۃ اشد فمودۃ العلویین الفاطمیین الزم من محبۃ العباسین (رضی اللہ تعالیٰ عنھم) وأثار تلک المودۃ التعظیم والاحترام والقیام باداء الحقوق اتم قیام۔

[1] (نھج الرشاد فی نظم الاعتقاد ج ۱ ص ۱۶)

”اہل بیت کی محبت کے مراتب ہیں حق بات یہ ہے کہ جس اہل کو جتنی نزدیک تر قربت ذاتِ فخر موجودات (ﷺ) سے ہوگی ان کی محبت کا وجوب بہ نسبت دوسروں کے اتنا ہی زیادہ ہوگا۔ لہٰذا حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ اور حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی اولاد پاک کی مودّت حضرت عباس (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کی اولاد سے زیادہ ہوگی۔ اہل بیت کرام کی محبت کی علامت ان کی تعظیم واحترام اور محبت کے حقوق کی ادائیگی میں ہے۔

آپ (ﷺ) کی محبت اپنی اہل سے کس قدر زیادہ تھی اس کا اندازہ اس حدیث شریف سے لگایا جاسکتا ہے:

أخرج ابو سعید عن النبی ﷺ انه قال لا تصلوا علی الصلاة البتیراء قالوا وما الصلاة البتیراء یا رسول اللہ قال تقولون اللھم صلی علی محمد وتسکتون بل قولوا اللھم صلی علی محمد وآل محمد۔[1]

”سرور کائنات (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا مجھ پر ناقص صلاۃ وسلام نہ پڑھا کرو۔ صحابہ نے عرض کیا نامکمل صلاۃ کیا ہے۔ فرمایا یہ کہ تم کہتے ہو **اللھم صلی علی محمد** اور پھر خاموش ہو جاتے ہو (ایسا نہ کرو) بلکہ یوں پڑھا کرو **اللھم صلی علی محمد وآل محمد** اس حدیث شریف سے معلوم ہوا کہ صلاۃ وسلام میں اہل بیت کی عدم شمولیت سے شرف قبولیت کامل نہیں ہوگا۔

ایک اور حدیث شریف:

قال رسول اللہ ﷺ انی تارک فیکم ما ان تمسکتم به لن تضلوا بعدی احدهما اعظم من الاخر کتاب اللہ حبل ممدود من السماء الیٰ الارض وعترتی اهل بیتی ولن یتفرقا حتی یردا علی الحوض فانظروا کیف تخلفونی۔[2]

”آپ (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: میں تمہارے اندر ایسی چیز چھوڑ کر جا رہا ہوں اگر تم نے اسے تھاما (یعنی اسے عملی اعتبار سے قبول کیا) تو میرے بعد تم ہرگز گمراہ نہ ہوگے۔ ان دونوں چیزوں میں سے ایک دوسرے سے عظیم تر ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی کتاب (قرآن کریم) جو ایک طویل رسی ہے جو آسمان سے زمین تک پہنچی ہوئی ہے، اور دوسری چیز میری اولاد ہے میری اولاد اور قرآن کریم ایک دوسرے سے جدا نہیں ہونگے یہاں تک کہ حوض کوثر پر مجھے آکر ملیں گے۔ پس لوگو! سوچ لو میرے بعد میری اولاد کے ساتھ تم کیا برتاؤ کروگے“۔

فائدہ: اہل بیت کے سلسلہ میں آنحضرت (ﷺ) نے ایک شرط اور معیار بیان فرمایا ہے:

قال رسول اللہ ﷺ وعدنی ربی فی اهل بیتی من اقر منهم بالتوحید ولی بالبلاغ ان لا یعذبهم۔

---

[1] (خزینة الاسرار ص ۱۸)

[2] (مشکوٰۃ ص ۵۷۹)

"سرور کائنات (ﷺ) نے فرمایا میرے رب نے میری اہل بیت رضی اللہ عنہم سے متعلق میرے ساتھ وعدہ فرمایا کہ ان کو عذاب سے محفوظ فرمائے گا۔ بشرطیکہ وہ توحید ورسالت پر یقین رکھتے ہوں یعنی اہل بیت کا صحیح العقیدہ ہونا ضروری ہے۔[1]

ایک اور حدیث میں فرمایا: **سألت ربی ان لا یدخل النار احدا من اھل بیتی فاعطانی ذلک۔** میں نے اپنے رب سے عرض کی کہ میری اہل بیت رضی اللہ عنہم کے کسی فرد کو دوزخ میں داخل نہ فرمانا تو میرے رب نے میرا سوال پورا کیا اور میری مراد مجھے عطا فرمائی۔

(شرح) فاستدل بعض العلماء به علی ان ذریته ﷺ یموتون علی اکمل الاحوال۔

ترجمہ: "بعض علماء نے اس سے استدلال کیا ہے کہ اہل بیت کا ہر فرد موت کے وقت اکمل الاحوال پر انتقال کرے گا۔"

یعنی مرتے وقت ان کو ولائیت کبریٰ کا درجہ ملے گا۔

حرم شریف کے ایک امام نے علماء کے اس فیصلہ کو پڑھا اور دلائل پر غور کیا تو یقین کر لیا کہ اس کے دلائل قوی ہیں لیکن اس کے بعد پھر خیال آیا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اہل بیت کے فرد جو بھی کرتے رہیں (گناہ اور نافرمانی وغیرہ) پھر بھی وہ ولی کامل ہو کر انتقال کریں گے؟ یہ درست نہیں ہے۔

علامہ شامی علیہ الرحمۃ اپنے تصنیف شدہ رسائل ستہ میں لکھتے ہیں:

فنظر الیٰ الدلیل فراہ قویا ثم استبعد ذلک بما یبلغه عن شرفاء مکه المشرفه فنام فرای حضرت صاحب الرسالة (ﷺ) فی منامه وھو معرض عنه فقال اتستبعد ان یموت اھل بیتی علی اکمل الاحوال او کما قال فاستیقظ خائفًا ورجع عن ذلک۔

"امام کعبہ نے جب اہل بیت کی فضیلت کے قوی دلائل دیکھنے کے باوجود ان کی فضیلت کو تسلیم نہ کیا کیونکہ اس نے سادات کے بعض نوجوانوں کو اچھے کام کرتے نہیں دیکھا تھا، تو اس نے ایسا خیال کیا تھا۔ خواب میں رسالت مآب ﷺ کی زیارت سے مشرف ہوا جب ملنے کیلئے خدمتِ اقدس کی طرف آیا، تو آپ ﷺ نے اعراض فرمایا اور انکار کر دیا، اس کی معذرت پر فرمایا کہ تجھے میرے اہل بیت کی موت علی اکمل الاحوال (ولایت کبریٰ) سے انکار ہے۔ نیند سے خوف زدہ ہو کر بیدار ہوا اور اس جرم سے توبہ کی"۔[2]

---

[1] (رسائل السته لابن عابدین الشامی علیہ الرحمہ ص ۵)

[2] (رسائل ستہ ص ٦)

آلِ بیت النبی ﷺ کی فضیلت میں کئی ایک آیات قران حکیم میں مذکور ہیں۔ ان میں سے ایک یہ آیت مبارکہ ہے:

فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ أَبْنَاءَنَا وَأَبْنَاءَكُمْ وَنِسَاءَنَا وَنِسَاءَكُمْ وَأَنْفُسَنَا وَأَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَعْنَتَ اللهِ عَلَى الْكَاذِبِينَ (آل عمران ۶۱)

"تو ان سے فرمادو آؤ ہم بلائیں اپنے بیٹے اور تمہارے بیٹے اور اپنی عورتیں اور تمہاری عورتیں اور اپنی جانیں اور تمہاری جانیں پھر مباہلہ کریں اور جھوٹوں پر اللہ کی لعنت ڈالیں"۔

آیت کریمہ کی شان نزول یہ ہے کہ نجران کے علاقہ میں رہنے والے نصرانیوں نے اپنے مذہب (نصرانیت) کی حقانیت کیلئے آنجناب نبوت مآب ﷺ سے مباہلہ کی تاریخ متعین کی جب آنے کا وقت آیا تو سرور دوعالم ﷺ نے حضرت حسین کو گود میں اور حضرت حسن کا داہنا ہاتھ پکڑا۔ حضرت فاطمہ پیچھے اور حضرت علی (رضی اللہ عنہم) ان کے پیچھے آپ ﷺ نے ان نفوسِ قدسیہ سے فرمایا میں جو دعا مانگوں تم آمین کہنا۔ اسی اثنا میں نصاریٰ کا وفد بھی پہنچ گیا۔ وفد کے پادری نے وفد سے کہا سنو! مذہب کی تائید اپنی جگہ ہے۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سامنے نظر آنے والے مقدس و منوّر چہرے اگر اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ یہ پہاڑ اپنی جگہ سے چل کر ہمارے پاس آجائے تو لازماً آجائے گا۔ اب مصلحت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم ان سے مباہلہ نہ کریں اور معافی مانگ لیں ورنہ مباہلہ میں ان کی دعاؤں سے ہمارا دنیا سے نام بھی مِٹ جائے گا۔ اس پر نصرانی متفق ہوگئے۔ ان کی معذرت پر رحمتِ دوعالم نورِ مجسّم ﷺ نے مباہلہ ترک فرمایا اور ان پر تاوان (جزیہ) رکھ دیا اور فرمایا کہ اگر یہ نصرانی مباہلہ کرتے تو تمام نصرانی اور ان کا علاقہ، درخت اور پرندے درندے سب جل کر راکھ ہو جاتے۔ اور دنیا میں نام کا ایک نصرانی باقی نہ رہتا ان کے لئے آسمان سے آگ اتر رہی تھی، میری دعا سے اللہ تعالیٰ نے ان کے عذاب کو واپس لے لیا۔

عن سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ قال لما نزلت ھٰذہ الآیۃ ندع ابنائنا وابنائکم دعا رسول اللہ ﷺ علیّا و فاطمۃ و حسنًا و حسیناً فقال اللھمّ ھٰؤلاء اھل بیتی۔ رواہ مسلم۔

"سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جب یہ آیت **فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنفُسَنَا وَاَنفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَل لَّعْنَتَ اللهِ عَلَى الْكٰذِبِينَ** (آل عمران ۶۱) نازل ہوئی، تو آنحضور ﷺ نے حضرت علی، حضرت فاطمہ حضرات حسنین رضی اللہ عنہم کو بلایا اور یہ فرمایا اے اللہ یہ میرے اہل بیت ہیں، اس کے بعد عیسائیوں سے مباہلہ کے لئے ان چاروں کو لے کر گئے مگر وہ مقابلہ پر نہ آئے"۔[1]

---

[1] (مشکوۃ شریف، ج ۲ ص ۵۶۸)

صاحبِ تفسیر مظہری، قاضی ثناء اللہ عثمانی پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت سے متعلق شیعوں کے اعتراضات کے جوابات دے کر آخر میں تحریر فرمایاہے:

لکنّ ھٰذہ القصۃ تدلّ علی کون ھٰؤلاء الکرام احبّ النّاس الی رسول اللہ ﷺ۔

یعنی اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ چاروں حضرات جناب رسول اللہ ﷺ کو زیادہ محبوب تھے۔[1]

علماء کرام نے اس آیت کے تحت نتیجہ اخذ کیا کہ:

فعلم انھم المراد من الاٰیۃ وان اولاد فاطمہ (رضی اللہ تعالی عنھا) وذریتھا یسمون ابنائہ ﷺ وینسبون الیہ نسبۃً صحیحۃً نافعۃً فی الدنیا والاخرۃ۔

"معلوم ہوا کہ آیت کریمہ میں جنکا ذکر ہے وہ حضرات اہل بیت مراد ہیں، اور بلاشبہ حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی اولاد آپ ﷺ کے بیٹے کہلاتے ہیں۔ اور ان کی آپکی ذاتِ بابرکات سے جو نسبت ہے بالکل درست اور دنیا اور آخرت میں نفع بخش نسبت ہے"۔

اسی نسبت کے اعتبار سے حدیث شریف میں مذکور ہے:

قال صلی اللہ تعالیٰ علیہ و اٰلہٖ وسلم الدعاء محجوب حتی یصلی علی محمد واھل بیتہٖ۔ اللھم صلّ وسلم علی محمدو اٰلہٖ۔[2]

عن علی رضی اللہ عنہ قال: الدعاء محجوب عن السماء حتی یتبع بالصلاۃ علی محمدٍ و آلہٖ۔

"حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ دعا آسمان سے اس وقت تک پردہ میں رہتی ہے جب تک اس کے بعد حضور نبی اکرم ﷺ اور آپ ﷺ کی آل پر درود نہ بھیجا جائے"۔[3]

عن علی بن أبی طالب رضی اللہ عنہ قال: کل دعاءٍ محجوب عن السماء حتی یصلی علی محمد ﷺ وعلی آل محمد ﷺ۔

"حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہر دعا اس وقت تک آسمان کے نیچے حجاب میں رہتی ہے جب تک حضور نبی اکرم ﷺ اور آپ ﷺ کی آل پر درود نہ بھیجا جائے"۔[4]

---

[1] (تفسیر مظھری، ج ۲ ص ٦۲)

[2] (الدیلمی)

[3] (عسقلانی، لسان المیزان، ۵۳:۴، رقم: ۱۵۰)

[4] (بیھقی، شعب الایمان، ۲۱٦:۲، رقم: ۱۵۷۵)

خلاصہ: قرآن و سنت کے دلائل اس پر شاہد ہیں کہ کائنات و ممکنات کا ہر ذرّہ آنحضرت ﷺ کی رحیمانہ شفقت سے ہر وقت مستفیض ہے۔ اور آپ کا وصفِ دائمی ہے کہ دنیاومافیہا آنجناب کے زیرِ نظر ہے۔

اس کی دلیل ملاحظہ ہو:

قال ان اللہ تعالیٰ رفع لی الدنیا و انا انظر الیھا و الی ماھو کائن فیھا الی یوم القیامۃ کانما انظر الی کفی ھذا۔

"اللہ تعالیٰ نے دنیاومافیہا اور قیامت تک ہونے والے حالات میرے سامنے روشن اور ظاہر فرمادیئے ہیں۔ میں انہیں دیکھ رہاہوں جیسے اپنی اس ہتھیلی کو دیکھتاہوں"۔[1]

جو لوگ اہل بیت کے ساتھ اچھاسلوک کرتے ہیں، اور ان کا احترام اور اعزاز بجالاتے ہیں اور جو خدمت کرتے ہیں ان کا بدلہ انہیں دنیامیں بھی ملتاہے اور قیامت میں بھی دیاجائے گا اور اللہ تعالیٰ کے حبیب ﷺ اس سے باخبر ہوتے ہیں اور بعض اوقات ان خدمت گزاروں کو خواب میں شرفِ زیارت سے مشرف فرماتے ہیں۔

علامہ شامی کتاب الحج میں نقل کرتے ہیں:

فی المسامرات عن رجل اراد الحج فحمل الف دینار یتأھب بھا فجاءتہ امرأۃ فی الطریق و قالت لہ انی من اٰل بیت النبی ﷺ و بی ضرورۃ فافرغ لھا ما معہ فلما رجع حجاج بلدہ صار کلما لقی رجلا منھم یقول لہ تقبل اللہ تعالیٰ منک فتعجب من قولھم فرای النبی ﷺ فی نومہ و قال لہ تعجبت من قولھم تقبل اللہ تعالیٰ منک قال نعم یا رسول اللہ ﷺ قال ان اللہ تعالیٰ خلق ملکًا علی صورتک حج عنک و ھو یحج عنک الی یوم القیامۃ باکرامک لامرأۃ مضطرۃ من اٰل بیتی۔

"مسامرہ (کتاب کانام) میں ہے کہ ایک شخص نے حج کا ارادہ کیا اور ایک ہزار دینار اور دوسراسامان لے کر نکلا تو راستہ میں ایک باپردہ خاتون سامنے آکر کہنے لگی میں سیّد زادی ہوں اور ضرور تمند ہوں، تو اس نے ایک ہزار دینار اور دوسراسامان خاتون کو دے دیا اور واپس گھر آگیا جب اس شہر کے حاجی واپس آنے لگے تو شہر کے لوگوں نے ان کا استقبال کیا ان میں یہ شخص بھی تھا، حاجیوں نے کہا اللہ تعالیٰ آپ کا حج قبول فرمائے (آپ پہلے آگئے ہیں) یہ بڑا متعجب ہوا۔ جب سویا تو خواب میں سرورِ کونین نور العین ﷺ نے اس کو شرفِ زیارت بخشا اور ارشاد فرمایا کہ کیا تو حاجیوں کی مبارکباد سے متعجب ہوتاہے؟ عرض کی جی ہاں یا رسول اللہ ﷺ! فرمایا اللہ تعالیٰ نے تیری صورت کا ایک فرشتہ پیدا فرمایا اس نے تیری طرف سے حج ادا کیا اور آئندہ قیامت تک کرتا رہے گا۔ کیونکہ تونے میری اولاد کی عزت و تعظیم کی ہے۔[2] (سبحان اللہ)

---

[1] (الفتوحات الاحمدیہ ص ۲۷ بحوالہ الطبرانی)

[2] (الشامی ج ۲ ص ۲۷۵)

قال ﷺ حرمت الجنة علی من ظلم اهل بیتی و اٰذانی فی عترتی و من اصطنع صنیعة الیٰ احد من ولد عبد المطلب ولم یجازه فانا اجازیه علیها غدًا اذ لقینی یوم القیامة۔

”آنجناب ﷺ نے فرمایا جو لوگ میرے اہل بیت پر ظلم کرتے ہیں اور میری اولاد کی وجہ سے مجھے ایذا اور تکلیف پہنچاتے ہیں ان پر جنت حرام ہے۔ اور جو شخص حضرت عبد المطلب (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کی اولاد کے ساتھ کوئی بھلائی کرتا ہے اور وہ اس کو بدلہ نہیں دے سکتا تو کل اس کو میں بدلہ دوں گا۔ جب اس کی ملاقات مجھ سے قیامت میں ہو گی۔“[1]

عن ابن عباسٍ رضی اللہ عنهما قال: قال رسول اللہ ﷺ: أحبوا اللہ لما یغذوکم من نعمه، وأحبّونی بحبّ اللہ عزوجل۔ وأحبّوا أهل بیتی لحبّی۔ رواه الترمذی والحاکم۔ وقال أبو عیسی: هذا حدیث حسن۔

”حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ سے محبت کرو ان نعمتوں کی وجہ سے جو اس نے تمہیں عطا فرمائیں اور مجھ سے محبت کرو اللہ کی محبت کے سبب اور میرے اہل بیت سے میری محبت کی خاطر محبت کرو۔“ اس حدیث کو امام ترمذی اور حاکم نے روایت کیا نیز امام ترمذی نے فرمایا کہ یہ حدیث حسن ہے۔[2]

عن العباس بن عبد المطّلب رضی اللہ عنهما قال: کُنّا نلقی النّفر من قریش وهم یتحدّثون فیقطعون حدیثهم، فذکرنا ذلک لرسول اللہ ﷺ فقال: ما بال أقوامٍ یتحدّثون فاذا رأوا الرجال من أهل بیتی قطعوا حدیثهم واللہ لا یدخل قلب رجلٍ الایمان حتی یحبّهم للہ ولقرابتهم منّی۔ رواه ابن ماجه والحاکم۔

”حضرت عباس رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ ہم جب قریش کی جماعت سے ملتے اور وہ باہم گفتگو کر رہے ہوتے تو گفتگو روک دیتے ہم نے حضور نبی اکرم ﷺ کی بارگاہ میں اس امر کی شکایت کی تو آپ ﷺ نے فرمایا: لوگوں کو کیا ہو گیا ہے جب میرے اہل بیت سے کسی کو دیکھتے ہیں تو گفتگو روک دیتے ہیں؟ اللہ رب العزت کی قسم! کسی شخص کے دل میں اس وقت تک ایمان داخل نہیں ہو گا جب تک ان سے اللہ تعالیٰ کے لئے اور میرے قرب کی وجہ سے محبت نہ کرے۔“ اسے امام ابن ماجہ اور حاکم نے روایت کیا ہے۔[3]

عن العباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنهما قال: قلت: یا رسول اللہ، انّ قریشًا اذا لقی بعضهم بعضا لقوهم ببشرٍ حسنٍ، واذا لقونا لقونا بوجوه لا نعرفها۔ قال: فغضب النبیّ ﷺ غضبًا شدیدًا وقال: والّذی نفسی بیده لا یدخل قلب رجل الایمان حتی یحبّکم للہ ولرسولهم ولقرابتی۔ رواه أحمد والنّسائی والحاکم والبزّار۔ وفی روایة: قال: واللہ، لا یدخل قلب امریءٍ ایمانٌ حتّی یحبّکم للہ ولقرابتی۔

---

[1] (روح البیان)

[2] (أخرجه الترمذی فی السنن، کتاب: المناقب، باب: مناقب أهل البیت النبی ﷺ، ۵/۶۶۴، الرقم: ۳۷۸۹، والحاکم فی المستدرک ۳/۱۶۲، الرقم: ۴۷۱۶، والبیهقی فی شعب الایمان، ۱/۳۶۶، الرقم: ۴۰۸)

[3] (أخرجه ابن ماجة فی السنن، المقدمة، باب: فضل العباس بن عبد المطلب ص، ۱/۵۰، الرقم: ۱۴۰، والحاکم فی المستدرک، ۴/۸۵، الرقم: ۶۹۶۰، والمقدسی فی الأحادیث المختارة، ۸/۳۸۲، الرقم: ۴۷۲، والدیلمی فی مسند الفردوس، ۴/۱۱۳، الرقم: ۶۳۵۰، والسیوطی فی شرح سنن ابن ماجة، ۱/۱۳، الرقم: ۱۴۰)

”حضرت عباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ میں نے بارگاہِ رسالت ﷺ میں عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! قریش کے بعض لوگ جب آپس میں ملتے ہیں تو حسین مسکراتے چہروں سے ملتے ہیں اور جب ہم سے ملتے ہیں تو ایسے چہروں سے ملتے ہیں جنہیں ہم نہیں جانتے (یعنی جذبات سے عاری چہروں کے ساتھ)۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: حضور نبی اکرم ﷺ یہ سن کر شدید جلال میں آگئے اور فرمایا: اس ذات کی قسم! جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے کسی بھی شخص کے دل میں اس وقت تک ایمان داخل نہیں ہو سکتا جب تک اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ اور میری قرابت کی خاطر تم سے محبت نہ کرے۔“ اسے امام احمد، نسائی، حاکم اور بزار نے روایت کیا ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ فرمایا: خدا کی قسم کسی شخص کے دل میں اس وقت تک ایمان داخل نہ ہو گا جب تک کہ وہ اللہ تعالیٰ اور میری قرابت کی وجہ سے تم سے محبت نہ کرے۔[1]

عن أبی سعیدٍ الخدریّ رضی اللہ عنه قال: سمعت النبی ﷺ یقول علی هذا المنبر: ما بال رجالٍ یقولون: انّ رحم رسول اللہ ﷺ لا تنفع قومه یوم القیامة، بلی واللہ، انّ رحمی موصولة فی الدّنیا والآخرة۔ وأنّی أیّها النّاس، فرطٌ لکم علی الحوض فاذا جئتم قال رجلٌ: یا رسول اللہ أنا فلانُ بن فلانٍ وقال: یتحقّق أنا فلانُ بن فلانٍ وقال لهم: أمّا النّسب فقد عرّفته ولکنّکم أحدثتم بعدی وأرتددتم القهقریّ۔ رواه احمد والحاکم۔

”حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے حضور نبی اکرم ﷺ کو منبر پر فرماتے ہوئے سنا ان لوگوں کا کیا ہو گا جو یہ کہتے ہیں کہ حضور نبی اکرم ﷺ سے نسبی تعلق قیامت کے روز ان کی قوم کو کوئی فائدہ نہیں دے گا کیوں نہیں! اللہ کی قسم بے شک میرا نسبی تعلق دنیا و آخرت میں آپس میں باہم ملا ہوا ہے اور اے لوگو! بے شک (قیامت کے روز) میں تم سے پہلے حوض پر موجود ہوں گا پس جب تم آگئے تو ایک آدمی کہے گا یا رسول اللہ ﷺ! میں فلان بن فلان ہوں پس حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: اس کا فلان بن فلان کہنا پایۂ ثبوت کو پہنچے گا اور رہا نسب تو تحقیق اس کی پہچان میں نے تمہیں کرا دی ہے لیکن تم میرے بعد احداث کرو گے اور الٹے پاؤں پھر جاؤ گے۔“ اس حدیث کو امام احمد بن حنبل اور امام حاکم نے روایت کیا ہے۔[2]

عن أبی هریرة رضی اللہ عنه: قال: قال رسول اللہ ﷺ خیرکم، خیرکم لأهلی من بعدی۔ رواه الحاکم وأبو یعلی۔

---

[1] (أخرجه أحمد بن حنبل فی المسند ۱۷۰۲۱ الرقم: ۱۷۷۲، ۱۷۷۷، ۱۷۶۵۶، ۱۷۶۵۷، والحاکم فی المستدرک، ۳۷۶/۳، الرقم: ۵۴۳۳، ۲۹۶۰، والنسائی فی السنن الکبری، ۵/۵۱، الرقم: ۸۱۷۶، والبزار فی المسند، ۶/۱۳۱، الرقم: ۲۱۷۵، والبیهقی فی شعب الایمان، ۱۸۸/۲، الرقم: ۱۵۰۱، والدیلمی فی مسند الفردوس، ۳۶۱/۴، الرقم: ۷۰۳۷)

[2] (أخرجه أحمد بن حنبل فی المسند، ۱۸/۳، الرقم: ۱۱۱۵۴، والحاکم فی المستدرک، ۸۴/۴، الرقم: ۶۹۵۸، وأبو یعلی فی المسند، ۴۳۳/۲، الرقم: ۱۲۳۸، والهیثمی فی مجمع الزوائد، ۳۶۴/۱۰)

”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: تم میں سے بہترین وہ ہے جو میرے بعد میرے اہل کے لئے بہترین ہے۔“ اس حدیث کو امام حاکم اور امام ابو یعلی نے بیان کیا ہے۔[1]

عن عبد الرحمٰن بن أبی لیلی عن أبیه قال: قال رسول اللہ ﷺ: لا یؤمن عبدٌ حتی أکون أحبّ الیه من نفسه و أهلی أحبّ من أهله و عترتی أحبّ الیه من عترته و ذاتی أحبّ الیه من ذاته۔ رواه الطبرانی و البیهقی۔

”حضرت عبد الرحمن بن ابی لیلیٰ رضی اللہ عنہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: کوئی بندہ اس وقت تک مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اس کے نزدیک اس کی جان سے بھی محبوب تر نہ ہو جاؤں اور میرے اہل بیت اس کے اہل خانہ سے محبوب تر نہ ہو جائیں اور میری اولاد اسے اپنی اولاد سے بڑھ کر محبوب نہ ہو جائے اور میری ذات اسے اپنی ذات سے محبوب تر نہ ہو جائے۔“ اسے امام طبرانی اور امام بیہقی نے روایت کیا ہے۔[2]

عن الحسن بن علی: أنّ رسول اللہ ﷺ قال: الزموا مودّتنا أهل البیت، فانّه من لقی اللہ عز و جل و هو یودّنا دخل الجنّة بشفاعتنا، و الّذی نفسی بیده: لا ینفع عبد عمله الّا بمعرفة حقنا۔ رواه الطبرانی۔

”حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ہم اہل بیت کی محبت کو لازم پکڑو پس بے شک وہ شخص جو اس حال میں اللہ سے ملا کہ وہ ہم سے محبت کرتا تھا تو وہ ہماری شفاعت کے صدقے جنت میں داخل ہو گا اور اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے کسی شخص کو اس کا عمل فائدہ نہیں دے گا مگر ہمارے حق کی معرفت کے سبب۔“ اس حدیث کو امام طبرانی نے بیان کیا ہے۔[3]

عن جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنهما قال: کانت لآل رسول اللہ ﷺ خادمةٌ تخدمهم یقال لها: بریرة فلقیها رجلٌ فقال: یا بریرة، غطی شعیفاتک، فانّ محمّدًا لن یغنی عنک من اللہ شیئاً قال: فأخبرت النّبیّ ﷺ: فخرج یجرّ رداءه محمّرة و جنتاه، و کنا معشر الأنصار نعرف غضبه بجر ردائه و حمرة و جنتیه۔ فاخذنا السلاح ثم أتیناه فقلنا: یا رسول اللہ مرنا بما شئت فو الّذی بعثک بالحق، لو أمرتنا بأمهاتنا و آبائنا و أولادنا، لأمضینا قولک فیهم، فصعد ﷺ المنبر فحمد اللہ عز و جل و أثنی علیه۔ و قال: من أنا؟ فقلنا: أنت رسول اللہ۔ قال: نعم، و لکن من أنا؟ فقلنا: محمد بن عبد اللہ بن عبد المطلب بن هاشمٍ بن عبد منافٍ۔ قال: أنا سید ولد آدم و لا فخر، و اوّل من تنشقّ عن الأرض و لا فخر، و اوّل من

---

[1] (أخرجه الحاکم فی المستدرک، ۳/۳۵۲، الرقم: ۵۳۵۹، وأبو یعلی فی المسند، ۱۰/۳۳۰، الرقم: ۵۹۲۴، وابن أبی عاصم فی السنة، ۲/۶۱۲، الرقم: ۱۴۱۴، والدیلمی فی مسند الفردوس، ۲/۱۷۰، الرقم: ۲۸۵۱، والخطیب فی تاریخ بغداد، ۷/۲۷۶، الرقم: ۳۷۶۵، والمناوی فی فیض القدیر، ۳/۴۹۷، والهیثمی فی مجمع الزوائد، ۹/۱۷۴)

[2] (أخرجه الطبرانی فی المعجم الکبیر، ۷/۷۵، الرقم: ۶۴۱۶، وفی المعجم المعجم الأوسط، ۶/۵۹، الرقم: ۵۷۹۰، والبیهقی فی شعب الایمان، ۲/۱۸۹، الرقم: ۱۵۰۵، والدیلمی فی مسند الفردوس، ۵/۱۵۴، الرقم: ۷۷۹۵، والهیثمی فی مجمع الزوائد، ۱/۸۸)

[3] (أخرجه الطبرانی فی المعجم الأوسط ۲/۳۶۰، الرقم: ۲۲۳۰، والهیثمی فی مجمع الزوائد ۹/۱۷۲)

ينفض التراب عن رأسه ولا فخر، وأوّل داخل الجنّة ولا فخر، ما بال أقوامٍ يزعمون أنّ رحمي لا ينفع۔ ليس كما زعموا انّي لأشفع وأشفّع، حتى أنّ من أشفَعُ له ليَشفعُ فيُشَفّعُ، حتّى انّ ابليس ليتطاول طمعًا في الشّفاعة۔

''حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ آل رسول صَلَّى اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی ایک خادمہ تھی جو ان کی خدمت بجالاتی، اسے ''بریرہ'' کہا جاتا تھا پس اسے ایک آدمی ملا اور کہا: اے بریرہ اپنی چوٹی کو ڈھانپ کر رکھا کر بے شک محمد صَلَّى اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم تمہیں اللہ کی طرف سے کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتے۔ راوی بیان کرتے ہیں پس اس نے حضور نبی اکرم صَلَّى اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو اس واقعہ کی خبر دی پس آپ صَلَّى اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم اپنی چادر کو گھسیٹتے ہوئے باہر تشریف لائے در آں حالیکہ حضور نبی اکرم صَلَّى اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی دونوں رخسار مبارک سرخ تھے اور ہم (انصار کا گروہ) حضور صَلَّى اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے غصے کو آپ صَلَّى اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے چادر کے گھسیٹنے اور رخساروں کے سرخ ہونے سے پہچان لیتے تھے پس ہم نے اسلحہ اٹھایا اور حضور نبی اکرم صَلَّى اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے پاس آ گئے اور عرض کیا: یارسول اللہ صَلَّى اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم! آپ جو چاہتے ہیں ہمیں حکم دیں پس اس ذات کی قسم جس نے آپ صَلَّى اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے! اگر آپ ہمیں ہماری ماؤں، آباء اور اولاد کے بارے میں بھی کوئی حکم فرمائیں گے تو ہم ان میں بھی آپ صَلَّى اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے قول کو نافذ کر دیں گے پس آپ صَلَّى اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم منبر پر تشریف فرما ہوئے اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء بیان کی اور فرمایا: میں کون ہوں؟ ہم نے عرض کیا: آپ صَلَّى اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم اللہ کے رسول ہیں۔ آپ صَلَّى اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا: ہاں لیکن میں کون ہوں؟ ہم نے عرض کیا: آپ صَلَّى اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم محمد بن عبد اللہ بن عبد المطلب بن ہاشم بن عبد مناف ہیں۔ آپ صَلَّى اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا: میں حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد کا سردار ہوں لیکن کوئی فخر نہیں، میں وہ پہلا شخص ہوں جس کی قبر پھٹے گی لیکن کوئی فخر نہیں اور میں وہ پہلا شخص ہوں جس کے سر سے مٹی جھاڑی جائے گی لیکن کوئی فخر نہیں، اور میں سب سے پہلے جنت میں داخل ہونے والا ہوں لیکن کوئی فخر نہیں، ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے جو یہ گمان کرتے ہیں کہ میرا رحم (نسب و تعلق) فائدہ نہیں دے گا ایسا نہیں ہے جیسا وہ گمان کرتے ہیں۔ بے شک میں شفاعت کروں گا اور میری شفاعت قبول بھی ہو گی یہاں تک کہ جس کی میں شفاعت کروں گا وہ یقیناً دوسروں کی شفاعت کرے گا اور اس کی بھی شفاعت قبول ہو گی یہاں تک کہ ابلیس اپنی گردن کو بلند کرے گا شفاعت میں طمع کی خاطر (یا کسی طور اس کی شفاعت بھی کوئی کر دے)۔'' اس حدیث کو امام طبرانی نے بیان کیا ہے۔[1]

تاجدارِ مدینہ صَلَّى اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا: خدا کی قسم کوئی شخص اس وقت تک مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک ہم سے محبت نہ کرے اور اس وقت تک محبت کرنے کے کا دعویٰ خام ہے جب تک ہماری اہل بیت و عترت اور قریبوں سے محبت نہ کرے۔[2]

[1](أخرجه الطبرانی فی المعجم الأوسط، ۲۰۳/۵، الرقم: ۵۰۸۲، والهيثمی فی مجمع الزوائد، ۳۷۶/۱۰)
[2](الصواعق المحرقه ص ۱۴۵)

ایک اور مقام پر امام الانبیاء علیہ الصلوۃ والسلام نے ارشاد فرمایا: کوئی شخص مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک ہمیں اپنی جان سے محبوب نہ رکھے اور ہماری عترت کو اپنی عترت سے اور ہماری اہل بیت کو اپنے اہل بیت سے محبوب نہ رکھے۔ اور ہماری ذات کو اپنی ذات سے محبوب نہ سمجھے۔[1]

ایک اور مقام پر حضور سرورِ کائنات فخر موجودات باعث تخلیق کائنات جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

واللہ لا یدخل قلب رجل الایمان حتی یحبھم للہ و لقرابتھم منی۔

"خدا کی قسم انسان کے دل میں اس وقت تک ایمان ہی داخل نہیں ہوتا جب تک میرے قریبوں سے محبت نہ کرے۔"[2]

امام الانبیاء تاج دارِ مدینہ ﷺ کو اپنی صاحبزادی والاشان رضی اللہ عنہا اور آپ رضی اللہ عنہا کی اولاد طاہرہ سے اس قدر والہانہ محبت ہے جس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ آپ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو مخاطب کر کے فرمایا: میری آلِ پاک کی محبت تم پر لازم اور واجب قرار دی گئی ہے۔ اور فرمایا کہ ہماری شفاعت اور جنت الفردوس میں داخلہ کا انحصار محض اس بات پر ہے کہ ہمارے گھر والوں سے مودت و محبت کرو۔ آپ ﷺ نے فرمایا: مجھے قسم ہے اس ذات کی جس کی قبضہ قدرت میں میری جان ہے! اگر اہل بیت کے بارے میں ہمارا حق نہیں پہچانو گے تو تمہارا کوئی عمل بھی تمہیں نفع نہیں دے گا۔[3]

عن أبی رافعٍ رضی اللہ عنہ: أنّ رسول اللہ ﷺ قال لعلیّ رضی اللہ عنہ: أنت و شیعتک تردون علیّ الحوض رواء مروّیین، مبیّضۃ وجوھکم۔ و انّ عدوک یردون علیّ ظماءً مقبّحین۔ رواہ الطبرانی۔

"حضرت ابو رافع رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا: اے علی رضی اللہ عنہ! تو اور تیرے (چاہنے والے) مدد گار (قیامت کے روز) میرے پاس حوض کوثر پر چہرے کی شادابی اور سیراب ہو کر آئیں گے اور ان کے چہرے (نور کی وجہ سے) سفید ہوں گے اور بے شک تیرے دشمن (قیامت کے روز) میرے پاس حوض کوثر پر بد نما چہروں کے ساتھ اور سخت پیاس کی حالت میں آئیں گے۔" اس حدیث کو امام طبرانی نے روایت کیا ہے۔[4]

اولادِ فاطمہ (سادات) پر جہنم حرام ہے

عن جابر بن عبداللہ قال: قال رسول اللہ ﷺ: انّما سمّیت بنتی فاطمۃ لأنّ اللہ عزوجل فطمھا و فطم محبّیھا عن النّار۔ رواہ الدّیلمی۔

---

[1] (الصواعق المحرقہ ص ۱۷۲)

[2] (الصواعق المحرقہ ص ۲۳۰)

[3] (جامع الصغیر، ج ۱ ص ۱۰۱، الصواعق المحرقہ ص ۱۷۳، الطبرانی فی المعجم الأوسط، ۳۶۰/۲، الرقم: ۲۲۳۰، والھیثمی فی مجمع الزوائد، ۱۳۱/۹)

[4] (أخرجہ الطبرانی فی المعجم الکبیر، ۳۱۹/۱، الرقم: ۹۴۸، والھیثمی فی مجمع الزوائد، ۱۳۱/۹)

"حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: بے شک میں نے اپنی بیٹی کا نام فاطمہ رکھا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے اور اس کے چاہنے والوں کو آگ سے چھڑا (اور بچا) لیا ہے۔" اس حدیث کو امام دیلمی نے روایت کیا ہے۔[1]

بنتِ رسول، خاتونِ جنّت، سیدہ بتول، سلام اللہ علیہا کا اسمِ مقدس ہی ایسا ہے جس کے معنی ہیں آزاد کرانے والی۔

چنانچہ لفظِ فاطمہ تشریح کرتے ہوئے محدثین نے لکھا ہے:

وفاطمة کما قال ابن درید مشتقة من الفطم وھو قطع سمیت بذالک لان اللہ تعالیٰ فطمھا عن النار۔

"اور فاطمہ! جیسا کہ کہا ابنِ درید کے بیٹے نے کہ یہ فطم سے مشتق ہے جس کا معنی ہے علیٰحدہ کرنا۔ اور فاطمہ کو اللہ تعالیٰ نے دوزخ سے علیحدہ کر دیا ہے"۔[2]

واخرج الدیلمی مرفوعا انھا سمیت فاطمة لان فطمھا ومحبّیھا عن النّار۔

"اور دیلمی نے مرفوعاً روایت بیان کی ہے کہ آپ کا نام فاطمہ ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اور ان کے محبین کو آگ سے علیحدہ کر دیا ہے"۔[3]

ان فاطمة قد احصنت فرجھا فحرّ مھا اللہ وذریّتھا علی النّار۔

"بیشک فاطمہ پاک دامن ہے، آپ کو اور آپ کی اولاد کو اللہ تعالیٰ نے جہنم پر حرام فرما دیا ہے"۔[4]

علاوہ ازیں بھی بیشتر فرامین رسول ﷺ کی روشنی میں ظاہر ہوتا ہے کہ جناب سیّدہ فاطمۃ الزہرا سلام اللہ علیھا کی تمام اولاد پاک جہنم سے محفوظ رہے گی۔

چند ایک روایات مزید ملاحظہ فرمائیں:

وَلَسَوْفَ یُعْطِیکَ رَبُّکَ فَتَرْضٰی (الضحیٰ ۵)

اور بیشک اللہ آپ کو اتنا دے گا کہ آپ راضی ہو جائیں گے۔

مندرجہ بالا آیت کی تفسیر کرتے ہوئے مفسرین کرام نے لکھا ہے:

عن ابن عباس قال رضا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان لا یدخل احد من اھل بیتہٖ النار۔

---

[1] (أخرجه الدیلمی فی مسند الفردوس، ۱/۳۴۶، الرقم: ۱۳۸۵، والخطیب فی تاریخ بغداد، ۱۲/۳۳۱، والمناوی فی فیض القدیر، ۳/۴۳۲)

[2] (اسعاف الراغبین حاشیہ نور الابصار ص ۸۰، شرح فقہ اکبر ص ۱۳۰)

[3] (صواعق محرقہ ص ۱۸۸ نور الابصار ص ۴۵)

[4] (المستدرک حاکم ۱۵۲/۳، الامن والعلیٰ ص ۲۳۸، اشرف المؤبد ص ۴۴، مراۃ شرح مشکوۃ ۴۵۲)

"کہ سرکارِ دوعالم ﷺ کی رضا یہ ہے کہ آپ ﷺ کے اہل بیت میں سے کوئی ایک فرد بھی جہنم میں نہ جائے"۔[1]

کتبِ احادیث میں آتا ہے کہ سرکارِ دوعالم ﷺ نے فرمایا کہ میں نے اللہ تبارک وتعالیٰ سے سوال کیا کہ یا اللہ میرے اہل بیت سے ایک شخص بھی جہنم میں نہ جائے تو اللہ تعالیٰ نے میرا یہ سوال قبول فرمالیا۔

عن عمران بن حصین رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ سألت ربّی ان لا یدخل النار احدا من اھل بیتی فاعطانیھا۔ (حدیث صحیح ولم یخرجاہ)۔

اور اولادِ فاطمہ پر دوزخ حرام ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ سرورِ کائنات، فخر موجودات، احمد مجتبیٰ، محمد مصطفی ﷺ کا ارشاد ہے کہ قیامت کے دن تمام لوگوں کے حسب نسب منقطع ہو جائیں گے مگر ہمارا سبب و نسب منقطع نہیں ہو گا۔[2]

چنانچہ روایات صحیحہ میں آتا ہے:

قال رسول اللہ ﷺ کل سببٍ و نسب ینقطع یوم القیامۃ الا سببی و نسبی۔[3]

عن ابن مسعودٍ رضی اللہ عنہ، عن النبی ﷺ قال: حبّ آل محمّدٍ یوماً خیر من عبادۃ سنۃٍ و من مات علیہ دخل الجنّۃ۔ رواہ الدّیلمی۔

"حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ حضور نبی اکرم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: اہل بیتِ مصطفی ﷺ کی ایک دن کی محبت پورے سال کی عبادت سے بہتر ہے اور جو اس محبت پر فوت ہوا تو وہ جنت میں داخل ہو گیا۔" اس حدیث کو امام دیلمی نے روایت کیا ہے۔[4]

قال علیہ الصلوۃ و السلام: "الا و من مات علی حبّ آل محمد مات مغفورا۔ الا و من مات علی حبّ محمد مات تائبا۔ الا من مات علی حب آل محمد مات مؤمنا۔ الا و من مات علی حبّ آل محمد مات شہیدا متکمل الایمان۔ الا و من مات علیٰ حبّ اٰل محمد یبشرہ ملک الموت بالجنۃ ثم منکر و نکیرا۔ الا و من مات علی حب آل محمد یزف الی الجنۃ کما تزف العروس الی بیت زوجھا و فتح لہ فی قبر باب الجنۃ جعل اللہ قبرہ مزار ملائکۃ رحمۃ۔ الا و من مات علی حبّ آل محمد مات علی السنۃ و الجماعۃ۔

"اے مسلمانو: آگاہ ہو جاؤ جو شخص حبّ ِآلِ محمد ﷺ میں مرے گا وہ بخشا ہوا مرے گا۔ آگاہ ہو جاؤ جو شخص حبّ ِآلِ محمد ﷺ میں مرے گا وہ تائب مرے گا۔ آگاہ ہو جاؤ جو شخص حبّ ِآلِ محمد ﷺ میں مرے گا وہ تائب مرے گا۔ آگاہ ہو جاؤ جو شخص حبّ ِآلِ محمد ﷺ میں مرا وہ مؤمن مرا۔ آگاہ ہو جاؤ، جو شخص حبّ ِآلِ محمد ﷺ میں مرا وہ شہید اور

---

[1] (تفسیر قرطبی جز ۳۰ ص ۲۸۲ اشرف الموبد ص ۴۴)
[2] (المستدرک ۳/۱۵۰، اشرف الموبد ۴۴)
[3] (المستدرک ۳/۱۶۴، خصائص کبریٰ ۲/۲۲۵ جامع الصغیر ۲/۹۳ اشرف الموجد ص ۴۵ الروضۃ الفیحانی تواریخ النساء ص ۱۶۴ طبقات ابن سعد ۸/۲۸۲)
[4] (أخرجہ الدیلمی فی مسند الفردوس، ۲/۱۴۲، الرقم: ۲۷۲۱)

کامل الایمان مرا۔ آگاہ ہو جاؤ جو شخص حبّ آلِ محمد ﷺ میں مرا ملکُ الموت اور منکر نکیر اسے جنت کی بشارت دیں گے۔ آگاہ ہو جاؤ جو شخص حبّ آلِ محمد ﷺ میں مرا جنت ایسے جائے گا جیسے دولہن اپنے خاوند کے گھر جاتی ہے، قبر میں اس کے لئے جنت کے دروازے کھولے جائیں گے اور اللہ تعالیٰ اس کی قبر کو رحمت کے فرشتوں کی زیارت گاہ بنائے گا۔ آگاہ ہو جاؤ، جو شخص حبّ آلِ محمد ﷺ میں مرا وہ سنت و جماعت پر مرا"۔[1]

عن عليّ بن حسين: أنّه ﷺ قال: يا عليّ انّ الله قد غفر لک و لذرّيتک و لو لدک و لأهلک، و لشيعتک و لمحبّی شيعتک فابشر۔ رواه الدّيلمی۔

"حضرت علی بن حسین رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: اے علی رضی اللہ عنہ! بے شک اللہ تعالیٰ نے تجھے اور تیری اولاد کو اور تیرے گھر والوں کو اور تیرے مدد گاروں کو اور تیرے مدد گاروں کے چاہنے والے کو بخش دیا ہے پس تجھے یہ خوشخبری مبارک ہو"۔[2]

اہل بیت کے ساتھ دشمنی کرنے والا یا منافق، یا ولدِ زنا، یا ناپاک حمل سے ہے

و اخرج ابن عدی و البيهقی فی شعب الايمان عن علی رضی الله عنه قال قال رسول الله ﷺ من لم يعرف حقّ عترتی و الانصار و العرب فهو الاحدی ثلاثٍ: أما منافق، و أما لزِنيةٍ، و أما امرؤٌ حملت به اُمّه لغير طهر۔

"حضرت علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: جو شخص میرے اہل بیت اور انصار اور عرب کا حق نہیں پہچانتا تو اس میں تین چیزوں میں سے ایک پائی جاتی ہے: یا تو وہ منافق ہے، یا وہ حرامی ہے، یا وہ ایسا آدمی ہے جس کی ماں بغیر طہر کے اس سے حاملہ ہوئی ہو۔" اس حدیث کو امام دیلمی نے اپنی مسند میں روایت کیا ہے۔[3]

حضور امام الانبیاء ﷺ نے ارشاد فرمایا:

لا يحبنا اهل البيت الا مؤمن تقی و لا يبغضنا الا منافق و شقی۔

"ہمارے اہل بیت سے وہی محبت رکھے گا جو مؤمن اور متقی ہے اور ہمارے اہل بیت پاک سے وہی بغض رکھے گا جو منافق اور بد بخت ہے"۔[4]

---

[1] (تفسیر کبیر ۷/۳۹۰، تفسیر ابن عربی ۲/۲۱۲، تفسیر روح البیان ۴/۴۰۷، تفسیر کشاف ۴/۳۳۹، اشرف المؤید ۱۵۷، نزهة المجالس ۲/۲۲۲)

[2] (أخرجه الديلمی فی مسند الفردوس، ۵/۳۲۹، الرقم: ۸۳۳۷)

[3] (أخرجه البيهقی فی شعب الايمان، ۲/۲۳۲، الرقم: ۱۶۱۴، الديلمی فی مسند الفردوس، ۳/۶۲۶، الرقم: ۵۹۵۵، و الذهبی فی ميزان الاعتدال فی نقد الرجال، ۳/۱۴۸)

[4] (اشرف المؤبد ص ۱۵۵)

ایک اور مقام پر سر تاج الانبیاء صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا:

من بغض اهل البيت فهو منافق۔

"جو ہمارے اہل بیت سے بغض رکھتا ہے وہ منافق ہے"۔ [1]

امام الانبیاء صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا:

حرمت الجنة على من ظلم اهل بيتي و اذاني في عترتي۔

"جو میرے اہل بیت پر ظلم کرتا ہے اور میری عترت کی وجہ سے مجھے ایذا دیتا ہے اس پر جنت کو حرام کر دیا گیا ہے"۔ [2]

سرکارِ دوعالم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا:

الا و من مات على بغض آل محمد جاء يوم القيامة كتب بين عينيه آئس من رحمة الله۔

"جو ہماری آل پاک سے بغض کی حالت میں مرے گا جب وہ قیامت کے دن آئے گا تو اس کی آنکھوں کے درمیان تحریر کر دیا جائے گا کہ یہ شخص اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس کر دیا گیا ہے"۔ [3]

الا من مات على بغض آل محمد لم يشم رائحة الجنة۔

آل محمد صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سے بغض رکھنے والا جنت کی خوشبو بھی نہیں سونگھ سکے گا۔ [4]

مسلمانوں کو چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے رہیں کہ وہ اپنے خاص لطف و کرم سے اہل بیتِ مصطفی علیہم السلام کی محبت عطا فرمائے اور ان سے بغض رکھنے والوں کے سایہ سے بھی محفوظ فرمائے، اہل بیت محمد صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سے بغض اور دشمنی کی سزا قطعی طور پر جہنم ہے اور یہ کسی دنیاوی عدالت کا فیصلہ نہیں بلکہ ان کی زبانِ فیض ترجمان سے نکلے ہوئے جملے ہیں جن کا ہر ارشاد حکمِ خداوندی اور ناقابلِ ترمیم ہے۔ اب آپ سرکارِ دوعالم علیہ الصلوۃ والسلام کے لئے مزید ارشادات ملاحظہ فرمائیں۔

ایک دفعہ تاجدار دوعالم امام الانبیاء صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے اپنی صاحبزادیٔ مکرمہ جناب سیدہ فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کے شہزادوں کو گود میں لے کر فرمایا: **من احبهما فقد احبني و من ابغضهما فقد ابغضني**، جو ان سے محبت کرتا ہے وہ ہم سے محبت رکھتا ہے جو ان سے بغض رکھتا ہے وہ ہم سے بغض رکھتا ہے۔ [5]

---

[1] (اشرف المؤبد ص ۱۵۵)

[2] (تفسیر کشاف ۴/۳۹۹)

[3] (کشاف ۴/۳۹۹، روح البیان ۴/۴۰۷، کبیر ۷/۳۹۶، ابن عربی ۲/۲۱۲، نزھۃ المجالس ۲/۲۳۸، اشرف المؤبد ۱۵۲)

[4] (تفسیر کبیر ۷;۳۹۰، تفسیر روح البیان ۴/۴۰۷، کبیر ۷/۳۹۶، ابن عربی ۲/۲۱۲، نزھۃ المجالس ۲/۲۳۸، اشرف المؤبد ۱۵۲)

[5] (البدایہ والنہایہ ۸/۲۶۵ المستدرک ۳/۱۶۶ و دیگر کتب احادیث متفقہ علیہ)

حضور سید المرسلین ﷺ اپنے اہل بیت کرام سے اختلاف رکھنے والوں کو فرماتے ہیں کہ وہ شیطان کے ساتھی ہیں۔ چنانچہ کتب احادیث میں آتا ہے کہ میری آلِ پاک میری امت کے لئے امان ہے اور تمہیں اختلاف سے بچاتی ہے جو قبیلہ بھی ان سے مخالفت کرے گا وہ شیطان کی جماعت ہے۔[1]

کائنات کی سلامتی آلِ نبی ﷺ ہے

ایک مقام پر تاجدارِ دوعالم سرورِ کائنات ﷺ نے ارشاد فرمایا میری آل پاک کی مثال نوح علیہ السلام کی کشتی کی سی ہے جو اس پر سوار ہو گیا اس نے نجات حاصل کرلی اور جس نے ان کی مخالفت کی وہ خود ہی ہلاک ہو گیا۔ دوسری جگہ فرمایا میرے اہل بیت کی مثال سفینۂ نوح کی ہے جو سفینہ پر سوار ہو گیا اس نے نجات حاصل کرلی اور جس نے ان کی مخالفت کی وہ غرق ہو گیا۔ اس حدیث کو امام طبرانی نے بیان کیا ہے۔ اسی طرح تاجدارِ مدینہ ﷺ نے فرمایا کہ میرے اہل بیت کی مثال سفینۂ نوح کی ہے جو سفینہ پر سوار ہو گیا اس نے نجات حاصل کرلی اور جس نے ان کی مخالفت کی وہ جہنم کا ایندھن بن گیا۔[2]

عن علی قال: قال رسول اللہ ﷺ: النجوم أمان لأهل السّماء۔ فاذا ذهبت النجوم ذهب أهل السّماء۔ و أهل بيتي أمانٌ لأهل الأرض۔ فاذا ذهب أهل بيتي ذهب أهل الأرض۔ رواه الديلمي۔

"حضرت علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ستارے اہل آسمان کے لئے امان ہیں پس جب ستارے چلے گئے تو اہل آسمان بھی چلے گئے اور میرے اہل بیت زمین والوں کے لئے امان ہیں پس جب میرے اہل بیت چلے گئے تو اہل زمین بھی چل گئے۔"

اس حدیث کو امام دیلمی نے روایت کیا ہے۔[3]

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

"بے شک اللہ تعالیٰ کی تین حُرمات ہیں جو ان کی حفاظت کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لئے اس کے دین و دنیا کے معاملات کی حفاظت فرماتا ہے اور جو ان تین کو ضائع کر دیتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی کسی چیز کی حفاظت نہیں فرماتا،" سو عرض کیا گیا: "یا رسول

[1] (خصائص الکبریٰ ۲/۱۴۵ اشرف صواعق محرقہ ۱۵۳)

[2] (أخرجه الطبرانی فی المعجم الکبیر، ۳/۴۵، الرقم: ۲۶۳۷، ۱۲/۳۴، الرقم: ۲۳۸۸، ۲۶۳۸، ۲۶۳۶، وفی المعجم الاوسط، ۴/۱۰، الرقم: ۳۴۷۸، ۵/۳۵۵، الرقم: ۵۵۳۶، ۶/۸۵، الرقم: ۵۸۷۰، فی المعجم الصغیر، ۱/۲۴۰، الرقم: ۳۹۱، ۲/۸۴، الرقم: ۸۲۵، والحاکم فی المستدرک، ۳/۱۶۳، الرقم: ۴۷۲۰، والبزار فی المسند، ۹/۳۴۳، الرقم: ۳۹۰۰، والدیلمی فی مسند الفردوس، ۱/۲۳۸، الرقم: ۹۱۶، والقضاعی فی مسند الشهاب، ۲/۲۷۳، الحدیث ۱۳۴۳، والهیثمی فی مجمع الزوائد، ۹/۱۶۸، صواعق محرقہ ص ۱۵۳، اشرف المؤبد ص ۱۵۲)

[3] (أخرجه الدیلمی فی مسند الفردوس، ۴/۳۱۱، الرقم: ۶۹۱۳، مرقاۃ شرح مشکوۃ ج ۱۱ ص ۳۹۹، ۴۰۰)

اللہ ﷺ! وہ کون سی تین حرمات ہیں؟ "آپ ﷺ نے فرمایا: "اسلام کی حرمت، میری حرمت اور میرے نسب کی حرمت۔"

اس حدیث کو امام طبرانی نے روایت کیا ہے۔

عن أنسٍ رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللہ ﷺ: وعدنی ربّی فی أھل بیتی من أقرّ منھم بالتّوحید ولی بالبلاغ أن لا یعذبھم۔ رواہ الحاکم وقال: ھذا حدیثٌ صحیح الأسناد۔

"حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: میرے رب نے مجھ سے میرے اہل بیت کے بارے میں وعدہ کیا ہے کہ ان میں سے جو بھی میری توحید کا اقرار کرے گا اسے یہ بات پہنچادی جائے کہ اللہ تعالیٰ اسے عذاب نہیں دے گا۔"

اس حدیث کو امام حاکم نے روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ اس حدیث کی سند صحیح ہے۔[1]

محبت اہل بیت فرض اور ان پر درود نہ پڑھنے سے نماز نہیں

حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

یا اھل بیت رسول اللہ حبّکم فرض من اللہ فی قرأن انزلہ۔

اے اہل بیت رسول ﷺ آپ سے محبت رکھنا اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جس کو اس نے اتارا ہے فرض قرار دیا ہے۔

کفاکم من عظیم القدر انّکم — من لم یصلّ علیکم لا صلوۃ لہ

اے اہل بیت آپ کی عظمت وشان کے لئے یہی کافی ہے کہ جس نے آپ پر درود نہ پڑھا اس کی نماز ہی نہیں۔

رافضی اور ناصبی

اذا نحن فضّلنا علیًّا فَاِنَّنا — روافض باالتفضیل عند ذی الجھل

جب ہم نے حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی فضیلت کو بیان کیا تو بیشک ہم بہ سبب بیان تفضیل کے جاہلوں کے نزدیک رافضی ہوئے۔

وفضل ابی بکرٍ اذا ماذکرتہ — رمیت بنصبٍ عند ذکری للفضل

اور جس وقت ہم فضائل حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں تو اس وقت ہم پر ناصبی ہونے کی تہمت لگائی جاتی ہے۔

قالو الرّفضت قلت کلا — ما الرفض دینی ولا اعتقادی

[1] (أخرجہ الحاکم فی المستدرک، ۳/۱۶۳، الرقم: ۴۷۱۸، والدیلمی فی مسند الفردوس، ۴/۳۸۲، الرقم: ۷۱۱۲)

جن جاہلوں نے مجھ کو رافضی کہا تو میں نے جواب دیا کہ حاشا میرا دین اور میرا اعتقاد رافضیوں کا سا نہیں۔

محبت اہل بیت عین ایمان

لٰکن تولّیت غیر شکٍّ   خیر امامٍ و خیر ھادی

لیکن اس میں شک نہیں کہ میں بہتر امام اور بہتر ہادی کے ساتھ دوستی رکھتا ہوں۔

ان کان رفضًا حبّ اٰل محمد   فلیشھد الثقلان انّی رافض

اگر آل محمد مصطفی ﷺ کی محبت ہی کا نام رفض ہے تو دونوں جہاں گواہ رہیں کہ بیشک میں رافضی ہوں۔

قرآن اور اہل بیتِ نبوت سے وابستگی نورِ ہدایت

حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور سرور کائنات علیہ الصلوۃ والسلام فریضہ حج سے فارغ ہو کر مکہ معظمہ سے باہر غدیر خم کے مقام پر تشریف فرما ہوئے جہاں سے مختلف اطراف کی طرف راستے جاتے ہیں تو مختلف علاقوں سے آئے ہوئے اصحاب کو الوداع کہنے سے پہلے حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے ایک تاریخی خطبہ ارشاد فرمایا۔ ”اے میرے ساتھیو! میں اپنے فرائض کو پایہ تکمیل تک پہنچا چکا ہوں۔ سنت الٰہیہ کے موافق کسی وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم آجائے اور مجھے اس کی تکمیل کرنا پڑے اس لئے میں تمہاری ہدایت و نجات کے لئے آخری بات کہہ دینا چاہتا ہوں تا کہ تم ہدایت صراط مستقیم سے بھٹک نہ جاؤ۔

وانا تارک فیکم الثقلین اوّلھما کتاب اللہ فیہ النّور و الھدیٰ فخذوا بکتاب اللہ واستمسکوا بہ۔ وقال واھل بیتی اذکر اللہ فی اھل بیتی وقال ثلاثاً۔

”(یعنی) میں تم میں دو بے مثل عمدہ نفیس چیزیں چھوڑے جاتا ہوں ایک اللہ تعالیٰ کی کتاب (قرآن) جو نورِ ہدایت سے بھرپور ہے، اس کو بہت مضبوطی سے پکڑے رہنا دوسری گرانقدر اور بزرگ چیز میرے اہل بیت (گھر والے) ہیں، میں تم کو خدا یاد دلاتا ہوں اپنے اہل بیت کے معاملہ میں، اور تین بار اس کا تکرار فرمایا۔“

اولاد کو تین باتوں کی تعلیم

حضورِ اقدس ﷺ کا ارشاد ہے کہ اپنی اولاد کو تین باتوں کی تعلیم دو:

حبّ نبیّکم و حبّ اھل بیتہٖ و قرأۃ قرآن۔

”اپنے نبی ﷺ کی محبت، اہل بیت رضی اللہ عنہم کی محبت اور قرآن پڑھنے کی محبت“۔

اللہ تعالیٰ ہم کو حب رسول ﷺ وحب اہل بیت رضی اللہ عنہم وحب قرآن سے سرشار فرمائے اور ایمان پر خاتمہ فرمائے۔(آمین)

اہل بیت مصطفی ﷺ

إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا (ألاحزاب ۳۳)

''اللہ تو یہی چاہتا ہے اے نبی کے گھر والو کہ تم سے ہر ناپاکی دُور فرمادے اور تمہیں پاک کر کے خوب ستھرا کر دے''۔

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب مکرم علیہ الصلوۃ والسلام کے اہل بیت عظام کے متعلق فرمایا ہے کہ ان کو پاک اور خوب پاک فرمایا ہے اور کوئی ناپاکی ان کے قریب نہیں آسکتی۔ اب اس آیت میں سب سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ اہل بیت سے یہاں کون مراد ہیں اور دوسرا یہ کہ رجس ناپاکی سے کیا مراد ہے تیسرا یہ کہ امتیازی شان کیا ہے اور چوتھا یہ کہ تطہیر کیا ہے۔ علماء ومفسرین کرام علیہم الرحمۃ کی کثرت رائے یہ ہے کہ یہ آیت سیدنا حضرت علی المرتضی، سیدہ فاطمۃ الزہرہ، سیدنا امام حسن، اور سیدنا امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے حق میں نازل ہوئی اور قرینہ اس کا یہ ہے کہ عنکم اور اس کے بعد تمام ضمیریں مذکر ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ آیت ازواجِ مطہرات کے حق میں نازل ہوئی کیونکہ اس کے بعد واذکر مایتلیٰ فی بیوتکن ہے۔

چنانچہ علامہ فخر الدین رازی علیہ الرحمہ اپنی تفسیر کبیر میں آیت تطہیر کے ماتحت فرماتے ہیں:

فالأولیٰ ان یقال هم اولاده وازواجه والحسن والحسین منهم وعلی منهم لانه کان من اهل بیته بسبب معاشره بنت النبی ﷺ وملازمته النبی ﷺ۔

''اولی اور حسن بات یہی ہے کہ اہل بیت نبی ﷺ کی اولاد، بیویاں اور سیدنا حسن، اور سیدنا حسین ہیں، سیدنا علی المرتضی رضی اللہ عنہم بھی اہل بیت سے ہیں اس لئے کہ نبی ﷺ کی شہزادی سیدہ (فاطمہ رضی اللہ عنہا) سے معاشرت کے باعث اور آپ کی معیت کی وجہ سے وہ اہل بیت میں شامل ہیں۔

اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ بھی اس نسبت میں بدرجہ اولیٰ شامل ہیں۔

اور علامہ صاوی علیہ الرحمہ اپنی تفسیر میں اسی آیت کے تحت فرماتے ہیں:

فی اهل بیت سکنه وهنّ ازواجه واهل بیت نسبه وهنّ ذریّة۔

''آیت میں اہل بیت سکونت ازواجِ مطہرات ہیں اور اہل نسب جو آپ ﷺ کی اولاد ہے تمام شامل ہیں۔

اور محقق علی الاطلاق علامہ شیخ شاہ عبد الحق محدث دہلوی علیہ الرحمۃ اشعۃ اللمعات میں یوں بیان فرماتے ہیں:

''بیت سہ است بیت نسب، بیت سکنی، وبیت ولادت پس بنو ہاشم اولاد عبد المطلب اہل بیت پیغمبر اند ﷺ از جہت نسب و ازواج مطہرات آں حضرت ﷺ اہل بیت سکنی اند و اولاد شریف آں حضرت اہل بیت ولادت اند''۔

یعنی اہل بیت تین ہیں: (۱) بیت نسب، (۲) بیت سکنی، (۳) بیت ولادت، پس حضرت عبد المطلب کی اولاد بنو ہاشم ہیں، وہ پیغمبر اسلام کے نسب کے لحاظ سے اہل بیت ہیں اور ازواجِ مطہرات نبی ﷺ کی اہل بیت سکنی ہیں اور اولاد شریف آں حضرت علیہ السلام کی اہلبیتِ ولادت ہیں۔ اس کے ساتھ ہی آگے چل کر شیخ محقق علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ حضور سید عالم علیہ الصلوۃ والسلام کی اہل بیت میں سیدنا علی المرتضیٰ، سیدہ فاطمۃ الزہرا اور سیدنا امام حسن اور سیدنا امام حسین صلوٰۃ اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو خصوصی امتیازی اور انفرادی مقام حاصل ہے اس لئے کہ سرکار ابد قرار علیہ الصلوۃ والسلام کو ان کے ساتھ خصوصی محبت و پیار ہے اس لئے ان کی فضیلت و بزرگی اس وجہ سے زیادہ ہے۔ ثابت ہوا کہ اہلبیت میں ازواجِ مطہرات النبی ﷺ یقیناً شامل ہیں یہ اس آیت سے کسی طریق سے خارج نہیں ہیں۔

رجس کے معنی ازروئے قرآن

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ (المائدة ۹۰)

''اے ایمان والو! شراب اور جوا اور بتوں کے پاس نصب شدہ پتھر اور فال کے تیر محض ناپاک ہیں، شیطانی کاموں سے ہیں۔''

یہاں آیت میں شراب، جوئے، بتوں اور فال کے تیروں کو ''رجس'' فرمایا گیا ہے۔

إِلَّا أَنْ يَكُونَ مَيْتَةً أَوْ دَمًا مَسْفُوحًا أَوْ لَحْمَ خِنْزِيرٍ فَإِنَّهُ رِجْسٌ أَوْ فِسْقًا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللَّهِ بِهِ (الأنعام ۱۴۵)

''مگر یہ کہ مردار ہو یا رگوں کا بہتا خون یا خنزیر کا گوشت ہو، وہ نجس ہے، یا بطور نافرمانی اس پر (ذبح کے وقت) غیر اللہ کا نام پکارا گیا ہو۔''

وَاُحِلَّتْ لَكُمُ الْاَنْعَامُ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ (الحج ۳۰)

''اور تمہارے لئے حلال کئے گئے بے زبان چوپائے، سوا ان کے جن کی ممانعت تم پر پڑھی جاتی ہے تو دور رہو بتوں کی گندگی سے۔''

ان دو آیات میں مردار بہتا ہوا خون، گوشت خنزیر اور بتوں کے نام پر ذبح کئے گئے جانور کو رِجْسٌ فرمایا گیا ہے۔

وَ اَمَّا الَّذِینَ فِی قُلُوبِھِم مَّرَضٌ فَزَادَتْھُمْ رِجْسًا (یونس ۱۲۵)

''اور جن کے دلوں میں آزار ہے، انہیں اور پلیدی پر پلیدی بڑھائی''

فَاَعْرِضُوا عَنْھُمْ اِنَّھُمْ رِجْسٌ (توبۃ ۹۵)

''تو تم ان کا خیال چھوڑو وہ تو نرے پلید ہیں''۔

ان تین آیات میں منافقین کے نفاق، بے ایمانی اور بے عقلی پر رجس کا اطلاق کیا گیا ہے۔

وَ یَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَی الَّذِینَ لَا یَعْقِلُونَ (یونس ۱۰۰)

''اور عذاب ان پر ڈالتا ہے جنہیں عقل نہیں۔''

قَالَ قَدْ وَقَعَ عَلَیکُم مِّن رَّبِّکُمْ رِجْسٌ وَّ غَضَبٌ (الاعراف ۷۱)

''کہا ضرور تم پر تمہارے رب کا عذاب اور غضب پڑ گیا۔''

ان دو آیات میں عذابِ خداوندی کو رجس فرمایا گیا ہے۔

ان تمام آیات کا خلاصہ یہ ہے کہ شراب، جوا، جاری خون، خنزیر کا گوشت، بتوں کے نام پر ذبح کیا گیا جانور، منافقین اور ان کے نفاق بے دینی و بے ایمانی اور عذابِ خداندی وغیرہم پر ''رِجس'' کا اطلاق ہوا ہے۔

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لِیُذْھِبَ عَنکُمُ الرِّجْسَ اَھْلَ الْبَیتِ (الاحزاب ۳۳)

اے نبی ﷺ کے اہل بیت کرام میں نے تم کو تمام اعتقادی و عملی ناپاکیوں اور برائیوں سے بالکل پاک اور منزہ فرما کر قلبی صفائی، اخلاقی ستھرائی اور تزکیہ ظاہر و باطن کا وہ اعلیٰ و ارفع مقام عطا فرمایا ہے جس کی وجہ سے تم دوسروں سے ممتاز و فائق ہو۔

سیدہ فاطمہ سلام اللہ علیہا کے گھرانے کا اہل بیت اور اہل کساء ہونے کا بیان

عن صفیّة بنت شیبة قالت: قالت عائشة رضی اللہ عنھا: خرج النّبی ﷺ غداةً و علیه مرطٌ مرحّلٌ من شعرٍ أسود، فجاء الحسن بن علی رضی اللہ عنھما فأدخله، ثمّ جاء الحسین رضی اللہ عنه فدخل معه، ثمّ جاءت فاطمة رضی اللہ عنھا فأدخلھا، ثمّ جاء علیّ رضی اللہ عنه فأدخله، ثمّ قال: إِنَّمَا یُرِیدُ اللّٰہُ لِیُذْھِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ أَھْلَ الْبَیْتِ وَ یُطَھِّرَکُمْ تَطْھِیرًا (الأحزاب ۳۳) رواہ مسلم۔

''حضرت صفیہ بنت شیبہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ حضور نبی اکرم ﷺ صبح کے وقت باہر تشریف لائے درآنحالیکہ آپ ﷺ نے ایک چادر اوڑھی ہوئی تھی جس پر سیاہ اون سے کجاووں کے

نقش بنے ہوئے تھے۔ حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما آئے تو آپ ﷺ نے انہیں اس چادر میں داخل کر لیا، پھر حضرت حسین رضی اللہ عنہ آئے اور ان کے ہمراہ چادر میں داخل ہو گئے، پھر سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا آئیں اور آپ ﷺ نے انہیں اس چادر میں داخل فرمالیا، پھر حضرت علی کرم اللہ وجہہ آئے تو آپ ﷺ نے انہیں بھی چادر میں لے لیا۔ پھر آپ ﷺ نے یہ آیت مبارکہ پڑھی: "اے اہل بیت! اللہ یہی چاہتا ہے کہ تم سے (ہر طرح کی) آلودگی دور کر دے اور تم کو خوب پاک وصاف کر دے۔"

اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔[1]

عن عمر بن أبی سلمة ربیب النبی ﷺ قال لمّا نزلت هذه الآیة علی النبی ﷺ: إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا (ألاحزاب ۳۳) فی بیت أمّ سلمة، فدعا فاطمة وحسنًا وحسینًا رضی اللہ عنهم فجلّلهم بکساء وعلیّ رضی اللہ عنه خلف ظهره فجلّله بکساء، ثمّ قال: اللهمّ هؤلاءِ أهلُ بیتی، فأذهب عنهم الرّجس وطهّرهم تطهیرًا۔ رواه التّرمذی وأحمد۔

پروردۂ نبی حضرت عمر بن ابی سلمہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب حضور نبی اکرم ﷺ پر حضرت سلمہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں یہ آیت مبارکہ۔۔۔ اے اہل بیت! اللہ تو یہی چاہتا ہے کہ تم سے (ہر طرح کی) آلودگی دور فرمادے اور تم کو خوب پاک وصاف فرمادے۔۔۔ نازل ہوئی تو آپ ﷺ نے حضرت فاطمہ، حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہم کو بلایا اور ایک کملی میں ڈھانپ لیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نبی اکرم ﷺ کے پیچھے تھے، آپ ﷺ نے انہیں بھی ڈھانپ لیا، پھر فرمایا: الٰہی! یہ میرے اہل بیت ہیں، ان سے نجاست دور کر اور ان کو خوب پاک وصاف کر دے۔" اس حدیث کو امام ترمذی اور احمد نے روایت کیا ہے۔[2]

سادات کرام رضی اللہ عنہم کی جو تعظیم و تکریم کتب احادیث سے ظاہر ہے وہ بیان سے باہر اور گمان سے بالا ہے۔ قلم کی ہر گز طاقت نہیں کہ اولادِ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے فضائل واکرام کا احاطہ کر سکے۔ ہم قارئین کی خدمت میں التماس کریں گے کہ جو شخص بھی اہل بیتِ رسول ﷺ کا فرد ہونے کا دعوی دار ہے، آپ بہر طور اس کی تعظیم و تکریم اولادِ مصطفی ﷺ سمجھ کر کریں، اور ہر گز اس ٹوہ میں نہ جائیں کہ ممکن ہے یہ سیّد نہ ہو۔

---

[1] (أخرجه مسلم فی الصحیح، کتاب: فضائل الصحابة، باب: فضائل أهل بیت النبی، ۱۸۸۳/۴، الرقم: ۲۴۲۴، وابن أبی شیبة فی المصنف، ۳۷۰/۶، الرقم: ۳۶۱۰۲، وأحمد بن حنبل فی فضائل الصحابة، ۶۷۲/۲، الرقم: ۱۱۴۹، وابن راهویه فی المسند، ۶۷۸/۳، الرقم: ۱۲۷۱، والحاکم فی المستدرک ۱۶۹/۳، الرقم: ۴۷۰۷، والبیهقی فی السنن الکبریٰ، ۱۳۹/۲، والطبرانی فی جامع البیان، ۶،۷/۲۲)

[2] (أخرجه الترمذی فی السنن، کتاب: تفسیر القرآن باب: ومن سورة الأحزاب، ۳۵۱/۵، ۳۶۲، الرقم: ۳۲۰۵، وأحمد بن حنبل فی المسند، ۲۹۲/۶، وفی فضائل الصحابة، ۵۸۷/۲، الرقم: ۹۹۴، والحاکم فی المستدرک، ۴۵۱/۲، الرقم: ۳۵۵۸، ۱۵۸/۳، الرقم: ۴۷۰۵، والطبرانی فی المعجم الکبیر، ۵۲/۳، الرقم: ۲۶۶۲)

ہم نے اشرف المؤبد و دیگر متعدد کتب میں پڑھا ہے کہ سیدہ فاطمہ سلام اللہ علیہا کی اولاد پاک سے ایک شہزادی فقر کی حالت میں ایک غنی مسلمان کے پاس کسی ضرورت سے تشریف لے گئیں اور اسے بتایا کہ میں سید زادی ہوں، اس لئے میری مدد کرو، تو اس شخص نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ مجھے کیا معلوم تم سید زادی ہو یا نہیں۔ وہ شہزادی بتول رضی اللہ عنہا پریشانی کے عالم میں واپس آ گئیں اور ایک یہودی سے اپنی حاجت بیان فرمائی۔ یہودی نے ایک برقعہ پوش اور خاندانِ سادات کی خاتون سمجھ کر ان کی نہایت تعظیم و تکریم سے ضرورت پوری کر دی۔ رات کو اس مسلمان اور یہودی دونوں نے خواب میں دیکھا کہ حضور سرور دو عالم ﷺ نے اس مسلمان کو جنت میں داخل ہونے سے یہ فرما کر منع فرما دیا کہ جب تمہیں ہماری بیٹی کے سیدہ ہونے پر شک تھا تو ہم تمہارے مسلمان ہونے پر کیسے یقین کر لیں، اور اس یہودی کو عزت سے جنت میں داخل ہونے دیا۔ یہودی نے جب یہ خواب دیکھا تو صبح بیدار ہوتے ہی مسلمان ہو گیا۔

اگر کوئی اپنا نسب تبدیل کرتا ہے تو اس کا ذمہ دار وہ خود ہے۔ نسب بدلنے والوں کے متعلق سرکار دو عالم ﷺ کا فرمان ہے کہ وہ ملعون و مردود ہیں اور ان پر اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے اور تمام لوگ لعنت کرتے ہیں۔ کراچی میں بھی ایسے پیران عظام ہیں جو کہ اپنا نسب بدلتے ہیں اور اپنے آپ کو سید شاہ جی کہلاتے ہیں اور مدرسہ بناتے ہیں اور اسے بھی شاجیہ مدرسہ لکھواتے ہیں وہ خود تو مردود و ملعون ہیں اگر کسی کو ان کے نسب بدلنے کا پتہ ہو اور پھر بھی ان کو سید پکارے تو وہ بھی گناہگار ہیں کیونکہ پنجاب اور سندھ میں لوگ شاہ جی کو سید کہتے ہیں ہمارے صوبہ خیبر پختون خواہ سید کو بادشاہ صاحب اور میاں صاحب پکارتے ہیں اور افغانستان میں آغا صاحب پکارتے ہیں۔

حکم دیا گیا کہ ہر شخص اپنی نسبت اپنے باپ کی طرف کرے، کسی کو بھی اُس کے آباء کے غیر کی طرف منسوب نہ کیا جائے، غیر سیّد اپنے آپ کو سیّد نہ بتائے اور غیر سادات کو سادات نہ کہا جائے، اس ممانعت پر قرآن کریم اور حدیث شریف وارد ہے اور نبی اکرم ﷺ نے اس پر وعید بیان فرمائی ہے۔

قرآن کریم

اسلام سے قبل لے پالک کو اپنی طرف منسوب کرنے اور انہیں اپنی اولاد بتانے کا عام رواج تھا اور لوگ بھی لے پالک کو پالنے والے کا بیٹا کہتے تھے اور وہ بھی اپنے آپ کو پالنے والے کا بیٹا بتاتے تھے اور ابتداء اسلام میں یہ معاملہ اسی طرح رہا۔

چنانچہ علامہ ابوالحسن علی بن حلف بن عبد الملک متوفی ۴۴۹ھ لکھتے ہیں:

ان أهل الجاهلية كانوا لا يستنكرون ذلك أن يتبنّى الرّجل منهم غير ابنه الذى خرج من صلبه فنسب اليه، ولم يزل ذلك أيضاً فى أوّل الاسلام۔

یعنی بے شک اہل جاہلیت اسے معیوب نہ سمجھتے تھے کہ اپنے صُلبی بیٹے کے علاوہ کسی اور کو اپنا متبنیٰ (لے پالک) بنالیں اور اُسے اپنی طرف منسوب کریں اور یہ امر اوّل اسلام میں بھی جاری رہا۔[1]

پھر اس سے منع کر دیا گیا، چنانچہ امام شرف الدین حسین بن محمد طیبی متوفی ۷۴۳ھ اور ملا علی قاری حنفی متوفی ۱۰۱۴ھ لکھتے ہیں:

قد کانوا یفعلونہ فنھی عنہ۔

یعنی لوگ ایسا کرتے تھے پھر اس سے روک دیا گیا۔[2]

اور ممانعت کے لئے قرآن کریم میں جو حکم نازل ہوا، اس کی ابتداء یوں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

وَمَا جَعَلَ أَدْعِيَاءَكُمْ أَبْنَاءَكُمْ (الأحزاب ۴)

ترجمہ: اور نہ تمہارے لے پالکوں کو تمہارا بیٹا بنایا۔ (کنز الایمان)

شانِ نزول

امام ابو عبد اللہ محمد بن احمد قرطبی مالکی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ متوفی ۶۶۸ھ لکھتے ہیں:

قوله تعالیٰ: وَمَا جَعَلَ أَدْعِيَاءَكُمْ أَبْنَاءَكُمْ (الأحزاب ۴) أجمع أهل التفسير على أن هذا نزل في زيد بن حارثة، وروى الأئمة أن ابن عمر قال: ما كنّا ندعوا زيد بن حارثة الا زيد بن محمد حتى نزلت: ادْعُوهُمْ لِآبَائِهِمْ هُوَ أَقْسَطُ عِنْدَ اللَّهِ (الأحزاب ۵)

یعنی اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ: "اور نہ تمہارے لے پالکوں کو تمہارا بیٹا بنایا"۔ اہل تفسیر کا اس پر اجماع ہے کہ یہ آیت حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے حق میں نازل ہوئی، اور ائمہ نے روایت کیا کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا "ہم زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو نہیں پکارتے تھے مگر زید بن محمد" یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی (جس میں حکم ہوا کہ) "انہیں ان کے باپ کا ہی کہہ کر پکارو (جن سے وہ پیدا ہوئے) یہ اللہ کے نزدیک زیادہ ٹھیک ہے۔"[3]

اور اللہ تعالیٰ کے فرمان وَمَا جَعَلَ أَدْعِيَاءَكُمْ أَبْنَاءَكُمْ (الأحزاب ۴) کے بارے میں علماء کرام نے لکھا ہے کہ اس میں دو احتمالات ہیں چنانچہ امام ابو منصور محمد بن محمد بن محمود ماتریدی سمرقندی حنفی رحمہ اللہ متوفی ۳۳۳ھ لکھتے ہیں کہ: اور اللہ تعالیٰ کا

---

[1] (شرح ابن بطال، کتاب الفرائض، باب "من ادّعی الی غیر أبیه وهو یعلم الخ"، ۸:۳۸۳)

[2] (شرح الطیبی، کتاب النکاح، باب اللعان، الفصل الأول، ۶:۳۹۶، مرقات، کتاب النکاح، باب اللعان، برقم: ۳۳۱۵، ۶:۴۳۶)

[3] (تفسیر القرطبی، سورۃ الأحزاب، الآیۃ: ۴، ۱۱۸/۱۴/۷)

فرمان ”اور نہ تمہارے لے پالکوں کو تمہارا بیٹا بنایا“ دو وجوہ کا احتمال رکھتا ہے، اُن میں سے ایک یہ کہ تمہارے لے پالکوں کو آباء کی طرف نسب کے حق میں تمہارا بیٹا نہیں بنایا اور وہ جو کچھ واقعات میں ذکر کیا گیا ہے کہ جب کوئی شخص کسی کو اپنا بیٹا بنالیتا تو وہ اس کی اولاد کے ساتھ اس کا وارث بنتا اور یہی وہ شیٔ ہے جو لوگ زمانہ جاہلیت میں کیا کرتے تھے (تو مطلب ہوگا کہ) جسے تم زمانہ جاہلیت میں مدد و نصرت کے لئے اپنا بیٹا بناتے ہو انہیں اسلام میں تمہارا بیٹا نہیں بنایا۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ تمہارے لے پالکوں کو نسبیت کے حق میں تمہارا بیٹا نہیں بنایا جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے کہ لوگ حضرت زید بن حارثہ کو زید بن محمد کہتے تھے۔[1]

اور لے پالکوں کو اپنا بیٹا کہنا، یہ لوگوں کی اپنائی ہوئی بات تھی جس کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہ تھا کہ کسی کو اپنا بیٹا بنانے سے وہ بیٹا بن جاتا، کسی کا نسب بدل دینے یا بدل لینے سے اس کا نسب نہیں بدل جاتا، چنانچہ ارشاد فرمایا:

ذٰلِكُمْ قَوْلُكُم بِأَفْوَاهِكُمْ (الأحزاب، ۴:۳۳)

ترجمہ: یہ تمہارے منہ کا کہنا ہے۔(کنز الایمان)

اس آیتِ مبارکہ کے تحت امام ابو عبد اللہ محمد بن احمد مالکی قرطبی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ متوفی ۶۶۸ھ لکھتے ہیں:

قوله تعالیٰ: ذَٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِأَفْوَاهِكُمْ (الأحزاب ۴) {بِأَفْوَاهِكُمْ} تأكيد ببطلان القول، أى أنه قول لا حقيقة له فی الوجود، انما هو قول لسانیٌ فقط۔

یعنی اللہ تعالیٰ کا فرمان ”یہ تمہارے منہ کا کہنا ہے“ میں ”بِأَفْوَاهِكُمْ“ (تمہارے منہ) لوگوں کے قول کے بُطلان کی تاکید ہے (کہ تمہارا کسی اور کے بیٹے کو بیٹا بنانا باطل ہے) یعنی یہ ایسا قول ہے کہ جس کے وجود کی کوئی حقیقت نہیں ہے وہ فقط زبانی قول ہے۔[2]

اور حقیقت وہی ہے جو اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے چنانچہ ارشاد ہوا:

وَاللّٰهُ يَقُولُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِى السَّبِيلَ (الاحزاب ۴)

ترجمہ: اور اللہ تعالیٰ حق فرماتا ہے اور وہی راہ دکھاتا ہے۔(کنز الایمان)

پھر صریح حکم ہوا کہ اب تم انہیں ان کے نسبی باپوں کی طرف منسوب کر دو۔

چنانچہ امام قرطبی مزید لکھتے ہیں کہ:

فأمر تعالیٰ بدعاء الأدعياء الى آبائهم للصّلب۔

---

[1] (تأويلات أهل السنة، سورة الأحزاب، الآية: ۴، ۴/۱۰۰)

[2] (تفسير القرطبی، سورة الأحزاب، الآية: ۵، ۷/۱۴/۱۲۱-۰)

یعنی پس اللہ تعالیٰ نے لے پالکوں کو ان کے صُلبی باپوں کی طرف منسوب کر کے پکارنے کا حکم فرمایا۔[1]

چنانچہ قرآن کریم میں ہے:

ادْعُوهُمْ لِآبَائِهِمْ هُوَ أَقْسَطُ عِندَ اللَّهِ (الأحزاب ۵)

ترجمہ: انہیں ان کے باپ کا ہی کہہ کر پکارو۔

اس آیہ کریمہ میں "اَقْسَطُ" کا معنی "اَعْدَلُ" ہے یعنی زیادہ عدل اور انصاف والی بات، تو مطلب یہ ہوگا کہ کسی آدمی کا اپنے آپ کو اپنے نسبی باپ کی طرف منسوب کرنا، باپ کے غیر کی طرف منسوب کرنے سے زیادہ عدل و انصاف والی بات ہے، اگر اس پر کوئی اعتراض کرے کہ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ خود کو غیر باپ کی طرف منسوب کرنا بھی انصاف والی بات ہے اور زیادہ انصاف کی بات یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو نسبی باپ کی طرف منسوب کرے حالانکہ اپنے آپ کو باپ کے غیر کی طرف منسوب کرنا انصاف کی بات نہیں ہے بلکہ یہ ظلم ہے، گناہ ہے، تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ اس آیہ کریمہ میں اسم تفصیل "اقسط" مجازاً صفت مشبّہ کے معنی میں ہے اور یہاں زیادتی مراد نہ ہوگی بلکہ مراد صرف عادلانہ فیصلہ اور انصاف کی بات ہے۔

اس آیت میں اپنے نسب کی حفاظت کا حکم دیا گیا اور اس بات پر سختی فرمائی گئی کہ کوئی شخص دانستہ اپنے کو کسی غیر کا بیٹا نہ کہے اور نہ اپنا نسب کسی غیر کے ساتھ جوڑے۔

ناسخ و منسوخ

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ اسلام سے قبل لے پالک کو اپنی طرف منسوب کرنے اور انہیں اپنی جائیداد میں وارث قرار دینے کا عام رواج تھا اور ابتداء اسلام میں بھی عمل اسی پر جاری تھا کہ جب تک اسلام میں اس سے کوئی ممانعت وارد نہ ہوئی اس پر عمل کی اجازت تھی پھر قرآن کریم میں اس کی اباحت کو منسوخ کر دیا گیا چنانچہ امام قرطبی لکھتے ہیں:

دليل على أن التبنّي كان معمولاً به في الجاهليّة والاسلام، يتوارث به ويتناصر، الى أن نسخ الله ذلك بقوله: ادْعُوهُمْ لِآبَائِهِمْ هُوَ أَقْسَطُ عِندَ اللَّهِ (الأحزاب ۵) أي أعدل، فرفع الله حكم التبنّي، ومنع من اطلاق لفظه، وأرشد بقوله الى أن الأولىٰ والأعدل أن ينسب الرّجل الى أبيه نسباً۔

یعنی، اس پر دلیل کہ متبنّٰی (یعنی لے پالک بنانے) کا جاہلیت اور اسلام میں معمول تھا اور اُس کو وارث قرار دیا جاتا اور ان سے مدد حاصل کی جاتی یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اسے اپنے اس فرمان سے منسوخ فرما دیا کہ "انہیں ان کے باپ کا ہی کہہ کر پکارو یہ اللہ کے نزدیک زیادہ ٹھیک ہے (تو یہ نسخ اس پر دلیل ہے کہ زمانۂ جاہلیت اور ابتداء اسلام میں اس کا معمول تھا اور

[1] (تفسیر القرطبی، سورۃ الأحزاب، الآیۃ: ۵، ۷/۱۴/۱۲۱)

"اَقْسَطُ"، بمعنی "اَعْدَلُ" کے ہے پس اللہ تعالیٰ نے تبنّی کا حکم اُٹھالیا اور اُسکے لفظ کے اطلاق سے منع فرمادیا اور اپنے فرمان سے ہمیں راہ یہ دکھائی کہ اَولیٰ اور اَعدل یہ ہے کہ مرد کو اس کے نسبی باپ کی طرف منسوب کیا جائے۔[1]

اور اگر غلطی سے بلا ارادہ کہہ دیا جائے تو اس پر پکڑ نہیں ہے، چنانچہ قرآن کریم میں ہے:

وَ لَیسَ عَلَیکُمۡ جُنَاحٌ فِیمَآ اَخۡطَاتُم بِهٖ (الاحزاب: ۵/۳۳)

ترجمہ: اور تم پر اس میں کچھ گناہ نہیں جو تم سے نادانستہ صادر ہو جائے۔(کنز الایمان)

جیسے کوئی کسی بزرگ یا استاد یا اپنے مرشد کو تعظیم کے طور پر باپ کہہ دے اور اس سے اس کی مراد یہ نہ ہو کہ وہ اس کے نسب سے ہے اسی طرح کوئی بڑا کسی بچے کو ازراہِ شفقت بیٹا کہے یا کوئی استاد اپنے شاگرد کو، شیخ اپنے مرید کو شفقت کے طور پر بیٹا کہے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے، کیونکہ ان کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ وہ اسے اپنا صلبی بیٹا کہہ رہے ہیں۔

گناہ تو اس صورت میں ہے جب کسی کو جانتے ہوئے اپنا نسبی باپ سمجھ کر باپ بتائے جیسے لوگ اپنا نسب بدل لیتے ہیں۔ غیر سادات، سادات کہلواتے ہیں حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ وہ سادات سے نہیں ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ نسب بدلنا حرام ہے، اور اسی طرح کوئی شخص یہ جانتے ہوئے کہ یہ اُس کا بیٹا نہیں ہے اُسے اپنا صُلبی بیٹا کہے یا بتائے، چنانچہ قرآن کریم میں ہے:

وَ لٰکِن مَّا تَعَمَّدَتۡ قُلُوبُکُمۡ (الأحزاب: ۵/۳۳)

ترجمہ: ہاں وہ گناہ ہے جو (ممانعت کے بعد) دل کے قصد سے کرو۔(کنز الایمان)

پھر اہل بیت کی طرف نسبت کا جرم غیر اہلبیت کی طرف نسبت کے جرم سے بڑا ہے چنانچہ امام قرطبی نے لکھا کہ حضرت مقداد بن اسود جو عمرو کے بیٹے تھے، اسود نے انہیں اپنا متبنّٰی (یعنی لے پالک) بنایا تھا اور وہ ان ہی کے نام سے معروف تھے، جب یہ حکم نازل ہوا تو آپ نے فرمایا کہ میں ابن عمرو ہوں لیکن لوگوں میں ابن اسود کے نام سے ہی معروف رہے اور کسی نے بھی انہیں مقداد بن اسود کہنے والے کو گناہ گار قرار نہیں دیا، اسی طرح حضرت سالم مولیٰ ابی حذیفہ رضی اللہ عنہ تھے جو اپنے باپ کے غیر کی طرف منسوب تھے اور اسی کے ساتھ مشہور تھے اور یہ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے حال کے برخلاف ہے کیونکہ ان کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ انہیں زید بن محمد کہا جائے، اگر کسی نے قصداً اس طرح کیا تو اللہ تعالیٰ کے فرمان: **وَلٰکِنۡ مَّا تَعَمَّدَتۡ قُلُوبُکُمۡ** کی وجہ سے گنہگار ہوگا۔[2]

---

[1] (تفسیر القرطبی، سورۃ الأحزاب، الآیۃ: ۵، ۱۱۹/۱۴/۷)

[2] (تفسیر القرطبی، سورۃ الأحزاب، الآیۃ: ۴، ۱۲۰/۱۴/۷)

تو معلوم ہوا کہ غیر سادات اقوام میں سے کوئی شخص کسی دوسری قوم کے ساتھ اپنا نسب جوڑے حالانکہ وہ ان میں سے نہ ہو تو وہ ضرور مجرم ہے لیکن اس سے بڑا مجرم وہ ہے جو غیر سیّد ہو کر سادات کرام کے ساتھ اپنا نسب جوڑتا ہے۔

حدیث شریف

نسب بدلنے یعنی اپنے آباء کے غیر کی طرف اپنے آپ کو منسوب کرنے کی ممانعت میں احادیث مبارکہ میں شدید وعید آئی ہے۔ اور ان احادیث کو امام بخاری، مسلم، ابو داؤد، ترمذی، ابن ماجہ، احمد، دارمی، ابن ابی شیبہ، طبرانی، ابن الجعد اور نور الدین ہیثمی رحمہم اللہ اجمعین وغیرہم نے حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت ابو بکرہ، حضرت ابو بکر الصدیق، حضرت علی المرتضیٰ، حضرت ابن عمر، حضرت ابن عمرو، حضرت ابن عباس، حضرت ابو ہریرہ، حضرت انس بن مالک، حضرت ابو ذر غفاری، حضرت عمرو بن خارجہ، حضرت ابو امامہ باہلی، حضرت معاذ بن انس اور حضرت واثلہ بن اسقع رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین سے روایت کیا ہے۔ اب ان احادیث مبارکہ کو بالترتیب ذکر کیا جاتا ہے اور اُن احادیث پر شارحین حدیث کا کلام، کلماتِ حدیث کی تشریح، قابل تاویل کلمات کی نشاندہی، ان میں تاویلات و احتمالات اور ان سے مستفاد احکام، مستند و معتمد ائمہ و علماء کے حوالے سے بیان کئے جائیں گے۔

نسب بدلنے والے پر جنت حرام ہے

امام محمد بن اسمٰعیل بخاری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ متوفی ۲۵۶ھ نے روایت کیا کہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

من ادّعی الیٰ غیر أبیه وهو یعلم انه غیر أبیه فالجنّة علیه حرامٌ۔

یعنی جس نے اپنا باپ کسی اور کو بنایا اور وہ جانتا ہے کہ یہ اس کا باپ نہیں تو جنت اس پر حرام ہے۔ [1]

امام ابو داؤد سلمان بن اشعث سجستانی متوفی ۲۷۵ھ روایت کرتے ہیں کہ ابو عثمان کہتے ہیں:

حدّثنی سعد بن مالکٍ قال سمعته أذنای و وعاه قلبی من محمّد علیه الصلاة و السلام انه قال: من ادّعی الیٰ غیر أبیه وهو یعلم أنّه غیر أبیه فالجنّة علیه حرامٌ۔ قال: فلقیت أبا بکرة فذکرت له، فقال: سمعته أذنای و وعاه قلبی من محمّد ﷺ۔

یعنی حدیث بیان کی مجھے حضرت سعد بن مالک رضی اللہ عنہ نے انہوں نے فرمایا کہ اسے حضرت محمد مصطفی ﷺ سے میرے دونوں کانوں نے سنا اور دل نے یاد رکھا کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس نے اپنا باپ کسی اور کو بنایا اور وہ جانتا ہے کہ

[1] (صحیح بخاری، کتاب الفرائض، باب: من ادعی الی غیر ابیہ، برقم ۶۷۶۶)

یہ اس کا باپ نہیں تو جنت اس پر حرام ہے۔ فرمایا پھر میں حضرت ابو بکرہ رضی اللہ عنہ سے ملا اور میں نے ان سے اس کا ذکر کیا تو انہوں نے فرمایا حضرت محمد مصطفی ﷺ سے اسے میرے دونوں کانوں نے سنا اور دل نے یاد رکھا۔[1]

امام محمد بن اسماعیل بخاری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے روایت کیا کہ ابو عثمان راوی کہتے ہیں کہ:

فَذَكَرْتُهُ لِأَبِي بَكْرَةَ، فَقَالَ: وَأَنَا سَمِعَتْهُ أُذُنَايَ وَوَعَاهُ قَلْبِي مِنْ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔

یعنی پس میں نے اس کا حضرت ابو بکرہ رضی اللہ عنہ سے ذکر کیا تو انہوں نے کہا: اسے رسول اللہ ﷺ سے میرے کانوں نے سنا اور دل نے یاد رکھا۔[2]

"وھو یعلم" "اور وہ اسے جانتا ہے" کا معنیٰ

حضور ﷺ کے ارشاد مبارک میں "وھو یعلم" کی قید مذکور ہے۔ علماء کرام نے لکھا ہے کہ اس قید کا یہ فائدہ ہے کہ وہ شخص گناہگار تب قرار پائے گا جب اُسے علم ہو کہ جس کی طرف وہ اپنی نسبت کر رہا ہے وہ اس کا حقیقی باپ نہیں ہے یا جس قوم کی طرف اپنے آپ کو منسوب کرتا ہے یا منسوب کیا جاتا ہے وہ اس قوم سے نہیں ہے جیسا کہ علامہ ابو العباس قرطبی رحمہ اللہ کے حوالے سے پہلے گزرا اور اس کے بارے میں علامہ محمد امین ہرری نے لکھا کہ:

"وھو" أی والحال أن ذلک الرّجل المنتسب لغیر أبیه "یعلمه" أی یعلم أن ذلک الغیر لیس أباه ووالده۔

یعنی اور وہ اسے جانتا ہے یعنی حال یہ ہے کہ بے شک وہ شخص جو اپنے باپ کے غیر کی طرف منسوب کیا گیا، اسے جانتا ہے کہ وہ غیر اس کا باپ نہیں ہے۔[3]

اور دوسری جگہ لکھا کہ:

قوله ﷺ: "وھو یعلم" تقیید لا بدّ منه، فان الاثم انما یکون فی حق العلام بالشیء۔

یعنی حضور نبی کریم ﷺ کا فرمان "حالانکہ وہ جانتا ہے" یہ ایک ضروری قید ہے بے شک گناہ تو صرف عالم بالشی کے حق میں ہے۔[4]

اس لئے علماء کرام نے لکھا کہ علم ہوتے ہوئے غیر باپ کی طرف نسبت حرام ہے چنانچہ علامہ شرف الدین طیبی اور ملا علی قاری لکھتے ہیں:

والادعاء الی غیر الأب مع العلم به حرام۔

---

[1] (سنن ابی داؤد، کتاب الأدب، باب فی الرجل ینتمی الی غیر موالیه، برقم ۵۱۱۳، ۵/۲۱۲)

[2] (صحیح بخاری، کتاب الفرائض، باب: من ادعی الی غیر ابیه، برقم ۶۷۶۷)

[3] (شرح صحیح مسلم للهرری، کتاب الایمان، باب حکم ایمان من انتسب لغیر أبیه الخ، ۱۲۴ (۶۰) ۲/۵۰۶)

[4] (شرح صحیح مسلم للهرری ۲/۲۰۷)

یعنی غیر باپ کی طرف اس پر علم کے باوجود (کہ یہ میرا باپ نہیں ہے) نسبت کرنا حرام ہے۔[1]

”جس نے خود کو غیر باپ کی طرف منسوب کیا“ کا مطلب

یعنی جو اپنے باپ کے سوا دوسرے کی طرف اپنی نسبت کرے یا جس نے خود کو غیر باپ کی طرف منسوب کیا۔ یہ کلمات حضرت سعد بن اَبی وقاص، حضرت ابو بکرہ، حضرت ابو ہریرہ، حضرت علی المرتضیٰ، حضرت ابن عمر، حضرت انس بن مالک، حضرت عمرو بن خارجہ اور حضرت ابو امامہ باہلی رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے مروی احادیث میں ہیں، جبکہ حدیث اَبی ذرّ رضی اللہ عنہ میں ”لیس من رجل ادعی لغیر أبیہ“ ہے۔ عربی زبان میں وہ لڑکا جسے اپنے حقیقی باپ کے علاوہ کسی اور کی طرف منسوب کیا جائے، اسے ”الدّعی“ کہتے ہیں، اس کی جمع ”الأدعیا“ ہے جو سورۃ (۳۳) الاحزاب کی آیت ۴ میں مذکور ہے اور اس کا مصدر ”الدّعوۃ“ ہے۔

اور ان کلمات کا مطلب حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہما سے واضح ہو جاتا ہے چنانچہ اس میں ہے: ”من انتسب الی غیر أبیہ“۔ یعنی جو اپنے آپ کو اپنے باپ کے علاوہ کسی کی طرف منسوب کرے۔[2]

تو اس کا معنی ہے کہ اپنے آپ کو غیر باپ کی طرف منسوب کرنا جیسا کہ امام محمد بن خلیفہ وشتانی اَبی مالکی متوفی ۸۲۸ھ، اور علامہ محمد بن محمد بن یوسف سنوی مالکی متوفی ۸۹۵ھ لکھتے ہیں:

أیما رجل ادّعیٰ لغیر أبیہ، أی أنتسب۔

یعنی جو آدمی اپنے آپ کو اپنے باپ کے غیر کی طرف منسوب کرے۔[3]

اور غیر کو اپنا باپ بنالینا جیسا کہ علامہ محمد امین ہروی شافعی نے لکھا ہے:

ادّعی انتسب لغیر أبیہ و الدہ أی انتسب الیہ و اتخذہ أباً۔

یعنی ”ادّعی“ کا معنی ہے انتساب کیا، اس نے اپنے باپ اور والد کے غیر کی طرف یعنی اس کی طرف اپنے آپ کو منسوب کیا اور اسے اپنا باپ بنالیا۔[4]

اور امام نووی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے نقل کرتے ہوئے لکھا کہ:

أی انتسب الیہ و اتخذہ أباً۔

---

[1] (شرح الطّیبی، کتاب النکاح، باب اللعان، الفصل الأول، ۶/۴۳۶)

[2] (سنن ابن ماجۃ برقم ۲۶۰۹، ۳/۲۶۳)

[3] (اکمال اکمال المعلم: کتاب الایمان، باب بیان حال من رغب عن أبیہ الخ برقم: ۱۱۲، (۶۱) ۱/۲۸۰)، (مکمل اکمال اکمال، کتاب الایمان، باب بیان حال من رغب عن أبیہ الخ برقم: ۱۱۲، (۶۱) ۱/۲۸۰)

[4] (شرح صحیح مسلم للهرری، کتاب الایمان، باب حکم ایمان من انتسب لغیر أبیہ الخ برقم: ۱۲۴ (۶۰)، ۲/۵۰۶)

یعنی اس کی طرف منسوب اور اسے اپنا باپ بنالیا۔[1]

اور اس میں علم ہونا شرط ہے جیسا کہ حضور نبی کریم ﷺ کے فرمان "**وهو يعلم**" اور "**وهو يعلمه**" سے ظاہر ہے اور حافظ ابو العباس احمد بن عمر قرطبی متوفی ۶۵۶ھ اور علامہ محمد امین ہرری لکھتے ہیں:

أی انتسب لغير أبيه رغبةً عنه مع علمه به۔

یعنی اپنے باپ سے اعراض کرتے ہوئے اس کے غیر کی طرف اپنی نسبت کی اس علم کے باوجود کہ یہ اس کا باپ نہیں ہے۔[2]

صرف غیر باپ کی طرف نسبت کرنا ہی نہیں بلکہ اس میں اپنے خاندان و قوم کے سوا دوسری قوم کی طرف اپنی نسبت کرنا بھی شامل ہے، چنانچہ علامہ شرف الدین حسین بن محمد بن عبد اللہ طیبی متوفی ۷۴۳ھ اور ان سے ملا علی قاری حنفی متوفی ۱۰۱۴ھ لکھتے ہیں:

قوله: "من ادّعی" الدّعوة بالكسر فی النّسب، وهو أن ينتسب الانسان الی غير أبيه وعشيرته۔

یعنی، حضور نبی کریم ﷺ کا فرمان "**من ادّعی**" **الدّعوة فی النسب** یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو اپنے باپ اور کنبے کے غیر کی طرف منسوب کرے۔[3]

اور اس میں دو باتیں پائی جائیں گی کہ وہ اپنے آباء کی طرف اپنی نسبت کو چھوڑے اور اُس نسبت کا انکار کر دے اور ان کے غیر کی طرف اپنے آپ کو منسوب کرے جیسا کہ قاضی عیاض بن موسیٰ مالکی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ متوفی ۵۴۴ھ اور امام ابو زکریا یحییٰ بن شرف نووی شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ متوفی ۶۷۶ھ "صحیح مسلم" کے ایک باب کے عنوان "**من رغب عن أبيه**" (جو اپنے باپ سے اعراض کرے) کے تحت لکھتے ہیں: **يريد ترك الانتساب اليه وجحده وانتسب سواه يقال: رغبت عن الشیء تركته وكرهته، ورغبت فيه أحببته وطلبته۔** یعنی وہ اس کی طرف (یعنی اپنے حقیقی باپ کی طرف) انتساب کے ترک اور اس کے انکار کا ارادہ کرتا ہے اور اس کے سوا کی طرف منسوب ہوتا ہے عربی زبان میں کہا جاتا ہے "**رغبت عن الشیء**" یعنی میں نے اسے چھوڑ دیا اور اسے مکروہ جانا اور کہا جاتا ہے **رغبت فيه** یعنی، میں نے اسے محبوب رکھا اور اسے طلب کیا۔[4]

---

[1] (شرح صحیح مسلم للهرری، ۲/۲۰۷)

[2] (المفهم، کتاب الایمان باب اثم من کفر مسلماً، برقم ۵۱، ۱/۲۵۴)(شرح صحیح مسلم للهرری، کتاب الایمان، باب حکم ایمان من انتسب لغیر أبیه الخ برقم: ۱۲۴ (۶۰)، ۲/۵۰۶)

[3] (شرح الطیبی، کتاب النکاح، باب اللعان، الفصل الأول، ۶/۳۹۶)(مرقات، کتاب النکاح، باب اللعان، الفصل الأول، برقم: ۳۳۱۵، ۶/۴۳۶)

[4] (شرح صحیح مسلم للنّووی، کتاب الایمان، باب بیان حال ایمان من رغب عن أبیه الخ، ۲-۱/۴۵)

اور علماء کرام نے یہ بھی لکھا ہے کہ جو نہ اپنے آباء کی طرف اپنی نسبت کا انکار کرے اور نہ غیر کی طرف اپنے آپ کو منسوب کرے بلکہ دوسرے لوگ اسے اس کے آباء کے غیر کی طرف منسوب کرتے ہوں اور وہ اس پر راضی ہو تو وہ شخص بھی اس حکم میں داخل ہو گا۔

جیسا کہ محشی صحاح ستہ علامہ نور الدین ابو الحسن محمد بن عبد الہادی سندھی حنفی متوفی ۱۱۳۸ھ لکھتے ہیں:

من ادّعی الی غیر أبیه أی رضی بأنه ینسبه النّاس الی غیر أبیه۔

یعنی حضور نبی کریم ﷺ کے فرمان ”جو شخص خود کو غیر باپ کی طرف منسوب کرے یعنی وہ اس بات پر راضی ہو کہ لوگ اسے اس کے باپ کے غیر کی طرف منسوب کریں۔[1]

امام محمد بن اسماعیل بخاری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ، امام عبد اللہ بن عبد الرحمن دارمی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ متوفی ۲۵۵ھ، اور امام احمد بن حنبل متوفی ۲۴۱ھ روایت کرتے ہیں:

عن عاصم قال سمعت أبا عثمان قال: سمعت سعداً و أبا بکرة، فقالا: سمعنا النبیّ ﷺ یقول: من ادّعی الی غیر أبیه، و هو یعلم، فالجنّة علیه حرامٌ۔

یعنی عاصم سے روایت ہے انہوں نے کہا میں نے ابو عثمان رضی اللہ عنہ سے سنا انہوں نے فرمایا کہ میں نے حضرت سعد اور حضرت ابو بکرہ رضی اللہ عنہما سے سنا، دونوں نے فرمایا: ”ہم نے نبی کریم ﷺ سے سنا، آپ ﷺ نے فرمایا: جس نے اپنا باپ کسی اور کو بنایا حالانکہ وہ جانتا ہے کہ اس کا یہ باپ نہیں تو اس پر جنت حرام ہے“۔[2]

اور امام مسلم بن حجاج قشیری متوفی ۲۶۱ھ، امام ابو عبد اللہ محمد بن یزید ابن ماجہ متوفی ۲۷۳ھ اور امام احمد بن حنبل متوفی ۲۴۱ھ روایت کرتے ہیں:

عن عثمان عن سعدٍ و أبی بکرة، کلاهما یقول: سمعته أذنای و وعاه قلبی محمداً ﷺ یقول: من ادعی الی غیر أبیه و هو یعلم أنّه غیر أبیه، فالجنّة علیه حرامٌ۔ و اللفظ لمسلم۔

---

[1] (فتح الودود فی شرح سنن أبی داؤد، کتاب الأدب، باب الرجل ینتمی الی غیر أبیه، برقم: ۵۱۱۳، ۴/۶۸۱)

[2] (صحیح البخاری، کتاب المغازی، باب غزوة الطائف، برقم: ۴۳۲۶، ۴۳۲۷، ۳/۱۰۰) (سنن الدارمی، کتاب السیر، باب فی الذی ینتمی الی غیره موالیه، برقم: ۲۵۳۰، ۲/۱۹۶) (المسند: ۵/۴۶) (و نقله التبریزی فی مشکاته، کتاب النکاح، باب العان، الفصل الاول، برقم: ۳۳۱۴، ۲-۱/۲۰۸)

یعنی عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت سعد (بن ابی وقاص) اور ابو بکرہ رضی اللہ عنہما سے بیان کیا دونوں نے فرمایا کہ اسے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ سے ہمارے کانوں نے سنا اور دل نے یاد رکھا کہ آپ ﷺ نے فرمایا: جس نے اپنا باپ کسی اور کو بنایا حالانکہ وہ جانتا ہے کہ اس کا یہ باپ نہیں تو اس پر جنت حرام ہے"۔[1]

امام مسلم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی دوسری روایت میں ہے:

عن أبی عثمان، قال: لمّا ادّعی زیاد لقیت أبا بکرة فقلت له: ما هٰذا الذی صنعتم؟ انّی سمعت سعد بن ابی وقاص یقول: سمع أذنای من رسول الله ﷺ وهو یقول: من ادّعی أبا فی الاسلام غیر أبیه یعلم أنّه غیر أبیه، فالجنّة علیه حرامٌ، فقال أبو بکرة: و أنا سمعته من رسول الله ﷺ۔

یعنی ابو عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب زیاد کے بھائی ہونے کا دعویٰ کیا گیا تو میں نے حضرت ابو بکرہ رضی اللہ عنہ سے ملاقات کی اور ان سے کہا یہ تم نے کیا کیا؟ میں نے تو حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے سنا انہوں نے فرمایا کہ میں نے خود رسول اللہ ﷺ کو اپنے کانوں سے سنا کہ آپ ﷺ نے فرمایا: جس نے اپنا نسب اپنے باپ کے سوا کسی اور شخص سے بیان کیا اس پر جنت حرام ہے، تو حضرت ابو بکرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے بھی رسول اللہ ﷺ سے یہی سنا تھا۔[2]

جنت میں داخل نہ ہونے کا مطلب

نسب بدلنے والے، غیر باپ کی طرف اپنی نسبت کرنے والے کے لئے فرمایا گیا کہ اس پر جنت حرام ہے وہ جنت میں داخل نہ ہو گا، اب دیکھنا یہ ہے کہ جنت میں داخل نہ ہونے کا مطلب کیا ہے؟

علماء کرام نے اس کے دو مطلب بیان کئے ہیں کہ اگر وہ نسب بدلنے کو حلال جان کر اس کا ارتکاب کرے گا تو جنت اُس پر حرام ہے اور یہ بھی بیان کیا کہ جب کامیاب لوگ جنت میں جائیں گے اس وقت یہ لوگ جنہوں نے اپنے نسب بدلے تھے جنت میں نہیں جائیں گے۔

اور امام ابو زکریا یحییٰ بن شرف نووی شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ لکھتے ہیں:

فیه تأویلان، أحدهما: أنه محمول علی من فعله مستحلاً له، و الثّانی: أن جزاء ہ أنها محرّمة أوّلاً عند دخول الفائزین و أهل السّلامة۔

---

[1] (صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان حال ایمان من رغب عن أبیه و هو یعلم، برقم: ۱۳۲/۱۱۵-(۶۳) ص ۵۹) (سنن ابن ماجه، کتاب الحدود، باب من ادّعی الی غیر أبیه الخ" برقم: ۲۶۱۰، ۳/۲۶۳، ۲۶۴) (المسند امام احمد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ، ۱/۱۷۴)

[2] (صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان حال ایمان من رغب عن أبیه و هو یعلم، برقم: ۱۳۱/۱۱۴-(۶۳)، ص ۵۸)

یعنی پس اس میں دو تاویلیں ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ یہ اس پر محمول ہے جو حلال جانتے ہوئے اس کا ارتکاب کرے، اور دوسری یہ کہ اس کی سزا یہ ہے کہ اولاً کامیاب اور اہل سلامۃ کے جنت میں دخول کے وقت اس کا ارتکاب مرتکب کو دخول جنت سے محروم کرنے والا ہے۔[1]

امام شرف الدین حسین بن محمد طیبی شافعی متوفی ۷۴۳ھ اور ملا علی قاری حنفی متوفی ۱۰۱۴ھ لکھتے ہیں:

أقول: معنی قوله: فالجنّة علیه حرام علی الأوّل ظاهر، وعلی الثّانی تغلیظ۔

یعنی میں کہتا ہوں کہ حضور ﷺ کے فرمان کہ اس پر جنت حرام ہے کا معنی پہلی وجہ پر تو ظاہر ہے اور سدوسری وجہ تغلیظ (یعنی تشدید) ہے۔[2]

اور شیخ محقق عبد الحق محدّث دہلوی حنفی متوفی ۱۰۵۲ھ لکھتے ہیں:

ابن زجر وتشدید ست یا محمول بر استحلال ست یا مراد عدم دخول جنت ست با مقربان وسابقان۔

یعنی یہ زجر اور تشدید ہے، یا اُس شخص کے بارے میں جو اسے حلال جانے، یا مطلب یہ ہے کہ وہ مقربین وسابقین کے ساتھ جنت میں داخل نہ ہو گا۔[3]

اور علامہ ابو الحسن سندھی حنفی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

قوله: فالجنّة علیه حرامٌ أی ان استحلّ ذلک، أو محمول علی الزّجر والتّغلیظ للتنفیر عنه۔

یعنی حضور نبی کریم ﷺ کا فرمان ''اس پر جنت حرام ہے'' یعنی اگر اسے حلال جانتا ہے تو اس پر جنت حرام ہے، یا یہ باپ سے نفرت کی وجہ سے زجر اور تغلیظ پر محمول ہے۔[4]

اور ایک مسلمان جب اس قبیح فعل کا ارتکاب کرتا ہے تو اس سے یہی توقع کی جاتی ہے کہ وہ اسے حلال نہیں جانتا اس لئے کچھ علماء کرام نے اس حدیث شریف کا دوسرا مطلب ہی بیان کیا۔

جیسا کہ محشی صحاح ستّہ علامہ نور الدین محمد بن عبد الہادی سندھی حنفی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ متوفی ۱۱۳۸ھ لکھتے ہیں:

وفیه ''من ادّعی الی غیر أبیه فالجنة علیه حرامٌ'' أی دخوله ابتدائً حرام أن جزاء عمله أن لا یدخل ابتداء۔

---

[1](شرح صحیح مسلم للنّووی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ، کتاب الایمان، باب حال ایمان من رغب عن أبیه الخ، برقم: ۱۱۲-(۶۱)، ۱/۲/۴۵)

[2](شرح الطیب، کتاب النکاح، باب اللعان، الفصل أول، ۶/۳۹۶)(مرقاۃ، کتاب النکاح، باب اللعان، الفصل الاول، برقم ۳۳۱۵، ۶/۴۳۶)

[3](أشعۃ اللمعاۃ، کتاب النکاح، باب اللعان، الفصل الاول، ۳/۱۷۷، ۱۷۸)

[4](حاشیۃ السندی علی الصحیح للبخاری، کتاب الفرائض، باب من ادّعی الی غیر أبیه، ۴/۲۲۶)

یعنی اور اس حدیث میں ہے ”جس نے اپنا باپ کسی اور کو بنایا اس پر جنت حرام ہے“ یعنی اس کا ابتداء دخول حرام ہے، بے شک اس کے عمل کی جزا یہ ہے کہ وہ ابتداء داخل نہ ہو۔[1]

اور لکھتے ہیں کہ:

أی لا یستحق أن یدخل فیہا ابتداء۔

یعنی وہ اس کا مستحق نہیں کہ جنت میں ابتداء داخل ہو۔[2]

اور لکھتے ہیں:

أی لا یستحقہ دخولہا أوّلا۔

یعنی وہ اولاً جنت میں دخول کا مستحق نہیں ہے۔[3]

اور دوسری تاویل کے مطابق جب اوّلا نسب بدلنے والوں کو سزا کے طور پر دخولِ جنت سے روک دیا جائے گا پھر بعد میں انہیں جنت میں داخلہ کی اجازت دی جائے گی۔

چنانچہ امام ابو زکریا یحییٰ بن شرف نووی شافعی متوفی ٦٧٦ھ لکھتے ہیں:

ثم ان قد یجازی فیمنعہا عند دخولہم ثم یدخلہا بعد ذلک۔

یعنی پھر یہ سزا دی جائے کہ کامیاب لوگوں کے جنت میں داخلے کے وقت انہیں روک دیا جائے پھر بعد میں جنت میں داخل کیا جائے۔[4]

اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں معاف فرما دے، ان سے مؤاخذہ ہی نہ فرمائے۔

چنانچہ امام نووی شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ لکھتے ہیں:

و قد لا یجازی یعفو اللہ سبحانہ و تعالیٰ عنہ و معنی حرام ممنوعۃ۔

یعنی اور یہ بھی ہو کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ اسے سزا نہ دے بلکہ اسے معاف فرما دے اور حدیث شریف میں مذکور لفظ ”حرام“ کا مطلب روکنا ہو گا۔[5]

---

[1] (حاشیۃ السندی علی الصحیح للبخاری، کتاب المغازی، باب غزوۃ الطائف برقم: ٤٣٢٦، ٤٣٢٧، ٣/١١٤)

[2] (حاشیۃ السندی علی السنن لابن ماجۃ، برقم: ٢٦١٠، ٣/٢٦٣)

[3] (فتح الودود شرح سنن أبی داؤد، کتاب الأدب، باب فی الرجل ینتمی الی غیر موالیہ، برقم: ٥١١٣، ٤/٦٨١، ٦٨٢)

[4] (شرح صحیح مسلم للنّووی، کتاب الایمان، باب حال ایمان، من رغب عن أبیہ الخ، برقم: ١١٢-(٦١)، ١/٢/٤٥)

[5] (شرح صحیح مسلم للنووی، کتاب الایمان، باب حال ایمان، من رغب عن أبیہ الخ، برقم: ١١٢-(٦١)، ١/٢/٤٥)

اور علامہ ابو الحسن سندھی حنفی لکھتے ہیں:

وأما فضل اللہ واسع، فیمکن أنه تعالیٰ بفضله یدخله ابتداءً لقوله تعالیٰ {اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِهٖ} الآیة۔

یعنی مگر اللہ تعالیٰ کا فضل واسع ہے تو ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے اپنے فضل سے ابتداءً جنت میں داخل فرمادے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: **اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِهٖ (النساء ۴۸)**۔[1]

اور اس تاویل کے راجح ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اہلسنت کا مذہب یہ ہے کہ گناہوں کی وجہ سے کوئی شخص جنت سے محروم نہیں ہوتا چنانچہ قاضی عیاض بن موسیٰ مالکی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ لکھتے ہیں:

تأویله علی ما تقدم من أهل السنة من أن الذنوب لا تحرّم علی أحد الجنة البتة، بل ان شاء اللہ تعالیٰ أخذ وعاقب وحرّمها للمذنب مدّة ثم یدخلها وان شاء عفی، أو یکون تأویل الحدیث لفاعله مستحلاً۔

یعنی اس کی تاویل وہی ہے جو اہلسنت کی طرف سے پہلے گزری یہ ہے کہ گناہ کسی پر جنت کو حرام نہیں کرتے، بلکہ اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو مواخذہ فرمائے، عذاب دے اور جنت گنہگار پر ایک مدّت کے لئے حرام فرمادے پھر اس میں داخل فرمائے اور اگر چاہے تو معاف فرمادے یا حدیث کی تاویل یہ ہے کہ یہ وعید حلال سمجھ کر اس کا ارتکاب کرنے والے کے لئے ہے۔[2]

جنت کی خوشبو نہیں پائے گا

امام ابو عبد اللہ محمد بن یزید ابن ماجہ متوفی ۲۷۳ھ روایت کرتے ہیں:

عن عبد اللہ بن عمر قال: قال رسول اللہ ﷺ: من ادّعی الیٰ غیر أبیه لم یرح رائحة الجنة، فانّ ریحها لیوجد مسیرة خمس مائة عام۔

یعنی حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے اپنا باپ کسی اور کو بنایا وہ جنت کی بو نہیں پائے گا بے شک جنت کی خوشبو پانچ سو سال کی دوری سے پائی جاتی ہے۔[3]

(بعض روایات میں سات سو سال بھی ذکر ہے لیکن محفوظ یہی ہے کہ پانچ سو سال ہے۔ **واللہ تعالیٰ اعلم**)

خوشبو پانے سے مراد

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایات میں ہے کہ "جس نے اپنا باپ کسی اور کو بنایا وہ جنت کی خوشبو نہ پائے گا" تو جنت کی خوشبو نہ پائے سے مراد کیا ہے؟ اس کے بارے میں شارحینِ حدیث کا کہنا ہے کہ یہ ابتداء جنت میں داخل نہ ہونے سے کنایہ

---

[1] (حاشیۃ السّندی علی الصحیح للبخاری، کتاب المغازی، باب غزوۃ الطائف، برقم: ۴۳۲۶-۷، ۱۱۵/۳)

[2] (اکمال المعلم، کتاب الایمان، باب بیان حال من رغب عن أبیه، الخ ۳۱۹/۲)

[3] (سنن ابن ماجۃ، کتاب الحدود، باب: من ادّعی الی غیر ابیه، الخ برقم: ۲۶۱۱، ۲۶۴/۳)

ہے یا اس حدیث شریف سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنے ایمان اور اچھے اعمال کے بعد اللہ تعالیٰ کے کرم سے جنت میں چلا گیا تو بھی جنت کی خوشبو پانے سے محروم رہے گا، چنانچہ علامہ نور الدین محمد بن عبد الہادی سندھی حنفی متوفی ۱۱۳۸ھ ''لم یرح ریح الجنة'' (جنت کی بو نہیں پائے گا) کے تحت لکھتے ہیں:

أی لم یشمّ ریحها، وهو کنایة عن عدم الدّخول فیها ابتداءً، بمعنی أنه لا یستحقّ ذلک، والمعنی لا یجد لها ریحاً وان دخلها۔

یعنی اس کا معنی ہے کہ جنت کی بو نہیں سونگھے گا اور یہ ابتداء جنت میں عدم دخول سے کنایہ ہے اس معنی میں ہے کہ وہ اس کا مستحق نہ ہو گا اور معنی یہ ہے کہ جنت کی خوشبو نہیں پائے گا اگرچہ اس میں داخل ہو جائے۔[1]

نسب بدلنے کو کفر فرمایا گیا

امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ھ روایت کرتے ہیں کہ:

عن أبی ذرّ أنه سمع النّبیّ ﷺ یقول: ''لیس من رجل ادّعیٰ لغیر أبیه، وهو یعلمه، الّا کفر، ومن ادّعیٰ قوما لیس له فیهم نسبٌ فلیتبوّ أمقعده من النار۔

ترجمہ: یعنی حضرت ابو ذرّ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے حضور نبی کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ جو شخص بھی اپنے باپ کے علاوہ کسی اور کی طرف نسب کا دعویٰ کرے (یا کسی اور نسب کی طرف خود کو منسوب کرے) حالانکہ وہ جانتا ہے (یہ نسبت غیر کی طرف ہے) وہ کافر ہو جائے گا اور جس نے کسی ایسی قوم کی طرف خود کو منسوب کیا جس میں اس کا نسب نہیں وہ اپنا ٹھکانہ جہنم بنالے۔[2]

اور امام مسلم بن حجاج قشیری متوفی ۲۶۱ھ کی روایت اس طرح ہے کہ:

عن أبی ذر أنه سمع رسول اللہ ﷺ یقول: لیس من رجل ادّعی لغیر أبیه وهو یعلمه، الا کفر، ومن ادّعی ما لیس له فلیس منّا ولیتبو أمقعده من النار۔

یعنی حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا کہ جو کوئی اپنے باپ کے غیر کی طرف اپنی نسبت کرے حالانکہ وہ جانتا ہے، تو وہ کافر ہو جائے گا اور جس نے ایسی چیز کا دعویٰ کیا جو اس کے لئے نہیں ہے وہ ہم میں سے نہیں ہے اور وہ اپنی جگہ دوزخ میں بنالے۔[3]

---

[1] (حاشیة السّندی علی السّنن لابن ماجة، برقم: ۲۶۱۱، ۳/۲۶۴)

[2] (صحیح البخاری، کتاب المناقب، باب نسبة الیمن الی اسماعیل، برقم: ۳۵۰۸، ۲/۳۱۶)

[3] (صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان حال ایمان من رغب عن أبیه، برقم: ۱۱۲/۱۲۹-(۶۱)، ص ۵۸) ایضاً المسند: ۵/۱۶۶۔

اور حدیث شریف میں "لیس من رجل" ہے اور اس میں "من" زائدہ ہے۔[1]

اور احادیث نبویہ علیہ التحیۃ والثناء میں وارد حکم جس طرح مردوں کے لئے ہے اسی طرح عورتوں کے لئے بھی ہے چنانچہ امام شہاب الدین احمد قسطلانی شافعی اور علامہ محمد امین ہرری نے لکھا ہے کہ مردوں سے تعبیر کرنا بطور غلبہ کے جاری ہو ورنہ عورتوں کا بھی یہی حکم ہے۔[2]

"وہ اپنا ٹھکانہ جہنم بنالے" کا مطلب

حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جو کوئی اپنے باپ کے غیر کی طرف اپنی نسبت کرے تو وہ اپنا ٹھکانہ جہنم بنالے"۔ اس میں آخری جملہ "جہنم ٹھکانہ بنالے" ہے، اس سے مراد کیا ہے؟ تو اس کے بارے میں کہا گیا کہ وہ جہنم کا مستحق ہے کہ اس نے اپنے کرتوت سے جہنم کو اپنے لئے واجب کر لیا۔

چنانچہ قاضی عیاض بن موسیٰ مالکی متوفی ۵۴۴ھ لکھتے ہیں:

وقوله: فليتبوّ أمقعده من النار: أى استحق ذلک بقوله، واستوجبه لمعصية الاّ أن يعفو اعنه۔

یعنی اور حضور نبی کریم ﷺ کا فرمان "چاہیئے کہ اپنا ٹھکانہ جہنم بنالے" یعنی وہ اپنے قول سے اس کا مستحق ہے اور اس نے اپنی معصیت کے ذریعے اپنے لئے اسے واجب کر لیا مگر یہ کہ اسے معاف کر دیا جائے۔[3]

پھر یہ جملہ یا تو مرتکب کے خلاف دعا ہے یا یہ اس کے انجام کی خبر ہے پھر اگر وہ نسب بدلنے کے حرام ہونے کا علم رکھتے ہوئے بھی اسے حلال جانتا ہے تو جہنم اس کا ہمیشہ کے لئے ٹھکانہ ہے اور اگر حلال نہیں جانتا پھر یا تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اسے معاف فرمادے اور اسے توبہ کی توفیق مرحمت فرمادے اور وہ گناہ اس سے ساقط ہو جائے ورنہ اسے مخصوص مدّت کے لئے بطور سزا جہنم میں رکھا جائے۔

چنانچہ علامہ محمد امین ہرری شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے لکھا کہ:

هذا دعاء عليه أو خبر الأمر وهو أظهر القولين فيه، أى يكون مقعده ومنزله من النار مخلدا فيها ان استحلّ ذلک أو هذا جزائه ان جوزى على ذلک ان لم يستحلّ لأنه يجاز عليه ان لم يغفر له، وقد يعفى عنه وقد يوفق للتوبة فيسقط عنه ذلک۔

---

[1] (ارشاد الساری، کتاب المناقب، باب بعد باب نسبة اليمن الى اسماعيل عليه السلام، برقم: ۳۵۰۸، ۱۹/۸)

[2] (ارشاد الساری، کتاب المناقب، باب بعد باب نسبة اليمن الى اسماعيل عليه السلام، برقم: ۳۵۰۸، ۱۹/۸) (شرح صحيح مسلم للهررى، کتاب الايمان، باب حکم ايمان من انتسب لغير أبيه وهو يعلم الخ، برقم: ۱۲۴ (۶۰)، ۵۰۷/۲، ۵۰۶)

[3] (اکمال المعلم، کتاب الايمان، باب بيان حال ايمان من رغب عن أبيه وهو يعلم، برقم: ۱۱۲، (۶۱)، ۳۱۹/۱)

یعنی اس مرتکب کے خلاف دعا ہے یا لفظِ امر کے ساتھ خبر ہے اور ان میں سے یہ قول اظہر القولین ہے یعنی اس کا ٹھکانہ اور منزل اگر اسے حلال جانتا ہے تو خلود فی النار ہے اور اگر اس گناہ کے ارتکاب پر سزا دیا گیا تو یہ اس کی سزا ہے اور اگر حلال نہیں جانتا کیونکہ اگر اسے نہ بخشا گیا تو وہ اس پر سزا دیا جائے گا اور کبھی بخش دیا جاتا ہے اور توبہ کی توفیق مرحمت کیا جاتا ہے تو اس سے وہ گناہ ساقط ہو جاتا ہے۔ [1]

''ہم میں سے نہیں'' کا مطلب

امام مسلم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی روایت میں ہے کہ ''جس نے ایسی چیز کا دعویٰ کیا جو اس کے لئے نہیں وہ ہم میں سے نہیں''۔ مستحلّ کے حق میں یہ کلمات اپنے ظاہر پر ہیں اور غیر مستحل کے لئے اس کا مطلب ہو گا کہ وہ حضور ﷺ کی ہدایت پر چلنے والا اور آپ ﷺ کی سنت پر عمل کرنے والا نہیں یا یہ کہ وہ اہل دین کے طریقے پر نہیں ہے۔

چنانچہ امام قاضی عیاض بن موسیٰ مالکی متوفی ۵۴۴ھ لکھتے ہیں:

و قوله: ليس منّا على ما تقدّم أى ليس مهتدياً بهدينا و لا مستّا بسنتنا۔

یعنی حضور نبی کریم ﷺ کا فرمان ''وہ ہم میں سے نہیں'' کا مطلب بنا بر اس کے جو پہلے گزرا ہے یہ کہ وہ ہماری ہدایت پر چلنے والا اور ہماری سنت پر عمل کرنے والا نہیں۔

اور حافظ ابو العباس احمد قرطبی متوفی ۶۵۶ھ لکھتے ہیں:

ظاهر التبرّى المطلق فيبقى على ظاهره فى حقّ المستحلّ لذلک على ما تقدم ويتأويل فى حقّ غير المستحلّ بأنه ليس على طريقة النّبىّ ﷺ ولا على طريقة أهل دينه، فان ذلک ظلم و طريقة أهل الدّين العدل، و ترک الظّلم ويكون هذا كماقال: ليس منامن ضرب الخدو دو شقّ الجيوب'' ويقرب منه من لم يأخذ من شاربه فليس منّا۔

یعنی ظاہر مطلق تبری (یعنی براءت) ہے اور یہ فرمان حلال جاننے والے کے حق میں اپنے ظاہر پر ہے اور حلال نہ جاننے والے کے حق میں اس کی تاویل کی جائے گی، اس طرح کہ وہ حضور نبی کریم ﷺ کے طریقہ پر نہیں ہے اور نہ ہی اہلِ دین کے طریقے پر ہے اور اہلِ دین کا طریقہ عدل ہے اور ترکِ ظُلم ہے اور یہ فرمانِ نبوی ﷺ ، حضور ﷺ کے اس فرمان کی طرح ہے جس میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''جس نے رُخسار پیٹے اور گریبان چاک کئے وہ ہم سے نہیں، اس کے قریب حضور ﷺ کا یہ فرمان ہے کہ ''جو اپنی مونچھوں سے نہ لے یعنی انہیں نہ تراشے وہ ہم سے نہیں''۔ [2]

---

[1] (شرح صحیح مسلم للهررى، كتاب الايمان، باب بيان حكم ايمان من انتسب لغير أبيه الخ، ۵۰۸/۲)

[2] (رواه البخارى برقم: ۳۵۱۹، ومسلم: برقم: ۱۰۳) (رواه الترمذى برقم: ۲۷۶۲)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت

امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ھ، امام مسلم بن حجاج قشیری متوفی ۲۶۱ھ اور امام ابو داؤد سلیمان بن اشعث سجستانی متوفی ۲۷۶ھ، روایت کرتے ہیں کہ:

عن عراک بن مالک أنه سمع أبا هريرة يقول: انّ رسول الله ﷺ قال: لا ترغبوا عن آبائكم فمن رغب عن أبيه فهو كفر۔ واللفظ لمسلم ونقله التبريزی فی "مشكاته" فی كتاب النّكاح، باب اللعان الفصل الاول۔

یعنی عراک بن مالک نے بیان کیا کہ انہوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے سنا آپؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اپنے آباء کے نسب سے اعراض نہ کرو (انکار نہ کرو) پس جس نے اپنے باپ کے نسب کا انکار کیا وہ کافر ہو گیا"۔[1]

"اعراض نہ کرو" کا مطلب

حدیثِ ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ میں ہے کہ "اپنے آباء کے نسب سے اعراض نہ کرو" اس سے مراد ہے کہ اپنے نسب کو اپنے آباء کے غیر کی طرف نہ پھیرو اور یہ زمانۂ جاہلیت کے کافروں کی عادات سے ہے، اسلام میں جب اس سے منع کر دیا گیا تو مرتکب کے لئے وعیدیں وارد ہوئیں۔

چنانچہ شارح صحیح البخاری حافظ ابن حجر عسقلانی شافعی متوفی ۸۵۲ھ لکھتے ہیں:

انما المراد به من تحوّل عن نسبت لأبيه الى غير أبيه عامداً مختاراً، وكانوا فی الجاهلية لا يستنكرون أن يتبنّى الرّجل ولد غيره ويصير الولد وينسب الى الذی تبنّاه حتى نزل قوله تعالىٰ {اُدْعُوْهُمْ لِأٰبَآئِهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ} وقوله سبحانه تعالىٰ {وَمَا جَعَلَ اَدْعِيَآئَكُمْ اَبْنَآئَكُمْ} فنسب كلّ واحدٍ الى أبيه الحقيقی، وترك الانتساب الى من تبنّاه۔

یعنی اس سے مراد صرف یہ ہے کہ جو شخص اپنے باپ کی طرف نسبت کو اپنے اختیار کے ساتھ عمداً غیر باپ کی طرف پھیر دے (تو وہ اس وعید کا مستحق ہے جو اس حدیث شریف میں مذکور ہے) اور زمانۂ جاہلیت میں لوگوں میں یہ معیوب نہ تھا کہ وہ غیر کے بیٹے کو متبنّی بنالیں اور وہ اس (متبنّی بنانے والے) کا بیٹا ہو جائے اور اُسی کی طرف منسوب ہو کہ جس نے اسے متبنّی بنایا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا یہ حکم نازل ہوا "انہیں ان کے باپوں کا کہہ کر پکارو یہ اللہ کے نزدیک زیادہ ٹھیک ہے" اور اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان نازل ہوا کہ "یہ تمہارے لے پالکوں کو تمہارا بیٹا نہیں بنایا" تو ہر ایک اپنے حقیقی باپ کی طرف منسوب کر دیا گیا اور متبنّی بنانے والے کی جانب انتساب کو ترک کر دیا گیا۔[2]

---

[1] (صحيح البخاری، كتاب الفرائض باب من ادّعى الى غير أبيه برقم: ۶۷۶۸، ۲۷۳/۴) (صحيح مسلم، كتاب الايمان، باب بيان حال ايمان من رغب عن أبيه الخ، برقم: ۱۱۳/۱۳۰-(۶۲)، ص ۵۸) (المسند، ۵۲۶/۲) (برقم: ۱۰۸/۱-۲،۳۳۱۵))

[2] (فتح البارى، كتاب الفرائض، باب من ادّعى الى غير أبيه، برقم: ۶۷۶۸، ۱۲-۶۳/۱۱)

اور شیخ محقق شیخ عبد الحق محدّث دہلوی متوفی ۱۰۵۲ھ لکھتے ہیں:

اعراض نکنید از پدرانِ خود بترک نسبت بایشان، کسیکہ اعراض کند از پدر خود و ترک کند نسبت خود را بوے پس تحقیق کُفرانِ نعمت کرد وچہ نعمت کہ اصل ہمہ نعمتہاست۔

یعنی اپنے آباء سے اعراض نہ کرو ان کی طرف اپنی نسبت کو ترک کر کے، جس نے اپنے باپ سے اعراض کیا اور اپنی اسکی طرف نسبت کو ترک کیا پس تحقیق اس نے کفرانِ نعمت کیا، اس نعمت کا جو تمام نعمتوں کی اصل ہے۔[1]

حضرت ابن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت

حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مرفوعاً مروی ہے کہ:

عن عمرو بن شعیب عن أبیه، عن جدّه قال: "کفر" بامرئٍ ادّعاءُ نسبٍ لا یعرفه أو حجده وان دقّ۔

یعنی عمرو بن شعیب اپنے باپ سے وہ اپنے دادا سے بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: آدمی کا ایسے نسب کی طرف انتساب کہ جسے وہ نہیں پہچانتا (یا وہ معروف نہیں) یا (اس کا اپنے) نسب کا انکار کرنا اگرچہ وہ چھوٹا (یعنی حقیر) ہو کفر ہے۔[2]

حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی اس روایت کو امام احمد بن حنبل متوفی ۲۴۱ھ نے اپنی "مسند" میں ان الفاظ سے روایت کیا:

عن عمرو بن شعیب عن أبیه، عن جدّه قال: قال رسول اللہ ﷺ: کُفرٌ تبرّؤٌ من نسب وان دقّ أو ادّعاء الیٰ نسب لا یعرف۔[3]

اور امام ابو القاسم سلیمان بن احمد طبرانی متوفی ۳۶۰ھ "معجم اوسط" میں اور معجم صغیر میں ان الفاظ کے ساتھ مرفوعاً روایت کیا:

کفرٌ بامریءٍ ادّعاه (وفی الصغیر ادّعا) الیٰ نسب لا یعرف وجحده وان دقّ۔[4]

اور حافظ ابو احمد عبد اللہ بن عدی متوفی ۳۶۵ھ نے "الکامل" میں ان الفاظ کے ساتھ مرفوعا روایت کیا:

کفر من ادّعی الیٰ نسب لا یعرف، أو جحده وان دقّ۔[5]

---

[1] (أشعة اللمعات، کتاب النکاح، باب اللعان، الفصل الأول، ۱۷۸/۳)

[2] (سنن ابن ماجه کتاب الفرائض، باب من أنکر ولده برقم: ۲۷۴۴، ۳۳۷/۳ وقال محققه اسناده صحیح)

[3] (المسند: ۲۱۵/۲)

[4] (المعجم الأوسط، من اسمه محمود، برقم: ۹۱۹۷، ۳۹/۲، ۴۰) (المعجم الصغیر، من اسمه محمود، ۱۰۸/۲)

[5] (الکامل لابن عدی، عمر بن شعیب (برقم: ۱۲۸۱/۳۱۴)، ۲۰۴/۶)

اور علامہ نور الدین ہیثمی متوفی ۸۰۷ھ نے "مجمع البحرین" میں اور "مجمع الزوائد" میں اسے نقل کیا ہے۔[1]

کافر ہونے کا مطلب

حدیث شریف میں نسب بدلنے، غیر آباء کی طرف انتساب کرنے کو کفر قرار دیا گیا ہے، اس میں بھی دو تاویلیں ہیں ایک یہ کہ نسب بدلنا جس سے قرآن میں ممانعت اور حدیث شریف میں اس پر سخت وعیدیں وارد ہوئیں اسے اگر حلال جانتا ہو تو کافر ہو جائے گا، دوسری یہ کہ اگر حلال نہیں جانتا تو مراد وہ کفر نہیں ہو گا جو اسے ملّتِ اسلام سے خارج کر دے بلکہ کفرانِ نعمت مراد ہے یا عملِ کفار کے ساتھ مشابہت کی وجہ سے اس پر کفر کا لفظ بولا گیا چنانچہ امام ابوزکریا نووی شافعی متوفی ۶۷۶ھ لکھتے ہیں جیسا کہ علامہ محمد امین ہرری نے ان سے نقل کیا کہ:

قال النووی: فیه تأویلات أحدهما: أنه فی حق المستحلّ، والثانی: أنه کفر النّعمة والاحسان وحق الله وحق أبیه، ولیس المراد الکفر الذی یخرجه عن ملّة الاسلام وهذا کقوله "یکفرن" ثم فسّره بکفر انهنّ الاحسان وکفران العشیر۔

یعنی امام نووی رحمہ اللہ نے فرمایا: اس میں تاویلیں ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ یہ وعید حلال جاننے والے کے حق میں ہے اور دوسری یہ کہ یہ نعمت، احسان، اللہ تعالیٰ کے حق اور اپنے باپ کے حق کی ناشکری ہے اور وہ کفر مراد نہیں ہے جو مرتکب کو ملّتِ اسلام سے خارج کر دیتا ہے اور حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے فرمان "یکفرن" کی مثل ہے، پھر اس کی تفسیر عورتوں کی طرف سے احسان کی ناشکری اور ان کی اپنے شوہروں کی ناشکری کے ساتھ کی ہے۔[2]

اپنے باپ کو چھوڑ کر دوسرے کی طرف نسبت یا تو قذف (یعنی تہمت زنا) ہے یا کذب (یعنی جھوٹ) ہے یا والدین کی نافرمانی علماء کرام نے فرمایا کہ ان میں سے کوئی چیز بھی کفر نہیں ہے، لہٰذا ظاہر حدیث کو حلال جاننے پر محمول کیا جائے گا۔

اور امام محمد بن خلیفہ وشتانی ابی مالکی متوفی ۸۲۸ھ اور علامہ محمد بن محمد بن یوسف سنوسی حسنی مالکی متوفی ۸۹۵ھ لکھتے ہیں کہ اس حدیث شریف میں تاویل کی ضرورت ہے:

لأن انتسابه لغیر أبیه قذف أو کذب، أو عقوق، ولا شیء من ذلک بکفر فیحمل أیضاً علی المستحلّ، أو أنه أراد کفر النعمة أی حجد حق أبیه، أو أنه أطلق الکفر مجازاً لشبهه بفعل أهل الکفر لأنهم کانوا یفعلونه فی الجاهلیة۔

یعنی کیونکہ غیر باپ کی طرف انتساب تہمت ہے یا جھوٹ ہے یا نافرمانی ہے اور ان میں سے کوئی چیز کفر نہیں تو اسے بھی (غیر آباء کی طرف انتساب کو) حلال جاننے والے پر محمول کیا جائے گا، یا یہ کہ حدیث شریف میں اس سے کفرانِ نعمت یعنی

---

[1] (مجمع البحرین، کتاب الایمان، باب فی الکبائر، برقم: ۱۳۴، ۱/۸۵)

[2] (شرح صحیح مسلم للهرری، کتاب الایمان، باب حکم ایمان، من انتسب لغیر أبیه الخ، برقم: ۲-۱۲۴/۵۰۷)

اپنے حقیقی باپ کے حق کے انکار کا ارادہ کیا گیا یا یہ کہ اس عمل کی اہلِ کفر کے ساتھ مشابہت کی وجہ سے مجازاً اس پر کفر کا اطلاق کیا کیونکہ وہ جاہلیت میں ایسا کرتے تھے۔[1]

علامہ محمد امین ہرری نے لکھا کہ:

ذلک المنتسب کفراً حقیقیاً یخرجه عن الملّة ان استحل ذلک الانتساب، لأنه ما هو معلوم حرمته من الدّین ضرورة، والا کفر کفراً بمعنی کفران نعمة الأبوّة أی جحد حق أبیه، لأن انتسابه لغیر أبیه اما قذف، أو کذب، أو عقوق ولا شیء من ذلک کفرٌ، قال القرطبی: أو أنه أطلق الکفر مجازاً لشبهه بفعل أهل الکفر لأنهم کانوا یفعلونه بالجاهلیة، وعبارته هنا۔

یعنی اگر وہ غیر باپ کی طرف انتساب کو حلال جانتا ہے تو وہ منتسب حقیقی کفر کا مرتکب ہو جائے گا جو اسے ملتِ اسلامیہ سے نکال دے گا کیونکہ یہ وہ ہے کہ جس کی حرمت کا ضروریات دین سے ہونا معلوم ہے ورنہ (یعنی اگر وہ اسے حلال نہیں جانتا تو) یہ کفر بمعنی کفرانِ نعمت ابوۃ ہے یعنی اس نے اپنے باپ کے حق کا انکار کیا، اس کی ناشکری کی اس لئے کہ اس کا اپنے باپ کے غیر کی طرف انتساب یا تو قذف (تہمت) ہے یا جھوٹ ہے یا عقوق (نافرمانی) ہے اور ان میں سے کوئی چیز بھی کفر نہیں ہے، امام قرطبی نے فرمایا کہ یا یہ ہے کہ اہل کفر کے فعل کی مشابہت کی وجہ سے اس پر کفر کا لفظ بولا گیا کیونکہ وہ زمانۂ جاہلیت میں اس طرح کیا کرتے تھے۔[2]

اور علماء کرام نے یہ بھی لکھا ہے غیر آباء کی طرف انتساب کرنے والا اگر اس کے حلال ہونے کا اعتقاد رکھتا ہے تو اجماع کی مخالفت کی وجہ سے کافر ہو گا۔

چنانچہ امام شرف الدین حسین بن محمد طیبی شافعی متوفی ۷۴۳ھ اور ملا علی قاری حنفی متوفی ۱۰۱۴ھ لکھتے ہیں:

فمن اعتقد اباحته کفر لمخالفة الاجماع، [ومن لم یعتقد اباحته ففی] فمعنی کفره وجهان، أحدهما: أنه قد أشبه فعله فعل الکفّار، والثّانی: أنه کافر نعمة الاسلام۔

یعنی پس جس نے اس (یعنی نسب بدلنے) کے مباح ہونے کا اعتقاد کیا وہ اجماع کی مخالفت کی وجہ سے کافر ہوا اور جو اس کی اباحت کا اعتقاد نہ رکھے تو اس کے مرتکب کے کفر کے معنی میں دو وجہیں ہیں، ان میں سے ایک یہ کہ اس (نسب بدلنے والے) نے اپنا فعل کافروں کے فعل کے مشابہ کر دیا اور دوسرا یہ کہ وہ نعمتِ اسلام کی ناشکری کرنے والا ہے۔[3]

---

[1] (اکمال اکمال المعلم، کتاب الایمان، باب بیان حال من رغب عن أبیه وهو یعلم، برقم: ۱۱۲-(۶۱)، ۱/۲۸۱، ۲۸۰)(مکمل اکمال الاکمال، کتاب الایمان، باب بیان حال من رغب عن أبیه وهو یعلم، برقم: ۱۱۲-(۶۱)، ۱/۲۸۰)

[2] (شرح صحیح مسلم للهرری، کتاب الایمان، باب بیان حکم ایمان من انتسب لغیر أبیه الخ)

[3] (شرح الطیبی، کتاب النکاح، باب اللعان، الفصل الأول، ۶/۳۹۶)(مرقاة، کتاب النکاح، باب اللعان، الفصل الاول برقم: ۳۳۱۵، ۶/۴۳۶)

شیخ الحدیث غلام رسول رضوی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں: اگر یہ سوال پوچھا جائے کہ انسان گُناہ کرنے سے کافر نہیں ہوتا اور حدیث میں اپنے والد کے غیر کی طرف اپنی نسبت کرنے کو کفر قرار دیا گیا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ موؤل ہے، تاویل یہ ہے کہ جو کوئی اپنے والد کے غیر کی طرف اپنی نسبت کو حلال اور جائز سمجھے وہ کافر ہے یا مراد کفرانِ نعمت ہے، یا یہ مراد ہے کہ اس نے اللہ تعالیٰ کے حق اور اپنے والد کے حق کا انکار کر دیا یا زجر و تہدید کے لئے فرمایا، حدیث کا معنی یہ ہے کہ جو کوئی اپنی نسبت غیر کی طرف کرے یا اپنے آپ کو غیر خاندان میں شمار کرے اور اس کو جائز سمجھے وہ شخص کافر ہے اس زمانہ میں دیکھنے میں آیا ہے بعض سادات کی طرف اپنی نسبت کر لیتے ہیں تاکہ عوام کی نگاہوں میں محترم ہوں وہ اس حدیث کے مصداق ہیں۔[1]

اور حافظ ابو العباس احمد بن عمر قرطبی متوفی ۶۵۶ھ لکھتے ہیں:

فمن فعل ذلک مستحلا فهو كافر حقيقة تبقى الحديث على ظاهره، أما ان كان غير مستحل فيكون الكفر الذى فى الحديث محمولا على كفران النعم و الحقوق فانه قابل الاحسان بالاساءة ومن كان كذا صدق عليه اسم الكافر، ويحتمل أن يقال: أطلق على ذلک، لأنه تشبه بالكفار أهل الجاهلية أهل الكبر و الأنفة فانهم كانوا يفعلونه ذلک۔

یعنی پس جس نے اسے (یعنی نسب بدلنے کو) حلال جانتے ہوئے ایسا کیا تو وہ حقیقۃً کافر ہو جائے گا، (اس صورت میں) حدیث شریف اپنے ظاہر پر باقی رہے گی، اگر حلال نہیں جانتا تو جس کفر کا حدیث شریف میں ذکر ہے وہ کفرانِ نعم اور کفرانِ حقوق پر محمول ہو گا کیونکہ اس نے احسان کے مقابلے میں اساءت کی اور جو ایسا ہو اس پر کفر کا اسم صادق آئے گا اور یہ بھی احتمال ہے کہ کہا جائے اس پر یہ لفظ بولا جائے گا کیونکہ اس نے اہل جاہلیت، اہل کبر کفار کے ساتھ مشابہت کی، بے شک وہ ایسا کیا کرتے تھے۔[2]

و ان ثبت ذلک فالمراد من استحلّ مع علمه بالتّحريم وعلى الرّواية المشهورة فالمراد كفر النعمة، وظاهر اللفظ غير مرادٍ، و انما ورد على سبيل التّغليظ و الزّجر لفاعل ذلک، أو المراد باطلاق الكفر أن فاعله فعل فعلاً شبيها بفعل أهل الكفر۔

یعنی اگر وہ ثابت ہو تو مراد وہ شخص ہو گا جو اس فعل کے حرام ہونے کا علم رکھتے ہوئے اسے حلال جانتا ہے اور روایت مشہور کی بنا پر مراد کفرانِ نعمت ہے اور ظاہر لفظ مراد نہیں ہے اور یہ صرف اس حرام فعل کے مرتکب کے لئے تغلیظ و زجر کے طور پر وارد ہوا ہے یا یہ کہ اطلاقِ کفر سے مراد ہے کہ اس کے فاعل نے ایسا عمل کیا ہے جو اہل کفر کے عمل کے مشابہ ہے۔[3]

---

[1] (تفهيم البخارى، كتاب المناقب، باب نسبة اليمن الى اسماعيل عليه السلام، برقم: ۳۲۸۱، ۵/۳۸۳، ۳۸۴)

[2] (المفهم، كتاب الايمان، باب اثم من كفر مسلماً، برقم: ۵۱، ۱/۲۵۴)

[3] (فتح البارى، كتاب المناقب، باب بعد باب نسبة اليمن الى اسماعيل عليه السلام، برقم: ۳۵۰۸، ۶/۸/۶۷۰)

اور حافظ شہاب الدین احمد قسطلانی شافعی متوفی ۹۱۱ھ لکھتے ہیں:

وعلی ثبوتھا مؤوّلة بالمستحلّ لذلک مع علمه التحریم، أو ورد علی سبیل التغلیظ والزّجر لفاعله۔

یعنی اس کے ثبوت کی بنا پر یہ نسب بدلنے کے حرام ہونے کا علم رکھنے کے باوجود اسے حلال جاننے والے کے ساتھ مؤوّل ہے یا یہ فاعل کے لئے بطور تغلیظ وزجر کے وارد ہوا ہے۔[1]

اور علامہ احمد بن اسماعیل بن عثمان کورانی شافعی ثم حنفی متوفی ۸۹۳ھ لکھتے ہیں:

وھو یعلمه الا کفر ان اعتقد ذلک، أو کفر بنعمة اللہ أو ذلک الفعل من أخلاق الکفّار۔

یعنی حضور نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے فرمان "**وھو یعلم الا کفر**" کا مطلب ہے کہ اگر اس (کے حلال ہونے) کا اعتقاد رکھتا ہے یا یہ کہ اس نے اللہ تعالیٰ کی ناشکری کی یا یہ کہ یہ فعل (یعنی نسب بدلنا، غیر باپ کی طرف نسب) کُفّار کے اخلاق سے ہے۔[2]

غیر مستحلّ کے حق میں اس کی ایک تاویل یہ بھی ہے کہ یہ عمل کفر تک پہنچانے والا ہے۔

چنانچہ علامہ ابن حجر ہیتمی شافعی لکھتے ہیں:

والکفر فیه بمعنی أن ذلک یؤدی الیه، أو استحل، أو کفر النّعمة۔

یعنی اس میں کفر اس معنی میں ہے کہ وہ (عمل) کفر تک پہنچانے والا ہے، اسے حلال جانتا ہے (تو کافر ہے) یا اس نے کفرانِ نعمت کیا۔[3]

نسب بدلنے کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر فرمایا گیا

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جسے امام ابو القاسم سلیمان بن احمد طبرانی متوفی ۳۶۰ھ نے "معجم الاوسط" میں ان الفاظ سے روایت کیا ہے:

عن أبی بکر یقول: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: کفر باللہ: ادّعاء نسب لا یعرف، و کفرٌ باللہ تبرّئٌ من نسبٍ و ان دقّ۔

یعنی حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے آپ نے فرمایا کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر ہے ایسے نسب کی طرف نسبت کرنا جو معروف نہیں اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر ہے نسب سے برأت اگرچہ چھوٹا (یعنی حقیر) ہو۔[4]

---

[1] (ارشاد الساری، کتاب المناقب، باب بعد باب نسبة الیمن الی اسماعیل علیه السلام، برقم ۳۵۰۸، ۱۹۸)

[2] (الکوثر الجاری الی ریاض أحادیث البخاری، کتاب المناقب، باب نسبة الیمن الی اسماعیل علیه السلام، برقم: ۳۵۰۸، ۳۵۳/۶)

[3] (الزواجر عن اقتراف الکبائر، برقم: ۲۹۳، ۱۰۰/۲)

[4] (المعجم الأوسط، من اسمه ابراهیم، برقم: ۲۸۱۸، ۴۴/۲)

اور ان الفاظ سے کہ:

عن أبی بکر الصّدیق قال: قال رسول اللہ ﷺ: من ادّعی نسباً لا یعرف کفر باللہ و انتفاء من نسب و ان دقّ کفر باللہ۔

یعنی حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جس نے ایسے نسب کی طرف نسبت کی جو معروف نہیں اس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کیا اور نسب سے نفی اگرچہ (یعنی حقیر) ہو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر ہے۔[1]

اسی طرح امام طبرانی نے "الدعاء" میں روایت کیا۔[2]

اور حافظ بزار نے اپنی مسند میں اور امام حافظ نور الدین ہیثمی متوفی ۸۰۷ھ نے "کشف الاستار" میں ان الفاظ سے مرفوعاً روایت کیا ہے:

کفر باللہ تبرّیئٌ من نسب و ان دقّ۔[3]

اور حدیث ابی بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ امام ابو محمد عبد اللہ بن عبد الرحمن دارمی متوفی ۲۵۵ھ نے اپنی "سنن" میں، حافظ، ابو الحسن علی ابن الجعد متوفی ۲۳۰ھ نے اپنی "مسند" میں ان الفاظ سے موقوفاً روایت کیا ہے:

کفر باللہ ادّعاءٌ الیٰ نسبٍ لا یعرف، و کفرٌ باللہ تبرّیٌٔ من نسبٍ و ان دقّ۔

یعنی غیر معروف نسب کی طرف نسبت اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر ہے اور نسب سے برأت اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر ہے اگرچہ وہ چھوٹا (یعنی حقیر) ہو۔[4]

اور امام ابو بکر عبد اللہ بن محمد بن ابی شیبہ متوفی ۲۳۵ھ نے "المصنف" میں ان الفاظ سے موقوفاً روایت کیا:

قال أبو بکر: کفر من ادّعی نسباً لا یعلم و تبرأ من نسبٍ و ان دق۔[5]

حدیث ابی بکر رضی اللہ عنہ کی اکثر روایات میں "کفر باللہ" (یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر ہے) اور "کفر باللہ" (یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کیا) مذکور ہے، اسی طرح حدیث اَبی ذرّ رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں "الا کفر باللہ" یعنی جو کوئی اپنے باپ کے غیر کی طرف اپنی نسبت کرے حالانکہ وہ جانتا ہے کہ یہ نسبت غیر کی جانب ہے تو اس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کیا" آیا ہے، یہ حدیث ابی بکر اور حدیث اَبی ذرّ رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی یہ روایت اگر اسی طرح ہو تو غیر مستحل کے حق میں اس کی

---

[1](المعجم الأوسط، من اسمہ معاذ، برقم: ۸۵۷۵، ۶/۲۲۱)

[2](کتاب الدّعاء، ذکر من لعنہ الرسول ﷺ، برقم: ۲۱۴۳، ص۵۸۷)

[3](البحر الزّخار، برقم: ۷۰، ۱/۱۳۹)(کشف الأستار، کتاب الایمان، باب من تبرّأ من نسبہ، برقم: ۱۰۴، ۱/۷۰)

[4](سنن الدّارمی، کتاب الفرائض، باب ن ادّعی الی غیر أبیہ، برقم: ۲۸۶۱، ۲/۲۷۰)(مسند ابن الجعد، بقیۃ حدیث الأعمش، برقم: ۳۶۹۱، ص۳۹۴)

[5](المصنّف لابن أبی شیبہ، کتاب الأدب، باب مایکرہ الرّجل أن ینتمی الیہ الخ، برقم: ۲۶۶۳۳، ۱۳/۳۳۱، ۳۳۰)

تاویل میں کہا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے جس کے نطفہ سے پیدا کیا تھا اس شخص نے اس کا انکار کر کے کہا کہ مجھے اس کے نہیں فلاں کے نطفہ سے پیدا کیا گیا ہے گویا اس نے اس معاملہ میں اللہ تعالیٰ کا انکار کر دیا اور مستحل کے حق میں تاویل کی حاجت نہیں ہے جیسا کہ ہماری ذکر کردہ دیگر عبارات سے ظاہر ہے اور اس جواب کے قریب حافظ ابن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ کی بعض شرّاحِ حدیث سے نقل کردہ یہ تاویل ہے، فرماتے ہیں:

قال بعض الشرّاح: سبب اطلاق الکفر هنا أنه کذب علی اللّٰہ کأنه یقول: خلقنی اللّٰہ من ماء فلان، و لیس کذلک لأنه انما خلقه من غیره۔

یعنی بعض شراح نے فرمایا کہ یہاں اطلاقِ کفر کا سبب یہ ہے کہ اس نے اللہ تعالیٰ پر جھوٹ بولا، گویا کہ اس نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے فلاں کے پانی (یعنی نطفہ) سے پیدا کیا حالانکہ ایسا نہیں ہے اللہ تعالیٰ نے تو اسے (جس کے پانی سے پیدا ہونے کا اس نے دعویٰ کیا ہے) اس کے غیر (کے پانی) سے پیدا کیا ہے۔[1]

اور حدیثِ اَبی ذر رضی اللہ عنہ کا یہ جواب اس صورت میں ہے جب یہ اضافہ ثابت ہو اور یہ اضافہ امام بخاری اور امام مسلم کی روایات میں نہیں ہے اس لئے علماء کرام نے لکھا کہ اس اضافہ کا حذف ہی مناسب ہے چنانچہ علامہ شہاب الدین احمد قسطلانی لکھتے ہیں:

و لیست هذه الزّیادة فی غیر روایته و لا فی روایة مسلم و لا اسماعیلی فحذفها أوجه لما لا یخفی۔

یعنی یہ اضافہ اس روایت کے غیر میں نہیں ہے نہ مسلم کی روایت میں ہے اور نہ اسماعیلی کی روایت میں ہے لہٰذا اس کا حذف اوجہ ہے اس لئے کہ اس کے حذف کا اوجہ ہونا مخفی نہیں ہے۔[2]

اور حدیث ابی بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اکثر روایات میں یہ اضافہ مذکور ہے جب کہ بعض میں سے نہیں ہے اگر یہ اضافہ ثابت ہو اس کا وہی جواب ہو گا جو حدیث اَبی ذرّ رضی اللہ عنہ کے ضمن میں حافظ ابن حجر عسقلانی نے دیا۔

اور علماء کرام رحمہم اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ کفر کا لغوی معنی ہے کہ کسی شیء کو ڈھانپا تو کفر باللہ کا معنی یہ ہو گا کہ اللہ عزّ و جلّ نے اسے جس کا بیٹا بنایا اس نے اس میں اللہ عز و جل کے حق کو ڈھانپ دیا۔

چنانچہ شارح صحیح بخاری علامہ ابو الحسن علی بن خلف بن عبد الملک متوفی ۴۴۹ھ لکھتے ہیں:

فان قیل: فتقول للرّاغب فی الانتماء الی غیر أبیه و موالیه کافر باللّٰہ کما روی عن أبی بکر الصّدیق أنه قال: کفر اباللّٰہ ادعاء نسب لا یعرف، و روی عن عمر بن الخطاب أنه قال: کان مما یقرء فی القرأن: "لا ترغبوا اباء کم فانه کفر

---

[1](فتح الباری، شرح صحیح البخاری، کتاب الفرائض، باب: من ادّعی الی غیر أبیه، برقم: ۶۷۶۸، ۱۵/۱۲/۶۳)

[2](ارشاد الساری، کتاب الفرائض، باب: من ادعی الی غیر أبیه، برقم: ۶۷۶۸، ۱۹/۸)

بکم" قیل: لیس معناہ الکفر الذی یستحق علیه التخلید فی النار، و انما ھو کفر لحقّ أبیه ولحقّ موالیه، کقوله فی النّساء: "یکفرن العشیر" والکفر فی لغة العرب: التعظیة للشیء والستر له، فکأنه تغطیة منه علی حقّ اللہ عزّ وجلّ فیمن جعله ولداً، لا أن من فعل ذلک کافراً باللہ حلال الدّم۔

یعنی پس اگر کہا جائے کہ تم غیر باپ اور غیر مالک کی طرف انتساب میں رغبت رکھنے والے کو کہتے ہو اس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کیا جیسا کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ "اس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کیا جس نے غیر معروف نسب کی طرف اپنے آپ کو منسوب کیا" اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا "قرآن کریم میں جو پڑھا گیا ہے اس میں یہ تھا کہ "اپنے آباء سے اعراض نہ کرو پس یہ کفر ہے" تو جواب میں کہا جائے گا کہ اس کا معنی وہ کفر نہیں ہے کہ جس میں بندہ خلود فی النار کا مستحق ہوتا ہے، اور کفر صرف باپ کے حق اور مالکوں کے حق کی وجہ سے ہے جیسا کہ نبی ﷺ کا عورتوں کے بارے میں فرمان ہے "یکفرن العشیر" (یعنی اپنے شوہروں کی ناشکری کرتی ہیں) اور لغتِ عرب میں کفر کا معنی ہے کسی شیء کو ڈھانپنا اور اسے چھپانا، تو گویا اللہ تعالیٰ نے اسے جس کا بیٹا بنایا اس نے اس میں اللہ عزّ وجلّ کے حق کو ڈھانپ دیا، یہ نہیں کہ جو اس کا ارتکاب کرے گا وہ کفر باللہ کا مرتکب، حلال الدّم ہو جائے گا"۔ [1]

نسب بدلنے والے پر لعنت فرمائی گئی

امام ابو داؤد سلیمان بن اشعث سجستانی متوفی ۲۷۵ھ روایت کرتے ہیں:

عن أنس بن مالک، قال سمعت رسول اللہ ﷺ یقول: من ادّعی الی غیر أبیه، أو انتمی الی غیر موالیه، فعلیه لعنة اللہ المتتابعة الیٰ یوم القیامة۔

یعنی حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا جس نے اپنا باپ کسی اور کو بنایا یا اپنے آپ کو اپنے مولیٰ کے غیر کی طرف منسوب کیا تو اس پر اللہ تعالیٰ کی قیامت تک لعنت ہے"۔ [2]

امام ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی متوفی ۲۷۹ھ روایت کرتے ہیں:

عن أبی أمامة الباھلی قال: سمعت رسول اللہ ﷺ یقول فی خطبة حجّة الوداع: ومن ادّعی الیٰ غیر أبیه، أو انتمی الیٰ غیر موالیه، فعلیه لعنة اللہ التّابعة الیٰ یوم القیامة الحدیث۔

---

[1] (شرح ابن بطال، کتاب الفرائض، باب من ادّعی الی غیر أبیه الخ" ۸/۳۸۴)

[2] (سنن أبی داؤد کتاب الأدب، باب فی الرّجل ینتمی الی غیر موالیه، برقم: ۵۱۱۵، ۵/۲۱۳)

یعنی حضرت ابو امامہ باہلی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو حجۃ الوداع کے خطبہ میں فرماتے ہوئے سنا کہ جس نے اپنا باپ کسی اور کو بنایا یا (جس غلام نے) اپنے مولیٰ کے غیر کی طرف اپنے آپ کو منسوب کیا تو اس پر قیامت تک اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے"۔ [1]

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت

امام مسلم بن حجاج قشیری متوفی ۲۶۱ھ، امام ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی متوفی ۲۷۹ھ اور امام احمد بن حنبل متوفی ۲۴۱ھ روایت کرتے ہیں:

عن ابراھیم التیمی عن أبیه قال: خطبنا علیٌ بن أبی طالبٍ فقال من زعم أنّ عندنا شیئاً نقرؤہ الا کتاب اللہ وھٰذہ الصحیفۃ۔ قال: وصحیفۃ معلّقۃ فی قراب سیفه فقد کذب فیھا اسنان الابل وأشیاء من الجراحات، وفیھا قال النبی ﷺ "ومن ادّعیٰ الی غیر أبیه أو انتمیٰ الیٰ غیر موالیه، فعلیه لعنۃ اللہ والملائکۃ والناس اجمعین، لا یقبل اللہ منه یوم القیامۃ فرضاً ولا عدلاً۔" واللفظ لمسلم۔

یعنی ابراہیم تیمی اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ہمیں خطبہ ارشاد فرمایا حالانکہ ان کی نیام کے ساتھ ایک صحیفہ لٹکا ہوا تھا حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے اس صحیفہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا جو شخص یہ گمان کرتا ہے کہ ہمارے پاس کتاب اللہ (قرآن) اور صحیفہ کے علاوہ کوئی اور چیز ہے، وہ جھوٹا ہے، اس صحیفہ میں تو اونٹوں کی عمروں کا بیان ہے اور کچھ زخموں کی دیت کا بیان ہے اور اس میں یہ ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اور جس نے اپنے آپ کو اپنے باپ کے غیر کی طرف منسوب کیا یا جس غلام نے اپنے آپ کو اپنے مالک کے غیر کی طرف منسوب کیا اس پر اللہ تعالیٰ کی، سب فرشتوں اور آدمیوں کی لعنت ہے، قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کا کوئی فرض قبول نہ فرمائے گا اور نہ نفل"۔ [2]

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی روایت

امام ابو عبد اللہ محمد بن یزید ابن ماجہ قزوینی متوفی ۲۷۳ھ روایت کرتے ہیں کہ

عن ابن عباس قال: قال رسول اللہ ﷺ: من انتسب الی غیر أبیه، أو تولی غیر موالیه، فعلیه لعنۃ اللہ والملائکۃ والناس أجمعین۔

---

[1] (سنن الترمذی، کتاب الوصایا، باب ماجاء "لا وصیۃ لوارث" برقم: ۲۱۲۰، ۱۷۸/۳، ۱۷۹)

[2] (سنن الترمذی، کتاب الولاء والھبۃ، باب ماجاء فیمن تولّی غیر موالیه الخ، برقم: ۲۱۲۷، ۱۸۳/۳، ۱۸۴) (المسند، ۸۱/۱)

یعنی حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے اپنا نسب اپنے باپ کے غیر سے بیان کیا یا (جس غلام نے) اپنے مولیٰ کے غیر کی طرف اپنے آپ کو منسوب کیا اس پر اللہ تعالیٰ اور سب فرشتوں اور آدمیوں کی لعنت ہے۔[1]

امام ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی متوفی ۲۷۹ھ اور امام عبد اللہ بن عبد الرحمن دارمی متوفی ۲۵۵ھ اور حافظ ابو القاسم سلیمان بن احمد طبرانی متوفی ۳۶۰ھ روایت کرتے ہیں:

عن عمرو بن خارجة قال: كنت تحت ناقة النبی ﷺ فسمعته يقول: من ادّعی الیٰ غير أبيه أو انتمی الیٰ غير مواليه رغبة عنهم فعليه لعنة اللہ و الملائكة و الناس أجمعين۔ و اللفظ للدارمی و زاد الطبرانی: لا يقبل منه صرف و لا عدل۔

یعنی حضرت عمرو بن خارجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ میں حضور ﷺ کی اونٹنی کے نیچے تھا تو آپ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ جو اپنے باپ کے سوا دوسرے کی طرف اپنے آپ کو نسبت کرے یا اپنے آپ کو اپنے مولیٰ کے غیر کی طرف منسوب کیا ان سے اعراض کرتے ہوئے تو اس پر اللہ تعالیٰ، سب فرشتوں اور آدمیوں کی لعنت ہے"۔[2]

لعنت سے مراد

حدیث شریف میں نسب بدلنے والے کے لئے لعنت مذکور ہے، یہ لعنت اس پر ہے جو اپنے آباء سے بیزاری ظاہر کرے اور اپنے آباء کے غیر کے نسب کا دعویٰ کرے جیسے غیر سیّد ہو کر سیّد ہونے کا دعویٰ کرے۔

چنانچہ شارح صحیح البخاری علامہ ابو الحسن علی بن خلف بن عبد الملک متوفی ۴۴۹ھ لکھتے ہیں:

و انما لعن النبی عليه السلام المتبرئ من أبيه و المدّعی غير نسبه فيمن فعل ذلك فقد ركب من الاثم عظيماً و تحمل من الوزر جسيماً، و كذلك المنتمی الی غير مواليه۔

یعنی حضور نبی کریم ﷺ نے صرف اس پر لعنت فرمائی ہے جو اپنے حقیقی باپ سے برأت ظاہر کرے اور حقیقی باپ کے غیر کے نسب کا مدّعی ہو، جس نے اس طرح کیا تو اس نے عظیم گناہ کا ارتکاب کیا اور (گناہ کا) بڑا بوجھ اٹھالیا، اسی طرح وہ غلام جو اپنے مالک کے غیر کی طرف اپنی نسبت کرے۔[3]

---

[1] (سنن ابن ماجہ، كتاب الحدود، باب: من ادّعی الی غير أبيه الخ، برقم: ۲۶۰۹، ۳/۲۶۳)

[2] (سنن الترمذی، كتاب الوصايا، باب ماجاء لا وصية لوارث، برقم: ۲۱۲۱، ۳/۱۷۹، ۱۸۰) (سنن الدّارمی، كتاب السّير، باب فی الذی ينتمی الی غير مواليه، برقم: ۲۵۲۹، ۲/۱۹۶) (المعجم الكبير، برقم: ۶۰ تا ۱۷، ۷۱-۱۵/ ۳۲/۲ تا ۳۶)

[3] (شرح ابن بطال، كتاب الفرائض، باب من ادّعی الی غير أبيه الخ، ۸/۳۸۳)

اور لعنت کی وجہ یہ ہے کہ بندہ جب اپنے مولیٰ کی نعمت کی قدر نہیں کرتا، اس کی نعمتوں کی ناشکری پر اتر آتا ہے تو ظالم قرار پاتا ہے اور ظالموں پر قرآن کریم میں لعنت مذکور ہے، چنانچہ حافظ ابو بکر محمد بن عبد اللہ ابن العربی مالکی متوفی ۵۴۳ھ لکھتے ہیں:

اذا کفر نعمة مولاہ فقد صار ظالماً، وقد قال اللہ تعالیٰ اَلَا لَعۡنَةُ اللّٰهِ عَلَی الظّٰلِمِیۡنَ (ھود ۱۸)

یعنی جب وہ اپنے مولیٰ کی نعمت کی ناشکری کرتا ہے تو وہ ظالم ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: {خبردار ظالموں پر اللہ کی لعنت ہے}۔[1]

اور لعنت کا معنی دھتکارنا اور دور کرنا ہے، احادیث نبویہ علیہ التحیۃ والثناء میں نسب بدلنے والے کے لئے قیامت تک اللہ تعالیٰ کی لعنت متتابعہ مذکور ہے تو لعنت جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو گی تو معنی ہو گا کہ وہ اس بندے کو رحمت سے دور فرما دیتا ہے، اور اسی طرح فرشتوں اور انسانوں کی لعنت بھی مذکور ہے، فرشتوں اور انسانوں کی لعنت میں دو احتمال ہیں، ایک یہ ہے کہ وہ اس شخص پر لعنت بھیجتے ہیں جیسا کہ ظاہر حدیث میں ہے، دوسرا احتمال یہ ہے کہ فرشتے چونکہ اہلِ ایمان کے لئے استغفار کرتے ہیں، بندہ جب اس جرم کا مرتکب ہو جاتا ہے اور اس پر نادم وپشیمان ہو کر توبہ نہیں کرتا تو وہ فرشتے اس کے لئے استغفار ترک کر دیتے ہیں اور اسی طرح انسانوں کی لعنت میں دوسرا احتمال یہ ہے کہ انسان اس کام کو قبیح گردانتے ہوئے مرتکب کو چھوڑ دیتے ہیں۔

چنانچہ حافظ ابو بکر ابن العربی لکھتے ہیں:

واللعنة ھی الطرد، فیکون المراد کما تقدم فی وقت أو حالٍ أو شخصٍ أو علی صفةٍ، وأما لعنة الملائکة فانھم کانوا یستغفرون له، فقطعھم الاستغفار ابعاد له عنھم، ویجوز أن یحمل علی ظاھرہ فیلعنونه، وأما لعنة الناس فھجر انھم، أو اطلاق اللعن له علی ظاھر الحدیث۔

یعنی اور لعنت دور کرنا ہے، دھتکارنا ہے جیسا کہ پہلے گزرا مراد ہو گی کسی وقت یا کسی حال میں یا کسی صفت پر (دور کرنا یا دھتکارنا) اور ملائکہ کی لعنت یہ ہے کہ وہ اس کے لئے استغفار کرتے ہیں تو فرشتے اس شخص کی (اس ممنوع فعل کے ارتکاب کے ذریعے) ان سے دوری کے سبب اس کے لئے استغفار قطع کر دیتے ہیں اور یہ بھی جائز ہے کہ اس لعنت کو ظاہر پر محمول کرتے ہوئے کہا جائے کہ وہ اس پر لعنت بھیجتے ہیں، اور لوگوں کی لعنت اُن کا اس شخص کو چھوڑنا ہے یا ظاہر حدیث کی بنا پر اس کے لئے لعنت کا اطلاق (یعنی لوگ اُن پر لعنت کرتے ہیں)۔[2]

---

[1] (عارضة الأحوذی، کتاب الولاء، باب ماجاء فیمن تولی غیر موالیه، ۴، ۲۱۲۷/۸/۲۱۹)

[2] (عارضة الأحوذی، کتاب الولاء، باب ماجاء فیمن تولی غیر موالیه، ۴، ۲۱۲۷/۸/۲۱۹)

نسب بدلنے والے پر اللہ تعالیٰ نظر رحمت نہیں فرمائے گا

امام احمد بن حنبل متوفی ۲۴۱ھ نے روایت کیا کہ:

عن سهل بن معاذ عن أبيه عن النبي ﷺ أنّه قال: انّ للّٰه تبارک و تعالیٰ عباداً لا يكلّمهم الله يوم القيامة، ولا يزكّيهم ولا ينظر اليهم۔" قيل: من أولٰئک يا رسول الله؟ قال: متبر من والديه، راغبٌ عنهما، ومتبر من ولده، ورجل أنعم عليه قومٌ فكفر نعمتهم وتبرّ امنهم۔

یعنی سہل بن معاذ اپنے باپ سے بیان کرتے ہیں، انہوں نے حضور نبی کریم ﷺ سے روایت کیا کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ کے کچھ ایسے بندے ہیں کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ نہ ان سے کلام فرمائے گا اور نہ انہیں پاک فرمائے گا اور نہ ان کی طرف نظر رحمت فرمائے گا۔" عرض کیا گیا یارسول اللہ یہ لوگ کون ہیں؟ فرمایا: "اپنے والدین سے برأت کا اظہار کرنے والا، ان سے اعراض کرنے والا اور اپنی اولاد سے برأت کا اظہار کرنے والا اور وہ شخص جس پر کسی قوم نے انعام کیا پس اس نے ان کی نعمت کی ناشکری کی اور ان سے برأت کا اظہار کیا"۔[1]

اس حدیث شریف کو امام ابو القاسم طبرانی متوفی ۳۶۰ھ نے بھی "المعجم الکبیر" میں **يحيىٰ بن ايوب كلاهما عن زبان ان فائدة وبهذا الاسناد** کے طریق سے روایت کیا ہے۔[2]

اپنے آپ کو غیر باپ کی طرف منسوب کرنا، حقیقی باپ سے برأت اور اس سے اعراض ہے، اسی طرح نسب بدلنا اپنے آباء سے برأت اور ان سے اعراض ہے اور حدیث شریف میں برأت اور اعراض سے منع کیا گیا اور ارتکاب کرنے والوں کے لئے یہ وعیدیں بیان کی گئیں کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ نہ ان سے کلام فرمائے گا اور نہ انہیں ستھرا رکھے گا اور نہ ان پر نظر رحمت فرمائے گا۔

اور اس میں بھی وہی تاویلیں ہیں جو پہلے ذکر کی جاچکیں کہ اگر کوئی شخص اس برأت و اعراض کے حرام ہونے کا علم رکھتے ہوئے اسے حلال جانتا ہے تو حدیث شریف اپنے ظاہر پر رہے گی اور اگر حلال نہیں جانتا تو یہ کلمات صرف اس حرام فعل کے مرتکب کے لئے بطور تغلیظ و زجر وارد ہوئے۔

اور علمائے کرام نے لکھا کہ اللہ تعالیٰ کا ان سے کلام نہ فرمانا شدتِ غضب سے کنایہ ہے۔

چنانچہ علامہ ابو الحسن سندھی لکھتے ہیں:

قوله: لا يكلّمهم الله: كناية عن شدّة الغضب۔

---

[1] (المسند ۳/۴۴۰)

[2] (المعجم الكبير ۲۰/۱۹۵، برقم: ۴۳۷ وقال فيه: عن سهل بن معاذ بن أنس عن أبيه)

اور انہیں ستھرا نہیں کرے گا" کا مطلب ہے کہ انہیں گناہوں کے میل سے پاک نہیں کرے گا اور ان کی طرف نہیں دیکھے گا کا مطلب ہے کہ نظرِ رحمت نہیں فرمائے گا ورنہ کوئی بھی اس سے پوشیدہ نہیں۔[1]

نسب بدلنا بہت بڑا بہتان ہے

امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ھ روایت کرتے ہیں:

عبد الواحد بن عبد اللہ النّصری قال: سمعت واثلۃ بن الأسقع یقول: قال رسول اللہ ﷺ: انّ من أعظم الفری أن یدّعی الرّجل الیٰ غیر أبیہ الخ۔

یعنی، عبد الواحد بن عبد اللہ النصری نے بیان کیا کہ میں نے حضرت واثلہ بن اسقع رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بہت بڑا بہتان یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی نسبت اپنے والد کے غیر کی طرف کرے۔

اور وہ اس طرح کہ اس سے بڑا بہتان اور کیا ہوگا کہ آدمی اپنے خالق پر بہتان باندھے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے جس کے نطفے سے پیدا فرمایا وہ کہتا ہے کہ نہیں اللہ تعالیٰ نے مجھے اس کے نہیں فلاں کے نطفے سے پیدا کیا ہے، اسی طرح اپنے باپ پر بھی بہتان ہے کہ میں تیرے نہیں فلاں کے نطفے سے پیدا ہوا ہوں، اسی طرح ماں پر بھی یہ عظیم بہتان ہے۔[2]

ذکر کردہ احادیث نبویہ علیہ التحیۃ والثناء میں وعیدیں

علماء اسلام نے ارشاداتِ نبویہ علیہ التحیۃ والثناء میں وارد کلمات کی جو توجیہات و تاویلات اور ان میں پائے جانے والے احتمالات ذکر کئے وہ اپنی جگہ درست ہیں، اس میں کوئی کلام نہیں ہے لیکن ایک مسلمان کو چاہیئے کہ وہ نسب بدلنے والوں، غیر آباء کی طرف اپنی نسبت کرنے والوں کے لئے حضور نبی کریم ﷺ نے جو وعیدیں ارشاد فرمائی ہیں انہیں مد نظر رکھے، اور اس قبیح و شنیع عمل کی گرد سے بھی اپنے آپ کو بچائے اور ان کا خلاصہ درج ذیل ہے:

۱۔ بہت بڑا بہتان ہے۔ جیسا کہ امام بخاری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اسے حضرت واثلہ بن اسقع رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا۔

۲۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس سے کلام نہیں فرمائے گا۔

۳۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ انہیں پاک نہیں فرمائے گا۔

۴۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ان پر نظرِ رحمت نہیں فرمائے گا۔

---

[1] (تحقیق مسند امام احمد، ۳۹۸/۲۴)

[2] (صحیح البخاری، کتاب المناقب، باب بعد باب نسبۃ الیمن الی اسماعیل علیہ السلام، برقم: ۳۵۰۹، ۶۱۶/۲، ۶۱۷)

۵۔ اس پر جنت حرام ہے۔ جیسا کہ امام بخاری، مسلم، او داؤد، ابن ماجہ، دارمی، اور احمد نے اسے حضرت سعد بن أبی وقاص اور حضرت ابو بکرہ رضی اللہ عنہما کی حدیث سے روایت کیا ہے۔

۶۔ وہ جنت کی خوشبو بھی نہ پائے گا۔ جیسا کہ امام ابن ماجہ نے اسے حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔

۷۔ اس پر قیامت تک اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے۔ جیسا کہ امام ابو داؤد اور امام ترمذی نے اسے حضرت انس بن مالک اور ابو امامہ باہلی رضی اللہ عنہما کی حدیث سے روایت کیا ہے۔

۸۔ اس پر خود اللہ تعالیٰ اور سب فرشتوں اور آدمیوں کی لعنت ہے۔ جیسا کہ امام مسلم، ترمذی، ابن ماجہ نے اسے حضرت علی المرتضیٰ، ابن عباس اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی حدیث سے روایت کیا ہے۔

۹۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کا کوئی فرض قبول نہیں فرمائے گا اور نہ نفل۔ جیسا کہ امام مسلم، ترمذی اور طبرانی نے اسے حضرت علی المرتضیٰ اور عمر بن خارجہ رضی اللہ عنہما کی حدیث سے روایت کیا ہے۔

۱۰۔ وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ جیسا کہ امام مسلم اور امام احمد نے اسے حضرت ابو ذرّ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے روایت کیا ہے۔

۱۱۔ وہ کافر ہو جائے گا۔ جیسا کہ امام بخاری، مسلم، ابو داؤد اور احمد نے اسے حضرت ابو ذرّ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی حدیث سے روایت کیا ہے۔

۱۲۔ نسب کا انکار کفر ہے۔ جیسا کہ امام ابن ماجہ، احمد، طبرانی اور ابن عدی نے اسے حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔

۱۳۔ آدمی کا ایسے نسب کی طرف اپنی نسبت کرنا جو معروف نہیں، کفر ہے۔

۱۴۔ ایسے نسب کی طرف نسبت کرنا جو معروف نہیں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر ہے۔ جیسا کہ امام طبرانی، ابن الجعد نے اسے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے۔

۱۵۔ نسب سے برأت اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر ہے۔ جیسا کہ امام طبرانی، براز اور ابن الجعد نے اسے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔

۱۶۔ نسب کی نفی کرنا اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر ہے۔ جیسا کہ امام طبرانی نے اسے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔

۱۷۔ وہ اپنا ٹھکانہ جہنم بنالے۔ جیسا کہ امام بخاری و مسلم نے اسے حضرت ابو ذرّ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث سے روایت کیا ہے۔

حکم

علماء اسلام نے قرآن کریم کی آیت اور حضور ﷺ کے ارشادات کو سامنے رکھتے ہوئے نسب بدلنے کو غیر باپ کی طرف اپنی نسبت کرنے کو حرام و گُناہ لکھاہے اور اسے کبیرہ گناہوں میں شمار کیا ہے۔

شارح بخاری شیخ الاسلام علامہ بدر الدین عینی حنفی متوفی ۸۵۵ھ اور شیخ الاسلام حافظ ابن حجر عسقلانی شافعی متوفی ۸۵۲ھ ''صحیح البخاری'' کی حدیث کے تحت لکھتے ہیں:

وفی الحدیث تحریم الانتفاء النسب المعروف، والادعاء الی غیرہ۔

یعنی اور حدیث شریف میں معروف نسب کی نفی اور اپنے آپ کو حقیقی باپ کے غیر کی طرف منسوب کرنے کا حرام ہونا مذکور ہے۔[1]

شارح بخاری علامہ شریف الحق امجدی لکھتے ہیں: جان بوجھ کر نسب کو بدلنا حرام و گناہ ہے یہاں تک کہ اس حدیث میں اسے کفر تک فرمایا گیا ہے، نسب بدلنے کی دو صورتیں ہیں ایک نفی یعنی اپنے باپ کے نسب سے انکار کرنا، دوسرے اثبات یعنی جو باپ نہیں اسے اپنا باپ بتانا دونوں حرام ہیں جیسا کہ آج کل رواج پڑ گیا ہے بڑی آسانی سے لوگ اپنے آپ کو سید کہنے اور کہلانے لگتے ہیں حالانکہ حقیقت میں وہ سید نہیں غالباً یہ بیماری پہلے بھی رائج تھی۔[2]

اور امام جمال الدین عبد الرحمن بن علی ابن الجوزی متوفی ۵۹۷ھ نے اپنے ایک رسالہ میں والدین سے اعراض اور غیر باپ کی طرف نسبت کو گناہ قرار دیا اور مسند امام احمد اور صحیحین سے احادیث نبویہ علیہ التحیۃ والثناء ذکر کی ہے۔[3]

اور امام ذہبی نے اسے کبیرہ گناہوں میں شمار کیا ہے جیسا کہ ان کی کتاب ''الکبائر'' میں ہے۔

اور علامہ ابن حجر ہیتمی شافعی نے بھی اسے کبیرہ گناہوں میں شمار کیا ہے۔[4]

---

[1] (عمدۃ القاری، کتاب المناقب، باب نسبۃ الیمن الی اسماعیل علیہ السلام، برقم: ۳۵۰۸، ۲۵۹/۱۱)(فتح الباری، کتاب المناقب، باب نسبۃ الیمن الی اسماعیل علیہ السلام، برقم: ۳۵۰۸، ۸/۶/۵۰۸ ۶۷۰/۳)(صحیح البخاری، برقم: ۳۵۰۸)

[2] (نزهۃ القاری شرح صحیح بخاری، کتاب المناقب، حدیث: ۱۸۵۳، ۱۹/۷)

[3] (بر الوالدین وصلۃ الرحم، فصل فیمن تبرأ من والدیہ الخ، وفصل اثم من ادّعی الی غیر أبیہ، ص ۶۱، ۶۲)

[4] (الزواجر عن اقتراف الکبائر، الکبیرۃ الثانیۃ والثالثۃ والتسعون بعد المائتین ۹۹/۲، ۱۰۰)

اہلِ بیتِ اطہار

اہلِ بیتِ اطہار رضوان اللہ علیہم اجمعین روئے زمین پر سب سے بہترین مخلوق ہیں کیونکہ ان ہی کے بارے میں آیاتِ قرآنیہ اور احادیثِ نبویہ تواتر سے ملتی ہیں۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْھِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَھْلَ الْبَیْتِ وَیُطَھِّرَ کُمْ تَطْھِیْرًا۔ (الاحزاب: ۳۳)

ترجمہ: اللہ تبارک وتعالیٰ تو یہی چاہتا ہے کہ وہ تم سے ناپاکی کو دور رکھے، نبی اکرم ﷺ کے گھر والو! اور تم کو پاک وصاف فرمادے، جیسا کہ پاک کرنے کا حق ہے۔

''مسند'' اور ''معجم کبیر'' میں حضرت ابو سعید الخذری رضی اللہ عنہ کی روایت ہے، ''نزلت ھٰذہ الاٰیۃ: فی خمسۃٍ: النبیّ ﷺ وعلیّ رضی اللہ عنہ وفاطمۃ رضی اللہ عنہا والحسن رضی اللہ عنہ والحسین رضی اللہ عنہ'' یعنی یہ آیۂ مبارکہ پانچ شخصیات کے لئے نازل ہوئی۔ نبی اکرم ﷺ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ۔

شرفِ انفرادی تطہیر

صحیح مسلم میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ:

''خرج النبی ﷺ ذات غداۃ وعلیہ مرطٌ مرجل من شعر اسود، فجاء الحسن رضی اللہ عنہ فادخلہ ثم جاء الحسین رضی اللہ عنہ فادخلہ ثم جائت فاطمۃ رضی اللہ عنہا فادخلھا ثم جاء علی رضی اللہ عنہ فادخلہ ثم قال: {اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْھِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَھْلَ الْبَیْتِ وَیُطَھِّرَ کُمْ تَطْھِیْرًا}

ایک دن نبی پاک ﷺ اُونی دھاری دار چادر اوڑھے صبح کے وقت باہر تشریف لائے اس اثناء میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ تشریف لائے تو آپ ﷺ نے ان کو چادر میں داخل کر دیا، پھر حضرت حسین رضی اللہ عنہ تشریف لائے تو ان کو بھی چادر میں داخل کر دیا، پھر سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا تشریف لائیں تو ان کو بھی چادر میں داخل فرمادیا، پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ تشریف لائے تو ان کو بھی چادر میں داخل فرمانے کے بعد آیت مذکورہ تلاوت فرمائی۔

خاص اہلِ بیتِ نبوی ﷺ

''سنن ترمذی'' میں حضرت امّ سلمہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے حضرت حسن، حضرت حسین، حضرت علی اور سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہم اجمعین کو اپنی چادر مبارک میں ڈھانپ کر فرمایا ''اللّٰھمّ ھؤلآء اھل بیتی و حامتی - ای

خاصتی -اذھب عنھم الرّجس وطھرھم تطھیراً۔ (اے اللہ! یہ میرے "خاص اہل بیت" ہیں ان سے آلودگی کو دور فرما کر ان کو پاک وصاف فرمادے)۔ حضرت امّ سلمہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میں ان کے ساتھ ہوں جس پر آپ ﷺ نے فرمایا بے شک تو خیر پر ہے۔ اس سے مراد ہے "انت من ازواج النبی ﷺ" کہ تو تو نبی ﷺ کے گھر والی ہے۔ {ازواج اور اولاد کی مجموعی صورت ہی کو اہلِ بیت کہا جاتا ہے}

یہ میرے اہلِ بیت ہیں!

"سنن ترمذی" میں حضرت ابن ابی سلمہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جس وقت آپ ﷺ حضرت امّ سلمہ رضی اللہ عنہا کے گھر تشریف فرما تھے۔ آپ ﷺ نے حضرت علی، حضرت فاطمہ، حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہم اجمعین کو بلوایا اور ان کو چادر میں ڈھانپ کر فرمایا: "اللھمّ ھؤلاء اھلُ بیتی فاذھب عنھم الرِّجسَ وطھّرھم تطھیرا۔ کہ یا رسول اللہ ﷺ میں ان کے ساتھ ہوں؟ جس پر آپ ﷺ نے فرمایا: "تیرا اپنا ایک مقام ومرتبہ ہے اور تو نیکی اور بھلائی پر ہے۔"

"مسلم" اور "ترمذی" میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ جب "آیتِ مباھلہ" سورۃ آل عمران، آیت ۶۱ نازل ہوئی تو آپ ﷺ نے حضرت علی، حضرت فاطمہ، حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہم کو بلوایا اور فرمایا "اَللّٰھمّ ھٰؤُلاءِ اَھلِی" اے اللہ! یہ! میرے اہل (گھر والے) ہیں۔"

اھلُ بیتی حقّاً

"مستدرک" میں حضرت واثلہ بن الاسقع رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ملاقات کے لئے آپ رضی اللہ عنہ کے درِ اقدس پر حاضر ہوا، دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے ہاں تشریف لے گئے ہیں۔ میں وہیں بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر میں رسول اللہ ﷺ، حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت حسن رضی اللہ عنہ، حضرت حسین رضی اللہ عنہ تشریف لے آئے اور ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے حجرۂ مبارکہ میں تشریف لے گئے۔ حضور ﷺ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو اپنی دائیں ران پر اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو بائیں ران پر بٹھایا، حضرت علی رضی اللہ عنہ اور سیدہ فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کو سامنے بٹھا کر ان سب کو چادر یا اپنی عباء میں ڈھانپ کر آیتِ تطہیر تلاوت فرمائی اور پھر ارشاد فرمایا: "اللھمّ ھؤلاء اھل بیتی حقًّا" اے اللہ! یہ ہی میرے حقیقی اہلِ بیت ہیں۔"

"معالم العترۃ"اور"مسند امام احمد"میں حضرت امّ سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ایک روز سیدۃ فاطمہ رضی اللہ عنہا صبح کے وقت ہنڈیا میں حلوہ لے کر رسول اللہ ﷺ کے پاس تشریف لائیں اور خدمتِ اقدس میں حلوہ پیش فرمایا۔ آپ ﷺ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ میرے چچا کے بیٹے (یعنی حضرت علی کرم اللہ وجہہ) کہاں ہیں؟ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے عرض کی کہ وہ گھر میں ہیں جس پر آپ ﷺ نے فرمایا: فاذھبی فادعیہ وآتینی بِبنیہ! کہ تم جاؤ، ان کو اور اپنے دونوں صاحبزادوں کو ساتھ لے کر میرے پاس آؤ۔ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا ان سب کو لے کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت اقدس میں تشریف لائیں۔ آپ ﷺ نے ان سب پر خیبر سے لائی ہوئی چادر ڈال کر فرمایا"اے اللہ! یہ آلِ محمد ﷺ ہیں ان پر تو اپنا درود اور برکات بھیج جیسا کہ تو آلِ ابراہیم پر بھیجتا ہے، بے شک تو بڑی تعریف اور بزرگی والا ہے"۔

"المطالب العالیہ" اور "فتح الباری" میں حضرت ابی الحمراء سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ فجر کے وقت ایک دروازے کی چوکھٹ پر تشریف لاکر فرماتے "السلام علیک یا اھل البیت ورحمۃ اللہ وبرکاتہ" پھر فرماتے "الصلاۃ رحمکم اللہ" یعنی نماز کا وقت ہے، اللہ آپ پر رحم فرمائے۔ پوچھا گیا کہ اس گھر میں کون ہے؟ فرمایا حضرت علی، سیدہ فاطمہ، حضرت حسن، حضرت حسین رضی اللہ عنہم۔

مصداقِ آیتِ تطہیر

"ضحاک" فرماتے ہیں کہ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی تو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت فرمایا اے اللہ کے نبی ﷺ ! ہم آپ کے اہل ہیں کہ جن سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے ناپاکی کو طہارت میں تبدیل فرمادیا ہے؟ جس پر آپ ﷺ نے فرمایا کیا تو نہیں جانتی کہ آدمی کی بیوی ہی پیار و محبت میں سب سے زیادہ اس کے قریب ہوتی ہے۔ "والذی خصّ اللہ نبیّا، لقد خصّ اللہ بھذہ الاٰیۃ: فاطمۃ وزینب ورقیۃ وامّ کلثوم وعلیّا والحسن والحسین وجعفراً وازواج محمّد ﷺ خاصۃ واقرباءہ۔ جس نے مجھے نبی بنا کر بھیجا ہے تحقیق اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ آیۃ مبارکہ ان سے مخصوص فرمائی ہے۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا، حضرت زینب رضی اللہ عنہا، حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا، حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا، حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت حَسن رضی اللہ عنہ، حضرت حسین رضی اللہ عنہ، حضرت جعفر رضی اللہ عنہ، نبی کریم ﷺ کی ازواج مبارکہ رضی اللہ عنہن اور ان کے اقارب۔

تفسیر طبری میں ہے کہ حضرت امام زین العابدین رضی اللہ عنہ واقعہ کربلا کے بعد جب شام تشریف لائے تو شام کے ایک شخص سے آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ کیا تو نے سورۃ الاحزاب کی یہ آیت (اِنّما یرید اللہ۔۔۔) نہیں پڑھی، جس پر اس شخص

نے سوال کیا کہ کیا آپ ہی وہ شخصیات ہیں؟ جواب میں حضرت زین العابدین رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہاں! ہم ہی اس آیتِ مبارکہ کے مصداق ہیں۔

اہلِ بیتِ نسب

"صحیح مسلم" میں حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ جب ان سے پوچھا گیا کہ کیا اہل بیت میں آپ ﷺ کی ازواجِ مبارکہ بھی شامل ہیں تو آپ نے جواب دیا کہ نبی پاک ﷺ کی ازواج بھی اہل بیت ہیں، لیکن وہ اہل بیتِ نسب نہیں ہیں۔ **وانما اهل بیت نسبه من حرم الصدقة** اور اہل بیت نسب وہی ہیں جن پر صدقہ حرام ہے۔ پوچھا گیا کہ وہ کون ہیں "**هم آل علی و آل جعفر و آل عقیل**" کہ اولادِ حضرت علی کرم اللہ وجہہ، اولادِ جعفر رضی اللہ عنہ اور اولادِ عقیل رضی اللہ عنہ۔

اہل بیت کی فضیلت کا اندازہ نبی اکرم ﷺ کے اس قول مبارک سے آسانی سے لگایا جاسکتا ہے کہ "**اللّٰھمّ انھم منّی و انا منھم**" اے اللہ! یہ مجھ سے ہیں اور میں ان سے ہوں۔ ایک موقع پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: خبردار! آگاہ رہو کہ جس نے میرے قرابت داروں کو تکلیف پہنچائی اس نے مجھے تکلیف پہنچائی اور جس نے مجھے تکلیف پہنچائی تو تحقیق اس نے اللہ تعالیٰ کو ناراض کیا۔

فضیلتِ بنو قریش و بنو ھاشم

حضرت سعد بن سہل الساعدی سے مرفوع حدیث روایت ہے کہ "**احبّوا قریشاً فانّ من احبّھم احبّه اللّٰه**" قریش سے محبت کرو، جو ان سے محبت کرے گا تو اللہ تبارک وتعالیٰ بھی اس سے محبت فرمائے گا۔

"صحیح مسلم" میں حضرت واثلہ بن الاسقع رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: **ان اللّٰه اصطفیٰ کنانه من بنی اسماعیل و اصطفیٰ من بنی کنانه قریشاً و اصطفٰی من قریش بنی ھاشم و اصطفانی من بنی ھاشم**" تحقیق اللہ تبارک وتعالیٰ نے بنی اسماعیل میں سے کنانہ کو منتخب فرمایا اور بنی کنانہ سے قریش کو پسند فرمایا اور قریش سے بنی ہاشم کو چنا اور بنی ہاشم سے مجھے منتخب فرمایا۔

مسلم، ترمذی، ابو حاتم، اور حمزہ السھمی نے فضائل العباس میں ایک روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تحقیق اللہ تبارک وتعالیٰ نے اولادِ آدم سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو پسند فرما کر ان کو اپنا دوست بنایا، پھر اولادِ ابراہیم سے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو منتخب فرمایا، پھر اولادِ اسماعیل علیہ السلام سے نزار کو پسند فرمایا، پھر نزار سے مضر اور مضر سے کنانہ

اور کنانہ سے قریش کو چنا، پھر قریش سے بنی ھاشم اور بنی ھاشم سے عبد المطلب رضی اللہ عنہ کو منتخب فرمایا اور پھر اولاد عبد المطلب رضی اللہ عنہ سے مجھے منتخب فرمایا۔ صلی اللہ علیہ و آلہ و بارک و سلم۔

صواعق محرقہ صفحہ ۱۱۵ پر بنی ھاشم کی دوسری فضیلت سے متعلق حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے مجھے بتایا ہے کہ قلبت الارض مشارقھا و مغاربھا میں نے زمین کے مشرق و مغرب کو تلپٹ کیا فلم اجدر جلا افضل من محمد ﷺ لیکن مجھے محمد ﷺ سے افضل کوئی شخصیت نہیں ملی۔ و قلبت الارض مشارقھا و مغاربھا کہ میں نے زمین کا مشرق و مغرب چھان ڈالا لیکن میں نے بنو ہاشم سے افضل کسی کو نہ پایا۔

اہلِ بیتِ کرام سے احسان کا صلہ

دیلمی نے الفردوس میں حدیثِ نبوی ﷺ نقل فرمائی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ”جو شخص میرے وسیلے سے روزِ قیامت شفاعت کا طلبگار ہے تو اسے چاہیئے کہ وہ میری اہلِ بیت سے تعلق رکھے اور انہیں خوشیاں بہم پہنچائے۔“

”ذخائر العقبیٰ“ میں حضرت عمر خطاب رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے جس میں انہوں نے حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ ”کیا تمہیں معلوم نہیں؟ بنی ہاشم کی عیادت فرض ہے اور ان کی زیارت نفل کا درجہ رکھتی ہے“۔

زیارتِ بنی ھاشم کی فضیلت

دار قطنی نے الفضائل میں نقل کیا ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ ”ہمارے ساتھ حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ کی زیارت کو چلو کیا تمہیں معلوم نہیں کہ بنی ہاشم کی عیادت فرض میں اور ان کی زیارت نوافل میں شمار ہوتی ہے۔“

طبرانی نے الاوسط میں حدیث حضرت ابان بن عثمان رضی اللہ عنہ نقل کی ہے کہ میں نے اپنے والد حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے سنا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ”جس کسی نے حضرت عبد المطلب رضی اللہ عنہ کی اولاد کے کسی بھی فرد سے نیکی کا ہاتھ بڑھایا اور وہ شخص اس نیکی کا بدلہ ادا نہ کر سکا، تو اس کا بدلہ میرے ذمے ہے، کل جب وہ مجھے ملے گا تو میں ادا کروں گا“۔

ایک علوی عورت کی خدمت کا صلہ

"تذکرہ خواص الامہ فی معرفۃ الائمۃ" میں "سبط ابن الجوزی" نے حضرت عبد اللہ ابن المبارک رضی اللہ عنہ کی سند سے نقل کیا ہے کہ آپ ایک سال حج ادا کیا کرتے اور ایک سال جہاد میں شرکت فرمایا کرتے، سالِ حج میں انہوں نے پانچ سو دینار نکالے اور کوفہ میں اونٹوں کی خریداری کے لئے چل پڑے، آپ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک عورت کو دیکھا کہ جو گندگی کے ڈھیر سے ایک مردہ بطخ کو صاف کر رہی ہے، میں اس کے قریب گیا اور مردہ بطخ کو صاف کرنے کی وجہ دریافت کی، جس پر اس عورت نے جواب دیا کہ اے عبد اللہ! تو مجھ سے ایسی بات کے متعلق پوچھ رہا ہے جس کا تجھ سے کوئی تعلق نہیں، حضرت عبد اللہ فرماتے ہیں کہ میرے ذہن میں اچانک ایک خیال گزرا اور حقیقت حال کا پتہ لگانے کے لئے میں نے دوبارہ اصرار کیا، جس پر اس عورت نے کہا کہ اے عبد اللہ تو نے مجھے اتنا مجبور کر دیا ہے کہ اب میں تجھے اصل صورتحال سے آگاہ کرتی ہوں: انا امرأۃ علویۃ ولی اربع بنات یتامیٰ مات ابوھنّ من قریب، کہ میں ایک علوی خاتون ہوں میری چار یتیم بچیاں ہیں ان کا باپ کچھ عرصہ قبل انتقال کر گیا ہے۔ اور آج چوتھا دن ہے کہ ہم نے کچھ نہیں کھایا اور یقیناً اب ہم پر مردار بھی حلال ہو گیا ہے، اس لئے اب اس بطخ کو صاف کر کے اپنی بچیوں کے کھانے کے لئے لے جا رہی ہوں۔ آپ رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں میں نے دل میں کہا "ویحک یا ابن المبارک" کہ اے ابن مبارک، حیف ہے تجھ پر، یہ سب کچھ کیا ہے؟ آپ رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرے دل سے حج ادا کرنے کی خواہش جاتی رہی اور میں نے مذکورہ رقم اس پریشان خاندان کے حوالہ کر دی۔ زمانۂ حج گزر گیا اور لوگ حج کی ادائیگی کے بعد واپس آنا شروع ہو گئے۔ میں جس حاجی کو بھی حج کی مبارک باد دیتا تو وہ جواباً مجھے بھی حج کی مبارک باد پیش کرتا اور کہتا کہ ہم نے آپ سے فلاں مقام پر ملاقات کی ہے، اور ہم فلاں مقام پر آپ سے ملے تھے، حتیٰ کہ بے شمار لوگوں نے مجھے اس قسم کی باتیں بتائیں کہ میں اس بارے میں بہت زیادہ متفکر ہو گیا۔ فرأیت رسول اللہ ﷺ فی المنام، وھو یقول: یا عبد اللہ، لا تعجب فانک اغثت ملھوفۃً من ولدی، فسألت اللہ ان یخلق علیٰ صورتک ملکاً یحج عنک کل عامٍ الیٰ یوم القیامۃ، فان شئت ان تحج، و ان شئت لا تحج۔ تو خواب میں مجھے رسول اللہ ﷺ کی زیارت کا شرف حاصل ہوا، اور آپ ﷺ مجھ سے فرما رہے ہیں کہ اے عبد اللہ! تو اس بات پر تعجب نہ کر، تو نے میری اولاد کی ایک حاجت مند خاتون کی مدد کی، تو میں نے اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا کی ہے کہ وہ تیری شکل وصورت کا ایک فرشتہ پیدا کر دے جو قیامت تک ہر سال تیری طرف سے حج کرتا رہے، اب تو حج ادا کر یا نہ کر یہ تیری مرضی ہے۔

جامع کرامات اولیاء از علامہ محمد یوسف اسماعیل النبہانی رضی اللہ عنہ میں ہے کہ حضرت عبد اللہ ابن مبارک رضی اللہ عنہ کا شمار اکابر مجتہدین میں ہوتا ہے، آپ بہت بڑے امام اور عارفین میں عظیم شخصیت ہو گزرے ہیں۔ حضرت یافعی رحمۃ اللہ علیہ

فرماتے ہیں کہ حضرت عبد اللہ بن مبارک رضی اللہ عنہ نے وفات کے وقت اپنی دونوں آنکھیں کھولیں، پھر ہنسے اور کہا لمثل هٰذافليعمل العاملون کہ کام کرنے والوں کو ایسے ہی کام کرنے چاہئیں۔

ایک علوی خاتون سے نیکی پر مجوسی کو زیارتِ رسول ﷺ اور جنت میں محل

ابو الفرج ابن الجوزی نے اپنی کتاب الملتقط میں ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک علوی بزرگ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ شہر بلخ میں مقیم تھے۔ کچھ عرصہ بعد اس علوی بزرگ کا انتقال ہو گیا اور ان کی خاتون دشمنوں کے خوف سے اپنی بچیوں کو ساتھ لے کر شدید سردی کی حالت میں سمرقند چلی گئیں۔ بچیوں کو مسجد میں چھوڑا اور خود ان کے کھانے کی تلاش میں باہر نکلیں، وہ خاتون بیان کرتی ہیں کہ میں نے دیکھا کہ کچھ لوگ ایک بزرگ شخص کے ارد گرد جمع ہیں، میں نے اس شخص کے بارے میں لوگوں سے پوچھا کہ یہ کون شخص ہیں، تو مجھے بتایا گیا کہ "هٰذا شيخ البلد" کہ یہ شہر کے بڑے بزرگ آدمی ہیں۔ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوئی، اپنی ساری داستانِ غم سنائی جس پر انہوں نے کہا "اقيمي عندي البيّنه انک علوية" تو مجھے اس بات کا ثبوت فراہم کر کہ تو علویہ (خاندانِ حضرت علی رضی اللہ عنہ) ہے۔ اس نے میری کوئی بات نہ سنی اور میں مایوس ہو کر واپس مسجد کی طرف چل پڑی تو راستے میں دیکھا کہ ایک اور بڑے آدمی چبوترے پر بیٹھے ہیں، اور ان کے گرد بھی ایک جماعت بیٹھی ہوئی ہے۔ میں نے پوچھا یہ کون ہیں؟ لوگوں نے کہا "هذا ضامن البلد" کہ یہ شہر کا ذمہ دار آدمی ہے اور مجوسی ہے۔ میں نے دل میں سوچا کہ شاید اس شخص کے ہاں میری مشکل کا حل نکل آئے، میں آگے بڑھی اور اپنی داستانِ غم اسے بھی سنا دی اور "شيخ البلد" سے بھی اپنی ملاقات کا ذکر کر دیا، مجوسی نے فوراً اپنے ملازم کو بلایا اور کہا کہ جا کر اپنی مالکن کو پیغام دو کہ فوراً تیار ہو کر باہر آئے۔ کچھ ہی دیر میں اس مجوسی کی بیوی تیار ہو کر اپنی کنیزوں کے ہمراہ باہر آ گئی، مجوسی نے اسے کہا کہ اس خاتون کے ہمراہ فلاں مسجد میں جاؤ اور ان کی بچیوں کو گھر لے کر آؤ۔ علوی خاتون بیان کرتی ہیں کہ مجوسی کی بیوی میرے ساتھ چلی اور بچیوں کو اپنے گھر لے آئی، ہمارے لئے بہترین رہائش کا انتظام کیا، قیمتی لباس پہنائے اور مختلف قسم کے کھانوں سے ہماری تواضع کی۔ ہم نے انتہائی آرام و سکون کے ساتھ رات گزاری۔ آدھی رات کے وقت اس مسلمان "شيخ البلد" نے ایک خواب دیکھا کہ قیامت قائم ہو چکی ہے اور سرکار ﷺ تاجِ شفاعت پہنے ہوئے ہیں۔ ایک سبز زمرد کا محل بھی اس نے دیکھا، جس پر "شيخ البلد" نے پوچھا کہ یہ کس کا محل ہے؟ جواب ملا یہ ایک مسلمان کا محل ہے۔ "شيخ البلد" رسول اللہ ﷺ کی طرف بڑھا تو آپ ﷺ نے اس سے اپنا رخِ انور موڑ لیا جس پر اس شخص نے کہا یا رسول اللہ ﷺ آپ نے مجھ سے اپنا رخِ انور موڑ لیا جب کہ میں مسلمان ہوں، جس پر رسول اللہ ﷺ نے اس شخص سے فرمایا: "اقم البينة عندي انک مسلم" کہ تو اپنے مسلمان ہونے پر

دلیل دے۔ وہ شخص حیران و پریشان ہو گیا جس پر رسول اللہ ﷺ نے اس شخص سے کہا کہ کیا اب تو وہ بات بھول گیا ہے جو تو نے اس علوی خاتون سے کہی تھی؟ وہ علوی خاتون اپنی بچیوں کے ہمراہ جس شخص کے گھر میں اب قیام پذیر ہیں، یہ اس شخص کا محل ہے۔ وہ شخص پریشانی کے عالم میں خواب سے بیدار ہوا، روتا ہوا اور اپنے منہ پر تھپڑ مارتا ہوا اس علوی خاتون کی تلاش کے لئے باہر نکل آیا۔ اسے پتہ چلا کہ وہ خاتون اس مجوسی کے ہاں قیام پذیر ہیں، وہ اس مجوسی کے پاس آیا اور اس علوی خاندان کے بارے میں پوچھا جس پر مجوسی نے جواب دیا کہ وہ میرے پاس مقیم ہیں۔ اس نے کہا کہ انہیں میرے ساتھ بھیج دو، مجوسی نے جواب دیا کہ اب یہ ناممکن ہے۔ ''شیخ البلد'' نے اس مجوسی سے کہا کہ یہ ہزار دینار ہیں ان کے بدلے اس خاندان کو میرے ساتھ کر دو۔ مجوسی نے جواب دیا ''لا واللہ ولا بمائۃ الف'' کہ نہیں خدا کی قسم! اگر تو ایک لاکھ دینار بھی دے تو اب یہ ممکن نہیں! ''شیخ البلد'' نے جب زیادہ منت سماجت شروع کر دی تو اس مجوسی نے کہا کہ جو خواب تو نے دیکھا ہے، وہ خواب میں نے بھی دیکھا ہے، اور جس محل کا تو نے نظارہ کیا ہے تو میرے ہی لئے تیار کیا گیا ہے، اور اگر تو اپنے مسلمان ہونے پر نازاں ہے تو پھر سن لے، خدا کی قسم! میں اور میرے اہل خانہ رات کو اس وقت تک نہ سوئے کہ جب تک ہم سب نے اس علوی خاتون کے دستِ مبارکہ پر اسلام قبول نہیں کر لیا اور اب ہم پر اسلام کی برکات کا نزول بھی شروع ہو گیا ہے اور میں نے رسول اللہ ﷺ کی زیارت کا بھی شرف حاصل کر لیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **القصر لک ولاھلک بما فعلت مع العلویۃ وانتم من اھل الجنۃ خلقکم اللہ مؤمنین فی القدم،** یعنی یہ محل تیرے اور تیرے اہل خانہ کے لئے ہے اور یہ اس نیکی کا بدلہ ہے جو تو نے اس علوی خاتون کے ساتھ کی اور تم اہل جنت میں سے ہو کیونکہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے تم سب کو بہت پہلے سے مسلمان پیدا کیا تھا۔

امیر تیمور کو اہل بیت سے محبت کا صلہ

''بلخی'' نے ''ینابیع المودۃ'' اور ''صواعق محرقۃ'' میں نقل کیا ہے کہ امیر تیمور کی وفات کے بعد قرأ حضرات اس کی قبر پر تلاوت کیا کرتے تھے۔ ایک قاری صاحب بیان کرتے ہیں کہ جب قرأ حضرات کی جماعت کے ساتھ اس کی قبر پر آتا تو قرآن پاک کی تلاوت کیا کرتا اور جب کبھی اکیلا قبر پر آتا تو سورۃ الحاقۃ کی آیت ۳۰ اور ۳۱ تلاوت کیا کرتا: ''پکڑ لو اس کو اور اس کی گردن میں طوق ڈال دو، پھر اسے دوزخ میں جھونک دو۔'' اور یہ آیات میں اکثر تلاوت کیا کرتا، ایک رات جب میں سویا ہوا تھا تو مجھے رسول اللہ ﷺ کی زیارت کا شرف حاصل ہوا، میں نے دیکھا کہ آپ ﷺ تشریف فرما ہیں اور پہلو میں امیر تیمور بھی بیٹھے ہوئے ہیں، قاری صاحب بیان کرتے ہیں کہ میں نے خواب میں ہی اسے ڈانٹتے ہوئے کہا ''الی ھنا یا عدوّ اللہ

وصلت" کہ اے دشمن خدا! تو یہاں تک پہنچ گیا ہے۔ میں نے ارادہ کیا کہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اس کو رسول اللہ ﷺ سے دور کر دوں جس پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: دعه فانّه کان یحبّ ذرّیتی! کہ اسے چھوڑ دو کیونکہ وہ میری اولاد سے محبت کرتا تھا۔" میں خواب سے بیدار ہوا اور امیر تیمور کی قبر پر جو خلوت میں پڑھا کرتا تھا، اس کو ترک کر دیا۔

"صواعق محرقة" میں "الزین عبدالرحمن البغدادی الخلال" بیان کرتے ہیں کہ امیر تیمور کے کچھ وزراء نے انہیں بتایا کہ ایک مرتبہ امیر تیمور سخت بیمار ہوا، چند دن شدت اضطراب میں گزارنے کے بعد اس کا چہرہ سیاہ ہو گیا لیکن کچھ ہی عرصہ بعد خود ہی دوبارہ اس کا چہرہ ٹھیک ہو گیا، اس کی وجہ جب پوچھی گئی تو امیر تیمور نے خود بیان کیا کہ عذاب کے فرشتے میرے پاس آئے اور اسی دوران رسول اللہ ﷺ بھی تشریف لائے اور ان سے فرمایا کہ اس سے دور ہو جاؤ کیونکہ یہ شخص میری اولاد سے محبت اور ان سے احسان کیا کرتا تھا۔

نسب بدلنے کا شرعی حکم میں حضرت علامہ شیخ القرآن والحدیث مفتی محمد عطاء اللہ نعیمی دامت برکاتہم العالیہ کا مطالعہ کیجئے۔ میں نے اس کتاب سے کچھ عبارات یہاں لکھ دی ہیں۔